جلد دوم

35

خاص نمبر

1857

تاریخ پبلی کیشنز کا کتابی سلسلہ

سہ ماہی

تاریخ

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ پبلی کیشنز

18- مزنگ روڈ لاہور

خط و کتابت (برائے مضامین)

بلاک 1، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ

فون:042-6665997

ای میل:mubarakali21@yahoo.com

خط و کتابت (برائے سرکولیشن)

پبلشرز	:	تاریخ پبلی کیشنز
		18-مزنگ روڈ' لاہور
فون	:	042-7236634
قیمت فی شمارہ	:	240روپے
سالانہ	:	400روپے
قیمت مجلد شمارہ	:	300روپے
بیرون ممالک	:	2000روپے (سالانہ معہ ڈاک خرچ)

رقم بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام فکشن ہاؤس لاہور، پاکستان

اہتمام	:	ظہور احمد خاں
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سیّد محمد شاہ پر
سرورق	:	عباس
تاریخ اشاعت	:	اکتوبر 2007ء
تقسیم کار	:	فکشن ہاؤس
		18-مزنگ روڈ' لاہور
فون	:	042-7249218-7237430
ای میل	:	fictionhouse2004@hotmail.com

فہرست

جلد دوم

مضامین

☆ تاریخ تحریک آزادی ہند: 1857 کی بغاوت تاراچند/ترجمہ: غلام ربانی تاباں 9

☆ اٹھارہ سو ستاون ابوالکلام آزاد/ترجمہ: خورشیدہ پروین 98

☆ منگل پانڈے راجیو متل/ترجمہ: حیدر جعفری سید 119

☆ 1857 کے چار باغی گوتم بہادرا/ترجمہ: پروفیسر طفیل ڈھانہ 137

☆ فضل حق خیرآبادی اور 1857 جمال ملک/ترجمہ و تلخیص: ڈاکٹر ناظر محمود 188

☆ جنگ آزادی 1857 کے ایک مجاہد
مولانا فیض احمد بدایونی محمد ایوب قادری 204

☆ بہادر شاہ ظفر اور 1857 کی جنگ آزادی جبار علی رضوان انصاری 240

☆ انقلاب 1857 اور غالب کا ردعمل ڈاکٹر ابوظہیر ربانی 254

☆ کانپور کی ایک مجاہدۂ آزادی رقاصہ: عزیزن پی۔ پی۔ سریواستوا رند 267

☆ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں
دلّی کا کردار پروفیسر ظفر احمد نظامی 271

☆1857 کی جنگ آزادی اور لکھنو	ارون کمار تری پاٹھی	290
☆پنجاب اور 1857	سریندر ناتھ سین	296
☆اجنالہ کی داستان	ترجمہ: اظہار حسین کاظمی	314
☆1857 کی تحریک آزادی اور میوات	نصیر الدین ازہر	323
☆1857 کا انقلاب اور ناگپور	محمد شرف الدین ساحل	328
☆1857 اور الہ آباد کا مورچہ	لئیق رضوی	337
☆غدر دہلی کے اخبار یا اقتباسات صادق الاخبار	خواجہ حسن نظامی	345
☆1857 اور فارسی اخبارات	اخلاق احمد آہن	364
☆بہادر شاہ ظفر کے فرامین	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	379
☆بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ	ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی	387
☆ہندوستانی بغاوت	کارل مارکس	393
☆ہندوستان سے متعلق یادداشتیں	کارل مارکس	397
☆ہندوستان سے موصول ہونے والے مراسلات	کارل مارکس	406
☆ہندوستان میں اذیت رسانی کی تفتیش	کارل مارکس	410
☆1857 کی کہانی بڑے بوڑھوں کی زبانی	آغا حیدر حسن مرزا	416
☆بادشاہ دہلی کے حضور میں انگریزوں کی آخری نذر	ولیم ایڈورڈ	430
☆مقید بادشاہ سے ملاقات	رسل/ترجمہ: محمد حسن رابع	434
☆انگریز افسروں کے خطوط		441

☆دستاویزات: ناناصاحب اور بالاصاحب		
کے خطوط		446
☆شیخ خیرالدین اور محمد حسن کے درمیان		
ہوئی مراسلت		453
☆بغاوتِ ہند اور برطانوی رائے	جیمز برائن	461
☆اٹلی میں 1857 کی صدائے بازگشت	للیاناڈل نوگارے	484
☆ہم عصر فرانسیسی پریس	چارلس فورنیں	494
☆چین اور ہندوستان انیسویں صدی کے		
وسط میں	یوشینگ ووچانگ چیں کن	503
☆1857 اور روسی پریس	پی۔ شاستی کو	519
☆1857-2007: تہذیبوں کا ٹکراؤ یا		
سامراج کے خلاف مزاحمت	کلپناولسن/ترجمہ: ظفر علی خان	524
☆جنگ آزادی کی سو (100) سالہ یادگار	نامہ نگار دلیل ونہار	530
☆ملکہ وکٹوریہ کا اعلان		532
☆حضرت محل کا جواب		533
☆1857 کے بارے میں شاعری		534
☆1857 سے متعلق تصاویر		545

مضامین

تاریخ تحریکِ آزادیِ ہند

1857ء کی بغاوت

تاراچند/ترجمہ: غلام ربانی تاباں

I- ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی نوعیت

جس وقت ڈلہوزی اپنے عہدے سے سبکدوش ہوا ہندوستان میں برطانوی حکومت اپنی فطری حدوں کو پہنچ چکی تھی۔ مغرب سے مشرق کی طرف یہ دریا سندھ سے ایراودی تک پھیلی ہوئی تھی اور شمال سے جنوب کی طرف ہمالیہ سے بحر ہند تک فتح کئے ہوئے ان وسیع علاقوں میں برطانوی سامراجی اہلیت نے حکومت کا ایک ایسا نظام بنایا جو دو مقاصد پورے کرتا تھا۔ ایک طرف تو اس نے مزاجیت سے نجات دلائی جو اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں پائی جاتی تھی، امن قائم کیا اور جان و مال کی حفاظت کا انتظام کیا اور ہندوستان کے لوگوں کے سیاسی اتحاد کے لئے سازگار حالات پیدا کئے۔ دوسری طرف انگریزوں نے ایک ایسی سلطنت پائی جس کی وسعت، دولت وسائل بے مثال تھے اور جس نے ایک چھوٹے سے جزیرے تک محدود برطانوی سلطنت کو دنیا کی قیادت کا منصب عطا کر دیا۔ اُس مہم کو جو سولہویں صدی میں دولت اور طاقت حاصل کرنے کی غرض سے تجارتی جذبے کے تحت شروع کی گئی تھی اتنی بڑی کامیابی نصیب ہوئی جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے۔

اس غیر معمولی واقع کے تین مرحلے تھے۔ پہلے مرحلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرگرمیاں تجارت تک محدود تھیں۔ دوسرے مرحلے میں کمپنی نے دوسرے یورپی رقیبوں کے ساتھ جنگیں

کیں، تجارت میں اپنی اجارہ داری قائم کی اور ہندوستان میں سیاسی اثر حاصل کیا۔

تیسرے مرحلے میں جو جنگ پلاسی سے شروع ہوتا ہے کمپنی نے تجارت کے ساتھ فتوحات بھی شروع کر دیں اور دونوں میں توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اُس نے ایک وسیع علاقہ حاصل کر لیا جو قدرتی وسائل سے مالا مال تھا اور جہاں صابر و شاکر محنتی اور فرماں بردار کسانوں اور دست کاروں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔ بنگال سے ہونے والی آمدنی نے نہ صرف مزید فتوحات کے لئے ساز و سامان مہیا کیا بلکہ منافع بخش بدیسی تجارت میں لگانے کے لئے نقد سرمایہ سے اور کم سے کم جانی نقصان کے ساتھ انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے بڑے حصے پر تسلط جما لیا۔

جب کمپنی اپنے تجارتی موقف سے دست بردار ہوئی تو تجارت سے منافع حاصل کرنے کا حق سب انگریزوں کو دیدیا گیا۔ لیکن کمپنی نے علاقوں کی مزید توسیع سے اپنے نقصان کی تلافی کر لی۔ اس پوری کی پوری طویل مدت میں یورپی طاقتوں کے ساتھ تصادم اور فضول خرچ اور کمزور ہندوستانی حکمرانوں کے ساتھ جنگوں میں منافع کا جذبہ ایک اہم عنصر رہا ہے۔ اس کے علاوہ نئے نئے علاقوں میں بڑی کشمکش تھی۔ یہ واقعہ کہ آسانی سے اُنہیں حاصل کیا جا سکتا تھا، ہندوستان کے مزید شاداب علاقوں کو سلطنت میں شامل کرنے کے لئے وجہ تحریک بن گیا تھا۔ لیکن آمدنی میں اضافہ کی خواہش کے ساتھ جز رسی کی خواہش بھی تھی جو کبھی احمقانہ حدوں تک پہنچ جاتی تھی۔

لارڈ ہیسٹنگز، ایلن برو اور ڈلہوزی کی جارحانہ جنگیں، ہندوستانی حکمرانوں کی بدانتظامی کو بہانہ بنا کر کئے جانے والے الحاقات اور ولی عہدوں کو گود لینے کے طریقے کو تسلیم نہ کر کے علاقوں پر عمل دخل حاصل کرنا۔ ان سب کے پیچھے علاقے حاصل کرنے کی خواہش کارفرما تھی۔ ڈزرائلی نے تسلیم کیا تھا کہ انگریزوں کی پالیسی ہے ''اپنے علاقے کی توسیع کر کے سلطنت کی آمدنی بڑھانا۔'' (1) مٹکاف نے ان لفظوں میں پالیسی کی تشریح کی تھی ''جن خطرات کا ہمیں اس وقت سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُن سے زیادہ خطرات میں ہمیں ڈالے بغیر ہندوستان کے وسط میں جو بھی علاقہ حاصل کیا جائے گا وہ اُس سرحد کی لمبائی کو کم کر دے گا جس کی ہمیں حفاظت کرنی پڑتی ہے یا قریب قریب بنگال کی فوجوں کے دوسری پریسیڈنسیوں کی فوجوں کے ساتھ روابط کو کم کر دے گا یا فوجوں کی تنخواہیں دینے کے لئے مزید آمدنی مہیا کر دے گا۔ اس لئے علاقہ میں اضافے کو بُرا سمجھ

کر اُس سے بچنے کے بجائے جہاں کہیں بھی وہ جائز طور سے حاصل کیا جا سکتا ہو ہمیں اُسے تحفظ اور طاقت کے ایک ذریعہ کے طور پر حاصل کرنا چاہیئے۔''(2) ڈلہوزی نے جو''زائل ہونے'' کی پالیسی کا معمار اعظم تھا، خود 30-اگست 1848ء کو لکھا تھا''میرے خیال میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی شخص اس پالیسی سے اختلاف کر سکے کہ ہمیں اُن ریاستوں پر قبضہ کر کے جن کا حق زائل ہو جائے اپنے علاقوں کے استحکام کی غرض سے ہر جائز موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اس طرح اُن چھوٹی چھوٹی درمیانی ریاستوں سے ہمارا پیچھا کٹ جائے گا۔ جو ناگواری کا ذریعہ بنائی جا سکتی ہیں۔''(3) چنانچہ اُس نے''اس اصول کا اعلان کیا کہ جب بھی موقع ملے دیسی حکمرانوں کو ختم کر دیا جائے۔''(4)

الحاق کو جائز قرار دینے کے لئے انگریزوں نے ہندوستانی حکمرانوں کی ناقابل برداشت بددیانتی اور بدانتظامی اور کچلے ہوئے عام لوگوں کے انتہائی دکھوں اور تکلیفوں کی بنیاد پر خود کو مطمئن کر لیا۔ لیکن حقیقت برنارڈ شاہ کے جوشیلے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔''ہر انگریز کچھ مافوق الفطرت طاقت لیکر پیدا ہوتا ہے جو اُس کو دنیا کا آقا بنا دیتی ہے۔ جب وہ کسی چیز کا خواہش مند ہوتا ہے تو وہ خود سے کبھی نہیں کہتا ہے کہ وہ اُس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اُس وقت تک انتظار کرتا ہے جب تک، نجانے کیسے، اُس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ نہ جائے کہ مطلوبہ شے جن لوگوں کے پاس ہے اُن کو فتح کرنا اُس کا اخلاقی اور مذہبی فرض ہے۔ اُس کے لئے وہ ناقابل مزاحمت ہو جاتا ہے۔ طبقہء اشراف کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس چیز کو پسند کرتا ہے اُسے چھین لیتا ہے۔ ایک دکاندار کی طرح وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اُس محنت اور ثابت قدمی سے کام کرتا ہے جو کٹر مذہبی اذعان اور اخلاقی ذمہ داری کے گہرے جذبے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اُسے موثر اخلاقی رویے کی تلاش میں کبھی کوئی دقت نہیں ہوتی ہے۔ کوئی کام نہ اتنا برا ہے نہ اتنا اچھا کہ انگریز اُسے نہ کر سکے۔ لیکن انگریز کبھی غلطی پر نہیں ہوگا۔ وہ آپ سے لڑتا ہے تو حب الوطنی کے اصولوں کے مطابق، وہ آپ کی چوری کرتا ہے تو تجارتی اصولوں کے مطابق، وہ آپ کو محکوم بناتا ہے تو سامراجی اصولوں کے مطابق، وہ آپ کو پریشان کرتا ہے تو مردانگی کے اصولوں کے مطابق۔ وہ وفاداری کے اصولوں کے مطابق اپنے بادشاہ کا سر کاٹ لیتا ہے۔ اُس کا نعرہ ہے فرض شناسی اور وہ یہ بات کبھی نہیں بھولتا ہے کہ جو قوم اپنے فرض کو اپنے مفاد

کے خلاف بن جانے دیتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔''(5)

الحاقات کی بنا پر کمپنی کی آمدنی تو بڑھ گئی لیکن جلد ہی اخراجات میں بھی اضافہ ہو گیا اور ڈائریکٹرا اپنے منافعوں کے لئے تشویش میں مبتلا ہو گئے۔اس لئے انہوں نے کفایت شعاری سے کام لینے کا حکم جاری کیا۔کفایت شعاری سے کام لیتے وقت نتائج پر توجہ نہیں دی گئی۔ان اقدامات میں دیسی حکمرانوں کو دی جانے والی پینشنوں کی تنسیخ یا تخفیف بھی شامل تھی۔اس کی واضح مثالیں تھیں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بیوہ ملکہ رانی جندن کور کی پینشن 15,000 پاونڈ سے گھٹا کر 12,000 پاونڈ کر دی گئی، پیشوا باجی راؤ دوم کے پسر متبنیٰ نانا صاحب کی پینشن منسوخ کر دی گئی، جھانسی کی رانی لکشمی بائی کی پینشن بند کر دی گئی اور کرناٹک اور تن جور کے اخراجات میں کمی اور حکومت کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے قدیم خاندانوں کی جاگیریں اور انعام چھین لئے گئے جنہوں نے ہندوستانی حکمرانوں کی خدمات انجام دی تھیں۔

سماجی بہبود کے کاموں میں بھی کفایت شعاری برتی گئی۔ 1813ء میں تعلیم کے لئے 10,000 پاونڈ کی خطیر رقم منظور کی گئی تھی۔لیکن صحت عامہ، طبی سہولت، قحط کے دوران راحت پہنچانے اور اس قسم کے دوسرے کاموں کے لئے کوئی رقم منظور نہیں کی گئی تھی۔تعلیم کے لئے جو رقم منظور کی گئی تھی وہ بھی کئی سال تک خرچ نہ کی جا سکی۔

لیکن کفایت شعاری کی بدتر مثال تھی فوجی اخراجات میں کمی۔ ہندوستانی سپاہیوں کی مدد سے ہندوستان فتح کیا گیا تھا اور امن و امان بحال رکھنے کی ذمہ داری بڑی حد تک ہندوستانی فوجوں پر تھی۔ ہندوستانی سپاہی ایران، افغانستان، سندھ اور برما میں لڑ چکے تھے اور کریمیا میں لڑنے کے لئے انہیں بھیجنے کی تجویز پر بھی غور کیا گیا تھا۔ ہر میدان جنگ میں وہ اپنی وفاداری، بہادری اور ضبط و نظم کا وافر ثبوت پیش کر چکے تھے۔وہ نمک حلال تھے، آقاؤں کے وفادار تھے اور افسروں کے جاں نثار تھے۔لیکن کمپنی کی نظروں میں اُن کی سب سے بڑی خوبی تھی کم تنخواہیں اور روپے کی لالچ میں فوج میں بھرتی ہونا۔اس لئے اُن کی طرف سے کوئی سیاسی خطرہ نہیں تھا۔

ایک ہندوستانی سپاہی پر جو رقم خرچ کی جاتی تھی وہ برطانوی سپاہی پر خرچ کی جانے والی رقم کا ایک تہائی حصہ تھی۔اس کفایت شعاری کا نتیجہ تھا کہ 1856ء میں مجموعی اعتبار سے کمپنی کی تقریباً تین لاکھ فوج میں صرف 24 رائل رجمنٹیں تھیں جو مجموعی اعتبار سے 23,000 سپاہیوں پر مشتمل

اگر چہ وہ سب نہیں کر سکتے تھے جو انگلستان میں نارمنوں نے کیا پھر بھی شہنشاہی روم کے نقش قدم پر تو چل ہی سکتے تھے اور ہندوستان کو ایک ایسی دودھارو گائے سمجھنے کے بجائے، جس کو انگلستان کے مفاد میں استعمال کیا جائے، وہاں کے لوگوں کی معاشی اور سیاسی ضرورتوں پر تو غور کر سکتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا جس کے نتیجے میں 1857ء کے موسم گرما میں انہیں نفرت اور عداوت کی افسوسناک فصل کاٹنی پڑی۔

II- شورش کی نوعیت

برطانوی مورخین کے مطابق 1857ء کی شورش غدر تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا اس زمانے کی حکومت کی طرف سے ہوئی۔ اس زمانے کے سکریٹری آف اسٹیٹ لرل اسٹینسلی نے 1857ء کے واقعات کی رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرتے ہوئے ''غدر'' کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ اس موضوع پر لکھنے والے زیادہ تر مصنفین نے اس کی پیروی کی۔ چنانچہ چارلس بال، جی۔ ڈبلیو۔ فارسٹ، ٹی۔ آر۔ ہولس، ایم۔ انس، جے۔ ڈبلیو۔ کے، جی۔ این۔ میک من، جی۔ بی۔ ملن، سی۔ ٹی۔ ٹکاف، ارل رابرٹس اور دوسرے لکھنے والوں نے اس شورش کے لئے ''غدر'' کی اصطلاح استعمال کی۔

بہرحال یہ اصطلاح گمراہ کن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس بغاوت میں فوج بڑے پیمانے پر شامل تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس کی تحریک بنگال کی فوج کی طرف سے ہوئی حالانکہ دوسرے صوبوں کی کچھ اور رجمنٹوں میں بھی بے چینی پائی جاتی تھی۔ لیکن اس کی ابتدا فوج تک محدود نہیں تھی۔ نہ یہ عام اصطلاحی معنوں میں غدر تھا یعنی مسلحہ آداب سے روگردانی اور آئینی ارکان اختیار کی حکم عدولی۔ اس کی وجوہ ان اسباب سے زیادہ گہری تھیں۔ جو عام طور سے فوجی ڈسپلن توڑنے کے واقعات کی تہہ میں پائے جاتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ڈزرائلی نے اس شورش کی اصل نوعیت کو سمجھ لیا تھا۔ ہاؤس آف کامنز میں 27- جولائی 1857ء کو تقریر کرتے ہوئے اس نے حکومت کی رائے سے اختلاف کیا اور کہا کہ یہ تحریک ''فوجی غدر'' کے بجائے ایک ''قومی بغاوت'' ہے۔''(8) پھر اکس میری میں 30- ستمبر 1857ء کو تقریر کرتے ہوئے اس نے زور دے کر کہا ''میرا خیال ہے کہ اب یہ عام طور سے سمجھا

جاتا ہے کہ ہندوستان میں رونما ہونے والی افسوسناک اور غیر معمولی تحریکات کی جو توضیح ابتدا میں کی گئی تھی۔ وہ واقعات کے مطابق نہیں تھی۔ روز بروز یہ بات واضح ہوتی جارہی ہے کہ جس کو ابتدا میں ایک چھوٹا سا اتفاقی واقعہ بتایا گیا تھا وہ حقیقت میں اُن عظیم حادثات میں سے ایک ہے جو انسانی تاریخ کا ایک دور تشکیل کرتے ہیں اور جن کی توجیہ کرنے کے لئے مدبروں اور قوموں کی انتہائی گہری توجہ درکار ہوتی ہے۔(9)

ایلین برونے، جو 1858ء میں بورڈ آف کنٹرول کا صدر مقرر ہوا تھا، لارڈ کیننگ کے اس اعلان پر تنقید کرتے ہوئے، جس کی رو سے اودھ کی تعلقداریاں ضبط کر لی گئی تھیں، لکھا تھا ''ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا چاہئے کہ وہاں پائے جانے والے حالات کے پیش نظر اودھ میں جو جارحانہ کارروائیاں ہوئیں اُن کو غدر کے بجائے ایک جائز جنگ سمجھا جانا چاہئے۔''(10)

جسٹس میک گارتھی نے اس موضوع کے گہرے مطالعہ کے بعد لکھا تھا ''واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے عظیم جزیرہ نما کے شمال اور شمال مغرب میں انگریزی حکومت کے خلاف دیسی نسلوں نے بغاوت کی تھی۔ اس کو کسی طرح بھی محض فوجی غدر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کے خلاف یہ فوجی شکایتوں، قومی نفرت اور مذہبی تعصب کا ایک مشترکہ محاذ تھا۔ اس میں دیسی حکمراں بھی شامل تھے اور دیسی سپاہی بھی عیسائیوں کے خلاف متحد ہونے کے لئے مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنے قدیم مذہبی اختلافات کو بھلا دیا تھا۔''(11)

چارلس بال نے مندرجہ ذیل الفاظ میں رونما ہونے والے واقعات کا ذکر کیا ہے ''بالآخر دھارا کناروں سے گزر گیا اور ہندوستان کی اختلافی سرزمین پر پھیل گیا۔ اس کے بعد یہ توقع تھی کہ موجیں تمام یورپی عناصر کو غرقاب اور تباہ کر دیں گی اور یہ کہ بغاوت کا دھارا جب ایک دفعہ پھر کناروں کی آغوش میں سمائے گا۔ تو بدیسی حکمرانوں کی محکومی سے آزادی حاصل کر کے حریت پسند ہندوستان محض کسی آزاد دیسی حکمراں کے سامنے اپنا سر جھکائے گا۔ اب اس تحریک نے زیادہ اہم صورت اختیار کر لی تھی۔ اور وہ تمام لوگوں کی بغاوت بن گئی تھی۔''(12)

دو آزاد فرانسیسی مصنفین کی رائے تھی ''ہندوستان میں قتلِ عام کا لمحہ قریب آتا جارہا ہے۔ ہندوستان کی آبادی کے تمام طبقات میں بے چینی پھیل چکی ہے۔ وہ سپاہیوں کا ساتھ دیں گے۔''(13)

بہادر شاہ کے مقدمے کی پیروی کرنے والا جج ایڈوکیٹ جنرل ہریٹ میجر سماعت کے وقت پیش کی جانے والی دستاویزات کے گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا ''ابتدا سے یہ سازش سپاہیوں تک محدود نہیں تھی۔ اس کو جنم بھی سپاہیوں نے دیا بلکہ اس کی شاخیں محل اور شہر میں پھیلی ہوئی تھیں۔''(14)

ونسنٹ اسمتھ کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ ''سول آبادی میں بے چینی اور بے اطمینانی بڑے پیمانے پر پائی جاتی تھی اور کئی مقامات پر وہاں مقیم سپاہیوں کی بغاوت سے پہلے لوگوں نے بغاوت کردی۔''(15)

کیننگ نے بھی اُس وقت اپنی رائے بدل دی جب اُس نے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کو لکھا کہ اُسے اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ''بغاوت'' کے لئے اشتعال ''مذہبی بنیادوں پر برہمنوں نے اور سیاسی وجوہ کی بنا پر دوسروں نے دی'' اور اینڈ ملیسن کے مطابق ''اُس نے جلد ہی غدر کی بات کرنا چھوڑ دی اور اسے بغاوت سے تعبیر کرنے لگا۔''(16)

چنانچہ یہ تو مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے کہ 1857ء کے واقعات کو ''غدر'' سے تعبیر کیا جائے۔ لیکن کیا اُنہیں ''قومی جنگ آزادی'' کہا جا سکتا ہے؟

یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف جنگ کا محرک کوئی قومیت کا جذبہ نہیں تھا اس لئے کہ 1857ء میں ہندوستان کو سیاسی اعتبار سے ایک قوم نہیں کہا جا سکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر حصہ لیا لیکن دونوں فرقوں کے قائدوں اور اُن کے ساتھیوں نے ایک مشترک مادر وطن کی وفاداری کے بجائے ذاتی وفاداریوں سے تحریک پائی۔ اس کے باوجود 1857ء کی شورش ہندوستان کو بدیسیوں کی غلامی سے نجات دلانے کی جنگ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بدیسیوں نے حکمراں طبقے کے وقار اور عزت نفس کو بری طرح مجروح کر دیا تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو ایک زمانے میں سماجی اثر رکھتا تھا اور نظم ونسق کا بوجھ اٹھا چکا تھا۔ بدیسیوں نے مال گزاری کی ظالمانہ پالیسی کی بنا پر اور ان معاشی اقدامات کی بنا پر، جن کی وجہ سے فنون اور دستکاریاں تباہ ہوگئی تھیں، عام لوگوں کو بھی اپنا مخالف بنالیا تھا۔

آگرہ کے کمشنر ہارڈلے نے 17- نومبر 1857ء کو لکھا تھا ''اس بغاوت کی ابتدا نہ محض مسلمانوں کی طرف سے ہوئی نہ صرف ہندوؤں کی۔ اس کو جاری بھی کسی ایک فرقے نے نہیں

رکھا۔ اس قسم کے اسباب ہمیشہ پائے جاتے تھے جو اس کی توضیح کے لئے کافی ہیں۔ حالات اور مواقع اور پرفریب کذب و افترا نے مسلمانوں کو شورش پر آمادہ کیا تاکہ وہ اُس کا بدلہ لے سکیں جسے اُن کے مذہب کی توہین سے تعبیر کیا گیا تھا۔ ایک پراسرار ہندو پیشن گوئی نے، جسے بڑے پیمانے پر پھیلایا گیا، اُس مذہب کے غیر مطمئن پیروؤں کو ہونے والے غدر اور بغاوت میں حصہ لینے پر آمادہ کر دیا۔'' (17)

ٹرولین کی شہادت بھی دیکھیئے۔ اُس نے کہا ہے ''بڑے ہوں یا چھوٹے، دولت مند ہوں یا غریب اُن میں سے ہر ایک محض اپنے سیاسی حالات کو سدھارنا چاہتا تھا۔ سماج بالائی طبقے میں اپنی پہلی سی اہمیت دوبارہ حاصل کرنے کی امید پر زندہ تھے۔ نچلے طبقے اس امید پر زندہ تھے کہ دیسی حکومت کے دوبارہ قیام کے بعد دولت و عزت کے راستے اُن پر ایک دفعہ پھر کھل جائیں گے۔'' (18)

فی الجملہ 1857ء کی بغاوت زوال کے سلسلے کو روکنے اور کھوئی ہوئی حیثیت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش تھی جسے عہد وسطیٰ کے نظام کی آخری کوشش کہنا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ نظام زوال پذیر تھا۔ بہرحال یہ اپنی سیاسی تنظیم کی قوت کو بحال رکھنے اور بیرونی حملوں کے سیلاب کو روکنے میں ناکام رہا تھا حالانکہ اُنیسویں صدی کے وسط تک پریسیڈنسی شہروں کے باہر اس کی عزت و وقار میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ مغربی اقتدار کے زیر اثر ہندوستان کے سماجی نظام میں کوئی بڑی تبدیلی ابھی تک نہیں آئی تھی اور بالائی طبقوں کو ابھی تک لوگوں کے قائد اور ہندوستان کے مفادات کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔

1857ء کی بغاوت مسلمانوں اور ہندوؤں کے روایتی اشراف کی عام تحریک تھی یعنی حکمرانوں، زمینداروں، سپاہیوں، عالموں اور پنڈتوں اور مولویوں کی تحریک۔ باغیوں کی اصل جماعت مندرجہ ذیل پر مشتمل تھی۔ دہلی کا شہنشاہ، اودھ کا بادشاہ، کچھ نواب اور راجہ، تعلقدار اور زمیندار، سپاہی جن میں پٹھان، مغل، راجپوت اور شمالی ہندوستان کے برہمن شامل تھے اور مولوی جو اس نظام کے جز تھے۔ باغیوں میں مختلف طبقات کی نمائندگی تحریک کے جغرافیائی کردار کو ظاہر کرتی ہے اور شرکاء کے مقاصد پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نظام سے تعلق رکھنے والے قریب قریب سبھی لوگ غیر مطمئن تھے حالانکہ اُن میں سے کچھ نے اپنے خصوصی

میں انگلستان کے حکمراں طبقے میں پائی جاتی تھیں۔ اُس نے حسب دستور ایک ایسے خود اعتماد گورنر جنرل کی طرح تقریر شروع کی جس کے جذبات کو اُس منظر نے برافروختہ کر دیا تھا جس کی مثال دنیا میں کوئی تاریخ پیش نہیں کر سکتی یعنی ''ڈیڑھ سو ملین لوگ پرامن انداز میں اور دلجمعی کے ساتھ، ایک ایسے ملک میں جو دولت سے بھرا ہوا ہے، بدیسیوں اور اجنبیوں کی حکومت کی اطاعت کرتے ہیں۔'' لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھا اس کے دل میں شک و شبہ پیدا ہونے لگا۔ ایسا لگا کہ خود اعتمادی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ وہ سنجیدہ ہو گیا اور بات کرنے میں احتیاط سے کام لینے لگا۔ اس نے کہا مجھے معلوم نہیں کہ حالات کیا شکل اختیار کریں گے۔ مجھے امید ہے اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ہمیں جنگ کی آخری منزل تک نہ جانا پڑے۔'' اُس کے بعد اس نے سنجیدگی کے ساتھ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا ''ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہندوستان کے مطلع پر، جو ابھی صاف ہے، بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آ سکتا ہے جو شروع میں انسان کے بالشت سے بڑا نہ ہو لیکن برابر بڑھتا جائے گا اور بالآخر اُس کے پھٹ پڑنے اور ہمیں تباہی سے دوچار کر دینے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔'' آخر میں اُس نے دھمکی دی ''اگر اپنی کوششوں کے باوجود ہمارے لئے ضرب لگانا ضروری ہو گیا تو ہم پائی ضمیر کے ساتھ ضرب لگائیں گے۔ اس قسم کی ضربوں کی صورت میں جدوجہد کم مدت میں ختم ہو جائے گی اور اُس کے نتیجے کے متعلق کسی قسم کے شک وشبہے کی گنجائش نہیں ہو گی۔''(7)

کون جانے کہ ہندوستان کے متعلق دستاویزات کا مطالعہ کرتے وقت کیننگ نے سلطنت کی نوعیت پر غور بھی کیا اور اُسے یہ خیال بھی آیا کہ ہندوستان کی سلطنت کا مقابلہ اُن دو سلطنتوں سے کرے جنہوں نے انگلستان کو غلامی کی زنجیروں سے جکڑ دیا تھا یعنی رومن سلطنت جو ایسی حکومت کی نمائندگی کرتی تھی جس نے وطن سے دور کے علاقوں پر اپنا تسلط جما لیا تھا اور نارمن حکومت جس کے فاتحین نے مفتوحہ علاقوں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

سلطنتوں کا حشر کیا ہوا اس کے متعلق کیننگ کے خیالات کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے لیکن ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ وہ ہندوستان میں پائی جانے والی عام بے چینی سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ کوئی بری شکل اختیار کر سکتی ہے۔ جو خطرناک صورتحال ہندوستان میں پیدا ہو رہی تھی وہ سلطنت کی نوعیت کا لازمی نتیجہ تھی۔ حالات مختلف ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں انگریز

تھیں۔ اور اتنی ہی تعداد میں یورپیوں کو ہندوستان میں بھرتی کیا گیا تھا۔(6) ظاہر ہے کہ یہ بڑے جوکھم کی بات تھی۔ برطانوی مدبرین دہری مشکل میں تھے یعنی سلطنت کی حفاظت وتوسیع کے لئے ایک بڑی فوج کی موجودگی اور صحت مند عوامی مالیات اور تجارتی منافع اور لاگت کے دعووٗں میں مطابقت کیسے پیدا کی جائے۔ مختلف گورنر جنرل کبھی ایک راستہ اختیار کرتے تھے اور کبھی دوسرا۔ دونوں صورتوں میں کفایت شعاری کا خیال فیصلہ کن عنصر ہوتا تھا۔

حکومت کے سول شعبہ میں بھی معاملہ کچھ ایسا ہی تھا۔ انگریز حکام کی تعداد کم تھی۔ لیکن وہ اختیار، رہنمائی اور نگرانی کے تمام عہدوں پر فائز تھے۔ اُن کی تنخواہیں دنیا میں سب سے زیادہ تھیں۔ وہ ہندوستانی ماتحتوں کی ایک بڑی فوج کے ذریعے کام کرتے تھے جن کی تنخواہیں بہت کم تھیں اور جن کے عہدوں پر کم حیثیتی کی چھاپ لگی تھی۔

ایسی سلطنت جس کے غالب مفادات معاشی ہوں تاریخ کے لئے کوئی نیا واقعہ نہیں تھی۔ لیکن انگریز اپنے کو اتنا پاک باز سمجھتے تھے اور اپنی نام نہاد پاکبازی کی بنا پر اتنے مطمئن تھے کہ انہوں نے سلطنت کے انسانی مضمرات پر کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اُن میں سے کچھ ہندوستان کے تعلق سے حکومتی خود اختیاری کی دور افتادہ منزل کی بات کرتے تھے لیکن دوصدی تک ہندوستان سے رہنے والے رشتے کے دوران میں سے زیادہ تر کے اعمال و افعال سے اُس منزل تک پہنچنے کی خواہش کا اظہار بہت کم ہوا۔ اُن میں سے کچھ اس غیر فطری صورت حال سے پریشان ضرور تھے لیکن وہ بھی برطانوی حکومت کے غیر محدود تسلسل کے علاوہ کچھ اور نہیں سوچ سکتے تھے۔

طوفان سے پہلے کی خاموشی

جب ڈلہوزی کی مدت کار ختم ہوئی تو اس کی جگہ لینے کے لئے کیننگ کا انتخاب کیا گیا۔ وہ اول درجے کا کلاسیکی عالم تھا اور اس نے برطانوی سردار کریکٹس کے متعلق جو رومن سلطنت کی عظمت وجلال سے ٹکرایا تھا، لاطینی میں ایک نظم لکھ کر آکسفورڈ میں انعام حاصل کیا تھا۔ اس کے اعزاز میں کمپنی کے ڈائریکٹروں نے الوداعی دعوت کی تھی اس میں جام صحت کا جواب دیتے ہوئے اس نے عجیب وغریب تقریر کی جو اُن اُلجھنوں اور پریشانیوں کی آئینہ داری کرتی ہے جو اُس زمانے

حالات کی بنا پر اس میں عملی حصہ لینے سے گریز کیا۔

سردار اور زمیندار باغیوں کی جماعت کے سرغنہ تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی باضابطہ اور بے ضابطہ فوجوں اور حکمرانوں کے مسلح سپاہیوں، ماتحتوں، کسانوں اور ملازموں پر مشتمل تھی۔ اُن کی روایتیں بھی مشترک تھیں اور شکایتیں بھی۔ وہ دکھوں میں ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے تھے۔ حکمرانوں کے علاقے اور سیاسی طاقت چھن جانے کا اثر اُن پر پڑا تھا۔ اگر بالائی طبقوں سے حق فرماں روائی چھین لیا گیا تھا یعنی اُن کی ریاستیں، فوجی کمانداری اور سول دفاتر تو دوسروں سے روزگار کے ذریعے اور اثر اور مالی منفعت کی حیثیتیں چھن گئی تھیں۔ صاحب علم یعنی عالم، مذہبی پیشوا اور شاعر اور دستکار اہل ہنر سرپرستی سے محروم ہو گئے تھے۔ بہت سے وہ لوگ بے روزگار ہو گئے تھے جن کا آبائی پیشہ تھا سپہ گری اور اُن میں بہت سوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں میں شامل ہونا پڑا تھا۔

اس تحریک کے قائدوں نے برطانوی حکومت کے خلاف جو فرد جرم تیار کی تھی وہ اس کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ بہادر شاہ نے 25-اگست 1857ء کو شائع ہونے والے منشور میں کہا تھا۔ ''یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے لوگ، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں، کافر اور ریاکار انگریزوں کے مظالم اور جبر کی بنا پر تباہ ہو رہے ہیں۔'' اُس کے بعد اُس نے پانچ اصل الزامات کی وضاحت اس طرح کی۔(19)

I-زمینداروں کے تعلق سے اُس نے یہ الزام لگائے۔ اُن پر بڑی بڑی جمع (زمین کی مالگزاری) تشخیص کی جاتی ہے، بقایا مال گزاری وصول کرنے کے لئے اُن کی جائیداد کو نیلام پر چڑھا کے اُن کی بے عزتی کی جاتی ہے، مہنگی مقدمے بازی سے انہیں تباہ کیا جاتا ہے جس میں اسٹامپ، کورٹ فیس اور سماعت میں ہونے والی دیر کی بنا پر بہت روپیہ خرچ ہوتا ہے۔

II- تاجروں کے تعلق سے اُس نے کافر اور ریاکار برطانوی حکومت پر الزام لگایا تھا کہ تمام اچھی اور بیش قیمت اشیاء مثلاً تیل، کپڑا اور جہازوں کے ذریعے بھیجی جانے والی دوسری چیزوں کی تجارت میں اجارہ داری حاصل کر لی ہے اور عام لوگوں کے لئے محض حقیر اشیاء کی تجارت چھوڑی ہے اور اُس میں بھی کسٹم ڈیوٹی، اسٹامپ فیس، محاصل، چنگی اور چندوں کے ذریعے وہ منافع میں سے اپنا حصہ وصول کر لیتے ہیں۔

III- ملازمین پولیس کے تعلق سے اُس نے کہا تھا کہ سول اور فوجی خدمات پر مامور ہونے والے دیسی لوگوں کی عزت نہیں کی جاتی۔ اُنہیں کم تنخواہ ملتی ہے اور اُن کا کسی طرح کا اثر نہیں ہوتا ہے۔ دونوں محکموں میں باعزت اور منافع بخش عہدے محض انگریزوں کو دیئے جاتے ہیں۔

IV- دست کاروں کے تعلق سے اُس نے کہا تھا کہ انگریزوں نے انگلستان کی مصنوعات کو رواج دیکر بنکروں، ندافوں، بڑھیوں، لوہاروں اور موچیوں وغیرہ کی روزی چھین لی ہے اور اُن کے پیشے چھین کر ہر قسم کے دیسی دست کاروں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا ہے۔

V- پنڈتوں، مولویوں اور دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں کے تعلق سے اُس نے کہا کہ پنڈت اور مولوی بالترتیب ہندو مسلم مذاہب کے سرپرست ہیں اور یورپین دونوں کے دشمن ہیں اور اس لئے اُن کے لئے لازمی ہے کہ وہ جہاد میں حصہ لیں۔ یہ اعلان برطانوی حکومت میں پائی جانے والی سیاسی اور معاشی خرابیوں کی طرف توجہ کھینچتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ بالائی طبقوں یعنی زمینداروں، بڑے تاجروں، سول اور فوجی حاکموں اور ہندو اور مسلمان عالموں کے دکھ بغاوت کی اصل وجہ تھے۔

نانا صاحب نے فرانس کے شہنشاہ کو خطوط (20) لکھے تھے جو بہادر شاہ کے لگائے ہوئے الزامات کی تصدیق کرتے ہیں۔ ''انگریز حکومت کی ناانصافیوں میں وہ مندرجہ ذیل کا ذکر کرتا ہے'' جھوٹ اور فریب سے کام لے کر مرہٹہ علاقوں کا الحاق کر لیا گیا، باجی راؤ دوم سے اُس کے اور اُس کے وارثوں کے لئے جس پینشن کا وعدہ کیا گیا تھا وہ ختم کر دی گئی، سیاسی سازشوں اور چال بازیوں سے کام لے کر ہندوستانی حکمرانوں کا تختہ الٹ دیا گیا، ایسی عدالتیں قائم کی گئیں جن میں مقدمہ بازی کرنے کے بڑے اخراجات نے صاحبِ حیثیت لوگوں کو تباہ کر دیا اور ایسے قانون بنائے گئے جو اُن کے مقدس ضابطوں اور مذہبی جذبات کے خلاف ہیں۔ مالکان آراضی پر بڑے بڑے محاصل لگائے اور اُن کے کھیتوں کی پیداوار پر کسٹم ڈیوٹی عاید کی، ایسی من مانی کارروائیاں کیں جن کی وجہ سے 200 سے زیادہ دیسی حکمراں اُن کے شاطرانہ چالوں کے شکار ہو گئے، ناگپور کے راجہ سے کئے گئے معاہدوں اور وعدوں کی خلاف ورزی کی گئی اُس کے محل کو لوٹا گیا اور اُس کے قیمتی سامان کو نیلام کر دیا گیا، دہلی کے شہنشاہ اور دکن اور سندھ کے حکمرانوں کی بے عزتی اور ذلت کی گئی، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نابالغ وارث دلیپ سنگھ کو معزول کر دیا گیا، معاہدوں اور عہد و پیمان کی

خلاف ورزی کر کے اودھ کے بادشاہ کو تخت سے ہٹا دیا گیا، عورتوں کی بے آبروئی کی گئی اور مندر اور مسجدیں مسمار کر دی گئیں، ہندوؤں کے گود لینے اور ستی ہونے کے رواجوں میں مداخلت کی گئی، مندروں اور دوسرے خیراتی اداروں کی مدد کے لئے کئے جانے والے اوقاف پر قبضہ کر لیا گیا اور سب سے زیادہ یہ کہ ہندوستانیوں کی مذہبی رسوم اور رواجوں کو مسخ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا یہاں تک کہ سپاہیوں نے بیک آواز کہا، انگریزوں نے ہمارے ذریعے ہندوستان کے تمام ملکوں کو فتح کیا۔ ان کے سپاہیوں نے کیا کیا ہے؟ کیا ہم نے اپنی زندگیاں اور اپنا وجود اس لئے قربان کیا تھا کہ ہم اپنے مذہب اور اپنی رسوم کو کھو دیں؟ ہم اُس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک ہماری قوت بالکل ختم نہیں ہو جاتی ہے اور جب تک ہم میں سے ایک بھی زندہ ہے۔'' نانا صاحب نے ایک جملے میں اس دکھ بھری کہانی کی تلخیص پیش کر دی۔ ''انگریزی حکومت کی ناانصافیاں اور دروغ بیانیاں سورج کی شعاعوں کی طرح ہر طرف پھیل گئی ہیں۔'' (21)

برجیس قدر نے، جسے باغیوں نے اس کی ماں حضرت محل کی تولیت میں 5- جولائی 1857ء کو اودھ کے تخت پر بٹھا دیا تھا، انگریزوں کے خلاف بغاوت کے جواز میں ایک فرمان جاری کیا۔ اس میں کہا گیا ہے ''تمام ہندو اور مسلمان اس سے واقف ہیں کہ ہر انسان چار باتوں کو عزیز رکھتا ہے، (1) مذہب اور ایمان (2) عزت اور آبرو (3) اپنی اور اپنے قرابت داروں کی زندگیاں (4) اور جائیداد۔ ہندوستانیوں کی حکومت میں ان چاروں کا تحفظ کیا جاتا تھا، ہر شخص اپنے مذہب کی پیروی کرتا تھا اور خود اُس کی منشا کے مطابق اُس کی عزت کا تحفظ کیا جاتا تھا۔ اشراف کے ساتھ چاہے وہ مسلمان ہوں اور سید، شیخ، مغل اور پٹھان خاندانوں سے تعلق رکھتے ہوں یا ہندوؤں میں براہمن، شتری، ویش اور کائستھ ہوں، اُن کی حیثیت کے مطابق عزت واحترام کیا جاتا تھا۔ کوئی پاجی مثلاً چوڑہا، چمار، دھانک اور پاسی اُن کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن چاہے کوئی اونچے طبقے سے تعلق رکھتا ہو یا نچلے طبقے سے اُس کی جان خطرے میں نہیں تھی۔ کسی بھی جرم یا خطا کی پاداش میں کسی کی جائیداد پر قبضہ نہیں کیا جاتا تھا۔'' اُس میں مزید کہا گیا ہے ''لیکن انگریز ان چاروں کے دشمن ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان اپنا مذہب کھو دیں اور سب عیسائی ہو جائیں۔ اُن کے دور حکومت میں ہزاروں نیا مذہب اختیار کر چکے ہیں اور دوسرے اپنا مذہب بدل رہے ہیں۔ وہ اعلیٰ طبقات کی آبرو کو نیچے کے لوگوں کی سطح پر لے آئے ہیں یعنی چوڑہوں اور

چماروں کی سطح پر۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریز اعلیٰ طبقوں پر نیچی ذاتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک چوڑھا یا چمار کی شکایت پر وہ ایک نواب یا راجہ کو بھی پکڑ لیتے ہیں اور اُس کی بے عزتی کرتے ہیں۔ جہاں بھی وہ جاتے ہیں اعلیٰ طبقات سے تعلق رکھنے والوں کو پھانسیاں دیتے ہیں اور اُن کی بیویوں اور بچوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ اُن کے سپاہی عورتوں کی بے آبروئی کرتے ہیں۔ وہ اُن کے گھر کھود ڈالتے ہیں، جائیدادیں چھین لیتے ہیں اور کچھ بھی نہیں چھوڑتے ہیں۔''(22)

تحریک کے تین اہم ترین قائدوں کی تین دستاویزات اس بات کو واضح کر دیتی ہیں کہ 1857ء کے واقعات کی ذمہ داری محض فوج کی شکایت پر نہیں تھی بلکہ بالائی طبقوں میں عام بے چینی پائی جاتی تھی۔ یہ کوئی فرقہ وارانہ تحریک نہیں تھی جو کسی ایک فرقے تک محدود ہو اور نہ اس کے محرک محض مذہبی اور رسوماتی خیالات تھے۔ موٹے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک سیاسی تحریک تھی جس کا مقصد تھا ملک میں بدیسی حکومت کو ختم کرنا۔ یہ اُس پرانے نظام کو ایک دفعہ پھر رواج دینے کی آخری کوشش تھی جسے بالجبر طاقت سے محروم کر دیا گیا تھا۔

اسکاٹ لینڈ کے مشنری الگزینڈر ڈف کے لئے، جو آؤٹ رم، ہنری لارنس اور چارلس ٹریویلین کا دوست اور کلکتہ یونیورسٹی کے بانیوں میں تھا، واقعات کے متعلق صحیح صحیح معلومات حاصل کرنا دشوار نہیں تھا اس لئے کہ بغاوت کے دوران وہ ہندوستان میں موجود تھا۔ بغاوت کی نوعیت کے متعلق اُس کی شہادت بیش قیمت ہے۔ فری چرچ آف اسکاٹ لینڈ کی فارن مشن کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر ٹویڈی کے نام ایک خط مورخہ 6- اکتوبر 1957ء میں اُس نے لکھا تھا ''میں اُس یقین کی حقیقت کو اب پہلے سے زیادہ محسوس کرتا ہوں، جو ابتدا سے میرے ذہن میں تھی، کہ یہ بڑی بغاوت بڑی حد تک سیاسی اور بہت کم حد تک مذہبی نوعیت کی ہے۔''(23)

III- انگریزوں کی فردِ قراردادِ جرم

عظیم بغاوت کے قائدوں نے انگریزوں کے خلاف جو فردِ جرم تیار کی ہے اُس میں درج کئے گئے ہر الزام کی حمایت تاریخ کرتی ہے۔ مغل شہنشاہ کے واقع کو لیجئے۔ 1803ء سے وہ انگریزوں کے زیرِ تحفظ رہا تھا۔ پہلے عزت واحترام اور ترجیح کے تعلق سے اُس کے دعوؤں کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ گورنر جنرل کو ''پسرِ عزیز'' اور ''وفادار ملازم'' کہہ کر خطاب کیا کرتا تھا اور گورنر کی

مہروں پر ''فدوی'' کندہ ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ ایک تبدیلی آئی۔ ایمہرسٹ نے بادشاہ سے صاف صاف کہہ دیا ''آپ کی بادشاہت محض نام نہاد بادشاہت ہے۔ آپ کو محض بر بنائے خوش خلقی بادشاہ کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے۔'' دربار سے منسلک ریزیڈنٹ نے نذر پیش کرتے وقت کھڑے ہونے سے انکار کر دیا۔ اکلینڈ نے بہادر شاہ سے کہا کہ وہ اپنے حقوق اور دعوے ترک کر دے۔ اُس سے نذر پیش کرنے خلعت عطا کرنے اور دربار کرنے کے حقوق چھین لئے گئے۔ دیوان خاص اور دیوان عام بند کر دیئے گئے۔ اُس پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ بادشاہ کے لقب سے دست بردار ہو جائے، لال قلعے کی سکونت ترک کر دے اور اپنا جانشین نامزد نہ کرے۔ ڈلہوزی نے اُس سے زیادہ کج خلقی کا ثبوت دیا۔ وسطی کا کہنا ہے ''بغاوت پھوٹنے سے پہلے بادشاہ کی حیثیت ناقابل برداشت دکھوں سے عبارت تھی۔ اُس کا محل حقیقت میں اُس کا قید خانہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گزشتہ عروج کی مضحکہ خیز نمائندگی کرنے والے کچھ استحقاق جو اسے حاصل ہیں وہ اُس کے جانشینوں سے چھین لئے جائیں گے۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ خود اپنے محل میں رہنے کے حق سے محروم کر دیئے جائیں گے۔ اور شہر پناہ کے باہر کہیں بھیج دیئے جائیں گے۔'' ہم نے اُس کے عزیزوں کو اپنی ملازمت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ہم نے انہیں محل کے حدود کے اندر افلاس اور قرض کی ذلت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور کیا اور اُس کے بعد کاہلی، کمینگی اور زود حسی کے لئے انہیں سخت سست کہا۔ ہم نے فوجی عہدوں کے دروازے اُن پر بند کر دیئے، ہم نے ہر کاروبار کے راستے اُن پر مسدود کر دیئے، ہم نے اُن سے باعزت عزم کا ہر شائبہ چھین لیا اور اُس کے بعد ہمارے اخبار اور ہمارے میس کے کمرے اس کے گھرانے کے سست، کاہل اور زود حس شہزادوں کے خلاف الزاموں سے معمور ہو گئے۔ (24)

اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ لال قلعے کا باسی اگرچہ محض کٹھ پتلی تھا پھر بھی اُس کی بڑی عزت کی جاتی تھی کہ نظام، بنگال کے نواب، پیشوا، مرہٹہ سردار یعنی سندھیا اور ہلکر اور راجپوت راجوں کی طرح نیم آزاد حکمراں اُس کی اطاعت کرنے، اُس کو نذر پیش کرنے اور اُس سے خطاب و خلعت حاصل کرنے کے خواہش مند رہا کرتے تھے۔ حالانکہ اُس کے پاس نہ طاقت تھی نہ وسائل پھر بھی مغل خاندان کے تیمور، بابر، اکبر اور شاہ جہاں کی طرح کے عظیم شہنشاہوں کے وارث کی حیثیت سے اُس کی عزت کی جاتی تھی۔ چنانچہ اس میں کوئی تعجب نہیں ہے کہ مسلمان اور ہندو،

حکمراں اور عام لوگ سب بادشاہ وقت کی بے عزتی سے نالاں تھے اور اُس خاندان کے ختم ہو جانے کے تصور کو ناپسند کرتے تھے۔

بنگال کی دیوانی رکھنے والوں کے لئے یہ بات نامناسب بھی تھی اور احسان فراموش کی مترادف بھی کہ وہ اپنے عہدے اور اُس سے حاصل ہونے والی آمدنی کو وہ اپنے علاقے کو توسیع دینے، فتوحات حاصل کرنے اور اپنے قانونی بادشاہ کے ساتھ گستاخی سے پیش آنے اور برابر کرنے کے لئے استعمال کریں۔ اُن کی بے وفائی کے متعلق اب کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ مارکوئز آف ویلزلی نے 1803ء میں شہنشاہ شاہ عالم کو یقین دلایا تھا ''حضور یقین رکھیں کہ برطانوی حکومت ہر اُس احترام کا مظاہرہ کرے گی اور ہر وہ توجہ صرف کرے گی جو حضور اور شاہی خاندان کے آرام و آسائش کے لئے ضروری ہو اور یہ کہ حضور کی ذات، آپ کے خاندان اور آپ کے متعلقین کی اعانت کا برطانوی حکومت کی طرف سے مناسب انتظام کیا جائے گا۔''(25) لیک نے، جس نے ویلزلی کا خط بھیجا تھا لکھا تھا ''حضور کی خدمت میں وفاداری اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرنے کی میں دوستانہ خواہش رکھتا ہوں اور میں اسے اپنے لئے ایک نمایاں اعزاز تصور کرتا ہوں، اس لئے کہ یہ ایک خصوصی حق ہے کہ حضور کے احکام کی تعمیل کروں۔''(26)

گورنر جنرلوں کے طریقہ کار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا جملوں میں خلوص نہیں تھا اور واقعہ یہ ہے کہ انگریز اپنے اُن حقوق کا قانونی جواز تلاش کرنے کے لئے شہنشاہ کے نام اور وقار کو استعمال کر رہے تھے جو انہوں نے بالجبر حاصل کئے تھے۔ اس کے علاوہ وہ بین الاقوامی الجھنوں سے بچنا چاہتے تھے جو اس علاقے کے متعلق صاف صاف دعوے کی بنا پر حکومت فرانس پیدا کر دیتی۔ لیکن بعد میں جب انہیں معلوم ہوا کہ اُن کی طاقت اختیارات کی بنیاد بن سکتی ہے تو انہوں نے عہد و پیمان توڑ دیئے۔ اپنے ایک خط میں ڈائریکٹروں نے اس پالیسی کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا تھا ''ہمارا خیال ہے کہ اب ہندوستان میں ہماری طاقت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ ہم دہلی کے بادشاہ سے کچھ اور اختیارات حاصل کر کے، جن پر ہم خود اپنے نام سے عمل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اُس کے مزید استحکام کی کوشش کا خطرناک تجربہ کریں۔''(27)

اُودھ کا معاملہ بھی اتنا ہی افسوس ناک ہے۔ وارن ہیسٹنگز کے زمانے سے اودھ کے تعلق سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا عمل دو طاقتوں کے روابط کی تاریخ میں ایک دردناک باب کا حکم رکھتا ہے۔

بکسر کی جنگ (1764ء) کے بعد سے اودھ کے نواب کمپنی کے دباؤ میں تھے۔ رفتہ رفتہ اُن کے اختیارات کم کر دیئے گئے لیکن اُن کی ذمہ داریوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ نواب شجاع الدولہ کو 1763ء میں مجبور کیا گیا کہ وہ فوج کی تعداد 35,000 افراد سے زیادہ نہ بڑھائے۔ اُسے اس امر کی ممانعت بھی کر دی گئی کہ برطانوی فوجوں کی طرح وہ 10,000 سے زیادہ پیدل فوج کو نہ اسلحہ مہیا کرے نہ قواعد پریڈ کروائے۔ بعد میں اُسے کمپنی کے علم میں لائے بغیر کسی ریاست سے مراسلت کرنے سے بھی روک دیا گیا اور اس طرح اُسے ایک ماتحت کی حیثیت تک پہنچا دیا گیا۔ 1798ء میں سعادت علی خاں کو حکم دیا گیا کہ وہ برطانوی فوج کے اخراجات کے لئے سالانہ ترسٹھ لاکھ روپے ادا کرے۔ اس کی بے بسی نے نواب سعادت علی خاں کو اتنا مغموم بنا دیا تھا کہ اُس نے تخت سے دست بردار ہو جانے کی دھمکی دی۔ لیکن ویلزلی نے اُسے واضح طور سے بتا دیا کہ اس کے معنی ہوں گے اُس کے خاندان کا زوال۔ اس دھمکی کے بعد سعادت علی خاں نے خاموشی اختیار کر لی اور اپنی حکومت کے بقیہ سال لوگوں کی حالت سدھارنے میں گزارے۔ اُس نے خزانہ ایک دفعہ پھر بھر دیا اور ریاست کے امور کا اتنا اچھا انتظام کیا کہ بشپ ہربرنے، جس نے اودھ میں سفر کیا تھا، ملک کو ''اُس حد تک آباد اور زیر کاشت پایا جس حد تک کمپنی کے زیادہ تر علاقے تھے۔'' (28) اروِن کے مطابق غالباً اس وقت اودھ میں ہمارے آس پاس کے اضلاع کے مقابلے میں بہت زیادہ دولت تھی، محاصل کم تھے اور وہ صوبے کے اندر خرچ کئے جاتے تھے۔'' (29)

سعادت علی کے جانشین غازی الدین حیدر کو، جسے دہلی کے شہنشاہ کی حیثیت کم کرنے کے برطانوی منصوبے کے تحت لارڈ ہیسٹنگز نے بادشاہ کا لقب اختیار کرنے پر آمادہ کر لیا تھا، نیپال کے خلاف جنگ میں کمپنی کی مالی امداد کرنے کی غرض سے مجبوراً پینتیس لاکھ روپیہ قرض دینا پڑا۔ وہ ایک ناکارہ حکمراں ثابت ہوا اُس کا بیٹا نصیر الدین اُس سے بدتر تھا۔

1837ء میں نصیر الدین کی موت کے بعد اُس کے جانشین محمد علی شاہ کو ایک نیا معاہدہ کرنا پڑا جس نے 1801ء کے معاہدے کی شرائط کو بدل دیا۔ اُس کے بعد تخت پر بیٹھنے والے امجد علی کے زمانے میں حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ مسز ہنری لارنس نے خود اُس کی وجوہ بیان کی ہیں۔ اُس کا کہنا ہے ''اصل خرابی اس نظام میں ہے، اُن میں نہیں جن کے ذریعے اس کو چلایا جاتا ہے۔

ہم نے ہر قسم کی مداخلت کی کوشش کر کے دیکھ لی۔ ہم نے براہ راست مداخلت کی، بالواسطہ طور سے مداخلت کی، عمل کے ذریعے مداخلت کی، ترک عمل کے ذریعے مداخلت کی لیکن ہر کوشش رائیگاں گئی۔"

"ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے چھوٹی چھوٹی باتوں میں دست اندازی کی لیکن جب اہم مسائل سامنے آئے تو اُن کی طرف توجہ نہیں دی۔ ایک اور بڑی خرابی یہ ہے کہ لکھنو کے دربار کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لئے پالیسی کا کوئی مسلمہ نظام موجود نہیں تھا۔"(30) جہاں تک نظام کا تعلق تھا اُس نے لکھا "اگر بدنظمی کو یقینی بنانے کا کوئی ذریعہ ہوسکتا ہے تو وہ ہے ایک دیسی حکمراں یا وزیر کی حکومت جن کا انحصار ہو بدیسی سنگینوں پر اور جو برطانوی ریزیڈنٹ کی ہدایات کے مطابق کام کریں۔"(31)

اُس کے بعد اُس نے مشورہ دیا "اس صوبے کا انتظام کچھ اسی قسم کے قواعد کے تحت ہاتھ میں لیا جائے جو لارڈ ولیم بینٹنک نے بنائے تھے (جولائی 1831ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز کو بھیجی جانے والی رپورٹ میں) جہاں تک ممکن ہو سکے ملک کا انتظام مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں رہنا چاہئے۔ ایک روپیہ بھی کمپنی کے خزانے میں نہیں آنا چاہئے۔ اودھ پر حکومت ایک شخص یعنی بادشاہ کی خاطر نہیں بلکہ اُس کے لوگوں کی خاطر کی جانی چاہئے۔"(32)

لیکن ڈلہوزی نے جو اودھ کے الحاق کا فیصلہ کر چکا تھا اُس کے مشورے کو رد کر دیا۔ واجد علی شاہ کی معزولی نے ملک میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی۔ نواب میں جو بھی خرابیاں تھی پھر بھی ہندوستان کے لوگ اس کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے تھے کہ ہندوستان کا سب سے اچھا صوبہ بدیسیوں کو منتقل ہو جائے۔ دیسی حکمراں، تعلقدار، حکام، متوسلین اور اودھ کے سپاہ گرانہ طبقے، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ غم و مایوسی سے بھرے ہوئے تھے۔ برطانوی عہد و پیمان میں اعتماد مکمل طور سے ختم ہو چکا تھا۔

الحاق کے متعلق اُس کے خیالات قابل غور ہیں۔ اُس نے لکھا تھا۔ لیکن اس اقدام نے ہندوستان کے لوگوں کے ذہنوں پر جو بُرا اثر ڈالا اُس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں ہے...... اس لئے کہ اس سے ہم نے جو فائدہ حاصل کیا اس سے اس عمل کی انسان دوستانہ نوعیت پر دھبہ آ گیا اور لاکھوں لوگوں کو ایسا لگا کہ عام لوگوں کی بھلائی، جس کا ہم نے اُس وقت دعویٰ کیا تھا جب

ہم خود فائدہ اٹھا رہے تھے، ایک بہانے اور مکر و فریب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہے۔''(33)

واجد علی شاہ کی سلطنت کا الحاق 3-فروری 1852ء کو کیا گیا۔ الحاق کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا تھا ''خدا اور انسان کی نظروں میں برطانوی حکومت گنہگار رہے گی اگر وہ ایک ایسی حکومت کی پشت پناہی کرتی رہی جو لاکھوں انسانوں کے دکھوں کا باعث ہے۔''(34)

اودھ کو چیف کمشنر کا صوبہ بنا دیا گیا۔ لارنس جو پہلا چیف کمشنر مقرر کیا گیا تھا آزادی کے ساتھ ہر قسم کے لوگوں سے ملتا تھا اور اُن کے احساسات جاننے کی کوشش کرتا تھا۔ برطانوی حکومت کی طرف اُن کی وفاداری پہ اُسے شبہ تھا۔ اُس نے 2- مئی 1857ء کو لکھا تھا ''توپ خانے کی وفاداری پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی حالانکہ دیسی افسروں کو متنفر کرنے کی بہت کوششیں کی گئی ہیں...... جہاں تک مجھے معلوم ہے ابھی تک برے جذبات زیادہ تر ہندو سپاہیوں میں پائے جاتے ہیں...... مسلمان جلد ہی نہایت پر جوش اور متشدد باغی بن جائیں گے۔''(35) اُس نے مزید لکھا تھا ''جب تک ہم یہ نہ سمجھیں کہ دیسی لوگ اور خصوصیت کے ساتھ دیسی سپاہی اُسی قسم کے احساسات، توقعات اور اہلیت اور نااہلی کا تصور رکھتے ہیں جیسا کہ خود ہم رکھتے ہیں۔ اُس وقت تک ہم محفوظ نہیں سو سکتے۔''(36) یہ سلگتی ہوئی آگ 3- مئی 1857ء کو انتقام کے شعلوں کی صورت میں بھڑک اُٹھی۔ اس سے پہلے کہ میرٹھ میں سپاہی بغاوت کریں ساتھ میں اودھ رجمنٹ میں بغاوت پھوٹ پڑی سپاہیوں نے نئے کارتوسوں کو دانتوں سے کاٹنے سے انکار کر دیا، اپنے ہتھیار پھینک دیئے اور بھاگ گئے۔ ہنری لارنس کو یقین تھا کہ ہندوستان کی سلطنت کے لئے انگریزوں کو از سر نو معرکہ آرائی کرنی ہوگی۔

پنجاب سرحدی صوبہ تھا اور اس لئے اُس پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں مغربی ایشیا میں رونما ہونے والے واقعات نے برطانوی سلطنت کے لئے ایک نئی صورت حال پیدا کر دی تھی۔ روس نے ایران کو شکست دیدی تھی۔ اُس کے بعد اُس نے ایران کو معاہدہ ترکمانچی (1828ء) کرنے پر مجبور کیا، کاکیشیا کے علاقے پر قبضہ کر لیا اور کسپین کے آس پاس کے علاقے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ تقریباً دو سال بعد پامرسٹن خائف ہو گیا اور ایک ہوا کھڑا کر دیا جو پوری انیسویں صدی میں اور اُس کے بعد بھی برطانوی مدبروں کے ذہنوں پر مسلط

رہا۔ ہندوستان کی طرف روسیوں کی پیش قدمی کو روکنا برطانوی خارجہ پالیسی کا اصل مقصد بن گیا اور روس اور ہندوستان کی سلطنت کے درمیان فاضل ریاستوں کی تشکیل برطانوی ڈپلومیسی کا اصل کام بن کر رہ گیا۔

روس نے ایران کی ہمت افزائی کی جو افغانستان کے خلاف اپنے دعوؤں کی تجدید کر کے نقصان کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ ہندوستان کی سرحد سے ملے ہوئے علاقے کے متعلق اُس کے عزائم نے ہندوستان کے برطانوی حکمرانوں کی نیندیں حرام کر دیں۔

پنجاب بھی، جو رنجیت سنگھ کی موت کے بعد خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا تھا، انگریزوں کے لئے زیادہ تشویش کا باعث بن گیا اُن کی حکمت عملیوں نے سکھوں کو مشتعل کر کے جنگ پر آمادہ کر دیا جس کی وجہ سے بالآخر پنجاب کا الحاق کر لیا گیا۔ پچاس ہزار مربع میل زرخیز زمین اور چالیس لاکھ تنومند کسان برطانوی حکومت میں آ گئے۔

شکست کے ساتھ ذلت بھی ہوئی۔ معزول شہزادے دلیپ سنگھ کو عیسائی بنا لیا گیا اور ملک بدر کر کے انگلستان بھیج دیا گیا۔ لاہور دربار کی املاک نیلام کر دی گئیں۔ برطانوی تاج کی آرائش کے لئے کوہ نور انگلستان بھیج دیا گیا۔ لارڈ ڈلہوزی امرت سر کے سنہرے گردوارے میں گیا اور جوتے پہن کر اُس کی مقدس حدود میں چلا۔

انگریزوں کی زیادتی کی ایک اور واضح مثال ہے ناگپور کا الحاق۔ اس کے متعلق ڈلہوزی نے روداد میں یہ وجہ بیان کی ہے ''میں اپنی قوت فیصلہ کو اس امر کے اعتراف کے لئے آمادہ نہیں کر سکتا ہوں کہ مہربانی و شفقت کا جذبہ ایک منصفانہ اور مصلحت اندیش پالیسی کو رد کر سکتا ہے۔''(37) لیکن اس پالیسی کے پیچھے کیا عوامل کام کر رہے تھے یہ بات ڈزرائلی نے پارلیمنٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے واضح کر دی تھی جس میں اُس نے گورنر جنرل کی روداد کے اقتباسات پیش کئے تھے۔ اُس نے کہا تھا ''ناگپور کے الحاق سے ہمیں ایسا علاقہ مل جائے گا جو 80,000 مربع میل پر مشتمل ہے، جس کی سالانہ آمدنی چالیس لاکھ روپیہ ہے اور جہاں 40,00,000 سے زیادہ لوگ آباد ہیں...... اس کی وجہ سے ہز ہائی نس نظام کی سلطنت برطانوی علاقے سے بالکل گھر جائے گی۔''(38) ڈلہوزی کے لئے برار کے علاقے کی کپاس پیدا کرنے کی صلاحیت اتنی زیادہ پرکشش تھی کہ اُس نے لوگوں کے احساسات اور انصاف کے تقاضے کو نظر انداز کرنے کے نتائج

کے متعلق کرنل لو اور ولیم منسل کے مشوروں کو رد کر دیا اور ناگپور کی مرہٹہ ریاست کی موت کے پروانے پر دستخط کر دیئے۔

سندھ کی فتح کو بدطینتی اور بدکرداری کے مظاہرہ کہنا چاہئے۔ گندی جارحیت۔ اس کے روح رواں نیپیر نے اعتراف کیا ''ہمیں سندھ پر قبضہ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ پھر بھی ہم اُس پر قبضہ کریں گے اور یہ نہایت سودمند، مفید اور انسان دوستی کے جذبات پر مبنی بدمعاشی ہو گی۔''(39) امیروں کے خلاف جھوٹے الزامات تراشے گئے جن کی بنیاد تھیں جعلی دستاویزات۔ برطانوی فوجوں کی بندوقوں نے زرق برق لباس پہنے اور بھڑکیلے صافے باندھے بلوچیوں کو بھون کے رکھ دیا جو بڑی بہادری سے لڑے۔ لیکن اُن کے پاس عہد وسطیٰ کے ہتھیار تھے یعنی تلواریں اور بھالے لیکن اس ظاہری تمسخر اور دکھاوے کی بہادری کے پیچھے ایک سنجیدہ مقصد تھا جس کا اعلان پامرسٹن نے کیا یعنی'' کاسکوں اور سکھوں کی ملاقات کو ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ دور رکھا جائے۔''(40)

بہت سے شاہی خاندانوں سے وارث کو گود لینے کا روایتی حق چھین کر اُنہیں علاقوں اور پینشنوں سے محروم کر دیا گیا۔ چنانچہ ستارا، رائچور، نلدرگ، کرناٹک، تانجور، جھانسی، کرولی اور سمبھل پور وغیرہ کے خاندان اپنے علاقوں سے محروم کر دیئے گئے۔

مالکان اراضی کے ساتھ بُرا برتاؤ

حکمراں خاندانوں کے بعد امراء اور شرفاء کے طبقے کا نمبر آیا یعنی تعلقداروں، زمینداروں اور اعلیٰ سرکاری حکام کا۔ اُن کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ''اُس زمانے کی پالیسی یہ تھی کہ حکمراں اور کسان کے درمیان کسی کو تسلیم نہ کیا جائے۔''(41) اس طبقے کا خاتمہ جزوی طور سے بڑی بڑی ریاستوں کے خاتمے کی پالیسی کا نتیجہ تھا۔ ہندوستانی انتظامیہ کے زوال اور اُس کی جگہ برطانوی نمونے کے سول اور فوجی انتظام کے قیام نے، جو برطانوی کارکنوں پر مشتمل تھا، قدرتی طور سے ہندوستانی حکمراں طبقے کو برطرف کر دیا۔

کمپنی نے جو مال گزاری کا نظام قائم کیا تھا اُس کی نوعیت نے بھی حکمراں طبقے کو ختم کرنے میں مدد دی۔ استمراری بندوبست کے علاقوں میں پرانے خاندانوں کی جگہ نئے قسم کے مالکان

اراضی نے لے لی۔ رعیت داری علاقوں میں مالکان اراضی نیست و نابود ہو گئے۔ مرہٹوں کی جنگوں اور اودھ کے الحاق کے نتیجے میں جو علاقے برطانوی سلطنت میں شامل کر لئے گئے تھے وہاں ''بہت سے قابل برطانوی مدبر، خصوصیت کے ساتھ شمالی ہند میں، کسی ایسے شخص کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ جس کو بجا طور سے مقامی شرفاء کے زمرے میں شامل کیا جا سکے۔ اُن کے دل ہمدردی اور مکمل انسان دوستی کے جذبات سے بھرے ہوئے تھے پھر بھی وہ مقامی شرفاء کے متعلق صرف ایک خیال رکھتے تھے اور وہ یہ تھا کہ اس ادارے کو بڑی ایمانداری کے ساتھ مٹا دیا جانا چاہئے۔'' (42)

صوبجات شمال مغربی اور اودھ

مثال کے طور پر بالائی صوبوں میں مالکانہ حقوق رکھنے والے تین طبقے تھے۔ 1- زمیندار، 2- تعلقدار اور 3- معافی دار، فیل کار۔ شروع میں اُن کے ساتھ جو بندوبست کئے گئے تھے اُن کی بنیاد پر کوئی واضح اصول نہیں تھے۔ پھر بھی یہ سمجھا جاتا تھا کہ اراضی کے تمام خالص اثاثے کی حقدار ریاست ہے۔ 1824ء میں خالص لگان کا 5/6 حصہ معیاری مال گزاری قرار دیا گیا تھا۔ 1922ء میں اُسے گھٹا کر لگان کا دو تہائی کر دیا گیا۔ صوبہ جات شمال مغربی کے لیفٹیننٹ گورنر ٹی۔سی۔ رابرٹسن کو 42-1833ء کی بندوبست کی کارروائی ''کچھ اس نوعیت کی معلوم ہوئی جس کا مقصد ہے سماج میں ایسی برابری پیدا کرنا کہ بالآخر حکمراں طبقے اور زمین جوتنے والے میں بڑے چھوٹے کا امتیاز باقی نہ رہے۔ یہ تجربہ خطرناک ہے کہ کسی درمیانی مقامی ایجنسی کی مدد کے بغیر حکومت کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس وقت ہم جو کارروائی رر ہے ہیں اُس کا راست نتیجہ ہوگا اس قسم کی صورت حال پیدا کرنا۔'' (43)

1855ء میں سہارن پور ضوابط کی رو سے تشخیص کی شرح 50 فی صد کر دی گئی۔ اس شرح کا نفاذ، اودھ، صوبہ جات متوسط، پنجاب اور بعد میں مدارس اور بمبئی میں کر دیا گیا۔ لیکن یہ راحت اتنی دیر میں نصیب ہوئی کہ 1857ء کے واقعات پر اس کا زیر اثر نہیں پڑا۔

اس بے اندازہ مطالبے کی وصولی میں انتہائی سختی سے کام لیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ کے کے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ''اس نظام کے تحت، جس کو ہم نے رواج دیا تھا، وہ لوگ جو تا حد نظر

پھیلے ہوئے زمین کے بڑے بڑے خطوں کے مالک تھے کچے جھونپڑوں میں رہنے والے کسان بن گئے جن کے پاس صرف کھانا پکانے کے کچھ برتن بھانڈے تھے۔" (44)

جہاں تک اودھ کے تعلقداروں کا تعلق تھا اُنہیں بلاشبہ جاگیردارانہ حقوق حاصل تھے۔ 1856ء میں اودھ کے الحاق کے وقت اودھ کا دو تہائی حصہ اُن کی ملکیت تھا۔ لیکن برطانوی حکومت اُنہیں محض "مال گزاری وصول کرنے کی خاطر مقرر کئے گئے درمیانی لوگ" (45) سمجھتی تھی۔ حکام بندوبست کا نظریہ تھا کہ "تعلقدار ایک نودولتیا اور فریبی انسان ہوتا ہے...... کچھ نوجوان حکام بندوبست کا خیال تھا کہ ایک تعلقدار کو زمین سے محروم کرنا اتنا ہی بڑا کارنامہ ہے جیسے شیر کا شکار کرنا اور اس پر عمل کرتے تھے...... کارروائی اس طرح کی جاتی تھی کہ جو لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے اُنہیں بھی بادل نخواستہ اس کی تعریف کرنا پڑتی تھی۔ سب کو برابر بنانے کا یہ عظیم نظام تھا جس نے ہر چیز کو پہلے اصولوں اور گرتے ہوئے آدم کی سطح تک پہنچا دیا۔" (46)

ہومس کے مطابق "لیکن حکام بندوبست، جنہوں نے مشہور و معروف رابرٹ مرٹنس برڈ سے تحریک پائی تھی، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بڑی سے بڑی مسرت سے ہمکنار کرنے کے تصور سے سرشار تھے۔ وہ تعلقداروں کو بے مصرف کاہلوں سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ایک فٹ زمین پر بھی اُن کے حق کو اُس وقت تک تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ جب تک وہ حق ملکیت کا ویسا ثبوت نہ پیش کریں جو ایک انگریز وکیل کو مطمئن کر سکے۔" (47) کے کا کہنا ہے "بندوبست کی جاروب نے بچے کھچے مالکانِ اراضی سے جاگیروں کو پاک کر دیا اور حق ملکیت رکھنے والے کسانوں کی ایک نسل کو زمین کے جائز وارث تسلیم کرلیا گیا۔" (48)

مثال کے طور پر مہاراجہ مان سنگھ سے، جو 577 گاؤں کا مالک تھا اور حکومت کو سالانہ 20,000 پاونڈ بطور مالگزاری ادا کرتا تھا، چھ کے علاوہ سب گاؤں چھین لئے گئے اور اُس کی مال گزاری 20,000 پاونڈ سے گھٹ کر 200 پاونڈ رہ گئی۔ ایک اور تعلقدار کے 378 گاؤں میں سے 266 چھین لئے گئے اور ایک کے 204 میں سے 155 چھن گئے۔ (49)

دوسری کارروائی جس نے اس طبقے کو متاثر کیا معافی دار و فیل کار کی زمینوں کو واپس لینا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر زمینیں اُن لوگوں کا ترکہ تھیں جنہوں نے حکومت کی شاندار خدمات سرانجام دی تھیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مغل سلطنت کے زوال کے انتشار پذیر زمانے میں اُن میں کچھ زمینوں

کو ناجائز طور سے حاصل کر لیا گیا ہو۔ فی الجملہ تحقیقات کا حکم دیا گیا۔ اُس کا جو نتیجہ ہوا اُسے کے کے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے ''معافی داروں سے زمین خالی کروانے والے حاکم کو پورے اختیارات سونپ دیئے گئے۔ معافی نامے طلب کئے گئے۔ اُن کے جائز ہونے کے ایسے ثبوت پیش کرنے تھے جو سرکاری کارکن کو مطمئن کر سکیں۔ اتنی مدت تک قابض رہنے کے بعد اُن سے کہنا کہ ثبوت پیش کریں ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ اُس وقت اُن کے پاس محض ایک ثبوت تھا اور وہ تھا اُن کا قبضہ اور دخل۔ اُس کے بعد مظالم کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اُس کے بعد جو کچھ کیا گیا اُسے عام ضبطی سے تعبیر کیا جانا چاہئے۔''(50)

متاثر ہونے والوں میں سے بہت سے علم دوست حضرات تھے۔ وہ علماء تھے جنہیں بزرگوں اور عالموں کے طور پر مذہبی خدمات سرانجام دینے کے لئے مدد معاش ملی تھی۔ اُن کے حقوق اور ذرائع معاش کی ضبطی تلخی پیدا کرنے کی ایک بڑی وجہ بن گئی اور انہیں دشمنی پر آمادہ کر دیا۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ برطانوی حکومت کے خلاف لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے میں مولویوں کا بڑا ہاتھ تھا۔

نظام مالگزاری کے شکار چھوٹے لوگ بھی ہوئے، واقعہ یہ ہے کہ چھوٹے زمینداروں کی تعداد اور زیادہ تھی۔ وہ کئی ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے یعنی راجپوت تھے، برہمن، جاٹ، گوجر وغیرہ تھے۔ حاصلہ حقوق پر حملے نے اُنہیں دشواریوں میں مبتلا کر دیا اور اُن کی وجہ سے سپاہی بھی دشواریوں میں مبتلا ہو گئے اس لئے کہ سپاہی اُن چھوٹے زمینداروں کے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے جن کی آمدنی خاندان کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں تھی۔ روٹی روزی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے سپاہی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔

کسانوں کی بے چینی

کسان بھی خوش نہیں تھے۔ عظیم بغاوت کے واقعات کے سرکاری بیان میں کہا گیا ہے۔(51) گنگا پار 6 کے پرگنوں میں شورش کے اسباب تھے۔ اُن کے تعلق مذہب سے زیادہ نہیں تھا۔ ہمارے حوالے کئے جانے کے وقت ان پرگنوں کے گاؤں کے بڑے بڑے تعلقے ٹھاکر خاندانوں کی ملکیت تھے۔ قدیم زمیندار جو عادتاً فضول خرچ تھے اور لوٹ کھسوٹ کر کے گزر معاش

کرتے تھے اپنی فضول خرچیوں کی بنا پر تباہ ہو گئے اور ہمارے ضابطوں اور قانون کی بنا پر اُن کی جائیدادیں نیلام ہو گئیں۔ کسان اور غریب طبقے نیلام خریدنے کے مقابلے میں اُن کا زیادہ لحاظ کرتے تھے۔ چاہے نیلام خریدنے والا کتنی مدت تک جائیداد پر قابض کیوں نہ رہا ہو اب بھی سابق زمیندار اور اُس کا خاندان گاؤں کے سب سے زیادہ بااثر لوگ سمجھے جاتے تھے۔ اکثر اوقات گاؤں کے غریب لوگ اُنہیں ایک قسم کا خراج ادا کرتے تھے اور وہ اُس کے عوض اُن کی مدد کرتے تھے۔

نیلام خریدنے والا عام طور سے شہر کا رہنے والا ہوتا تھا جو لگان وصول کرنے یا ڈگری جاری کرانے کے قابل نفرت مقصد کے علاوہ کبھی گاؤں نہیں جاتا تھا۔ قدرتی طور سے لوگ زمینداروں کا ساتھ دیتے تھے جنہوں نے اس بغاوت کو پرانی حیثیت دوبارہ حاصل کرنے کا بہترین موقع سمجھا انہوں نے پہلے تو ہر اُس چیز کو تباہ کر دیا اور لوٹ لیا جس کا تعلق یورپ سے تھا اور اُس کے بعد اپنی پرانی جائیدادوں پر بالجبر قبضہ کر لیا۔

اُن علاقوں میں بھی زراعت کی صورت حال اتنی ہی خراب تھی جہاں رعیت داری طریقہ رائج تھا۔ بمبئی پریسیڈنسی میں میراث دار ختم کر دیئے گئے جو زمین کے موروثی مالک تھے اور اراضی کا ایک مقررہ محصول ادا کرنے کی صورت میں وہ اُس پر قابض رہ سکتے تھے اور جب تک وہ محصول ادا کرتے رہیں انہیں بیدخل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

1824ء لغایت 1828ء پرنگل نے مجموعی پیداوار کا 55 فی صدی سرکاری مطالبہ مقرر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسانوں نے اپنے کھیت چھوڑ دیئے اور بڑے بڑے قطعوں پر کاشت ختم ہو گئی۔ 1835ء میں اس کی جزوی تلافی کی گئی۔ پھر بھی 1852ء کی پارلیمانی کمیٹی کے سامنے سر جارج کی شہادت کی رو سے رعیت داری علاقوں کے لوگ غربت اور افلاس کا شکار تھے۔ (52) 1817ء اور 1835ء کی درمیانی مدت میں مالگزاری قریب قریب دگنی ہو گئی تھی یعنی 8,68,000 پاونڈ سے بڑھ کر 15,35,000 پاونڈ ہو گئی تھی۔

مدارس پریسیڈنسی میں بھی حالات بہتر نہیں تھے۔ 1820ء میں رعیت داری بندوبست کی کارروائی شروع کی گئی۔ اور 1817ء میں وہ پائے تکمیل کو پہنچی۔ رمیش دت کے الفاظ میں اس کا نتیجہ تھا ''تیس سال تک مدراس کے صوبے میں ایسے مظالم اور زرعی دکھ دیکھنے میں آئے جن کی

مثال اُس عہد کے ہندوستان میں بھی نہیں ملتی ہے۔'' (53)

بعد میں ہونے والے بندوبستوں نے اس صورت حال میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی۔ 53-1852ء میں بورڈیلون نے دیکھا تھا کہ کسان روز کنواں کھود کر روز پانی پیتے تھے اور ہمیشہ چیٹی (مہاجن) کے مقروض رہتے تھے۔

شمال کے صوبوں کی طرح بمبئی اور مدراس میں شورش نہ پھوٹنے کی وجہ سے اطمینانی کی کمی نہیں تھی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ رعیت داری نظام نے انہیں ضروری قیادت سے محروم کر دیا تھا۔ بڑی حد تک بمبئی کے میراث دار اور مدراس کے پولیگر اور زمیندار ختم کئے جا چکے تھے۔

حالانکہ مجموعی اعتبار سے یہ حقیقت ہے کہ برطانیہ کے خلاف عام طور سے بے اطمینانی پائی جاتی تھی پھر بھی واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے کچھ حصوں میں اور کچھ طبقوں میں یہ احساس دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تھا، اس اختلاف کی بڑی وجہ تھی مال گزاری کے نظام کے نوعیت۔ جن علاقوں میں زمینداری نظام تھا، وقفہ وقفہ سے بندوبست کیا جاتا تھا اور سرکاری مطالبے کی شرح میں تبدیلی کا بڑا بار اُٹھانا پڑتا تھا وہاں برطانیہ کا تختہ الٹنے کی خواہش میں معاشی دکھوں نے شدت پیدا کر دی تھی۔ زمینداری نظام رکھنے والے دوسرے علاقوں میں جہاں مال گزاری کی استمراری تشخیص تھی جو مقابلتاً کم تھی اور آسانی سے ادا کی جا سکتی تھی وہاں کے لوگ زیادہ شدید کارروائی کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔

شمالی ہندوستان میں بنگال کو جو زرعی نظام کے تجربوں کی سرزمین تھا، ابتدا میں بہت سے دکھ اُٹھانے پڑے لیکن جب بندوبست استمراری کی ابتدائی بھاری شرح تشخیص کے نتائج کی شدت رفتہ رفتہ کم ہوگئی تو اُنیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے زمینداریوں کی نسلیں بڑھتی ہوئی خوشحالی کے دور میں داخل ہوگئیں اور 1857ء میں اُن کی زمینداریوں کی آمدنی اتنی تھی جس سے وہ فی الجملہ مطمئن تھے۔ ان خاندانوں کے نوجوان انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے لگے اور اُس زمانے میں اُنہیں روزگار حاصل کرنے میں بھی زیادہ دشواری نہیں ہوتی تھی۔ وہ سرکاری ملازمتوں یا آزاد پیشوں میں داخل ہوگئے۔

نئے مالکان اراضی کا تعلق کئی ذاتوں سے تھا اور انتظام و انصرام یا جنگ کی روایات اُن میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ اُنہوں نے بدیسی حکومت کو قبول کر لیا اور اُن کے پہلے کے حکمرانوں

کے مطلق العنان اور من مانے نظم حکومت پر اُن سے باضابطہ طریقے اور باقاعدہ طریقہ کار کو ترجیح دی۔ قدرتی طور سے وہ نوابوں کہ فیڈرل حکومت کی بحالی کے خلاف تھے۔ باغیوں سے اُنہیں کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ کلکتہ کے ہندو پیٹریارٹ نے اُن کے نقطہ نظر کی وضاحت اُن الفاظ میں کی تھی۔

''ان صوبہ جات کے لوگ اپنی عادت اور تولیم کی بنا پر باغی سپاہیوں کی صفوں میں شامل ہو سکیں گے یا قومی امن و امان میں خلل ڈالنے والوں کی حفاظت کی کم سے کم ذمہ داری بھی قبول نہیں کر سکیں گے۔ بنگالیوں نے کچھ اس امر کی خواہش نہیں کی ہے وہ جنگ میں فوجوں کی قیادت یا مایوس زندگی کی شہادت کی ناموری سے بہریاب ہوں۔ اُن کے پیشے اور اُن کی کامیابیاں تمام تر سول ہیں۔ ایک ہمہ گیر بصیرت سوچنے اور پہلے سے کسی مسئلہ پر غور و فکر کرنے میں اُن کی معاونت کرتی ہے۔ وہ اس سے واقف ہیں کہ اُن کے پرسکون ذہنی مذاق کے لئے برطانوی حکومت سب سے زیادہ موزوں ہے یہ کہ ایک مفتوح نسل جس حد تک خوشحالی حاصل کر سکتی ہے وہ برطانوی حکومت کے سازگار دور میں اُس حد تک خوشحالی حاصل کر سکیں گے۔ اُنہیں امید ہے کہ انگریزوں کے جذبہ انصاف پسندی سے جو اپنے نمائندوں کے ذریعے مقتدر کونسل یا پارلیمنٹ میں حصہ لیتے ہیں، قانونی اور دستوری طریقوں سے رجوع کر کے وہ، وقت آنے پر، اپنے بدیسی حاکموں کے ساتھ زیادہ برابری کے مدارج طے کر لیں گے اور ایشیا کی سب سے زیادہ منظم سلطنت کے انتظام و انصرام کی باعزت ذمہ داری میں اُن کے شریک ہو سکیں گے۔ ہندوستانیوں کے دوسرے حصوں سے زیادہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ شورش میں ملک کو بہت پیچھے دھکیل دیا ہے۔(54)

صوبجات متوسط

1818ء میں مرہٹہ سلطنت کے زوال کے بعد وہ علاقے انگریزوں کے ہاتھوں میں آ گئے جن پر صوبہ جات متوسط مشتمل ہیں۔ مال گزاری کے بندوبست کی فوری کارروائی کی گئی۔ اس بندوبست کی خاص خاص باتیں یہ تھیں کہ حکومت کے مطالبے کی تشخیص اونچی شرح سے کی گئی اور اُس پر نظر ثانی کرنے کی مدت کم کر دی گئی۔ مالکان اراضی کے اُس طبقے کو تسلیم کر لیا گیا جو مالگزار کہلاتا تھا اور اُن کے سابق حقوق میں بیع اور رہن کے حقوق کا اضافہ کر دیا گیا۔

بہت بھاری لگان کی وصولی میں برتی جانے والی سختی کے حسب دستور نتائج سامنے آئے۔ ہوشنگ آباد اور سیونی کے اضلاع میں 1825ء میں مال گزاری کی تشخیص 2,277 پاونڈ فی سال سے بڑھ کر 13,877 پاونڈ کر دی گئی۔ چونکہ اس رقم کی وصولی ناممکن ثابت ہوئی اس لئے اسے گھٹا کر 6,192 پاونڈ کر دیا گیا۔ یہ بھی اُس رقم سے تقریباً تگنی تھی جو مرہٹے وصول کیا کرتے تھے۔ نرسنگھ پور، دموہ، ساگر اور نربدا کے علاقوں میں بھی یہ طریقہ اپنایا گیا۔ 1853ء میں ناگپور کے الحاق کے بعد وہاں بھی یہی کیا گیا۔

اضلاع سے مظالم، جائیداد کی قیمت گرنے، تباہی اور بدنظمی کی اطلاعات آنے لگیں اور بے اطمینانی بڑے علاقے میں پھیل گئی۔ اُس کا تلخ ثمر تھا 1857ء میں رونما ہونے والے واقعات۔

پنجاب

1839ء میں مکمل الحاق کے بعد پنجاب میں مالگزاری کا بندوبست شروع کیا گیا۔ دوسرے مقامات پر تشخیص کی اونچی شرح نے جن دشواریوں کو جنم دیا تھا اُس کے تجربے کی بنا پر انگریزوں کے کان ہو گئے تھے اس لئے پنجاب میں بڑی احتیاط کے ساتھ بندوبست کئے گئے۔ زمین کی پیائش، فصلوں کی قیمت اور تشخیص کے کاموں میں مقامی محاسبوں اور گاؤں کے نمائندوں کو شامل کیا گیا۔ 1856ء میں حکومت کا مطالبہ اُس سے 25 فی صدی کم تھا جو سکھ حکومت وصول کرتی تھی۔ 58-1857ء کی رپورٹ کے مطابق اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ''زراعت پیشہ طبقے بافراغت اور خاموش تھے، حالات کا شکار کوئی نہیں تھا، کوئی تبدیلی کا خواہش مند نہیں تھا۔'' (55)

مالگزاری کی تشخیص کی شرح کم تھی اور بغاوت کے دوران پنجاب میں مقابلتاً پرسکون حالات کی وجہ یہی تھی۔

اذیتوں کا استعمال

ایسٹ، نارٹن اور اسٹوکس نے 1855ء میں اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ سرکاری مالگزاری وصول کرنے کے لئے لوگوں کو اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں۔ مالگزاری وصول کرنے اور پولیس کی تفتیش کے دوران اذیتیں پہنچانے کا بڑا الزام کمپنی کی حکومت پر لگایا گیا تھا۔ مسٹر بلیکٹ نے 11- جولائی 1854ء کو ایک تحقیقاتی کمیشن کے تقرر کی تجویز پر بولتے ہوئے ہاؤس آف کامنز میں

یہ مسئلہ اٹھایا تھا۔ اُس نے کہا کہ سرکاری مطالبات اتنے بھاری ہیں کہ بدقسمت رعیت ظالمانہ وصولی کے بوجھ کے نیچے پس رہی ہے۔'' (56) اس کے خلاف سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ''اس پراُن ذرائع کواستعمال کئے بغیر عمل نہیں کیا جاسکتا جنہوں نے اس کوانتہائی نا قابلِ برداشت ظلم میں تبدیل کردیا ہے۔'' (57) اُس نے مزید کہا کہ نظام کے تحت لوگوں کی حالت ''نہایت درجہ خائف کن ہوگئی ہے جنہیں زمین اورتباہی کے بوجھ نے جسمانی اور ذہنی طور سے خاک میں ملا دیا ہے۔ یہ بوجھ غربت، دکھ اور فاقہ کشی کا بوجھ ہے۔'' (58) مسٹر وینی سیمور نے کہا کہ مدراس کی حکومت کا بڑا مقصد تھا اُس شخص سے 10 شلنگ فی سال وصول کرنا جس کے پاس محض شلنگ تھے۔ یہ کام ہمیشہ آسان نہیں ہوتا تھا اور رقم وصول کرنے کے لئے اُس قسم کی جسمانی اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں جن کا رواج پچھلی صدی کے اوائل میں تھا۔'' (59) جان برائٹ کے مطابق ''زمین غیر زرخیز نہیں تھی لیکن اُس پر اتنا بھاری محصول لگایا جاتا تھا کہ اُس میں کاشت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔'' (60) اس بات کو ثابت کرنے کے لئے مال گزاری کی وصولی کے سلسلے میں جسمانی اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں اس نے انگریزوں یعنی کلکٹروں اور دوسرے حاکموں کی شہادتیں پیش کیں۔ مسٹر آٹوے نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کلکتہ کے ایک بیرسٹر مسٹر تھیولڈ کا حوالہ دیا جس نے اُسے لکھا تھا ''ہندوستان میں قریب قریب ہر قسم کی خرابی اور برائی پائی جاتی ہے۔ آپ نے جسمانی اذیتوں کے متعلق جو اطلاعات حاصل کیں ہیں وہ میرے لئے نئی نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کلکتہ کی ہر حوالات میں اُن پر عمل کیا جاتا ہے۔ زیادہ مدت نہیں ہوئی جب مضافات میں خود مجھے اس کا ثبوت ملا۔'' (61)

پانچ ووٹوں سے یہ تحریک گرگئی اُس کے بعد ارل آف ایمپارل نے ہندوستان کے لوگوں کی شکایتوں کو دور کرنے کی خاطر ایک عرضداشت 16- جولائی 1855ء کو ایوان میں پیش کی اور مدراس پریسیڈنسی میں مبینہ اذیتوں کی تفتیش کرنے والے کمیشنروں کی رپورٹ کا حوالہ دیا جس میں مالگزاری کے معاملات اور پولیس کے مقدمات کے سلسلے میں پہنچائی جانے والی اذیتوں کی نوعیت کی وضاحت کی گئی تھی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ''مال گزاری کے وصولی اور پولیس کے مقدمات دونوں صورتوں میں اس پریسیڈنسی کے طول وعرض میں مقامی مال گزاری اور پولیس کے حکام لوگوں کے خلاف تشدد سے کام لیتے ہیں۔'' (62)

ایک آزاد فرانسیسی مشاہد کمانڈر مارٹن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اُن اذیتوں کی ذمہ داری خود کمپنی پر آتی ہے جنھوں نے 1857ء میں بہت سے انگریز خاندانوں کو سوگوار بنا دیا'' کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ (کمپنی کے) ایجنٹوں کی زیادتیوں کا انتقام لینے کے لئے باغیوں نے وہ خوفناک مظالم کئے جس نے پوری سلطنت میں غصے کی لہر دوڑا دی ہے؟ بغاوت شروع ہونے سے مشکل سے ایک سال پہلے حکومت کے حکم پر کی جانے والی تفتیش سے ظاہر ہوا تھا کہ ہندوستانیوں کو جسمانی اذیتیں پہنچانے کا ایک قابل نفرت با قاعدہ نظام پایا جاتا ہے جس سے عورتیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ اس تحقیقات کے بعد انگلستان کو، جو ہوورڑ اور ولیبرفورس کی سرزمین ہے، اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ کمپنی کے ملازم ہندوستانی مقبوضات میں اس قسم کی خباثت آمیز جسمانی اذیتیں پہنچاتے ہیں جو غیر مہذب طریق عملی کی آپ مثال ہیں۔'' (63)

انتظامیہ سے ہندوستانیوں کی علیحدگی

بالائی طبقوں کی مزاحمت اور بے اطمینانی کی کئی اور وجوہ تھیں۔ سید احمد خاں کا خیال تھا کہ حکومت کے اثر اور اُس کی کارروائیوں سے ہندوستانیوں کی مکمل علیحدگی سے اہم تھی۔ اُنہوں نے لکھا تھا ''یہ بات عام طور سے تسلیم کی جاتی ہے کہ اچھی اور مناسب حکومت اور استحکام کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کی حکومت میں رعایا کا بھی دخل ہو۔ اس سے پہلے کہ خرابیاں اُس منزل تک پہنچ جائیں جب اُن کا تدارک ناممکن ہو صرف عام لوگ منتظمین کو اُن کی پالیسیوں کی اچھائیوں اور برائیوں سے باخبر رکھ سکتے ہیں۔ اور یہ اُس وقت تک نہیں کیا جا سکتا ہے جب تک رعایا کو ایسی حکومت کے معاملات میں دخل و رسوخ حاصل نہ ہو جو ہمارے لوگوں سے مذہب، روایات، طور طریق، رواجوں، مزاج اور عادات میں مختلف ہے۔ ہندوستان کے لوگوں کو مجلس قانون ساز سے دور رکھنا کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اُن کو دور رکھنے کی وجہ سے نہ صرف اتنا نقصان ہوا کہ حکومت کو اُن قوانین وضوابط کی حقیقی خامیاں نہیں معلوم ہو سکیں جنھیں اس نے نافذ کیا، بلکہ اُس کا بدترین نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت اپنی رعایا کے حقیقی اغراض و مقاصد اور ارادوں سے واقف نہ ہو سکی اور لوگ حکومت کی تمام تر تجاویز کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا رہے۔'' (64)

IV- ہندوستانیوں کے ساتھ برا سلوک

ایک اور وجہ تھی ہندوستانیوں کی طرف انگریزوں کا بدلا ہوا رویہ۔ یہ تبدیلی، نتیجہ تھی نپولین کے خلاف جنگ میں انگلستان کی کامیابی، صنعتی انقلاب کی بنا پر بڑھتی ہوئی خوشحالی، میتھوڈزم اور ایونجیلیکلزم کی طرح کی مذہبی تحریکوں کے پھیلاؤ اور سماجی رسم و رواج اور اخلاقی معیارات میں سدھار کا۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر انگریزوں میں دوسروں کے مقابلے میں احساس برتری پیدا ہو گیا اور اُن کے قومی فخر و مباہات میں اضافہ ہو گیا۔

بال کے مطابق ہندوستان کی مقامی نسلوں کے ساتھ یورپی حکام اس قسم کا برتاؤ کرتے تھے ''جسے کوئی بھی باحمیت لوگ ایک گھنٹے کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔'' (65) اس نے ایک ہندوستانی مصنف کی شہادت پیش کی جس نے لکھا تھا ''سول اور فوجی دونوں قسم کے انگریز حکام کی ایک بڑی اکثریت اپنے ماتحتوں ملازموں اور سپاہیوں کے ساتھ اور ملک کے عام لوگوں کے ساتھ بھی بدکلامی کرتے ہیں۔ (66) اُس کا خیال تھا کہ حاکموں اور محکوموں کے درمیان ایک خلیج حائل تھی ''روز بروز وسیع تر اور ناقابل عبور بنتی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں کمپنی کے سول اور فوجی ملازمین پڑھے لکھے مقامی باشندوں کے ساتھ بھی جس توہین آمیز لہجے اور طریقے سے بات کرتے ہیں اور جس قسم کے تکبر کا مظاہرہ کرتے ہیں اُس نے دونوں فریقوں میں جذبہ خیر سگالی اور اعتماد پیدا نہیں ہونے دیا۔'' (67)

سکریٹریٹ آف اسٹیٹ فار انڈیا لارڈ اسٹیلی نے 10- ستمبر 1857ء کو ادلیس کومب کالج کے نوجوان کیڈٹوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے ہندوستان میں یورپینوں کے ''تکبرانہ اور نفرت انگیز احساس برتری'' (68) کی طرف اشارہ کیا تھا۔

1818ء میں منزو نے گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز کو لکھا تھا ''بدیسی فاتحین نے مقامی آبادی کے خلاف تشدد اور اکثر اوقات بڑی سنگدلی سے کام لیا ہے لیکن کسی نے اُس قسم کا ذلت آمیز برتاؤ نہیں کیا جیسا ہم نے کیا۔ کسی نے پوری قوم کے چہرے پر کالک نہیں لگائی اور اُس کو ناقابل اعتماد، دیانتداری سے محروم اور اس قابل نہیں ٹھہرایا جس کو محض اُس وقت استعمال کیا جائے جب اُس کے بغیر کام نہ چلے۔ یہ بات محض غیر شریفانہ نہیں بلکہ مصالح کے منافی بھی ہے کہ جو لوگ ہمارے

زیرنگیں ہیں اُن کے کردار کو ہدف ملامت بنایا جائے۔''(69)

اُس نے مزید کہا'' ہمارے نظام کی اصل خرابی وہ ذلت آمیز حقیقت ہے جو ہم نے مقامی باشندوں کو دی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ توہم پرست، جاہل اور جھوٹ اور بے ایمانی کی طرف مائل ہیں۔ اُن کی خوشحالی کے لئے ہمارا جوش اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ اتنے پست ذہنیت لوگوں کو ملک کے انتظام میں کوئی حصہ دیا جائے۔ ہم اُنہیں قابل اعتماد اور منافع بخش عہدوں سے دور رکھتے ہیں۔ ہم اُنہیں ادنیٰ ترین عہدوں تک محدود رکھتے ہیں جہاں ان کو محض اتنی یافت ہوتی ہے جو انہیں زندہ رکھ سکے۔ یہ عہدے بھی اُن کو محض اس لئے دیئے جاتے ہیں کیونکہ یورپین اُن پر کام کرنے کی استعداد نہیں رکھتے۔ ہم انہیں انسانوں کی فرو نسل سمجھتے ہیں...... ہم اُنہیں اس گری ہوئی حالت تک پہنچا دیتے ہیں اور اُس کے بعد بڑی حقارت کے ساتھ ہم اُنہیں اعلیٰ عہدوں کے نا قابل سمجھتے ہیں۔''(70)

مارکوائز ف کلینز یکارڈ نے فروری 1857ء میں ہاؤس آف لارڈز میں اُس نظام پر بحث کرتے ہوئے کہا تھا جس کے تحت حکومت ہند انتظام و انصرام کرتی تھی'' سچ تو یہ ہے کہ وہ نظام جس کے ذریعے ہندوستان پر حکومت کی جاتی ہے مقامی باشندوں میں گراوٹ پیدا کرنے اور اُنہیں چالاکی، کمینگی اور دھوکے بازی سے کام لینے پر اکسانے کا باعث ہے۔''(71)

ہندو مذہب اور رسم رواج کے متعلق انگریزوں کا حقارت آمیز رویہ

انگریزوں کے دلوں میں ہندوستانیوں کے تعلق سے جو جذبہء تحقیر پایا جاتا تھا اس کا اطلاق ان کے مذہب اور تہذیب پر بھی ہوتا تھا۔ ہندو دھرم کے تمام پہلوؤں کی خدمت میں عیسائی مشنری سب سے آگے تھے اور بہت سے سول اور فوجی افسر اس امر کو اپنا فرض منصبی تصور کرتے تھے کہ ہندوستان کے تاریک خیالوں کو عذاب ابدی سے محفوظ رکھنے کے لئے بشارت عیسوی کی ترویج کریں۔ غالباً اس کی وجہ تھی ہندوستانی نظام مذہب کے متعلق اُن کی عدم واقفیت۔ واقعہ یہ ہے کہ ولیم بیٹنگ نے اے ذوبو کی کتاب کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا'' ہندوستان میں اپنے زمانہ قیام میں جو کچھ میں نے دیکھا وہ یہ ہے کہ بالعموم یورپ کے لوگ ہندوؤں کے رسم و رواج کے متعلق بہت کم یا بالکل نہیں جانتے۔ ہم سب کچھ اہم نشانات و واقعات سے واقف ہوتے ہیں

جو وہاں جانے والا ہر شخص پڑھ سکتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم میں سے زیادہ تر اُن کے انداز فکر اور اُن کی گھریلو عادتوں اور رسموں سے ناواقف ہوتے ہیں جو کسی قوم کو سمجھنے کے لئے ضروری شرائط ہیں۔ ہم اُن کی زبان بھی پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں۔۔۔ اور انہیں اُن کے گھروں اور خاندانوں میں دیکھنے کا موقع ہمیں نہیں ملتا ہے۔'' (72)

مائیکل ایڈورڈسن نے کہا ہے ''اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی اور انگریز ایک دوسرے کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتے تھے جیسا کہ ملک کی طاقتیں کرتی ہیں۔ لیکن اُس صدی کی آخری دنوں میں وہ کشیدگیاں نمودار ہونے لگیں جو 1857ء کے غدر کی سبب بنیں جوں جوں انگریزوں میں اپنی طاقت کا شعور بڑھتا گیا وہ دور ہٹتے گئے اور اُن تک رسائی مشکل ہوگئی اور سماجی حکومت کے لازمی جُز کے طور پر کمتر اور مفتوح لوگوں کے لئے حقارت کا جذبہ حکمراں طبقے کی نمایاں خصوصیت کے طور پر روز بڑھنے لگا۔'' (73) انگریز اُن لوگوں سے بالکل علیحدہ رہتے تھے جن پر وہ حکومت کرتے تھے۔ انہوں نے نیپیر کے مشورے کو قابل اعتنا نہیں سمجھا یعنی ''ہر چیز میں اُنہیں حصہ دیجئے یہاں تک کہ ہم اُن میں آمیز ہو جائیں اور قوم بن جائیں۔'' (74)

شورش کی اصل وجہ تھی لوگوں کے مختلف حصوں کی سیاسی اور معاشی شکایتیں۔ مذہب کے لئے جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا وہ گڑبڑی کی مزید وجہ بن گیا اس لئے کہ ہندو مذہب کو زندگی کا سرچشمہ اور وجود کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ اپنے مذہب سے دور ہو جانے کے بعد ہندو یا مسلمان ایک ایسی کشتی کی طرح تھا جس میں لنگر اور پتوار نہ ہو۔ وہ سب سے زیادہ خائف اس سے تھا کہ جانے پہچانے ماحول سے اٹھا کر کسی انجان اور اجنبی دنیا میں پھینک دیا جائے۔ یہ خیال ہی اُس کے لئے پریشان کن تھا۔

عیسائی مشن کا پرچار

سید احمد خاں نے کہا کہ حکومت کے سماجی اقدامات، مشنریوں کی کارروائیوں اور سرکاری حکام کے بیانوں نے مل کر لوگوں میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ حکمراں ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

1813ء کے بعد، جب اُنہیں ہندوستان میں آباد ہونے کی اجازت دی گئی۔ عیسائی

مشنریوں کا پرچار بڑھنے لگا۔ اُن کے پادری بازاروں اور میلوں میں نظر آنے لگے۔ اکثر اوقات پولیس اُن کے ساتھ ہوتی تھی۔ سرسید نے لکھا ''مشنریوں نے انجیل کی تبلیغ کا ایک نیا طریقہ رائج کیا تھا۔ ایسے مذہبی رسالے شائع کئے اور لوگوں میں تقسیم کئے جانے لگے جو سوالوں اور جوابوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کی خاطر وہ حسب مرضی مسلمانوں کی مسجدوں، ہندوؤں کے مندروں اور میلوں میں جاتے تھے اور حکومت کے خوف کی بنا پر کوئی اس پر اعتراض کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اضلاع میں وہ خدمت کے لئے چپراسی کو استعمال کر سکتے تھے یا تھانے سے کسی سپاہی کو بلا سکتے تھے۔ یہ لوگ محض انجیل کی تبلیغ پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ دوسرے مذاہب کے بزرگوں اور مقدس مقامات کا ذکر بڑے توہین آمیز انداز میں کرتے تھے جس سے سننے والوں کی دل آزاری ہوتی تھی اور اُن کے دلوں میں حکومت کے خلاف بے اطمینانی کا جذبہ جڑ پکڑ لیتا تھا۔'' (75)

جن اقدامات کو قابل اعتراض سمجھا گیا وہ تھے ستی کی رسم کو ختم کرنا، ہندو بیواؤں کی دوبارہ شادی، عیسائی مذہب قبول کرنے والے کا حق موروثی جائیداد پر تسلیم کرنا، مختلف ذاتوں کے قیدیوں کے لئے یکساں کھانے کا انتظام، ریلوے میں ذات پات کا خیال نہ کرنا، سپاہیوں کی بھرتی کی شرط کہ اُنہیں باہر کے ملکوں میں جانا پڑے گا اور پوری کے جگناتھ مندر کی طرح کے مندروں کا انتظام سنبھالنا۔ اخلاق اور انتظامی کارکردگی کی بنیاد پر ان تمام اقدامات کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے کچھ کو روشن خیال ہندوستانیوں کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن پرانے خیال کے لوگوں کی ان سے بڑی دل آزاری ہوئی۔ چونکہ ان فیصلوں میں ہندوستانیوں کو دخل نہیں تھا اس لئے وہ انہیں اوپر سے لادے گئے ایسے فیصلے سمجھتے تھے جن کا نفاذ ایک بدیسی طاقت کی مدد سے کیا جا رہا تھا۔

تعلیم کے نئے نظام کے میدان میں پنڈت اور مولوی کی اجارہ داری کو ختم کر دیا اور نوجوانوں کے ذہنوں میں ایسے تصورات پیدا کر دیئے جن کی بنا پر ہندوستانی مذاہب کے عقائد و رسموں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ چونکہ تعلیم کے نظام میں عیسائی مشنریوں کا بڑا اثر تھا اس لئے نئے تعلیمی اداروں کو تبدیلی مذہب کے مراکز تصور کیا جانے لگا۔

ایک طرف تو مشنری کھل کر ہندو دھرم اور اسلام کا مذاق اڑاتے تھے اور اُن کی خدمت

کرتے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کو غصہ آتا تھا مگر عیسائی حکمرانوں کی حکومت کے تحت وہ اُس کو ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری طرف بہت سے سول اور فوجی افسر اُس کی حمایت کرتے تھے جس کو وہ یسوع مسیح کی اعلیٰ وارفع تعلیمات سمجھتے تھے اور مشنری نہ ہونے کے باوجود تبلیغ کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ریورنڈ ایم۔ ایڈمنڈ نے 1855ء میں کلکتہ سے ایک گشتی چٹھی شائع کی جس میں اُس نے کہا ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت آ گیا جب اس بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جانا چاہئے کہ سب لوگوں کو ایک مذہب قبول کرنا چاہئے یا نہیں۔ ریلوے، دخانی جہاز اور تار برقی تیزی کے ساتھ دنیا کے لوگوں کو متحد کر رہے ہیں...... کیا اس تصور کو معقول تصور سمجھا جاتا ہے کہ ہر قوم بر بنائے قیاس خدا کی مہربانی سے اپنے لئے ایک رستے کا انتخاب کرے۔ یا یہ کہ اُس خدائے واحد نے، جس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے، اپنے خاندان کے مختلف حصوں کی موجودہ اور آئندہ مسرت کے لئے مختلف طریقے متعین کئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا نہیں ہوسکتا ہے۔ عیسائی مذہب وہ واحد مذہب ہے جو دعویٰ کرتا ہے کہ راست وحی کے ذریعے وہ خدا کی طرف سے آیا ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جو اس دنیا میں مسرت کا باعث ہے اور دوسری دنیا میں جس کے حالات کا انکشاف اُس نے کیا ہے۔۔۔ چونکہ ہم نے اس سے بہت سی سعادتیں اور برکتیں پائی ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ان کے حصول میں دوسروں کی ہمت افزائی بھی کی جائے۔

ہماری خواہش ہے کہ گرجا ہندوستانیوں سے بھرے ہوں جہاں نہ صرف بدیسی بلکہ اس ملک کے لوگ بھی باقاعدگی سے مسیحی مذہب کی بشارت دیں اور جہاں وہ اپنے گناہوں سے توجہ کریں اور خدا کی حضور جانے کے لئے خود کو تیار کریں اور جہاں بچوں کو اخلاق اور سچائی کی تعلیم دی جاسکے۔(76)

V- سپاہیوں کی شکایتیں

جو شکایتیں بالائی طبقوں کے ذہنوں کو پریشان رکھتی تھیں اُن میں بنگال آرمی کے ہندوستانی سپاہی بھی شریک تھے جو زیادہ تر برہمن اور راجپوت تھے لیکن انہیں کچھ اور بھی شکایتیں تھیں۔ اُن میں مندرجہ ذیل شامل تھیں۔ ملازمت کے غیر اطمینان بخش حالات، مذہبی رسموں میں مداخلت اور اُن کے وقار و عزت نفس کو پہنچائے جانے والے صدمے۔

جہاں تک ملازمت کی شرائط کا تعلق تھا ترقی اور تنخواہ کے مسائل سب سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔اس لئے کہ اُن کا اثر سپاہیوں کی ملازمت اور وفاداری پر پڑتا تھا۔ابتدائی زمانے میں جب کمپنی جنوب میں اپنی بقا کے لئے فرانسیسی رقیبوں اور دکنی حکمرانوں کے خلاف جنگ کر رہی تھی ہندوستانی سپاہی ترقی کر کے افسروں کے عہدوں تک پہنچ سکتے تھے جو یورپی اور ہندوستانی فوجوں کی آزادانہ کمانڈ کرتے تھے بنگال کی فتح کے بعد جب انگریز افسروں کی بڑی تعداد ہندوستان آ گئی اور کارنواس نے انگریزوں کو افسر بنانے کی پالیسی اختیار کی تو ان عہدوں کے دروازے ہندوستانیوں کے لئے پوری طرح بند ہو گئے۔ ہندوستانیوں کو معمولی سپاہیوں کی حیثیت دی گئی اور کمیشنڈ افسروں کے عہدوں تک پہنچنے کے تمام امکانات ختم ہو گئے۔ بالائی طبقوں سے تعلق رکھنے والے اُن سپاہیوں کے لئے جو مغل حکومت اور ہندوستانی حکمرانوں کی فوجوں کو اعلیٰ ترین حیثیت کے کمانڈر مہیا کر چکے تھے، یہ واقعہ اس توہین آمیز صورت حال کا مظہر تھا کہ انگریزوں کے تحت اُن کی حیثیت کمتر ہے۔

تنخواہوں کا مسئلہ زیادہ الجھا ہوا تھا۔ یوں بھی تنخواہیں کم تھیں اور یورپی سپاہیوں کی تنخواہوں کے مقابلے میں تو وہ اور بھی کم تھیں۔ ہندوستانی سپاہی کا تعلق سماج کے معزز گروہوں سے تھا۔اسے اپنے پیشے پر بڑا فخر تھا اور اخلاق اور پیشے کے اونچے معیار رکھتا تھا۔اس کے برخلاف یورپی سپاہی کی خود اُس کے سماج میں عزت نہیں کی جاتی تھی اور اُس کے عادات واطوار بہت اچھے نہیں تھے۔ دونوں کے درمیان بڑا فرق تھا۔ اور اُن کے تنخواہوں کا فرق ذلت آمیز تھا۔(77) اگر اُن کے مختلف معیار زندگی کے پیش نظر تنخواہوں اور بھتوں کی مختلف شرحوں کو جائز قرار بھی دیا جائے پھر بھی ہر جنگ کے بعد اُن کی تنخواہ اور بھتے کے سلسلے میں جو غیر یقینی حالات پیدا ہو جاتے تھے اور جن من مانے طریقے سے اُن کا فیصلہ کیا جاتا تھا اُس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ سر ہنری لارنس نے اُس وقت اس کی طرف اشارہ کیا تھا جب اُس نے لکھا ''فوج کی ضرورتوں میں غالباً سب سے بڑی ضرورت ہے تنخواہ کا ایک سیدھا سادا ضابطہ جس میں ہر حال میں اور ہر شعبے کے تمام چھوٹی بڑی حیثیتوں کے سپاہیوں کی تنخواہ واضح انداز سے دکھائی جائے۔اس سلسلے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔اس وقت بہت سے شبہات پائے جاتے ہیں...... حالانکہ تنخواہ اور آڈٹ کے ضابطوں کی جلدیں موجود ہیں۔'' (78)

ظاہر ہے کہ اس بات پر سپاہیوں کو بڑا غصہ آتا تھا کہ کسی صوبے کی فتح اور الحاق کے بعد بھتہ ختم کر دیا جاتا تھا اور اُنہی سپاہیوں کو کم تنخواہیں دے کر اُن علاقوں میں رکھا جاتا تھا۔ غریب سپاہی کو محض 7 روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی جس میں سے وہ ساڑھے تین روپے کھانے پر صرف کر دیتا تھا اور دو سے ڈھائی روپے تک زندگی کی دوسری ضروریات پر خرچ کرتا تھا اور بڑی مشکل سے ایک یا ڈیڑھ روپیہ بچا پاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی تنخواہیں پانے والے سپاہیوں کو جو بات گھر سے دور جانے پر اکساتی تھی وہ تھا روپیہ بچانے کا خیال جو وہ اپنے خاندان کو بھیج سکے۔ لیکن یہ اُس کے لئے ممکن نہیں تھا۔

زمانہء امن میں اس قسم کی بے اطمینانی تو ہمیشہ موجود ہی رہتی تھی۔ اس میں اضافہ اُس وقت ہو گیا جب معاہدے کی شرائط کے خلاف ہندوستان کے باہر افغانستان اور برما لڑنے کے لئے اُنہیں بھیجنے کا غیر معقول فیصلہ کر کے انگریزوں نے برہمن اور راجپوت سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا۔ مسلمانوں کے درمیان رہنا اور اُن کا چھوا ہوا کھانا کھانا یا پانی پینا اُن کی روایات کے قطعی منافی تھا اور سمندر پار کرنا دھرم سے دست بردار ہونے کے مترادف تھا۔ ان میں سے کوئی بھی عمل کر کے وہ ذات باہر ہو جاتے تھے جو اُن کی سماجی زندگی کا کلیدی عنصر تھی۔

مالی دشواریوں اور مذہبی اشتعال کی بنا پر سپاہی کو انگریزوں کے متعلق پھیلائی جانے والی کہانیوں پر یقین آ گیا کہ وہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ سر ہنری لارنس نے لارڈ کیننگ کو رپورٹ میں کہا تھا کہ اودھ توپ خانے کے ایک جمعدار کو، جو اچھے کردار کا انسان ہے، یقین ہے کہ ''پچھلے دس سال سے حکومت مقامی باشندوں کو بالجبر بلکہ دھوکہ دے کر عیسائی بنانے کے کام میں مصروف ہے۔'' (79)

اس سے بھی زیادہ یہ کہ ''سفید فام'' افسروں کے برتاؤ پر، جن میں کمیشنڈ اور نان کمیشنڈ دونوں قسم کے افسر شامل تھے، بڑی ناراضگی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اس کا شاہد سیتا رام ہے جو کمپنی کی فوج میں صوبیدار تھا اور اُس وقت بھی کمپنی کا وفادار رہا جب اُس کا بیٹا بغاوت میں شامل ہو گیا۔ اُس نے کہا ''لیکن بہت سے (یورپی سارجنٹ) اپنا مافی الضمیر ظاہر نہیں کر سکتے تھے یا لوگوں کو اپنی بات نہیں سمجھا سکتے تھے اور اس قسم کے لوگ گالیاں دینے پر اتر آتے تھے اور سپاہیوں کو مارنے اور مکّے رسید کرنے میں بھی انہیں تامل نہیں ہوتا تھا۔ کئی دفعہ اڈجوٹنٹ سے شکائتیں کی گئیں لیکن اس

نے ہمیشہ سپاہی کے خلاف سرجنٹ کا ساتھ دیا اور شکایت دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔"(80)

کمیشنڈ افسروں کا برتاؤ بھی اس سے بہتر نہیں تھا۔ وہ سپاہیوں کو کمتر مخلوق سمجھتے تھے "اُسے برا بھلا کہا جاتا ہے۔ اُس کے ساتھ برا برتاؤ کیا جاتا ہے اُس کو 'حبشی' کہا جاتا ہے......نوجوان اس کو ایک اچھا مذاق، جوش کے اظہار کی شہادت اور سپاہی کے مقابلے میں قابل قدر احساس برتری سمجھتے ہیں کہ اُس کے ساتھ جانوروں سے بھی برا سلوک کیا جائے۔"(81)

لیفٹیننٹ کرنل ولیم ہنٹر کی شہادت اس کو ثابت کرتی ہے۔ یورپین نان کمیشنڈ افسروں کی بے ہودگی کے تعلق سے اُس نے کہا کہ مروجہ نظام "ہمیشہ انہیں (ہندوستانی افسروں کو) پس پشت رکھتا ہے اور نہ صرف رجمنٹ کا سب سے کم عمر اور ناتجربہ کار یورپین سیکنڈ لیفٹیننٹ اُن پر حکم چلاتا ہے بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ یورپین نان کمیشنڈ افسر بھی نہ صرف اُن پر حکم چلاتے ہیں بلکہ اکثر اوقات انہیں بغیر کسی وجہ کے نہایت فحش گالیاں بھی دیتے ہیں۔"(82)

اس نظام کے تحت یہ ممکن نہیں تھا کہ افسروں اور اُن کے سپاہیوں کے درمیان اچھے تعلقات پیدا کیے جاسکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ دونوں دو مختلف دنیاؤں کے باسی تھے۔ یورپین افسر ہندوستانی سپاہیوں اور ہندوستانی افسروں سے دور رہتا تھا۔ فرائض منصبی کے علاوہ اُن میں کوئی سماجی مراسم نہیں تھے۔ 1824ء میں فوج کی تنظیم نو کے بعد کمانڈنگ افسر کا سپاہیوں سے تعلق ٹوٹتا گیا۔ دخانی جہازوں کے رواج نے یورپ سے رشتہ رکھنے کے لئے زیادہ سہولتیں پیدا کر دیں جس کی بنا پر یورپی افسروں کا نقطہ نظر اور اُن کی دلچسپیاں بدل گئیں جوں جوں اپنی نسل کے مردوں اور عورتوں سے رسم و راہ پیدا کرنے کے مواقع بڑھتے گئے ویسے ویسے اپنی رجمنٹ، اپنے سپاہیوں اور اپنی ہندوستانی داشتاؤں سے اُس کا لگاؤ کم ہوتا گیا۔ اس کی وجہ سے بھی فوج کی کارکردگی متاثر ہوئی۔ نظم وضبط کم ہوگیا اور سپاہیوں کے دلوں میں افسروں کی عزت گھٹنے لگی۔

یورپین افسروں میں ڈسپلن کی کمی نے حالات کو بد سے بدتر بنا دیا۔ وہ لالچی، ناعاقبت اندیش اور فضول تھے اور کھلم کھلا الزام تراشی کرتے تھے۔ تنخواہ اور بھتے کے معاملے میں وہ حکومت کے احکامات کی خلاف ورزی بھی کرتے تھے۔ اس طریق عمل نے اُن کے خلاف جذبہ حقارت پیدا کر دیا اور سپاہیوں کے سامنے بری مثالیں رکھیں۔ افسر کے الفاظ اپنی قدر و قیمت کھو چکے تھے اور سپاہی اُن کے وعدوں پر یقین نہیں کرتے تھے۔ بار بار وعدے توڑے گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ

بنگال آدمی کے ایک ریٹائرڈ افسر کے مطابق ''ہندوستان کی تمام بغاوتیں، چاہے وہ بنگال میں ہوئی ہوں یا کہیں اور، خود ہماری پیدا کردہ ہیں یا کم از کم اُن کے لئے پہل ہم نے کی۔ عام طور سے یا تو معاہدے کی خلاف ورزی کی گئی یا مقامی سپاہیوں کے احساسات، صحت یا سہولت کا خیال نہیں کیا گیا۔''(83) اس کی مثالیں ہیں جاوا، ویلور، بارک پور، بنگال اور مدراس کی فوجوں میں 1842ء اور 1844ء میں ہونے والے ہنگامے اور پنجاب کی بغاوت 50-1849ء۔

کمپنی کی فوجوں کی ساخت

جہاں تک فوجوں کا تعلق تھا بنگال کمانڈ کی تمام تر چھاؤنیاں متاثر ہوئیں۔ کمپنی کی فوجوں میں، جن کی تنظیم تین کمانڈوں میں کی گئی تھی۔ بنگال کمانڈ سب سے بڑی تھی۔ اُس کا حلقہء اختیار ایک بڑے علاقے پر محیط تھا جو خلیج بنگال سے افغانستان کی سرحد تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ پورا علاقہ ایک کمانڈر انچیف کے تحت تھا جس کے ماتحت سات ڈویژنل کمانڈ تھیں۔ ہر ڈویژن کے تحت کئی اول اور دوسرے درجے کے برگیڈ تھے۔ جن کی کمانڈ برگیڈیر کرتے تھے۔

بنگال کمانڈ میں 1,10,000 پیدل، دس سے بارہ ہزار تک رسالہ اور تیس ہزار ہر قسم کے یورپی سپاہی تھے۔ ہندوستانی فوجوں میں آٹھویں سے دسویں حصے تک مسلمان تھے اور بقیہ سب ہندو تھے۔ (84)

ڈویژنل علاقوں میں سے ایک تھا بنگال۔ وہاں تین چھاؤنیاں کلکتے کے گرد اور تین چھوٹی چھاؤنیاں سرحدوں پر واقع تھیں تا کہ آسام اور مشرقی پہاڑیوں کے سرداروں پر نظر رکھی جا سکے۔ بارک پور، برہام پور اور ڈم ڈم کی بڑی چھاؤنیوں میں مجموعی اعتبار سے ہندوستانی پیدل فوج کی پانچ رجمنٹیں، بے ضابطہ رسالے کا ایک دستہ، ایک ہندوستانی توپ خانہ اور رائفلوں کا اسلحہ خانہ تھا جس کی حفاظت ایک چھوٹا سا دستہ کرتا تھا۔ چٹا گانگ، ڈھاکہ اور جلپیگری کی چھوٹی چھوٹی چھاؤنیوں میں فی الجملہ ہندوستانی پیدل فوج کی چھ کمپنیاں مقیم تھیں۔

دوسرا ڈویژنل علاقہ تھا بہار۔ اُس کا صدر مقام تھا دیناپور اس کے تحت سات چھاؤنیاں تھیں جن میں پانچ پیدل اور دو بے ضابطہ رسالے کی رجمنٹ، ایک یورپی بٹالین اور ایک یورپی توپ خانے کی بٹالین تھی۔ شمال مغربی صوبجات میں دو کمانڈ تھیں یعنی کانپور اور میرٹھ اور وہاں بیس سے

زیادہ چھاؤنیاں تھیں۔ وہاں کم سے کم دس رجمنٹ تھیں جن میں کئی بے ضابطہ رسالے، کچھ سکھ سپاہی اور کچھ توپ خانوں کی بٹالین اور اسلحہ سازی کے ڈپو تھے۔

آگے مغرب کی طرف فوجوں کا ارتکاز بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اُس علاقے کو تین کمانڈروں میں تقسیم کیا گیا تھا یعنی سرہند، لاہور اور پشاور جس میں تقریباً بیس فوجی مرکز تھے۔ ہندوستانی فوج میں تیس سے زیادہ پیدل رجمنٹ اور خاص بڑی تعداد میں رسالہ اور توپ خانہ تھا جس کی مجموعی تعداد تقریباً 65,000 تھی۔ زیادہ تر یورپی فوج پنجاب میں تھی۔ اُن چار بٹالینوں اور یورپی توپ خانوں کو چھوڑ کر جو کلکتہ اور دہلی کے درمیان مقیم تھے زیادہ تر یورپی فوج جس میں 15,000 سپاہیوں سے زیادہ تھے، پنجاب میں تھی۔ میرٹھ سے پشاور تک یورپی پیدل فوج کی نو رجمنٹ تھیں جن کے ساتھ گھوڑوں پر لے جائی جانے والی اور زمین پر لے جائی جانے والی توپوں کے کئی دستے تھے۔

وسطی ہند اور راجپوتانہ میں کمپنی کی ہندوستانی فوجوں کے کئی دستے کچھ بے ضابطہ رسالے، ہندوستانی توپ خانہ اور ہندوستانی والیان ریاست کی فوجیں تھیں۔ اُس علاقے میں تقریباً ایک درجن چھاؤنیاں تھیں۔ سب سے بڑی چھاؤنی تھی گوالیار۔ وہاں 8,000 سپاہیوں کا دستہ تھا، دو رسالے کی رجمنٹ تھیں، دس پیدل بٹالین تھیں اور توپ خانے کی چار کمپنیاں تھیں۔ جبل پور، مہو اور نگود میں ایک ایک رجمنٹ تھی اور دیولی، بیور، رنپورا اور کھرواڑا میں چھوٹی چھوٹی فوجی اکائیاں تھیں۔ اجمیر میں گولا بارود بنانے کا کارخانہ تھا۔ جہاں تک بنگال کی فوج کے مواصلات اور نقل و حمل کا تعلق تھا ریلوں کی عدم موجودگی میں آبی راستے استعمال کئے جاتے تھے۔ چونکہ شمالی ہندوستان کے لئے گنگا، جمنا اور دریائے سندھ اور کشتی رانی کے قابل اُن کی معاون ندیاں بڑی اہمیت رکھتی تھیں اس لئے چھاؤنیاں اور اسلحہ خانے اُن کے ساتھ ساتھ تعمیر کئے گئے تھے۔

بنگال کی فوج میں بالائی طبقوں سے تعلق رکھنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ لیکن بمبئی اور مدراس کی فوجوں میں ایسا نہیں تھا۔ بمبئی کی کمانڈ کے تحت، جس میں سندھ بھی شامل تھا، 23 چھاؤنیاں تھیں جہاں کچھ بلوچی فوجوں کے علاوہ 26,000 فوج مقیم تھی۔ اس فوج کا ایک تہائی حصہ شمال کے ہندوؤں اور مسلمانوں پر اور ایک تہائی مرہٹوں پر مشتمل تھا۔ بقیہ فوج نیچی ذاتوں پر مشتمل تھی جن میں زیادہ تر مہر تھے۔ اُونچے طبقوں سے تعلق رکھنے والے

مرہٹوں، برہمنوں، پرجوں اور سرسوتوں کو بھرتی نہیں کیا جاتا تھا۔

مدراس کی فوج کی بھرتی مقامی طور سے کی جاتی تھی اور اُس میں بہت سے قبیلوں اور ذاتوں سے تعلق رکھنے والے سپاہی تھے۔ چونکہ مدراس میں کوئی جنگجو طبقہ نہیں تھا اور برہمن سپاہی کا پیشہ اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے مدراس کی فوج بڑی حد تک نیچی ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ زیادہ تر مسلمان شمالی ہند کے تھے۔ مدراس اور بمبئی کی فوجوں میں ایک تہائی مسلمان تھے اور دو تہائی ہندو۔(85)

چربی لگے کارتوس

چربی لگے کارتوسوں نے بغاوت کرانے میں جو رول ادا کیا اُس کو ضرورت سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ڈم ڈم کے اسلحہ خانے کے کمانڈر میجر یونٹین نے اس امر کی شہادت دی ہے کہ حالانکہ چربی لگے کارتوس نے ہندوستانی سپاہیوں میں اشتعال پیدا کر دیا تھا لیکن جب اُس نے اُن سے پریڈ کروائی ''تو اُن میں سے کم سے کم ایک تہائی، جس میں ہندوستانی کمیشنڈ افسر تھے، فوراً آ گئے۔ انہوں نے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئی رائفلوں کے کارتوس بنانے کے طریقے پر واضح الفاظ میں اعتراضات کئے۔'' سپریم کونسل کے رکن جنرل لو نے اودھ کی بے ضابطہ پیدل فوج کے متعلق اپنی تحریر میں کہا تھا ''مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس رجمنٹ کے زیادہ تر سپاہیوں نے غالباً حکومت یا اپنے افسروں کے خلاف کسی بے اطمینانی یا بے وفائی کا اظہار کرنے کی خاطر ان کارتوسوں کو کاٹنے سے انکار نہیں کیا بلکہ انہیں واقعی اس امر کا خوف ہے...... کہ کارتوس کاٹنے کی وجہ سے اُن کی ذات خراب ہو جائے گی اور آئندہ اُن کے کردار کے لوگوں کی دلوں میں عزت باقی نہیں رہے گی۔''(86)

لیکن سپاہیوں کی شکایتوں میں سے چربی لگا کارتوس محض ایک بہانہ تھا۔ اس کو رواج دیئے جانے کی بنا پر اُس کے خطرات بڑھ گئے اور اشتعال میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے میں پائے جانے والے حالات میں ''بنگال کی فوج کا عمومی موقف تھا بغاوت۔''(87) اس کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا تھا؟ ہندوستانی سپاہی محض بھاڑے کا سپاہی تھا۔ فوج میں ملازمت کرنے کی جزوی وجہ تو تھی اُس کی ذات کی روایات اور جزوی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستانی فوجیں ناپید ہو چکی تھیں

جن میں اُسے روزگار ملتا تھا اور کمپنی اُسے تنخواہ اور پنشن کے علاوہ ایک ایسا پیشہ دیتی تھی جس کا وہ عادی تھا۔ کمپنی کی فوج کی فتوحات نے اُس کو خود پسند بنا دیا اور ابتدا کے زمانے میں اُس کے ساتھ برابری کا برتاؤ کیا جاتا تھا جس نے اُس میں ذاتی وفاداری اور باہمی اعتماد کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ لیکن نظام کی تبدیلی کے ساتھ حالات بھی خراب ہونے لگے اور یورپینوں اور ہندوستانیوں کے درمیان دوری پیدا ہوگئی۔

ہندوستانیوں کی عزت نفس مجروح ہوگئی۔ شاہی خاندانوں کی بے حرمتی ہوئی۔ امیروں کا اثر زائل ہوگیا۔ بدیسی طاقت نے لوگوں کو سرنگوں کر دیا۔ طاقت کے قدیم مراکز کھنڈر بنا دیئے گئے۔ قدیم طور طریقے ماند پڑ گئے۔ ایک دوسری نسل کے نئے انسان، جن کا مذہب، زبان اور تہذیب مختلف تھی، ملک کے باشندوں پر حکم چلانے لگے اور اُن کی توہین و تذلیل کرنے لگے۔ اس میں کیا تعجب کہ سول آبادی کے ساتھ سپاہی بھی غصے سے بھر گئے اور بدیسی حکمرانوں کے خلاف مسلح بغاوت کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ ملک میں بغاوت کے لئے حالات سازگار تھے۔

یہ قدرتی امر ہے کہ مفتوح لوگ بدیسی حکومت کو ناپسند کرتے ہیں۔ انگریز اس سے واقف تھے۔ سر جان شور نے یہ مسئلہ اس وقت اٹھایا جب اُس نے لکھا ''برطانوی نظام حکومت کے جو بھی فوائد ہوں لیکن بدیسی غلبے کی برائی اُن تمام فوائد پر پانی پھیر دیتی ہے۔'' میکالے نے کہا تھا ''سب سے بھاری ہوتا ہے اجنبی کا جوا۔'' فلسفی جان اسٹورٹ مل نے خیال ظاہر کیا تھا ''عام لوگوں کی حکومت بامعنی اور ایک حقیقت ہے۔ لیکن ایک قوم کی دوسری قوم پر حکومت کوئی وجود نہیں رکھتی۔ ایک قوم دوسری قوم کو محض خرگوشوں کا ایک جنگل تصور کر سکتی ہے یا اُسے ایک ایسا مخصوص علاقہ تصور کر سکتی ہے جہاں دولت کمائی جائے اور اپنی قوم کے لوگوں کے فائدے کے لئے اسے انسانی جانوروں کے فارم کے طور پر استعمال کیا جائے۔ لیکن اگر حکومت کا صحیح کام ہے اُن کی بھلائی جن پر وہ حکومت کرے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ وہ قوم براہ راست یہ خدمت سرانجام دے سکے۔''(88)

VI- بغاوت کی پیش رفت

چنانچہ دھماکہ ہوا اور پورا ملک تھرا گیا۔ اس کا اثر ہر علاقے میں محسوس کیا گیا۔ اتنے بڑے

پیمانے پر ہونے والی سیاسی شورش تاریخ ہند میں ایک نیا حادثہ تھی۔ پچھلے زمانوں میں فاتح آئے اور خاندانوں کا تختہ الٹ گیا لیکن فتنہ وفساد زندگی کی اوپر سطح تک محدود رہا۔ کسی فتح کے نتیجے میں ہونے والی سیاسی تبدیلی عموماً کسی ایک علاقے تک محدود رہتی تھی۔ اگر پنجاب میں شورش پھوٹ پڑتی تھی تو ملک کے دوسرے حصے اُس سے مامون ومحفوظ رہتے تھے جیسا کہ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے وقت ہوا۔ انگریزوں نے بنگال فتح کیا لیکن سراج الدولہ کے زوال نے لکھنو، دہلی، لاہور، حیدرآباد، پونا یا مدراس کو بالکل متاثر نہیں کیا۔ دوآبے میں جاٹوں اور پنجاب میں سکھوں کی بغاوت کی آواز بازگشت کہیں اور سنائی نہیں دی۔ اورنگ زیب کے خلاف مرہٹوں کی لڑائی ایک طاقت ور سلطنت کے خلاف طویل جدوجہد تھی لیکن مہاراشٹر کے باہر اُس کا شور مشکل سے کسی نے سنا ہوگا۔ انیسویں صدی کے نصف اول کی بغاوتیں شورشیں علیحدہ علیحدہ رونما ہونے والے حادثات تھے۔

لیکن 1857ء کی بغاوت ان سے بہت مختلف تھی۔ اس کی بنا پر ملک کے بڑے بڑے حصے نے بالواسطہ یا بلاواسطہ انداز سے انگریزی سرکار کی مزاحمت کی۔ بغاوت کی آگ بھڑکی اور اُس کے شعلے پورے ملک میں پھیل گئے۔ کچھ حصوں میں بغاوت نے خوں ریز جنگ کی شکل اختیار کی جس میں لاکھوں انسانوں نے حصہ لیا، دوسرے علاقوں میں مختلف مقامات پر مسلح بغاوتیں ہوئیں اور کچھ اور حصوں میں سول بدنظمی پھوٹ پڑی۔ لیکن ملک کا کوئی ایسا حصہ نہیں تھا جس نے حاکموں کو تشویش میں مبتلا نہ کیا ہو اور جہاں بغاوت کا خطرہ نہ پیدا ہوا ہو۔

بنگال سے پنجاب تک شمالی ہندوستان میں بغاوت پھوٹ پڑی تھی۔ دوسرے صدیوں میں حالانکہ وہاں کے خصوصی حالات نے بے چینی کو بغاوت کی شکل اختیار نہیں کرنے دی پھر بھی لوگ مطمئن نہیں تھے۔ جس طبقے نے بغاوت کی حمایت نہیں کی وہ تھا نیا متوسط طبقہ جس نے مغربی تعلیم پائی تھی۔ لیکن اُن کی تعداد کم تھی اور وہ پریسیڈنسی شہروں تک محدود تھے۔ اُن کے متعلق ٹرولین نے لکھا ہے ''انگریزوں کے گلے کاٹنے کے بجائے وہ اُن کے ساتھ گرنڈ جیوری اور مجسٹریٹوں کی عدالتوں میں بیٹھنا چاہتے تھے۔ پنجاب اور نیپال کی سیاست کے متعلق قیاس آرائی کرنے کے بجائے وہ مباحث اُن کی انجمنوں میں، جو انہوں نے قائم کرلی تھیں، انگریزی میں دادِ خطابت دے کر طباعت وآزادیٔ اظہار کے فوائد پر بحث ومباحثہ کیا کرتے تھے۔''(89)

چنانچہ تعلیم یافتہ بنگال نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا۔لیکن فوج نے بغاوت کی جو بالائی ہند سے تعلق رکھنے والے سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ بارک پور میں، جو کلکتہ سے 16 میل کی دوری پر واقع ہے، 29 مارچ 1857ء کو منگل پانڈے آگے بڑھا اور اُس نے اپنے ساتھیوں کو مذہب کے لئے ضرب لگانے کی دعوت دی۔ اُس کے بعد ہفتوں اور مہینوں میں کلکتہ میں بغاوت پھوٹ پڑنے کا بار بار خطرہ پیدا ہوا اور یورپین بہت دنوں تک اپنے کو غیر محفوظ سمجھتے رہے۔کلکتہ کے باہر کئی مقامات پر یا تو بغاوت ہوئی یا اُس کا خطرہ پیدا ہو گیا مثلاً بیر بھوم، بالکورا، جیسور، کرشن نگر، مالدا، ڈھاکہ، فرنڈ پور، باقر گنج، پتیرہ، سلہٹ، چٹا گانگ، کھاسی اور جینتیا کی پہاڑیاں۔

آسام

آسام میں 1832ء سے تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہیں تھیں۔ آسام کے آخری بادشاہ پریندر سنگھ کو اپنی سلطنت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ برطانوی حکومت کے بوجھ کے نتیجے میں لوگ پس رہے تھے جو اُن پر لادی گئی تھی۔ اُس وقت کے دیوانی متی رام دت نے 1853ء میں حکومت کو پیش کی جانے والی ایک یادداشت میں کہا تھا ''شاستروں میں لکھا ہے کہ حکمرانوں کو پاکبازی سے کام لینا چاہئے اور اُس کی خوشحالی پر نظر رکھتے ہوئے اپنی رعایا پر انصاف کے ساتھ حکومت کرنی چاہئے۔اس وقت اس پر عمل نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ اس کے برعکس کارروائی ہو رہی ہے۔اس قسم کے گناہوں اور لاپرواہیوں کا خمیازہ ایک سرحدی ریاست میں بھی بھگتنا پڑے گا'' اور سابق مقامی حکومت کی بحالی کا مطالبہ کیا۔لیکن مقامی حکام اور گورنر جنرل دونوں نے یہ اپیل خارج کر دی۔

جس وقت 1857ء کی بغاوت شروع ہوئی اُس وقت متی رام کلکتہ میں تھا۔ ناکامیوں نے اس کے دل میں غم وغصہ بھر دیا تھا اس لئے اُس نے باغیوں کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے قدیم امیروں کے خاندانوں کو خطوط لکھے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ 1857ء میں چاند کی آٹھویں تاریخ کو وہ بغاوت کریں گے اور آسام کے آخری تاجدار کے پوتے کندر پیسور سنگھ کو تخت پر بٹھا دیں گے۔

لیکن ایک پیغامبر کی بے احتیاطی کی بنا پر سازش کا علم حکومت کو ہو گیا جس نے اُس کو کچلنے

کے فوری اقدامات کیئے۔ کندر پیسور سنگھ کو اُس کے محل سے اور متی رام کو کلکتہ میں گرفتار کرلیا گیا۔ محبِ وطن عناصر کے لئے آسام کا کونا کونا چھان ڈالا گیا۔ متی رام اور پیالی بروا پر مقدمہ چلا اور اُن دونوں کو ایک ہی دن یعنی 26 فروری 1858ء کو پھانسی دی گئی۔ دوسروں کو مختلف مدتوں کی قید کی سزائیں دی گئیں اور دوبارہ آزادی حاصل کرنے کی آسامی امیروں کی کوشش ناکام بنادی گئی۔

اُڑیسہ میں حالات مختلف تھے۔ 1803ء میں اُس کے الحاق کے بعد دوتہائی اُڑیا زمیندار ختم کر دیئے گئے اور اُن کی جگہ بنگالی زمینداروں نے لے لی۔ کاشتکاروں کے طبقے کو بھی بہت نقصان پہنچا اور اُن میں سے پائکوں کو، جو اڑیسہ کے حکمرانوں کی کسانوں کی نیم فوجی تنظیموں میں شامل تھے، کمپنی کی حکومت کے چھوٹے حکام کچلنے لگے اور ان کا خون چوسنے لگے۔ چونکہ گم سور، باؤ اور انگل کے سردار انگریزوں کے اقتدارِ اعلیٰ کی مزاحمت کر رہے تھے اس لئے اڑیسہ میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک اور مظلوم عنصر تھا کھونڈ کا آدی واسی قبیلہ جو اُس علاقے میں آباد تھا۔

1857ء میں غیر مطمئن عناصر متحد ہو گئے اور ہنگامہ شروع ہو گیا۔ سمبل پور کے شہزادوں سرندر ساہی اور اُجل ساہی کو، جو ہزاری باغ جیل میں بند تھے، باغی سپاہیوں نے چھڑا لیا اور انہوں نے بغاوت کی قیادت سنبھال لی۔ بغاوت کا جھنڈا بلند کیا گیا اور انگریزی حکومت سے ٹکر لی گئی۔ سمبل پور کے آس پاس کا پورا علاقہ عارضی طور سے باغیوں کے ہاتھوں میں آ گیا۔ بالآخر 1862ء میں سرندر سنگھ نے خود کو انگریزوں کے سپرد کر دیا اور وہ جلاوطن کر دیا گیا۔ اُس وقت بھی مالکان اراضی اور کسانوں نے حکومت سے درخواست کی کہ اُسے گدّی پر بحال کر دیا جائے۔

پرلکی میدی کے زمیندار گنجم کے ایک آدی واسی قبیلے سواروں نے رادھا کرشن ڈنڈ سینا کی قیادت کی۔ کوتیہ کھونڈوں نے بھی بغاوت کی۔

چھوٹا ناگپور

چھوٹا ناگپور میں، جو اُس وقت بنگال کا حصہ تھا، پالاموں، ہزاری باغ، رانچی، سنگھ بھوم، مان بھوم اور سمبل پور کے ضلعوں میں بغاوتیں ہوئیں۔ حالات اتنے خراب ہو گئے کہ انگریز افسروں کو ''حملوں کو ناکام بنانے، چھوٹی موٹی شورشوں کو فروکرنے، حکومت کے دعویداروں کو کچلنے، مسلح لٹیروں کی سرکوبی کرنے، اُن مقامات کو دوبارہ حاصل کرنے جن پر اچانک قبضہ کرلیا گیا تھا اور

مظالم کا انتظام لینے کا دشوار کام کرنا پڑا۔''(90)

ان شورشوں میں حصہ لینے والے تھے آدی واسی قبیلے اور مالکان اراضی۔ باغی سپاہیوں اور غیر مطمئن زمینداروں کا مقصد تھا بابو کنور سنگھ کے ساتھ اشتراک عمل کرنا۔ پوراہٹ کے راجا کی قیادت میں سنگھ بھوم کے کونوں اور پالاموں کے چیرو اور کھیرواڑ قبیلوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی اور کئی مہینوں تک گوریلا جنگ جاری رکھی۔

شمالی ہندوستان

اُس وسیع میدان میں جو بنگال کی سرحد سے پنجاب تک پھیلا ہوا ہے بڑے پیمانے پر بغاوت ہوئی۔ جو لوگ اس کی وسعت کو کم کر کے پیش کرنے کی طرف مائل تھے اُنہیں بھی یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اُس علاقے میں بغاوت نے کم سے کم ایک عمومی تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اودھ، روہیل کھنڈ، بندیل کھنڈ، الٰہ آباد، آگرہ اور میرٹھ کی کمشنریوں اور مغربی بہار میں ''زیادہ تر لوگوں نے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی'' اور ''عام لوگوں اور سپاہیوں کی بغاوتیں قریب قریب ایک ہی وقت ہوئیں۔''(91)

ڈف نے ڈاکٹر ٹوپڈی کے نام اپنے خط مورخہ 10-دسمبر 1857ء میں بڑی صحت کے ساتھ اس کی نوعیت کو پیش کیا تھا۔ ''اس بات کی تصدیق ہر نیا حادثہ کرتا ہے کہ یہ بغاوت ایک ایسی بغاوت ہے جو کسی فوری وجہ کی بنا پر وجود میں نہیں آئی۔ یہ ایسی بغاوت ہے جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک غیر فطری صف میں لا کھڑا کیا ہے، ایسی بغاوت جس کو اودھ کی پوری آبادی ہوا دے رہی ہے اور جاری رکھے ہوئے ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ انداز سے جس سے ہمدردی اور جس کی حمایت آس پاس کے قریب قریب آدھے صوبے کر رہے ہیں۔''(92)

بہار

اس علاقے کے مشرقی حصے یعنی بہار میں بغاوت کی پہلی چنگاری سنتھال پرگنے میں واقع روہنی میں نظر آئی جہاں ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے افسروں پر حملہ کیا۔ جلد ہی پورے بہار میں بغاوت کی آگ پھیل گئی جہاں بے اطمینانی پہلے سے پائی جاتی تھی۔ گنگا پار کے شمال ضلعوں میں پورنیا سے چمپارن تک یہ چنگاریاں بھڑک کے شعلے بن گئیں۔ شاہ آباد، پٹنہ اور گیا کے اضلاع وہ

خاص خاص مرکز تھے جہاں بغاوت کا سب سے زیادہ اثر پڑا۔ جگدیش پور کے بابو کنور سنگھ اور اُن کی موت کے بعد اُن کے بھائی امر سنگھ نے باغی فوجوں کی قیادت کی۔ کچھ مدت کے لئے بہار کے حصوں میں برطانوی حکومت کی جگہ باغیوں نے لے لی۔

بغاوت شروع تو ہوئی تھی ہندوستانی فوج میں لیکن جلد ہی سول آبادی اُس کی لپیٹ میں آ گئی۔ ایک انگریز فوجی افسر نے لکھا تھا'' پہلے تو یہ محض فوجی بغاوت لگی لیکن جلد ہی اُس کی نوعیت بدل گئی اور اُس نے قومی بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ بہار کے راجپوت گاؤں میں اور بنارس، اعظم گڑھ، گورکھپور کے ضلعوں، پورے دوآبے میں جوالہ آباد، کانپور، میرٹھ اور آگرہ کمشنریوں پر مشتمل ہے ہماری حکومت ختم کر دی گئی اور ہمارے خلاف اعلان جنگ کیا گیا۔'' (93) پٹنہ ڈویژن کے کمشنر سیمولس نے بنگال کی حکومت کو لکھا کہ'' شاہ آباد میں اس تحریک نے ایک فوجی بغاوت کا وقار حاصل کر لیا ہے۔'' (94) ٹریلر نے حکومت کو اطلاع دی تھی کہ'' چھپرا کے مغرب کے ضلعوں میں لوگ کھلم کھلا بغاوت کر رہے ہیں۔'' (95)

بہار کے ہندو اور مسلمان شانے سے شانہ ملا کر لڑے 1845-46ء میں بھی وہ حکومت کے خلاف مشترکہ اقدام کر چکے تھے۔ جب 1857ء کی بغاوت شروع ہوئی تو انہوں نے اپنے مشترکہ محاذ کو برقرار رکھا۔ یہ اتحاد حکمرانوں کے مفاد کے منافی تھا اور وہ اُسے مسلمانوں کی سازش تصور کرتے تھے جو ہندوؤں کی شکایتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لیکن اُس میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ دونوں مذہبی فرقوں سے تعلق رکھنے والوں نے بہار اور ملک کے دوسرے حصوں میں تلوار اُٹھائی تھی۔ جہاں تک بہار کا تعلق ہے اس کی تصدیق پٹنہ کے کمشنر ٹیلر نے کی جو پہلے ہی مشورہ دے چکا تھا کہ پولیس کے پرانے دستوں کو برطرف کر دیا جائے اور نئے دستے کھڑے کئے جائیں'' جن میں کوئی راجپوت، برہمن یا مسلمان بھرتی نہ کیا جائے۔'' (96) بہار میں بغاوت کی عام نوعیت کے پیش نظر تمام شمالی اور جنوبی بہار میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

مولویوں اور پنڈتوں دونوں نے باغیوں کی ہمت افزائی کی۔ پٹنہ کمشنری میں پیر علی کی طرح کے مسلمان رہنماؤں نے شورش کو ہوا دی۔ راجپوت اور مسلمان زمیندار دونوں باغیوں کی صفوں میں شامل ہو گئے۔

صادق پور کے مولوی، جو نامدار خاں کے وارث تھے، نرہٹ کا زمیندار اور نوادا، جہان آباد،

راجگیر ،امرتھو،امانا وغیرہ کے ہندواور مسلم زمینداران سب نے اشتراک عمل کیا۔
بہار کے سرکردہ رہنما تھے ضلع شاہ آباد میں واقع جگدیش پور کے معمر بابو کنور سنگھ۔ وہ اس تحریک کے مرکزی کردار تھے۔ اُن کی بہادری، تنظیمی صلاحیت اور فوجی سوجھ بوجھ نے اُن کے دشمنوں کو بھی متاثر کیا۔ تمام گروہوں نے اُن کے ساتھ تعاون کیا چاہے وہ پیر علی، یوسف علی، امداد دین وغیرہ کی قیادت میں ہوں یا دہلی کے حامی یعنی علی کریم، وارث علی وغیرہ کی قیادت میں۔ جب دیناپور کے سپاہیوں نے بغاوت کی تو انہوں نے دہلی کے بادشاہ کے نعرے بلند کئے اور کنور سنگھ کو اپنا کمانڈر بنایا۔ کنور سنگھ کا مرکز تھا بہار اور وہاں سے انہوں نے ریوا، باندہ اور کالپی تک اپنی سرگرمیاں بڑھائیں اور کانپور کے ضلع میں انگریزوں کے خلاف لڑائی میں نانا صاحب کی امداد کی۔ کانپور سے وہ لکھنو گئے اور اُس کے بعد بہار واپس چلے گئے جہاں ایک معرکے کی جنگ کے بعد اپریل 1858ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

اتر پردیش

اتر پردیش میں (جو اُس زمانے میں صوبجات شمال۔ مغرب و اودھ کہلاتا تھا) بغاوت کا جذبہ سب سے زیادہ شدید تھا۔ یہ سپاہیوں کا وطن تھا اور وہ علاقہ تھا جسے مغل سلطنت کا دل کہنا چاہئے۔ یہاں ہندوؤں کے مقدس مقامات اور اُن کی قدیم اور وسطی تہذیب کے مشہور مرکز واقع تھے یعنی دہلی، آگرہ، لکھنو، متھرا، اجودھیا، پریاگ اور بنارس۔ یہ وہ شہر ہیں جن کے نام ناقابل فراموش یادوں کو جنم دیتے ہیں۔ اُن کے ناموں کے ساتھ ہندوستان کے لوگوں کے پرجوش عزائم اور عظیم کارنامے جڑے ہوئے ہیں۔ دہلی کا لال قلعہ ماضی کی عظمت اور شان و شوکت کی علامت تھا۔
اتر پردیش کی آٹھ کمشنریوں میں سے ہر ایک میں شورش پھوٹ پڑی تھی اور بہت سے علاقوں میں برطانوی حکومت ختم ہو گئی تھی۔ بے چینی اور ہلچل بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی لیکن 10- مئی 1857ء کو میرٹھ میں شروع ہونے والی بغاوت نے پورے صوبے میں عام شورش پھیلا دی۔ کچھ مقامات پر، جہاں کمپنی کی فوجیں نہیں تھیں، عام لوگوں نے پہل کی جبکہ دوسرے مقامات پر پہلے ہندوستانی سپاہیوں کی رجمنٹوں نے بغاوت کی اور اُس کے بعد عام لوگ اُس میں

شریک ہوگئے۔

سول آباد کے رہنما مالکان اراضی کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔صوبے کے مغربی حصوں میں گوجر، جاٹ اور رانگڑ پیش پیش تھے۔لیکن اس تحریک کے اہم حامی تھے راجپوت یعنی چوہان، بائی، بچکوئی، گوڑ، پنوار وغیرہ جو پورے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔روہیل کھنڈ کے روہیلے اور پورے صوبے کے مسلمان زمیندار اس میں شامل ہو گئے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ بغاوت کی روح رواں تھے۔شہروں اور دیہات میں لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے میں مولویوں اور پنڈتوں نے اہم رول ادا کیا جیسا کہ وہ بہار میں کرر ہے تھے۔

ہر جگہ باغیوں نے بڑی تعداد میں برطانوی حکومت کا مقابلہ کیا۔فوج کے سپاہیوں کے علاوہ دیسی حکمرانوں اور سرداروں کے بہت سے سپاہیوں اور زمینداروں کے عملوں نے بغاوت میں حصہ لیا۔محاصرہ کے دوران مٹکاف کے اندازے کے مطابق دہلی میں 40,000 سے لے کر 60,000 تک سپاہی موجود تھے۔کانپور میں نانا صاحب کے جھنڈے کے نیچے تقریباً 58,000 مجاہد جمع ہو گئے تھے جن میں سے تقریباً 20,000 سپاہی تھے۔خان بہادر خان کی کمان میں کئی ہزار راجپوت اور روہیلوں کی فوج تھی۔فیض آباد کے ضلعوں میں شنکر پور کے رانا بینی مادھو سنگھ کے 15,000 نجی سپاہی تھے اور تقریباً 85,000 باغی انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔گورکھپور کی کمشنری میں گجادھر سنگھ کی قیادت میں 51,000 باغیوں نے ترائی کے جنگلوں میں رہ کر حکومت کا مقابلہ کیا۔گورکھپور کے ناظم محمد حسن خاں کے ساتھ دس سے بارہ ہزار تک فوج تھی جن میں سے آدھے سپاہی تھے۔یہ بات مبالغے پر مبنی نہیں ہوگی اگر کہا جائے کہ لڑائی میں عملی حصہ لینے والوں کی تعداد پانچ لاکھ سے زیادہ تھی۔ظاہر ہے کہ پانچ لاکھ تعداد بڑی تعداد ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تمام ارکان اراضی بغاوت میں شامل نہیں ہوئے۔لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ زمینداروں کی خاصی تعداد نے اس جدوجہد میں حصہ لیا۔مثال کے طور پر گورکھپور کے میر محمد حسن اور سلطان پور کے مہدی حسن کے نام لئے جاسکتے ہیں جن کی سرگرمیوں نے بہت سے ہندو اور مسلمان غیر مطمئن سرداروں کو تحریک میں شامل ہونے پر آمادہ کر دیا۔بہرائچ، گونڈہ، پردا اور چندوسی وغیرہ میں خاص طور سے بہت بدامنی پھیل گئی۔ باندا میں ''ایک گاؤں بھی ایسا نہیں تھا جو کسی نہ کسی حد تک تحریک سے وابستہ نہ تھا۔''(97)

دہلی

میرٹھ میں 10- مئی 1857ء کو خطرے کی گھنٹی بجی، باغی فوجیں دہلی کی طرف بڑھیں اور بہادر شاہ سے انہوں نے درخواست کی کہ وہ ہندوستان کے شہنشاہ کی جائز حیثیت اختیار کریں۔ ابتدا میں وہ اس کے لئے تیار نہیں تھے لیکن شدید خطرات کے باوجود انہوں نے کانٹوں کا تاج پہن ہی لیا۔ اس کا فوری اثر ہوا۔ کمپنی کے دعوے بے نقاب ہو گئے۔(98) قانون اور اخلاق کی نظر میں کمپنی محض غاصب تھی۔ اُس نے اُس بادشاہ کے خلاف بغاوت کی تھی جس نے اُسے محصول کنندہ محاصل کے عہدہ پر مقرر کیا تھا یعنی بنگال کی دیوانی عطا کی تھی۔ اب کمپنی کے خلاف یہ الزام ثابت ہو چکا تھا کہ اُس نے اطاعت سے منہ موڑا اور مالک کے خلاف تشدد سے کام کیا۔ برطانوی حکومت کے خلاف اور اُس کو اکھاڑنے کے لئے ہر طرف ایک شورش پھیل گئی۔ اس کے اثرات اُن تمام چھاؤنیوں کے علاوہ، جہاں ہندوستانی سپاہی مقیم تھے، پورے ہندوستان کے بہت سے شہروں اور گاؤوں میں محسوس کئے گئے۔

شمالی ہندوستان کے وسطی علاقے میں اس بغاوت نے ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ پورے اُتر پردیش بشمول اودھ، بہار کے بہت سے ضلعوں، چھوٹا ناگپور، وسطی ہند، مالوا، بندیل کھنڈ اور صوبجات متوسط میں لوگوں نے تلوار اُٹھالی۔ ہر جگہ جنگ و جدل کا منظر دکھائی دینے لگا۔ لوگ غم و غصے کے جذبات سے مغلوب ہو گئے اور دردناک مظالم کئے گئے۔ دہلی وہ مرکز تھا جس کی طرف اس علاقے کے تمام لوگوں کی نظریں اٹھتی تھیں۔ بہادر شاہ کے تاج و تخت قبول کرنے کے بعد لوگوں کو ایک ایسا مرکز مل گیا جہاں برطانوی حکومت کو ختم کرنے کی کوشش کرنے والے جمع ہو گئے۔ سپاہیوں کی باغی رجمنٹوں کا اولین کام تھا دہلی کی طرف بڑھنا اور باغی رہنماؤں نے مغل شہنشاہ کی نیابت کا اعلان کر دیا۔

دہلی کا محاصرہ 11- مئی سے 20- ستمبر تک جاری رہا۔ انگریزوں نے 20- ستمبر کو شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس زمانے کے واقعات بہادری اور غداری، سول انتظام اور فوجی کارروائیوں کی بڑھتی ہوئی دشواریوں، خاص خاص مشیروں کے اختلافات اور کچھ رہنماؤں کی اٹل ثابت قدمی کی ملی جلی کہانیاں سناتے ہیں۔ اُن سب کے درمیان بہادر شاہ کی شخصیت تھی جو اتحاد اور شہر میں امن وامان

13- Tonvielle et Leganlt, I' insurrection de'l inde (مہدی حسن، بہادر شاہ دوم)(دہلی 1958ء)، تعارف، صفحہ 1

14- Proceedings of the trial of Bahadur Shah (Calcutta, 1899) صفحہ 145

15- Oxford History of India (1920ء کا ایڈیشن)، صفحہ 722

16- کے اینڈ ملیسن بحوالہ بالا، جلد 1، صفحات 452-453

17- Narative of Events attending the out track of disturbance Agra district in 1857-58 صفحہ 3

18- ٹرولین ۔ سے، On Education of the people of India، صفحہ 199

19- یہ وہ مشہور اشتہار ہے جو پہلے اعظم گڑھ میں شائع ہوا تھا اور اس کے بعد خفیہ طور سے دہلی گزٹ مورخہ 29- ستمبر 1857ء میں شائع کیا گیا تھا۔ بال، محولہ بالا، صفحات 630 اور بعد کے صفحات۔

20- ان میں تین خط چندرنگر کے گورنروں کے توسط سے بھیجے گئے تھے اور ایک براہ راست ''ملک معظم نپولین بہادر شاہ شاہان، امیر الامرا'' کے نام بھیجا گیا تھا۔ اُن پر نانا صاحب کے ایجنٹوں درگا پرشاد اور بھگوان پرشاد کے دستخط تھے۔ 28- اپریل اور 30- مئی 1958ء کو روانہ کئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے ''انگریزی حکومت کی انتہائی ناانصافی کے شکار، جسے عہد و پیاں توڑنے میں پس و پیش نہیں ہوتا ہے، ہم چند دیگر میں پناہ لینے کا ارادہ رکھتے تھے۔'' یہ خطوط اس وقت آرکائیوز ڈونسٹریس دس افیسرس ارٹربجیرز، پیرس کی تحویل میں ہیں۔ ہندوستان کے نیشنل آرکائیوز نے اُن کی تصویری نقلیں (فوٹو اسٹیٹس) حاصل کر لی ہیں۔

21- اُس کے الفاظ ہیں۔

"Les actos d'injustec at de perjure du ganut Anglois brillent partout comme Les rayons du solil".

22- Foreign Consultation. No. 63-69, 25th June 1958

-23 ڈف، The Indian Rebellion (London, 1858)، صفحات 132-133

-24 رسل۔ڈبلیو۔ایچ، My Diary in India (London, 1860)، جلد II، صفحہ 51

-25 ویلزلی کا خط شاہ عالم کے نام، 27-جولائی 1902ء، Wellesley's Corespondence، جلد III، صفحہ 233

-26 اسپیر، پرسیول، Twilight of the Mughals (conbridge, 1951)، صفحہ 35

-27 کورٹ آف ڈائریکٹرز کا سیاسی خط، مورخہ 4- ستمبر 1811ء پیرا 199، اپیر، محولہ بالا، صفحہ 44

-28 اقتباس، ارون، ایچ۔سی۔ The Garden of India (London 1880)، صفحہ 113

-29 ایضاً، صفحہ 114

-30 ایضاً، صفحہ 134

-31 دیکھئے باسو، میجر۔بی۔ڈی۔ Rise of The Christian Power in India (Calcutta)، صفحہ 946

-32 ارون محولہ، صفحہ 134

-33 کے اور ملیسن، محولہ بالا، صفحہ 110

-34 لارڈ ڈلہوزی کا اعلان جو 13-فروری 1852ء کو جاری کیا گیا، فارسٹر جے۔ڈبلیو۔ Selection from Letters, Dispachs and other State Papers of the Govt. of India, 1857-58 (Calcutta-Vol.II) P.1.

-35 Foreign secret consultation, no.564, 18th december, 1857

-36 ایضاً

-37 کے اور ملیسن، محولہ بالا، جلد 1، صفحہ 78

-38 ڈزرائلی کی تقریر 27-1857ء، Hansords Parlimentary Debates، 454

-39 نیپر۔سر۔ڈبلیو۔ The life & opinions of Genral Sir Charles

ے خواہش مند تھے۔ اور محاصرہ ختم کرنے کے لئے زوردار اقدامات کے خواہاں۔ سرکاری فرائض پورے کرنے اور تمام سول اور فوجی معاملات میں فیصلے کرنے کی غرض سے ایک کونسل مقرر کی گئی تھی۔ یہ کونسل فوج اور سول حکام کے نمائندوں پر مشتمل تھی۔

ابتداء میں فوج کی قیادت مغل شہزادے کر رہے تھے لیکن جولائی کے شروع میں جب بخت خاں بریلی سے دہلی آ گئے تو اعلیٰ کمان اُن کے سپرد کر دی گئی۔ لیکن یہ لڑائی دو غیر مساوی فریقین کی لڑائی تھی۔ ایک طرف ایک منظم طاقت تھی جس کے وسائل روز بروز بڑھ رہے تھے۔ دوسری طرف وہ فوج تھی جو شہر کے حدود میں محصور تھی، جس کے سپاہی اور افسر ناتجربہ کار تھے۔ اور جنگی وسائل دن بدن کم ہوتے جا رہے تھے۔ ان تمام دشواریوں کے باوجود دہلی نے سخت مقابلہ کیا اور محاصرہ کرنے والی فوج پر بار بار حملے کئے۔ ایک وقت تو دہلی والوں نے خود محاصرہ کرنے والوں کو محصور کر لیا تھا۔ لیکن پنجاب سے آنے والی بڑی کمک نے پانسہ پلٹ دیا اور دہلی کو اطاعت قبول کرنی پڑی۔

آس پاس کے ضلعوں کی قسمت دہلی سے جڑی ہوئی تھی۔ گوڑگاؤں کے ضلع میں وہاں کے سرداروں اور عام لوگوں نے شہنشاہ کا ساتھ دیا۔ دہلی کی ہمدردی میں حصار اور روہتک میں بھی بغاوت پھوٹ پڑی اور اُن کا بھی وہی حشر ہوا جو دہلی کا ہوا۔

دہلی کے باہر ہونے والی بغاوتیں

دہلی میں بغاوت کے جو شعلے بھڑکے تھے انہوں نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پہلے وہ دہلی کے آس پاس کے ضلعوں میں پھیلی۔ سردھنہ اور باغپت میں 11- اور 12- مئی کو بغاوتیں ہوئیں۔ رڑکی 13- مئی کو آزاد کرا لیا گیا اور 26- مئی کو بلند شہر میں ایک مغل گورنر مقرر کیا گیا۔ مظفر نگر میں 14- مئی کو، علی گڑھ میں 20- مئی کو اور سہارن پور میں 30- جون کو بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ اس طرح صوبے کی زیادہ تر مغربی کمشنریوں میں شورش پھیل گئی۔ روہیل کھنڈ میں بغاوت مئی میں شروع ہوئی اور خان بہادر نے 31- مئی کو انتظام سنبھال لیا۔ بریلی کے بعد رام پور، مراد آباد، امروہہ، بجنور، بدایوں اور شاہجہاں پور میں بغاوتیں ہوئیں۔ فرخ آباد میں سپاہیوں نے نواب تفضّل حسین خاں کی اطاعت قبول کر لی اور فتح گڑھ اور سیتاپور بھی اُن کے زیرِ نگیں آ گئے۔

آ گرہ

آ گرہ کمشنری آ گرہ، متھرا، مین پوری اور اٹاوہ کے اضلاع پر مشتمل تھی۔ آ گرہ صوبے کا صدر مقام تھا اور لیفٹیننٹ گورنر وہاں رہتا تھا۔ دہلی سے بغاوت کی خبر آنے کے فوراً بعد وہاں بھی طوفان کے آثار نظر آنے لگے۔ علی گڑھ اور بلند شہر کے واقعات نے 23- مئی کو مین پوری میں اور 20- مئی کو اٹاوہ میں بغاوت شروع کر دی اور جلد ہی باغیوں کا آ گرے پر قبضہ ہو گیا۔ بھرت پور کی فوج نے جولائی کے شروع میں بغاوت کر دی۔ باغیوں نے آ گرے کے قریب ساسیاہ کے مقام پر انگریزی فوجوں کو 8- جولائی کو شکست دی اور لیفٹیننٹ گورنر اور آ گرے میں رہنے والے انگریزوں نے قلعہ میں پناہ لی۔ مئی کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہاتھرس، متھرا اور دوسرے قریبی اضلاع میں بغاوت شروع ہو چکی تھی۔

الہ آباد کی کمشنریوں میں بغاوت پہلے ہی شروع ہو چکی تھی اور یہاں دونوں فریق کچھ انتہائی نفرت انگیز کارروائیوں کے مرتکب ہوئے۔ لیکن جلد ہی جب مولوی لیاقت علی نے فوجی قیادت سنبھال لی تو پورے کے پورے دیہی علاقے میں شورش پھوٹ پڑی۔

''اس شخص نے، جو ذات کے اعتبار سے بنکر اور پیشے کے اعتبار سے مدرس تھا، گاؤں میں اپنے انتہائی تقدس کی بنا پر عزت حاصل کر لی، بغاوت شروع ہونے کے بعد پرگنہ چائل کے زمینداروں نے اُن کی قیادت قبول کر لی اور اُن کی سربراہی میں شہر کی طرف بڑھے۔ وہاں انہیں دہلی کے بادشاہ کی طرف ضلع کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔''(99) فتح پور، باندا اور ہمیر پور بھی جلد ہی بغاوت میں شامل ہو گئے۔

کانپور

لیکن کانپور میں، جو کمپنی کی فوجی حلقے کا صدر مقام تھا، دل دہلا دینے والے نفرت انگیز واقعات رونما ہوئے۔ سپاہیوں میں 14- مئی سے ہیجان واشتعال پایا جاتا تھا اور وہ اپنے بال بچوں کو واپس گھروں کو بھیج رہے تھے۔ خیال تھا کہ 24- مئی کو بغاوت شروع ہو گی جو عید کا دن تھا۔ لیکن حقیقت میں بغاوت 4- جون کو شروع ہوئی۔ باغیوں نے خزانہ چھین لیا، جیل کا پھاٹک کھول دیا، اسلحہ خانے اور سرکاری دفاتر پر قبضہ کر لیا اور دہلی کی طرف کوچ کر دیا۔ نانا صاحب کو رہنما چنا گیا

اور عظیم اللہ کو اُن کا مشیر خاص مقرر کیا گیا۔ ابھی وہ کلیان پور تک ہی پہنچے تھے کہ پروگرام تبدیل ہو گیا اور کانپور کو واپسی کا حکم دیا گیا۔ باغیوں نے ویلر کے کیمپ پر حملہ کیا اور تین ہفتے کے محاصرے کے بعد انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ نانا صاحب کو پیشوا بنا دیا گیا۔

جھانسی

بندیل کھنڈ مرہٹہ سلطنت کا حصہ رہ چکا تھا۔ اس میں جھانسی اور باندا شامل تھے جن پر مرہٹہ والیان ریاست حکومت کرتے تھے۔ جھانسی کے گنگا دھر راؤ کا انتقال 1854ء میں ہوا۔ اُس نے کوئی وارث نہیں چھوڑا۔ ڈلہوزی نے 1817ء کے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اُس ریاست کا الحاق کر لیا۔ بیوہ رانی لکشمی بائی کی کوششیں بے اثر ثابت ہوئیں۔ اُس وقت اور زیادہ تلخی پیدا ہوگئی جب مندروں کی معافیاں ختم کر دی گئیں۔ مایوسی نے جان پر کھیل جانے کی دعوت دی۔ رانی کے ایک ملازم برہمن لکشمن راؤ نے سپاہیوں کو بھڑکایا جنہوں نے 4- جون کو مقامی افسروں کی حکم عدولی شروع کر دی اور تشدد اور قتل و غارت پر اتر آئے۔ رانی کو ریاست کا والی مقرر کیا گیا۔ انہوں نے بڑی بے جگری کے ساتھ باغیوں کی قیادت کی، بہادری کے ساتھ انگریزی فوجوں کے خلاف لڑیں اور میدان جنگ میں ایک سپاہی کی طرح شہید ہوئیں۔

باندہ کے نواب نے بھی، جو پیشوا خاندان کا ایک رکن تھا، باغیوں کا ساتھ دیا اور اپنی ریاست کھو دی۔

بنارس

شمال مغربی صوبجات کی مشرق کی طرف آخری کمشنری تھی بنارس۔ وہ شہر صرف ہندوؤں کا مقدس مقام اور مہاراجا کا مستقر ہی نہیں تھا بلکہ دہلی کے شاہی خاندان کے کچھ افراد بھی وہاں رہتے تھے۔ مئی کے شروع میں انگریز افسروں نے چنار جانے کا منصوبہ بنا لیا تھا چونکہ وہاں بدامنی نہیں پھیلی تھی اس لئے یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ لیکن 21- مئی کو وہاں بغاوت پھوٹ پڑی۔ سپاہیوں سے 4- جون کو اسلحہ واپس لے لئے گئے جس کی وجہ سے فوراً بغاوت شروع ہوگئی۔ مارشل لاء نافذ کر دیا گیا لیکن دیہی علاقے باغیوں کے ہاتھوں میں رہے۔ ''دیہاتی سماج کی سطح پر وہ عظیم تحریک ابھرنے لگی جس نے وہیں جنم لیا تھا۔''(100)

اعظم گڑھ میں شعلے پہلے ہی سے بھڑک رہے تھے جونپور میں 5- جون کو بغاوت پھوٹ پڑی اور لدھیانہ کی سکھ رجمنٹ نے اُس میں حصہ لیا۔ گورکھپور میں 6- جون کو سپاہیوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ دوسرے دن قیدیوں نے جیل کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور سپاہیوں نے خزانے پر قبضہ کرنے کا منصوبہ ناکام بنا دیا گیا اور اُنہیں ہتھیار ڈالنے پڑے پھر بھی ضلع میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غازی پور میں شورش پھوٹ پڑی تھی اور سنگھاہی میں سپاہی بغاوت کر چکے تھے۔ اگست کے شروع میں حالات نے بدتر شکل اختیار کر لی اور انگریزوں کو گورکھپور سے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اُس کے بعد کنور سنگھ کی طوفانی مہم کے نتیجے میں انگریزوں کو اعظم گڑھ سے بھی ہٹنا پڑا۔

اودھ اور لکھنو کا محاصرہ

الحاق کے بعد برطانوی حکام لوٹ کھسوٹ کی بنا پر اودھ بڑے دکھوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اُن کے خلاف یہ الزام لگائے گئے تھے کہ ''انہوں نے لکھنو کے شاہانہ محلوں کو اصطبلوں اور کتے خانوں میں تبدیل کر دیا، یہ کہ بادشاہ کہ مصاحبوں کی نازک اندام بیٹیوں کے بے گھر اور بے سہارا بنا دیا، یہ کہ خزانوں کے قفل توڑ کر اُنہیں لوٹ لیا گیا، یہ کہ شاہی خاندان کے نجی املاک کو نیلام کر دیا گیا اور یہ کہ بہت سی ایسی باتیں کی گئیں جو صرف بادشاہ کی رعایا کے لئے توہین آمیز ہیں بلکہ خود میرے لئے شرمناک تر ہیں۔'' (101)

ان الزامات کی تحقیقات کرانے کی کیننگ کی کوششوں کو لکھنو میں مقیم اس کے نمائندے نے ناکام بنا دیا۔ اس کی وجہ سے بے اطمینانی اور بڑھ گئی۔

واجد علی شاہ کی معزولی اور جلاوطنی نے لوگوں میں سخت غم وغصہ پیدا کر دیا تھا۔ ایسے لوگوں کی کمی بھی نہیں تھی جو حالات سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اُن میں سے ایک تھے مولوی احمد اللہ شاہ جنہوں نے 1856-57ء کے موسم سرما میں شمالی صوبوں کا دورہ کیا اور لوگوں کو جہاد کے لئے تیار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے لکھنو اور اودھ کے دوسرے اضلاع میں بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کیں۔ نانا صاحب کے ساتھ عظیم اللہ بھی لکھنو گئے۔

اپریل کی 3- تاریخ کو حکم عدولی کے آثار نظر آنے لگے اور بغاوت کی تیاری ہونے لگی لیکن

سپاہیوں سے اسلحہ واپس لے لئے گئے۔ نانا صاحب اور عظیم اللہ نے اودھ کے دوسرے اضلاع کا بھی دورہ کیا۔ دہلی سے آنے والی خبروں نے انگریزوں کو خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ انہوں نے فوراً ضروری حفاظتی انتظامات کئے۔ لیکن مئی کے آخری ہفتے میں طوفان پھوٹ پڑا اور 30- تاریخ کو سپاہیوں کی بغاوت شروع ہوگئی۔ شعلوں نے لکھنو کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جلد ہی سیتا پور (30- جون)، محمدی (4- جون)، لکھیم پور کھیری (4- جون)، فیض آباد (5- جون)، بہرائچ (9- جون)، سلطان پور (9- جون) اور گونڈا (10- جون) تک پھیل گئے۔ چنانچہ مہینہ ختم ہونے سے پہلے اودھ میں ایک ضلع بھی ایسا نہیں تھا جو باغیوں کے قبضے میں نہ آ گیا ہو۔

لکھنو میں واجد علی شاہ کے گیارہ سالہ بیٹے برجیس قدر کو اُن کی ماں حضرت محل کی ولایت میں ولی مقرر کیا گیا۔ انتظام ایک کمیٹی کے سپرد تھا جو ہندو اور مسلمان مشیروں پر مشتمل تھی۔ انہیں معلوم ہوا کہ انگریزوں نے ریزیڈنسی کی قلعہ بندی کر لی ہے اور وہاں وہ کمک کے آنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ انقلابیوں کی حکمت عملی کا تقاضہ تھا کہ انگریز فوج کو لکھنو میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اور محصور دستے تک غذائی اجناس نہ پہنچنے دی جائیں تا کہ فاقوں کی تاب نہ لا کر وہ ہتھیار ڈال دیں۔ ریزیڈنسی کے لئے جنگ جون 1857ء کے وسط سے شروع ہوئی اور فریقین کی ہار جیت کے ساتھ 21- مارچ 1858ء تک جاری رہی بالآخر انگریزی فوج نے لکھنو پر قبضہ کر لیا۔ مولوی احمد اللہ شاہ آخری دم تک بہادری کے ساتھ لڑتے رہے۔ حضرت محل ہاتھی پر بیٹھ کر میدان جنگ میں اپنی فوج کی ہمت بڑھاتی تھیں۔ جب لکھنو ہاتھ سے نکل گیا تو مولوی احمد اللہ شاہ نے گوریلا جنگ شروع کی۔ روہیل کھنڈ میں داد شجاعت دیتے تھے اور کبھی اودھ میں۔ لیکن جب انہوں نے محمدی کو اپنا مستقر بنا لیا تو پودبن کے راجہ نے اُن سے غداری کی اور انہیں قتل کر دیا۔ حضرت محل نے سپر انداز ہونے سے انکار کر دیا اور اپنا پیچھا کرنے والی انگریزی فوج سے لڑتی ہوئی نیپال چلی گئیں۔

فیض آباد میں، جو اُس زمانے میں لکھنو کے بعد سب سے اہم شہر سمجھا جاتا تھا، نیٹو انفینٹری کا گھوڑوں سے لیجانے والا توپ خانہ بھی تھا۔ اس چھاؤنی میں بغاوت شروع ہوگئی۔ اعظم گڑھ اور بنارس کے انقلابی اُن سے آ کر مل گئے اور تعلقداروں نے اُن کی حمایت کی مولوی احمد اللہ شاہ نے اس تحریک میں جان ڈال دی۔ بڑے دشوار حالات میں باغی بہادری کے ساتھ لڑے لیکن لکھنو پر

انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد اُن کی مزاحمت ختم ہو گئی۔

قصہ مختصر جب بغاوت شروع ہوئی تو انگریزی حکومت قریب قریب مفلوج ہو کر رہ گئی۔ پورے دوآبے میں اُن کا اقتدار ختم ہو گیا۔ لیکن بدقسمتی سے بغاوت کے رہنماؤں میں آپسی تعاون کی کمی اور پورے صوبے کے لئے یکساں نظم حکومت قائم کرنے کی عدم صلاحیت نے اُن کے انقلابی جوش کو بار آور ہونے سے محروم رکھا۔

گنگا کی وادی کے باہر اور مغرب کی طرف کئی مقامات پر انگریزوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

پنجاب

میرٹھ میں 10- مئی کو بغاوت شروع ہونے، سپاہیوں کے 11- مئی کو دہلی کی طرف بڑھنے اور بہادر شاہ کے آزاد اختیارات سنبھال لینے کی بنا پر جلد ہی پنجاب میں ایک بڑا بحران شروع ہو گیا۔ انگریزی سلطنت میں پنجاب کا حال ہی میں الحاق ہوا تھا اور یہ بتانا مشکل تھا کہ سکھ سرداروں اور برطرف شدہ سکھ سپاہیوں کا ردعمل کیا ہوگا۔ افغانوں کا رویہ بھی انگریزوں کے لئے بڑی پریشانی کا باعث تھا۔ سکھ سلطنت ختم ہونے کے بعد پشاور اور سرحدی علاقہ، جو رنجیت سنگھ نے افغانوں سے چھین لیا تھا، انگریزوں کے زیر نگیں آ گیا۔ خیال تھا کہ افغان ممکن ہے کہ انگریزوں کی دشواریوں سے فائدہ اٹھا کر کھویا ہوا علاقہ پھر حاصل کرنا چاہیں۔ رائے بریلی کے بعد سید احمد نے جہاد کی جو تحریک چلائی تھی اُس کی چنگاریاں پوری طرح ٹھنڈی نہیں ہوئی تھیں اور انہیں ہوا دے کر آسانی سے شعلوں میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ قبائل میں سرکش عناصر موجود تھے مثلاً مغرب کی طرف رانگر اور صوبے کے مشرقی حصوں میں پہاڑی لوگ، حصار، ریواڑی اور گوڑگاؤں کے لوگ دشمنی پر آمادہ تھے۔

بالائی صوبوں میں بغاوت میں ہندوستانی سپاہیوں کی رجمنٹیں پیش پیش تھیں۔ پنجاب میں بھی بہت سی رجمنٹیں موجود تھیں۔ وہ رجمنٹیں اُن بہادر سپاہیوں پر مشتمل تھیں جنھوں نے کئی لڑائیوں میں داد شجاعت دی تھی۔ لیکن انگریزوں کو شبہ تھا کہ وہ بغاوت کے اُن منصوبوں سے ہمدردی رکھتے ہیں جو پک رہے تھے۔

چنانچہ پنجاب میں صورت حال بہت نازک تھی۔ لیکن ستلج کے اس طرف کی ریاستوں کے سکھ سرداراور مغربی اضلاع کے مسلمانوں نے بھی بڑی ثابت قدمی کے ساتھ انگریزوں کی مدد کی۔ کشمیر کے مہاراجہ گلاب سنگھ کو ''جھانسا دیکر اطلاعت پر آمادہ'' کرلیا گیا تھا اور پنجاب میں انگریزوں کی قسمت کا فیصلہ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ پرانے سکھ امراء کو مکمل شکست نے سراسیمہ کر دیا تھا اور وہ تیزی کے ساتھ ختم ہو رہے تھے۔ پنجاب میں بڑے بڑے مالکان اراضی نہیں تھے اس لئے کہ ''مسلم سلطنت'' پٹھان فاتحین اور بعد میں سکھ حکمرانوں نے مقامی سرداروں کو اُس قسم کے اختیارات سے کبھی نہیں نوازا جیسے اودھ کے تعلقداروں یا بنگال کے زمینداروں کو حاصل تھے اور اس لئے وہ کبھی مالکان اراضی کی حیثیت حاصل نہیں کر سکے۔'' (102) برطرف شدہ سکھ سپاہی قیادت سے محروم تھے اور امداد کے لئے اُن کی درخواستوں کا پنجاب کے سرداروں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ زمانہء امن میں قابل برطانوی افسروں کے ایک گروہ نے لوگوں کی دشمنی کو برطانوی حکومت کی مدح وستائش میں تبدیل کر دیا تھا۔ اُنہوں نے بہ نظر احتیاط لوگوں کو غیر مسلح بھی کر دیا تھا۔

جہاں تک افغانوں کا تعلق تھا اُن کے حکمران دوست محمد کی حمایت دولت کے زور پر حاصل کر لی گئی تھی۔ اُس کے لئے ''انگریز قوم کی نفرت کے مقابلے میں انگریزوں کی دولت کا پیار زیادہ اہم تھا۔'' (103)

اس کے علاوہ اگرچہ ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد بہت تھی پھر بھی یورپین پیدل فوج، رسالہ اور توپ خانہ کا تناسب بھی خاصا تھا۔ کُل 59,656 سپاہیوں میں سے، جو اُس صوبے میں مقیم تھے، ہندوستانی اور پنجابی (زیادہ تر باضابطہ) تھے 35,900 پنجابی (بے ضابطہ) 13,430 اور یورپین 10,336 علاوہ ازیں فوجی پولیس کے سپاہیوں کی تعداد تقریباً 9,000 تھی۔ ہندوستانی باضابطہ سپاہیوں میں کچھ پنجابی تھے۔ زیادہ تر یورپین فوج یا تو شملہ اور انبالہ یا پشاور کی وادی میں تھی۔

لیکن جس بات سے انگریزوں کو سب سے زیادہ فائدہ ہوا وہ یہ تھی کہ ہندوستانی انقلابیوں کے سامنے نہ تو کوئی واضح مقصد تھا اور نہ اُن میں اتفاق رائے تھا۔ انگریز افسروں نے جو خط پکڑے تھے اُن سے انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ''بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ بغاوت کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔'' (104) چنانچہ میرٹھ میں 10- مئی کو بغاوت ہونے کی خبر سنتے ہی انہوں نے بڑے جوش اور عزم کے ساتھ کارروائی شروع کردی۔ دوسرے دن انہوں نے پوری کی پوری ہندوستانی فوج

کو، جو دو پیدل رجمنٹوں اور ہلکے رسالے کے دو دستوں پر مشتمل تھی، پریڈ کے میدان میں حاضر ہونے کا حکم دیا اور اُن سے اسلحہ واپس لے لیے۔ لاہور بچ گیا اور دوسروں کے لئے ایک مثال قائم کر دی گئی۔

دوسری طرف پنجاب کے باغی رہنما تاج الدین (105) نے 29- مئی 1857ء کو شہنشاہ بہادر شاہ کو جو عرضداشت بھیجی تھی اُس کا جواب نہیں دیا گیا۔ اُس نے اپنے خط میں 10- مئی کے بعد پنجاب کے حالات کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ تمام ہندوستانی سپاہی باغیوں سے ملنے کی خواہش مند ہیں۔ یہ کہ پنجاب کے سردار مذبذب ہیں اور یہ کہ گرمی کے موسم نے انگریزوں کے لئے لڑائی کی سنتقان برداشت کرنا مشکل بنا دیا ہے۔ اُسے اس امر کا یقین تھا کہ اگر ایک باصلاحیت افسر کی کمان میں پانچ چھ ہزار سپاہی بھیج دیئے جائیں تو پورے پنجاب سے، بشمول پشاور، انگریزوں کو نکالا جا سکتا ہے۔

لاہور میں انگریز حکام کے جرأت مندانہ طریق عمل کی تقلید دوسرے فوجی مراکز میں بھی کی گئی یعنی جھیلم، سیالکوٹ، امرتسر اور گورداس پور خلعت علزئی کی رجمنٹ کے ہندوستانی سپاہیوں کے علاوہ تما دوسری چھاؤنیوں سے اسلحہ واپس لے لئے گئے اور اُنہیں برطرف کر دیا گیا۔ انگریزی پیدل فوج کی رائفلوں اور اُن کے توپ خانوں کی توپوں کے پیش نظر اسلحہ واپس کرنے کے حکم سے سرتابی ممکن نہیں تھی۔ لیکن یہ کام آسانی سے نہیں ہوا۔

نویں بے ضابطہ رسالے میں بغاوت ہوئی۔ یہ وہ رجمنٹ تھی جس نے افغانستان میں بڑے کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ اس کو اس قدر قابل اعتماد سمجھا گیا کہ دہلی کے خلاف لڑنے کے لئے اُسے بھیجا گیا۔ لیکن جلد ہی یہ معلوم ہوا کہ وہ ہندوستانیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں اس لئے اُنہیں پنجاب واپس جانے کا حکم دیا گیا۔ جب وہ کالا باغ پہنچے تو انہوں نے بغاوت کر دی۔ اُن کا رہنما وزیر خاں ''رجمنٹ کا سب سے پُرانا ممتاز رسالدار تھا'' جھنگ کے مقابل باغیوں کی انگریزوں سے جنگ ہوئی جس میں بہادر رسالدار اور اُس کے سپاہی سبھی مارے گئے۔

میاں میر میں ہندوستانی رسالے نے گھوڑوں کے زین واپس کرنے سے انکار کر دیا اور جس دن اُن کے ہتھیار واپس لئے گئے اُس کے دوسرے دن برطرف کی جانے والی رجمنٹ کے 1,400 سپاہیوں کے ساتھ فیروز پور چلا گیا۔ انگریزوں سے اُن کی لڑائی ہوئی جس میں 100

انگریز مارے گئے۔

میاں میر کے سپاہیوں سے اسلحہ واپس لینے کی خبر نے پنجاب میں مقیم ہندوستانی سپاہیوں کو خوفزدہ کر دیا اور وہ بغاوت پر مائل ہو گئے۔ اُن میں سے بہت سے خود کو بے سہارا سمجھتے تھے۔ دہلی پہنچنے کے ارادے سے وہ اپنی بارکوں سے نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن دہلی دور تھا۔ اُن کا پیچھا کیا گیا اور اُنہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ چھبیسویں نئو انفنٹری کو سخت سزا دی گئی۔ اُن میں سے دوسو بیاسی جنگ کے دوران گرفتار کر لئے گئے۔ اُنہیں اجنالا لایا گیا اور وہاں فیصلہ کیا گیا کہ سزائے موت دی جائے دس دس کر کے سپاہی پکارے جاتے تھے، اُن کی مشکیں کسی جاتی تھیں اور قتل گاہ کی طرف لیجایا جاتا تھا جہاں گولی سے اڑانے والا دستہ تیار کھڑا تھا۔''(106) اس طرح دوسوسینتیس نے جام شہادت پیا۔ اُن میں سے کچھ خاموش تھے اور کچھ ناچتے گاتے قتل گاہ کی طرف جا رہے تھے بقیہ سینتالیس نے اُس قلعہ کے باہر آنے سے انکار کر دیا جہاں اُنہیں قید کیا گیا تھا۔ لیکن جس وقت قلعہ کا دروازہ توڑ کر انگریز سپاہی اُس میں داخل ہوئے تو ''وہ سب قریب قریب مر چکے تھے۔''(107)

ایک نبرد آزما طاقت کے طور پر ہندوستانی فوج ختم ہو گئی۔ اُس کی جگہ اُتنی ہی نئی بھرتی ہونے والی سکھوں، آفریدیوں، خٹکوں اور مہمندوں کی رجمنٹوں نے لے لی۔ لیکن پنجاب کی دشواریاں محض فوج تک محدود نہیں تھیں۔ کلو کی پہاڑیوں میں راجہ پرتاپ سنگھ اور اُن کے بھائی ویر سنگھ نے بغاوت کی۔ لیکن اُنہیں شکست ہوئی، مقدمہ چلا اور سزائے موت دی گئی۔ برطرف رجمنٹوں کی یعنی جہلم کی 14 ویں انفنٹری، سیالکوٹ کی 46 ویں اور میاں میر کی 26 ویں انفنٹری کے سپاہیوں نے لڑائی کا فیصلہ کیا جو جموں کی پہاڑیوں کی طرف چلے گئے تھے۔ انہوں نے راوی کو پار کیا اور مادھو پور کے قصبے میں داخل ہو گئے جو بڑی دوآبہ شہر کا صدر مقام تھا۔ لیکن سکھ پہرہ داروں نے اُنہیں بھگا دیا۔ سیالکوٹ میں سپاہیوں نے اسٹیشن پر قبضہ کر لیا اور دیہات میں پھیل گئے لیکن یورپین ''خدا کی مہربانی سے بچ نکلے جس نے باغیوں کی گولیوں کا رخ موڑ دیا۔''(108)

ستمبر میں کھرّل، کھتّی ہتو، نتوان اور دوسرے مسلم قبیلوں کے بیس سے تیس ہزار تک افراد نے بغاوت کر دی جو مسلم ملتان میں 3,000 مربع میل کے رقبے میں آباد تھے۔ انہوں نے بہاول پور اور فیروز پور سے اسلحہ حاصل کئے تھے۔ انہوں نے اچانک حملہ کر کے پولیس کی چوکیوں پر قبضہ

کرلیا، اُن سے اسلحہ چھین لئے، لاہور اور ملتان کے درمیان سلسلہء مواصلات کاٹ دیا اور لوگوں سے چندہ وصول کرنے لگے۔ اُن کے خلاف جو ملٹری پولیس بھیجی گئی تھی اُسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ انہوں نے بے ضابطہ رسالے کو بھی چیچاوطنی کے سرائے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اُس کے بعد باغی گوگیر کے ریگستانوں کی طرف چلے گئے جہاں اُنہیں برطانوی فوج نے گھیر لیا اور گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالا۔(109)

سندھ

انگریزوں نے امیروں کو جس طرح ہٹایا تھا اُس کی یاد لوگوں میں بے اطمینانی کا سبب بن گئی تھی اس لئے سندھ بھی بغاوت میں شامل ہو گیا۔ ہیرات کلے شاہی خاندان کے ایک رکن اور شکارپور میں نظر بند وظیفہ خوار شہزادہ پیر محمد ایک اور سردار امام بخش اور ایک وظیفہ خوار الف خاں نے مل کر برطانوی حکومت کو معزول کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

راجستھان

اٹھارہویں صدی میں راجپوتانہ کے حالات میں انتشار پایا جاتا تھا۔ وہ زمانہ انحطاط اور سرکردہ قبائل کے سرداروں کے باہمی رقابت کا دور تھا۔ کچھ چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور جاگیروں کے علاوہ وہاں چار اہم ریاستیں تھیں۔

مارواڑ کا سیسودیا ایک قدیم قبیلہ تھا جن کو راجپوتوں میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ حالانکہ اُن کی بڑی عزت کی جاتی تھی لیکن وہ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے اور دوسرے خاندانوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ وہ دہلی کی سیاست سے بھی دور رہتے تھے۔ 1857ء میں مہارانا سروپ سنگھ اُودے پور کا راجہ تھا۔ جے پور کے کچھواہوں نے ایک بڑی سی ریاست قائم کر لی تھی اور اُس وقت ولی ریاست تھا مہاراجہ رام سنگھ۔ اُس خاندان کی ایک شاخ الور پر حکومت کرتی تھی۔

جودھ پور میں مہاراجہ تخت سنگھ راٹھور حکومت کرتا تھا۔ لیکن لوگ اُسے پسند نہیں کرتے تھے اور اپنا نہیں سمجھتے تھے۔ مہاراجہ مان سنگھ کے عہد میں جودھ پور نے اپنی آزادی کے لئے شہرت حاصل کر لی تھی اس لئے کہ مہاراجہ نے انگریزوں کے خلاف جسونت راؤ ہلکر کی مدد کی تھی۔ اس نے

سندھ کے امیروں اور ناگپور کے لیاروؤ کی بھی مدد کی تھی۔ تب اُسے برطانوی ریزیڈنٹ رکھنے پر مجبور کیا گیا اور اُس کے دو مذہبی مشیروں کو گرفتار کر لیا گیا تو اُس نے بددل ہو کر گدی چھوڑ دی اور سنیاس لے لیا۔

بوندی اور کوٹا کے راجہ ہدا راجپوت تھے۔ ٹونک میں ہنڈاری رہنما امیر خاں کے خاندان کا ایک فرد حکومت کر رہا تھا۔

مندرجہ بالا ریاستوں کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی راجپوت ریاستیں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ بہت سے جاگیردار تھے جو نام کو والیان ریاست کے اطاعت گزار تھے بڑی حد تک خودمختار، بدقسمتی سے والیان ریاست اور جاگیرداروں کے مراسم خوشگوار نہیں تھے۔ برطانوی حکومت کی پالیسی تھی جاگیرداروں کے خلاف والیان ریاست کی حمایت کرنا۔ وہ جاگیروں کے داخلی معاملات میں مداخلت کرتے تھے تاکہ رعایا پر جاگیرداروں کے فیوڈل اختیارات کو محدود رکھا جاسکے۔ جاگیردار اپنے مالکوں کے ساتھ انگریزوں سے بھی غیر مطمئن تھے جو اُن کی پشت پناہی کرتے تھے۔

جہاں تک والیان ریاست کا تعلق تھا وہ بڑی دشواریوں میں مبتلا تھے۔ مرہٹوں کے حملوں اور خراج کے مطالبوں کی بنا پر وہ بہت نقصان اُٹھا چکے تھے اور جب انگریزوں نے مرہٹوں کو شکست دی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور برطانوی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن مالک بدلنے کے بعد اُنہیں آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ اگرچہ نئے مالک باضابطہ انداز سے کام کرتے ہیں لیکن مطالبوں کی حد تک اُن میں اور مرہٹوں میں کوئی فرق نہیں۔ زیادہ بری بات یہ تھی کہ انگریز والیان ریاست کے اختیارات کم کرنے میں بڑی سنگدلی سے کام لیتے تھے اور چونکہ اُن کے پاس بڑی طاقت تھی اس لئے مزاحمت نہیں کی جاسکتی تھی۔

اُن ریاستوں میں جو چھاؤنیاں قائم کی گئی تھیں وہ اُن کی آزادی کے لئے خطرہ بن گئی تھیں۔ اُن کی فیوڈل فوجیں برطرف کر دی گئی تھیں اس لئے وہ انگریزی حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ چونکہ اُن کے رسم و رواج میں مداخلت کی جاتی تھی اس لئے اُن کے دلوں میں مذہب و مراسم کو برقرار رکھنے کے تعلق سے خدشات پیدا ہو گئے تھے۔

1857ء سے پہلے فتنہ وفساد سر اُٹھا چکا تھا۔ اُس کی وجہ تھی مان سنگھ کی سرتابی، ڈنگارپور کے جسونت سنگھ کی معزولی، جودھ پور میں راٹھور بھیم جی کالڈ پر حملہ اور جئے پور میں کیپٹن بلیک کا قتل۔

سیکر، کھیالی اور کھیتڑی میں بغاوتیں ہوئیں۔ میواڑ، مارواڑ اور سیکھاولی کے جاگیردار اور سول آبادی غیر مطمئن تھی۔ بانکی داس کی طرح کے شاعر اور سوریہ مشر اور ان کی طرح کے دانش ور لوگوں کے جذبات کو مشتعل کر رہے تھے۔

والیان ریاست کے باہمی اختلافات اور حکمرانوں اور جاگیرداروں کے آپسی جھگڑوں کے علاوہ انگریز حکمراں اپنی فوجی طاقت پر بھروسہ رکھتے تھے۔ اجمیر میں اُن کا ایک بڑا اسلحہ خانہ تھا جس کی نگرانی ہندوستانی پیدل فوج کی کمپنیاں کرتی تھیں، نصیر آباد اور نیمچ میں دو اہم چھاؤنیاں تھیں اور چھوٹی چھوٹی چھاؤنیاں ارن پوری، دیولی اور دیسا میں تھیں۔

حالانکہ ضابطے کی رو سے راجپوتانہ کا انتظام شمال مغربی صوبجات کے لیفٹیننٹ گورنر کی ذمہ داری تھی لیکن عملاً اختیارات گورنر جنرل کے ایجنٹ اور اودے پور، جے پور، جودھ پور اور کوٹا میں مقیم ایجنٹوں کو حاصل تھے۔

میرٹھ کی بغاوت کی خبر جب راجپوتانہ پہنچی تو چھاؤنیوں میں مقیم ہندوستانی سپاہیوں کی رجمنٹوں، ریاستوں کے ملازم، راجپوت سپاہیوں اور جاگیرداروں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ عام لوگوں میں اُن کے لئے بڑا ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ پہلی بغاوت 28- مئی کو نصیر آباد میں ہوئی۔ اُس کے بعد 3- جون کو نیمچ میں بغاوت ہوئی۔ پھر تو بدامنی پھیلتی ہی چلی گئی۔ اجمیر پر حملہ کیا گیا۔ اس حملے کی قیادت ابو نے کی تھی۔ ارن پورہ میں سپاہیوں نے بغاوت کر دی اور مندسور پر شہزادہ فیروز شاہ نے قبضہ کر لیا۔ جودھ پور میں ''لوگوں میں پھیلی ہوئی بے چینی کو خاکی سادھوؤں نے تقویت پہنچائی جو جگہ جگہ جاتے تھے اور محل میں بھی مدعو کئے گئے تھے۔'' لیکن بدامنی کے اصل مرکز تھے کوٹا اور جودھ پور کی باج گزار جاگیر اُوا۔

سب سے پہلے ارن پورہ کی فوج نے بغاوت کی۔ جلد ہی جاگیردار بھی اس میں شامل ہو گئے۔ اُوا کے ٹھاکر کشن پال سنگھ ہی نے اُن کا ساتھ دیا اور میواڑ اور مارواڑ کے جاگیرداروں اور اسوپ النسیاوس، گولار، روپ نگر، سلیچر وغیرہ کے سرداروں نے اُس کی حمایت کی۔ انہوں نے مہاراجہ جودھ پور کی بھیجی ہوئی فوج کو شکست دی اور شہنشاہ کے سامنے اپنی شکایتیں پیش کرنے کی غرض سے دہلی کی طرف کوچ کر دیا۔ راستے میں انہیں مجبوراً نرنول کے مقام پر جنگ کرنی پڑی جس میں انہیں شکست ہوئی۔ لیکن ستمبر میں دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد اُن کی ہمتیں

ٹوٹ گئیں۔

راجستھان میں انگریزوں کے خلاف انقلابی تحریک کا سب سے اہم مرکز تھا کوٹا۔ وہاں پولیٹکل ایجنٹ میجر برٹن کو قتل کر دیا۔ افسروں میں جئے دیال اور اُن کے بھائی ہردیال نے تحریک کی رہنمائی کی۔ ریزیڈنسی کا محاصرہ کر لیا گیا اور مہاراؤ کو قریب قریب حراست میں لے لیا گیا۔ یہ حالات کئی مہینے تک جاری رہے یہاں تک کہ جنرل رابرٹسن نے پانچ ہزار پانچ، انگریز سپاہیوں کی مدد سے جن کے ساتھ ایک کرولی کا دستہ بھی تھا، باغیوں پر حملہ کیا، بہت نقصان پہنچایا اور شکست دی۔ اُن کے رہنماؤں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ اُن تاجروں اور دستکاروں پر جرمانے کئے گئے جن کے متعلق شبہ تھا کہ تحریک سے ہمدردی رکھتے ہیں اور جئے دیال کو توپ سے اُڑا دیا۔

حالانکہ کھلی بغاوت کچل دی گئی تھی پھر بھی بہت سے راجپوت باغیوں کی امداد کرتے رہے۔ تانتیا ٹوپے نے راجستھان میں پناہ لی اور سیمبر اور کوٹھاریا کے سرداروں نے مہاجرین کی امداد کی۔

وسطی ہند

سینٹرل انڈیا ایجنسی کئی چھوٹی بڑی ریاستوں پر مشتمل تھی جو بہار اور چھوٹا ناگپور سے راجپوتانہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُتر پردیش اُن کے شمال میں تھا۔ چنانچہ یہ ریاستیں اُن علاقوں میں گھری ہوئی تھیں جہاں بغاوت ہو رہی تھی۔ اس ایجنسی مین ہندوستانی فوجوں کے خاص خاص مرکز تھے گوالیار، اندور، بھوپال اور مہو۔ جب بغاوت کی خبر وہاں پہنچی تو والیان ریاست کے ناموافق رویے کے باوجود ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے ساتھیوں کی حمایت میں بغاوت کر دی اور زیادہ تر اضلاع میں بدامنی پھیل گئی۔ ساگر، جبل پور، نرسنگھ پور، ہوشنگ آباد، لوگانگ، ناگپور وغیرہ میں شورش پھوٹ پڑی۔ وہاں سپاہیوں نے بغاوت کر دی اور اُن کی حمایت پانی پور کے راجہ اور گونڈ راجہ شنکر شاہ کی طرح کے کچھ دیسی حکمرانوں نے کی۔

گوالیار کے مہاراجہ انگریزوں کا وفادار تھا۔ کلکتہ کے ایک حالیہ دور کے وقت اُسے برطانوی راج کی قوت نے بڑا متاثر کیا تھا۔ لیکن گوالیار میں مقیم ہندوستانی سپاہیوں کا رجمنٹ باغیوں سے ہمدردی رکھتی تھی۔ یہ سپاہی باغیوں کے ساتھ خون اور ذات کے رشتے رکھتے تھے۔ اُن کی تعداد آٹھ ہزار سے زیادہ تھی۔ جب انہوں نے 14- جون کے جھانسی کے قتل عام کی خبر سنی تو انہوں نے

بغاوت کردی۔ لیکن اُن کی کامیابی عارضی تھی۔ انگریزوں نے حالات پر قابو پالیا اور مہاراجہ کو گدی پر بحال کردیا۔

بھوپال کے سرداراور امراء وہاں کی حکمراں سکندر بیگم سے خوش نہیں تھے۔ قدرتی بات ہے کہ ملحقہ برطانوی علاقوں میں ہونے والی بغاوت کو انہوں نے غنیمت سمجھا۔ انہوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ غیر مطمئن باغیوں کا ساتھ دیا اور کئی موقعوں پر ولایتیوں یعنی پٹھانوں اور ریاست کی فوج کو اُکسایا کہ وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کردیں۔

گورنر جنرل کے ایجنٹ کرنل ڈیورنڈ نے وسطی ہند کی بغاوت کے متعلق 13- اگست کے تبصرے میں اپنے خیالات مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کئے۔ ''امن وامان بحال کرنے اور جہاں جہاں انتشار پایا جاتا ہے اُس کو ختم کرنے کے لئے ہمارے پاس محدود وسائل ہیں۔ گوالیار کا دستہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے اور اپنے اچھی طرح توپ خانے کے ساتھ سندھیا کے ہاتھ میں چلا گیا ہے اور اس کا حکم بجالائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ہماری مخالفت کرے۔ وہ کبھی بھی ہماری خواہش (کذا) نہیں کرسکتے ہیں۔ مالوا میں پورا کا پورا رسالہ، جس میں آٹھ سو اچھے اچھے گھوڑے ہیں، ہاتھ سے نکل چکا ہے اور اندور میں پیدل فوج نے اتنی بدتمیزی سے کام لیا کہ اُس پر شبہ نہ کرنے کا امکان باقی نہیں رہا ہے۔ بھوپال کا دستہ، اندور میں نازیبا اور غدارانہ حرکتیں کرانے کے بعد، اب سیہور میں کھلی ہوئی بغاوت کررہا ہے۔ بھیلوں کا دستہ دوبارہ جمع ہورہا ہے۔۔۔ بگورے۔۔۔ اب ایک توپ، ایک تلوار اور ایک بندوق ایسی نہیں ہے جس کو امن وامان اور برطانوی اقتدار بحال رکھنے کے لئے استعمال کیا جاسکے۔''(110)

اس اجمالی بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمالیہ سے نربدا تک اور کلکتہ سے پشاور تک پورا شمالی ہند انقلابی شورشوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مختلف علاقوں میں شورش کم یا زیادہ ہوسکتی تھی لیکن کوئی حصہ بے چینی سے خالی نہیں تھا۔

جنوبی ہند

مہاراشٹر

دکن اور جنوبی ہند میں بھی کئی جگہ پر شورشیں ہوئیں۔ وسطی ہند میں اندور، سور، مہو، دھار،

امنبھیر اوغیرہ میں بغاوت ہوئی اور حکومت کے لئے پریشانی کا باعث بن گئی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقہ مہاراشٹر سے ملا ہوا تھا جہاں بڑی ''بے چینی'' پائی جاتی تھی۔آزادی کے خاتمے، پیشوا کی حکومت کے زوال اور پونا کی حیثیت کم ہو جانے کی بنا پر، جو مرہٹہ حکومت کا مستقر تھا،لوگ بددل ہو گئے تھے۔ وہ تاریخی خاندان خاص طور سے متاثر ہوئے تھے جنہوں نے قدیم ریاست کے معاملات میں اہم رول ادا کیا تھا۔انام کمیشن کے فیصلے کے مطابق بہت سی ریاستوں کی ضبطی، زمینداریوں کے مالکوں کے قدرتی وارث نہ ہونے کی صورت میں وارث کو گود لینے کی ممانعت اور نانا صاحب اور پٹوردھن سرداروں سے خاندانوں کے باہمی قریبی رشتوں کی بنا پر خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔

نوجوان شہزادہ پرتاپ سنگھ، جسے الفنسٹن نے ستارا کی گدی پر بٹھا دیا تھا، آزادی پسند طبیعت رکھتا تھا اور انگریز افسر اُس پر شبہ کرتے تھے۔ 1839ء میں اسے معزول اور جلاوطن کر دیا گیا۔ انصاف کے لئے اُس کی درخواستیں رد کر دی گئیں اور اُس کے وارث کی 1848ء میں موت کے بعد ریاست کا الحاق بمبئی پریزیڈنسی میں کر لیا گیا۔مرہٹوں کی سرزمین کا جنوبی حصہ انام کمیشن کی سرگرمیوں کے نتیجے میں اور کولہاپور 1844ء کی بغاوت کے بعد عائد کئے جانے والے بھاری جرمانے کی بنا پر مایوسی کا شکار تھا اور انگریزوں سے وہاں کے لوگوں کو بڑی شکایتیں تھیں۔ چھوٹے سے چھوٹا واقعہ ان عناصر کو ''مرتا کیا نہیں کرتا'' کے مصداق بغاوت پر آمادہ کر سکتا تھا۔حقیقت میں ایسا ہی ہوا۔

اسیر گڑھ، ہربان پور، اورنگ آباد، بلگام، کولہاپور اور بمبئی کے ہندوستانی سپاہیوں اور غیر مطمئن مسلمانوں نے مل کر بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ستارہ میں شیواجی کے خاندان کے ایک قدیم اور وفادار ملازم رنگوباُو جی کپتے نے رموشی، منگ اور کولی رنگروٹ بھرتی کئے اور انگریزوں کو نکالنے اور پرتاپ سنگھ کے بیٹے شاہو کو گدی پر بحال کرنے کے لئے مرہٹہ سرداروں میں سے کچھ کی حمایت حاصل کر لی۔ کندل کے نانا رموشی راجہ، کراد کے دولت راؤ ہری پوار کولہاپور کے تاتیا فدنس اور دوسرے سرداروں نے حمایت کا وعدہ کیا۔شورام کلکرنی اس کا روح رواں تھا اور انگو باپو جی کے بیٹے سیتارام کے سپرد عام نگرانی کا کام کیا گیا تھا۔ایک راجپوت سپاہی مان سنگھ کو پیغام بر مقرر کیا گیا کہ وہ سپاہیوں کی رجمنٹوں کی حمایت حاصل کرے۔ بدقسمتی سے سازش کا علم ہو گیا اور سازش کرنے

والے قتل کردیئے گئے۔

کولہاپور، بلگام اور دھاروار میں بڑی بے چینی تھی۔ کانپور میں نانا صاحب کی بغاوت کی خبر نے ہندوستانی سپاہیوں کی رجمنٹوں میں بڑی اشتعال پھیلادی تھی۔ بغاوت 31- جولائی کو پھوٹ پڑی۔ کچھ سپاہیوں نے دو دفعہ کولہاپور پر قبضہ کرنے کی کوششیں کیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ دسمبر میں ایک دفعہ پھر کوشش کی گئی۔ اس دفعہ اُنہیں اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ شہر پر قبضہ ہوگیا اور اُس کے دروازے بند کردیئے گئے۔ لیکن برطانوی فوجوں نے ایک دروازہ بارود سے اُڑادیا اور شہر اور راجہ کے محل پر قبضہ کرلیا۔ راجہ کے بھائی کو قید کر کے سندھ بھیج دیا گیا۔ بلگام میں ایک منشی نے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ لیکن بغاوت شروع ہونے سے پہلے انگریزوں کو اس کا علم ہوگیا اور شورش فرو کردی گئی۔

بمبئی میں تین ہندوستانی رجمنٹ تھیں۔ اُنہوں نے محرم کے موقع پر بغاوت کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن پولیس کا ڈپٹی کمشنر فورجٹ اس کے لئے تیار تھا اور اُس کے اقدامات نے سازش کو ابتدائی مراحل ہی میں ختم کردیا۔

نارگنڈ کے سردار نے، جس کے دل میں انام کمیشن کی کارروائیوں نے خطرات پیدا کردیئے تھے، بغاوت کی اور حکمرانوں کے غیظ وغضب کا نشانہ بن گیا۔ سوانت داری کے دیسائیوں نے اپنے جنگلوں میں واقع قلعوں سے حکومت کی مخالفت شروع کی لیکن بالآخر اُنہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

لوگوں کی سرگرمیوں میں تال میل کی کمی اور برطانوی حکمرانوں کی حکمت عملی اور ہوشیاری نے ان شعلوں کو بڑے پیانے پر پھیلنے سے روک دیا، مرہٹوں کی سرزمین کے جنوبی حصے میں ہونے والی بغاوت ایک چھوٹے سے واقعہ سے زیادہ کچھ نہیں تھی جو سرداروں، زمینداروں اور تھوڑے سے شمالی ہند کے سپاہیوں تک محدود تھی۔ مرہٹوں اور مہاروں اور پوربیا سپاہیوں میں کوئی چیز مشترک نہیں تھی اور اس لئے ان کی بات کا مقامی لوگوں نے اثر قبول کیا۔

بمبئی کے تاجروں اور تھوڑے سے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو اس انقلاب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

حیدرآباد اور مدراس کی بغاوت

دہلی کے مغل حکمراں اس سے ہمدردی کی بنا پر نظام کے علاقے کی مسلم آبادی بہت بے

چین تھی۔ مولوی جہاد کی تبلیغ کر رہے تھے جس کے نتیجے میں روہیلہ فوج اور اُس کے بہت سے ہمدردوں نے بغاوت کر دی اور برطانوی ریذیڈنسی کی طرف بڑھے۔ لیکن نوجوان نظام اور اُس کا معمر وزیر اعظم سالار جنگ انگریزوں کے وفادار رہے اور باغی کچل دیئے گئے۔

مدراس کی پریسڈنسی میں بے چینی تو کم نہیں تھی لیکن قیادت کا فقدان تھا۔ ہندوستانی سپاہی نیچی ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے جنہیں اونچی ذاتوں کے خلاف کی جانے والی زیادتیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ رعیت داری نظام کے قیام نے اُس طبقے کو ختم کر دیا تھا۔ جو حکومت کرنے کی روایات کے قابل تھے۔ مغربی تعلیم پائے ہوئے لوگ اس تحریک کے خلاف تھے اور اُس کو رجعت پسند تحریک سمجھتے تھے۔

اس کے باوجود دہلی میں مغل حکومت کی بحالی کی خبر نے جنوب کے لوگوں میں ہلچل پیدا کر دی۔ مسلمان سپاہیوں کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ عام مسلمانوں کا رویہ تہدید آمیز تھا۔ کرنول، کڑپا اور مالابار میں مسلمانوں کی خاص آبادی تھی۔ ارکاٹ ویلور اور ترچنا پلی کرناٹک سے نوابوں کی حکومت میں رہ چکے تھے اور اُس حکومت کی یاد تازہ تھی جو حال میں ختم ہوئی تھی۔ حیدر آباد اور میسور میں غیر مطمئن گروہ موجود تھے۔

پورے مدراس میں باغی سرگرم عمل تھے۔ مثال کے طور پر نیٹو انفینٹری کی تیرہویں رجمنٹ میں ایک برہمن سادھو پکڑا گیا جو برطانوی حکومت کے اختتام کا اعلان اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتحاد کی تلقین کر رہا تھا۔ سرکاری رپورٹ میں کہا گیا تھا(111) کہ بنگال کمانڈر کے بہت سے سپاہی اس پریسڈنسی کے مختلف حصوں میں موجود ہیں جن کا مقصد ہے ''ہمارے سپاہیوں سے ملنا اور جھوٹی اور بدباطنی پر مبنی افواہیں پھیلا کر اُن کے دلوں میں حکومت کی طرف سے شک وشبہات اور نفرت پیدا کرنا۔''

ستمبر 1857ء میں صورت حال تشویشناک ہوگئی تھی۔ لیکن حکومت مدراس نے اشتعال کو فرو کرنے اور امن بحال رکھنے کے لئے مناسب اقدامات کئے۔ ریاست کے خلاف جرائم کی سرسری سماعت کے لئے 1857ء کے ایکٹ نمبر 14 کے تحت احکام جاری کئے گئے، فوجی عدالتیں قائم کی گئیں تا کہ اُن سپاہیوں کے خلاف عدالتی کارروائی کی جا سکے جو قواعد شکنی کے مرتکب ہوں اور تمام مرکزوں میں پولیس میں نئی بھرتی کی گئی۔ اس طرح اکا دکا شورشیں فرو کر دی گئیں۔ حالانکہ لوگوں

کے جذبات نے حکومت کو بڑی تشویش میں مبتلا رکھا لیکن بڑے پیمانے پر تشدد نہیں پھیل سکا۔

VII- تبصرہ

ہندوستان کی مجموعی صورت حال کا مطالعہ اس بات میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتا ہے کہ بغاوت وسیع پیمانے پر ہوئی تھی، یہ کہ سپاہی اور سول آبادی نے اس میں شرکت کی اور یہ کہ دونوں نے مل کر بدیسی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ کچھ حکمرانوں کے خیال اور توقع کے برعکس مسلمانوں اور ہندوؤں نے اشتراک عمل کیا۔ حالانکہ کچھ مقامات پر فرقہ وارانہ اختلافات بھی رونما ہوئے پھر بھی مجموعی اعتبار سے دونوں نے شانے سے شانہ ملا کر جنگ کی اور ایک دوسرے کی پوری پوری حمایت کی۔ بہادر شاہ نے بقرعید کے موقع پر گائے کی قربانی کی ممانعت کر دی اور خان بہادر روہیل کھنڈ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرنے کی انگریزوں کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ زیادہ تر باغی رہنماؤں نے بہادر شاہ کو ہندوستان کا جائز شہنشاہ تسلیم کر لیا۔ باغیوں کی قائم کی ہوئی حکومت میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ ہندوؤں کے مقدموں کا فیصلہ کرنے کے لئے ہندو ججوں کی عدالتیں قائم کی گئیں اور مسلمانوں کے لئے قاضی مقرر کئے گئے۔ جہاں کہیں بھی اعلان جہاد کیا گیا اُس میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی کہ جہاد محض عیسائی حکمرانوں کے خلاف کیا جائے گا۔

بغاوت کے اسباب بہت سے تھے۔ کمانڈنٹ جے۔ مارٹن نے لکھا ہے "اس وسیع سلطنت کو فتح کرنے کے لئے مفید تھا کہ وہ نظام جس پر اب تک عمل کیا گیا لیکن وہ اس پہلے دھکے کو بھی برداشت نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کے اندر اُس کے پاس وہ مضبوط امدادی عناصر نہیں تھے جن پر وہ بھروسہ کر سکتا اور جن کی مدد سے ایک فریق دوسرے فریق کے خلاف لڑ سکتا۔ چونکہ کمپنی میں خود کو بحال و برقرار رکھنے کی صلاحیت نہیں تھی چنانچہ وہ اپنے وطن (انگلستان) کی مدد کے بغیر اس بغاوت پر قابو پانے کی سکت نہیں رکھتی تھی اس لئے کہ اپنی قدیم علیحدگی پسندی پر عمل کرتے ہوئے اس نے بامقصد تصورات کے پرچار کو نظر انداز یا اُن ملکوں میں جن پر اُسے غلبہ حاصل ہو گیا تھا مغربی تہذیب کی شجر کاری سے احتراز کیا۔ چونکہ اُسے اپنی رعایا کی خوشحالی، اخلاق اور زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور برآمدات، درآمدات، اجارہ داریوں، تنخواہوں اور منافعوں کے علاوہ

کسی اور بات سے سروکار نہیں تھا اس لئے ہندوستانیوں کو مہذب بنانے کے بجائے اس نے محض اُن کا استحصال کیا۔ اُن لوگوں کو وہ تعلیم اور مہارت مہیا کرنے کی بجائے جو آزادی کے خواہش مندوں میں تحریک پیدا کرتے ہیں اُس نے وہاں کے لوگوں کو حکومت خود اختیاری کے نا قابل بنا دیا۔ یہ پالیسی چالاکی پر مبنی ہوسکتی ہے لیکن اس کو فیاض سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ بات قرین انصاف ہے کہ ہندوستان کی کمپنی کی بد باطنی، جاہ طلبی، خود غرض اور ہر قسم کے استحصال بالجبر کے لئے مذمت کی گئی ہے۔''(112)

ہندوستان کے لوگوں پر ایک صدی تک کی جانے والی اس قسم کی حکومت کا نتیجہ تباہ کن ہونا ضروری تھا جس کی لپیٹ میں پورا ملک آ گیا۔ الگزینڈر رڈف نے ٹھیک ہی کہا ہے ''ہر وہ شخص جس نے عمداً آنکھیں بند نہیں کر لی ہیں یہ جانتا ہے کہ اُن سینکڑوں اور ہزاروں مقامات پر بھی جہاں حسنِ انتظام یا قدرت کی مہربانی سے بغاوت نہیں ہوئی وہاں بھی بے اطمینانی اور بڑے غدارانہ جذبات اور باغیانہ احساسات کا اظہار کیا گیا اور وہاں بھی حکام کو بہت سے خطرات وخدشات کا سامنا کرنا پڑا۔''(113)

اپنے غیر ضروری اطمینان قلب کی بنا پر انگریز جس فریب میں مبتلا ہو گئے تھے 1857ء کی بغاوت نے اُسے پاش پاش کر دیا۔ اس تحریک نے اُن پر روشن کر دیا کہ محکوموں کو طاقت کے ذریعے اطاعت پر مجبور تو کیا جا سکتا ہے لیکن طاقت کے ذریعے کسی کو وفادار نہیں بنایا جا سکتا ہے۔

اس عظیم بغاوت کی وسیع نوعیت کی بنا پر ظاہر ہے کہ تال میل اور منصوبہ بندی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنے والے طوفان کا کچھ نہ کچھ احساس ہندوستانی رجمنٹوں کو تھا۔ اس قسم کے واقعات جیسے چپاتیاں یا سُرخ کنول کے پھول تقسیم کرنا اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ نانا صاحب کے مشیر خاص عظیم اللہ خاں، مولوی احمد اللہ شاہ، جنھوں نے اودھ میں اہم رول ادا کیا، مشہور ومعروف مولوی فضل الحق خیر آبادی اور بہت سے دوسرے مولویوں کے روابط ظاہر کرتے ہیں کہ ایک عام تحریک کے لئے صلاح مشورے کے بعد کوششیں کی گئیں۔ حالانکہ ایران اور روس کے ساتھ مراسلت کی کہانی دوراز کار معلوم ہوتی ہے لیکن اس امر کا ثبوت کافی ملتا ہے بہادر شاہ نے کئی دیسی حکمرانوں اور سرداروں اور ہندوستانی فوج کے کارکنوں سے بھی خط وکتابت کی۔ اس قسم کی افواہیں گشت کر رہی تھیں کہ ایک مقررہ دن تمام چھاؤنیوں میں فوجیں بغاوت اور

انگریزوں پر حملہ کریں گی۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ بغاوت کے لئے 31- مئی کا دن مقرر کیا گیا ہے جس کا شمار شمالی ہند کے گرم ترین دنوں میں ہوتا ہے اور اس لئے ملک کے بدیسی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کے لئے بہت موزوں تھا۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرٹھ میں جب سپاہیوں نے مقررہ دن سے تین ہفتے پہلے ہی بغاوت کردی تو اس پر بہادر شاہ کو تعجب ہوا اور وہ قبل از وقت بغاوت میں حصہ لینے کے سلسلے میں تذبذب کا شکار ہو گئے۔

مختلف مواقع پر رہنماؤں میں تال میل دیکھنے میں آیا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قسم کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ مثال کے طور پر کانپور کی لڑائی میں شہزادہ فیروز، گوالیار کی فوج، بابو کنور سنگھ اور دوسروں نے نانا صاحب کی مدد کی۔ بہادر شاہ نے راجوں، نوابوں اور راجستھان، پنجاب اور شمالی ہند کے سرداروں کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کی دعوت دی لیکن اُنہیں خاطر خواہ جواب نہیں ملا۔ خاص طور سے اودھ کے اخبارات نے تال میل کے نظریے کی حمایت کی۔ ملک کے مختلف حصوں میں وہ جاتے تھے جس کی وجہ سے دہلی اور دوسرے مراکز کی خبریں پھیل رہی تھیں۔

حالانکہ معمر بہادر شاہ جو گدّی پر بیٹھے محض نام کے شہنشاہ تھے پھر بھی تاریخ کے فیصلہ کُن بحران میں اُن کا نام جادو کا سا اثر رکھتا تھا۔ پرانے جھگڑے جنہوں نے پچھلے سو سال سے ملک کو پریشان کر رکھا تھا، عارضی طور سے بھلا دیئے گئے، عقیدت اور وفاداری کے پیمان کئے گئے اور اطاعت کے عہد کی تصدیق نو ہوئی۔ واجد علی شاہ کے بیٹے برجیس قدر نے، جن کے اسلاف نے شہنشاہ کی اطاعت سے منہ موڑ کر بادشاہ کا خطاب اختیار کر لیا تھا، والی کی حیثیت سے گدّی پر بیٹھنے کے بعد اعلان کیا کہ وہ دہلی کے حکام کی پوری پوری تعمیل کریں گے۔

خان بہادر خاں نے، جو حافظ رحمت خاں کے پوتے تھے جس نے دوآبے میں اپنے لئے ایک ریاست حاصل کر لی تھی، جب روہیل کھنڈ کا انتظام سنبھالا تو اُنہیں دہلی کے شہنشاہ کا وائسرائے تسلیم کیا گیا۔ وہ بڑی فوجی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، انگریزوں کی فوجی طاقت سے واقف تھے اور اُن سے مقابلہ کرنے اور اُنہیں شکست دینے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ اس کا ثبوت مندرجہ ذیل حکم عام سے ملتا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے جاری کیا تھا ”کافروں کے باضابطہ دستوں کا مقابلہ نہ کیجئے اس لئے کہ نظم وضبط اور بندوبست کی حد تک وہ آپ سے برتر ہیں اور اُن کے پاس بڑی بڑی توپیں ہیں۔ لیکن اُن کی نقل وحرکت پر نظر رکھئے،

دریاؤں کے تمام گھاٹوں کی حفاظت کیجئے اُن کے مواصلات کاٹ دیجئے، رسد روک دیجئے اُن کی ڈاک اور چوکیاں کاٹ دیجئے اور اُن کے کیمپوں کے قریب رہئے۔ اُنہیں چین سے نہ بیٹھنے دیجئے۔(114)

پیشوا باجی راؤ دو کے بیٹے نانا صاحب نے اُس وقت اختیارات سنبھال لئے جب کانپور میں فوجوں نے بغاوت کی اور دہلی کی طرف بڑھنے لگے اس لئے کہ ''مغل شہنشاہیت کی بحالی سے اُن کی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔''(115) بغاوت کے شروع ہونے سے پہلے اپنے مشیر عظیم اللہ خاں کے ساتھ نانا صاحب نے ایسے حالات میں دہلی اور لکھنو کا سفر کیا تھا جنھوں نے انگریز افسران کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کردیئے تھے۔ باندا کے نواب علی بہادر نے، جو نانا صاحب کی عملی حمایت کررہے تھے، شاہ گڑھ کے راجہ کے نام ایک خط میں لکھا تھا ''خدا کے فضل سے شہنشاہ کی حکومت قائم ہوگئی ہے۔''(116) میسور کے جوڈیشیل کمشنر، مسٹر ایچ۔ بی۔ ڈورو کے سامنے بیان دیتے ہوئے سیتارام باوا نے کہا ''نانا صاحب اور مان سنگھ نے دہلی کے بادشاہ سے خط وکتابت کی اور یہ طے ہوا کہ بادشاہی مسلمانوں کو ملے اور دیوان گیری ہندوؤں کے حصے میں آئے۔''(117)

ان بیانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نانا صاحب کوشش کررہے تھے کہ شہنشاہ کے ساتھ مل کر کام کریں۔

پٹنہ، الٰہ آباد، لکھنو، کانپور، فرخ آباد، بریلی وغیرہ کے حکمراں اپنے القاب کی تصدیق کے لئے دہلی پر نظریں جمائے ہوئے تھے اور دہلی کی کوشش تھی کہ تمام طبقوں میں تال میل پیدا کیا جائے چاہے وہ ہندوستانی سپاہیوں کی رجمنٹ ہوں یا ہندوستانی راجہ نواب اور امیر۔ شہنشاہ نے فوجوں کو ہدایتیں جاری کیں اور شمالی ہندوستان کی کئی حصوں سے عرضداشتیں قبول کیں یعنی راجپوتانہ، مالوا، صوبجات متوسط، شمال مغربی صوبجات اور اودھ اور بہار سے پٹیالہ اور گوالیار کے راجوں راجستھان کے راجوں، کشمیر کے مہاراجہ گلاب سنگھ اور دوسرے ہندو مسلم سرداروں کو نجی خط بھی لکھے گئے۔ کچھ نے اطاعت ظاہر کی لیکن بہت سوں نے یا تو کوئی بہانہ بنادیا یا راست عمل سے گریز کیا اس لئے کہ اُن کے خیال میں بغاوت کی کامیابی کے امکانات بہت کم تھے اور ناکامی کی صورت میں اُن کی تباہی لازمی تھی۔

مدراس(118) میں باغیوں نے ''بادشاہ دہلی زندہ باد'' کے نعرے لگائے۔ حیدرآباد اور پنجاب میں ہندوستانی رجمنٹوں سے اسلحہ واپس لے لئے گئے تھے لیکن بہت سے برطرف شدہ سپاہی دہلی کی طرف چل پڑے۔ ناناصاحب نے جب پیشوا کا لقب اختیار کیا تو راجپوتانہ، وسطی ہند اور مہاراشٹر میں سرداروں کے دل خوشی سے بھر گئے اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑ گیا کہ اگر کوئی منصوبہ بنایا گیا تو وہ معمولی نوعیت کا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسا کوئی رہنما منظر عام پر نہیں آیا جو تحریک کی قیادت کے لئے ضروری تنظیمی صلاحیت رکھتا ہو۔ باغی بہادر تھے اور داد شجاعت دے سکتے لیکن نظم وضبط کا اُن میں فقدان تھا۔ نہ کوئی لڑائی کا معقول منصوبہ تیار کیا گیا تھا، نہ وہ یہ جانتے تھے کہ یہ کام کتنا بڑا ہے فوجی ضرورتوں کا بھی انہیں پورا احساس نہیں تھا اور روپے اور جنگی سامان کی فراہمی کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ حکومت اور فوج کی ویسی تنظیم نہیں کی گئی تھی جس کا تقاضا اُس وقت کے حالات کرتے تھے۔ بغاوتیں تو بہت سی ہوئیں لیکن کسی ایسے جامع پروگرام میں اُنہیں منسلک نہیں کیا جاسکا کہ مل کر وہ مشترک مقصد حاصل کرسکیں۔

عظیم بغاوت تقریباً دو سال تک جاری رہی اور اس دوران بہت سے اچھے اور بُرے واقعات ہوئے۔ ایک طرف اگر شجاعت اور مقصد سے لگن، بے جگری کے ساتھ مقابلہ کرنے اور سپر اندازی پر عزت کی موت کو ترجیح دینے کے واقعات دیکھنے میں آئے تو دوسری طرف بزدلانہ بے رحمی، غداری، نااہلی، بزدلی اور بیوقوفی کے نمونے بھی سامنے آئے۔ سرکردہ مردوں اور عورتوں مین کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے ثابت قدمی، وفاداری، دشوار حالات میں تدبر سے کام لئے، دشمن کی چالوں کو ناکام بنانے اور جنگی کارروائیوں کے دوران مہارت سے کام کرنے کی اہلیت کا ثبوت دیا۔ اسی کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بہت سے وہ بھی تھے جنہوں نے ڈر کے یا تو نجی فائدے کی خاطر تحریک میں حصہ لیا تھا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ غداری کرنے کو تیار رہتے تھے۔ ان لوگوں کا طرز عمل ملک کے حسین دامن پر ایک داغ رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔

آخر الذکر واقعات کو بھلا دینا ہی اچھا ہے۔(119) لیکن تاریخ اُن پر جوش مردوں اور عورتوں کو کبھی نہیں بھلا سکے گی جنہوں نے ملک کو بدیسی حکمرانوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ دہلی کے شاہی خاندان نے اس تحریک کو ایک ایسا نمائندہ عطا کیا جو ماضی کی شاندار روایات کے ناقابل نہیں تھا۔ شہزادہ فیروز شاہ ابھی صرف تیئس چوبیس سال کے

تھے جب غدر شروع ہوا لیکن اپنی کم عمری کے باوجود وہ ایک کامیاب رہنما ثابت ہوئے۔ انہوں نے مندسور میں علم بغاوت بلند کیا اور وسطی ہند میں انگریزی فوجوں کے خلاف لڑتے رہے۔ وہاں سے نکلنے کے بعد وہ اتر پردیش میں نمودار ہوئے اور روہیل کھنڈ اور اودھ میں جنگیں کیں۔ وہاں شکست پانے کے بعد وہ راجپوتانہ میں تانتیا ٹوپے کی فوجوں سے جا کر مل گئے، انگریزوں کی بڑی بڑی فوجوں سے جنگ کی اور اپنے پیچھا کرنے والوں سے بچ کر سرونج کے جنگل میں پناہ لی۔ اُس وقت تک بغاوت ختم ہو چکی تھی اور ملکہ وکٹوریہ کا اعلان جاری ہو چکا تھا جس میں اُن لوگوں کو معاف کر دینے کا وعدہ کیا گیا تھا جو اطاعت کر لیں۔ اس اعلان کی بڑی تشہیر کی گئی تھی۔ حالانکہ انہیں بہت دشوار حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا لیکن انہوں نے اپنی عزت نفس، آزادی یا اپنے خاندان کے وعدوں کو ذلت آمیز اور شرمناک قید پر ترجیح دی۔ وہ ایک بہادر سپاہی تھے اور آخری سانس تک اپنے ملک کے روشن مستقبل پر اُن کا اعتماد باقی رہا۔ جلاوطنی میں اُن کا انتقال ہوا۔

روہیل کھنڈ میں حافظ رحمت خاں کے پوتے خاں بہادر خاں نے، جن کی عمر ستر سال تھی، دہلی کے شہنشاہ کے وائسرائے کا عہدہ سنبھال لیا اور اتنی مدبرانہ سوجھ بوجھ کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں پر حکومت کی کہ اُن میں اختلافات پیدا کرنے کی دشمن کی تمام کوششیں ناکام ہو کر رہ گئیں۔ انہوں نے بڑی مہارت کے ساتھ روہیل کھنڈ کی حفاظت کی اور شکست کھانے اور ترائی کے جنگلوں میں پناہ لینے سے پہلے انگریزی فوج کے اُن چار دستوں کو شکست دی جو بریلی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک غدار نے اُنہیں گرفتار کروا دیا۔ اُن پر مقدمہ چلا اور سزائے موت دی گئی۔ انہوں نے ایک محب وطن بہادر کی طرح جان دی اور آخر تک نہایت بہادری اور بے جگری کا مظاہرہ کیا۔

اودھ میں ایک بہادر خاتون حضرت محل نے، جو واجد علی شاہ کی بیگم تھیں، بغاوت میں یادگار رول ادا کیا۔ انہوں نے اپنے گیارہ سالہ بیٹے برجیس قدر کی طرف سے اقتدار اعلیٰ سنبھال لیا۔ وہ باغیانہ تحریک کی روح رواں بن گئیں۔ انہوں نے نہ صرف انتقامی ڈھانچہ ترتیب دیا اور سرکاری کام سرانجام دیئے بلکہ ریزیڈنس پر حملے کی قیادت بھی کی۔ جب وہ لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں تو انہوں نے شاہجہاں پور کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تاکہ وہاں مولوی احمد اللہ شاہ کی حمایت کر سکیں۔ لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکیں اور نیپال کی سرحد کے جنگلوں کی طرف چلی گئیں۔

انہوں نے بڑی بازی لگائی تھی لیکن وہ ہار گئیں۔ حالانکہ میدان جنگ میں اُنہیں شکست ہوئی لیکن اُنہوں نے اپنی عزت نفس کو برقرار رکھا۔ اُنہیں پینشن کی پیش کش کی گئی جسے انہوں نے منظور نہیں کیا اور بدیس میں گمنامی کی موت کو ترجیح دی۔

شیر بہار کنور سنگھ سپہ سالاری کی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایک حقیقی راجپوت زمیندار کی طرح وہ کشادہ دل اور بہادر انسان تھے۔ رعیت اُن کی پوجا کرتی تھی اور خود وہ برطانوی حکومت کے شدید دشمن تھے۔ روہی میں 12- جون کو ہونے والے سپاہیوں کی بغاوت اَسّی سال کے اس بُزرگ سپاہی کے لئے بانگ درا کا کام کیا۔ انہوں نے شاہ آباد کے ضلع میں برطانوی حکومت کو معزول کرایا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ جب دشمن کے دباؤ کی بنا پر وہ شاہ آباد پر اپنا قبضہ بحال نہ رکھ سکے تو اپنے سپاہیوں کے ساتھ روہتاس کی پہاڑیوں کی طرف چلے گئے اور انگریزی مواصلات کے لئے خطرہ بن گئے۔ مرزاپور کے جنگلوں میں سے گزر کے وہ ریوا پہنچے۔ اُن کو امید تھی کہ راجہ کی حمایت حاصل کر لیں گے۔ جب وہ اسی میں کامیاب نہ ہو سکے تو باندہ گئے اور وہاں سے کالپی گئے تاکہ نانا صاحب سے مل کر کانپور پر حملہ کر سکیں۔ یہ منصوبہ بھی کامیاب نہ ہو سکا اور وہ لکھنو چلے گئے جہاں اُن کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ اس کے بعد وہ اعظم گڑھ کی طرف بڑھے، انگریزی فوج کو شکست دی اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ ایک بڑی انگریزی فوج کے آنے کے بعد انہوں نے شہر خالی کر دیا اور غازی پور کے قریب دشمن کو ایک بڑی شکست دینا۔ اس جنگ میں انگریزوں کا بڑا نقصان ہوا۔ برطانوی کمانڈر اور کئی دوسرے افسر مارے گئے اور باغیوں نے اُن کی کچھ توپیں چھین لیں۔ لیکن اس شاندار کامیابی سے زخمی شیر زیادہ دن تک اپنا دل خوش نہ کر سکا۔ غیر معمولی شفقت نے اُنہیں تھکا دیا تھا اور پچھلی لڑائی میں لگنے والے زخموں نے اُنہیں کمزور کر دیا تھا۔ بالآخر 26- اپریل 1858ء کو اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے بھائی امر سنگھ کی قیادت میں جنگ دسمبر 1859ء تک جاری رہی۔

ایک اور انتھک سپاہی تھے تانتیا ٹوپے جن کا اصل نام تھا رام چندر پندورنگا۔ اُنہوں نے مرہٹوں کی ابتدائی گوریلا جنگ کی روایات ورثہ میں پائی تھیں اور اس غیر مساوی لڑائی میں، جو نہایت دشوار حالات میں دو سال تک جاری رہی تھی انہوں نے اپنی اہلیت کا بہترین مظاہرہ کیا۔ بجلی کی سی سرعت کی طرح وہ جگہ جگہ پہنچتے اور بغاوت کے شعلے بھڑکاتے تھے، اپنے مخالفوں کی

حکمت عملیوں کو ناکام بناتے اور اُنہیں شکست دیتے تھے، جم کر جنگ کرنے سے بچتے تھے، شکست کے بعد بچ نکلتے تھے اور اپنا پیچھا کرنے والے دشمنوں کو چکر میں ڈال دیا کرتے تھے۔ ایک بڑی برطانوی فوج وسطی ہند اور راجپوتانہ میں اُن کا پیچھا کرنے میں مصروف تھی جہاں وہ کبھی پیچھے ہٹتے تھے اور کبھی آگے بڑھتے تھے۔ شکست سے اُن کا جوش کم نہیں ہوتا تھا اور تباہی اور بربادی کے خوف سے اُن کی وفاداری میں کمی نہیں آتی تھی۔ اُن کا انجام افسوسناک ہوا۔ اُن کی ایک دوست نے اُن کے ساتھ غداری کی۔ ایک برطانوی عدالت میں، جسے اُن کے مقدمے کی سماعت کا اختیار حاصل نہیں تھا، اس لئے کہ وہ انگریزی رعایا نہیں تھے، اُن پر مقدمہ چلایا گیا اور موت کی سزا دی گئی۔ ایک بہادر برہمن کی طرح انہوں نے پھانسی کا پھندا اپنے ہاتھ سے گلے میں ڈالا اور بڑی شان کے ساتھ پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو گئے۔

بندیل کھنڈ میں باغیوں کی رہنما تھیں جھانسی کی رانی لکشمی بائی جن کی یاد نے بجاطور سے اس تحریک کے گرد رومانی کہانیاں بنادی ہیں اور جن کے شجاعت کے کارناموں کا ذکر گاؤں کے شاعروں کے گیتوں میں ملتا ہے۔ ''اس نوجوان، پرجوش، خوددار، منت سماجت سے عاری اور سمجھوتا نہ کرنے والی رانی'' کو برطانوی حکام کی بے رحمی اور بیجا شک وشبہ نے بغاوت میں حصہ لینے پر مجبور کردیا تھا۔ ان کی بے جا مخالفت نے رانی کے غصے کو بھڑکایا اور جب برطانوی فوج نے بڑھ کے جھانسی کا محاصرہ کرلیا تو انہوں نے بڑی بہادری کے ساتھ اُس کا مقابلہ کیا۔ ''سڑک سڑک، گھر گھر اور کمرے کمرے میں بڑی سخت لڑائی ہوئی اور شہر کی حفاظت کرنے والے شیروں کی طرح لڑے۔'' اس سے پہلے کے قلعے پر حملہ آوروں کا قبضہ ہو ہر شخص کے جسم کے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ لیکن رانی بچ کے نکل گئیں اور کالپی پہنچیں۔ جب کالپی پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو اُنہوں نے اور اُن کے ساتھی تانتیا ٹوپے نے گوالیار پر قبضہ کرنے کا جرأت آمیز منصوبہ بنایا۔ یہ خیال ''اتنا ہی نیا اور جرأت آمیز تھا جتنا ارکاٹ پر قبضہ کرنے کا یادگار منصوبہ۔'' (120) گوالیار پر اُن کا قبضہ تو ہو گیا لیکن وہ زیادہ دن تک اُس پر قابض نہ رہ سکے اس لئے کہ مختلف سمتوں سے برطانوی فوج کے دستے اُس پر حملہ کر رہے تھے۔ کوٹا کی سرائے سے گوالیار آنے والی سڑک کی حفاظت کرنے کے لئے رانی اپنے سپاہیوں کے ساتھ شہر کے باہر نکلیں۔ اُس لڑائی اور رانی لکشمی بائی کی بہادری کے ساتھ جان دینے کی کہانی بغاوت کے سرکاری برطانوی مورخ ملیسن کے الفاظ میں بیان کی جاتی

چاہئے۔اُس نے لکھا ہے ''مردانہ لباس پہنے اور گھوڑے پر سوار جھانسی کی رانی دن بھر اپنی فوجوں کی ہمتیں بڑھاتی دیکھی گئیں۔ جب ایک ایک انچ آگے بڑھتی ہوئی برطانوی فوجیں درّے میں سے گذر گئیں اور جب چوٹی پر پہنچنے کے بعد اسمتھ نے رسالے کو حملہ کرنے کا حکم دیا تو جھانسی کی رانی نے برطانوی رسالے کے سپاہیوں کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ جب اُن کے ساتھی اُنہیں چھوڑ کر بھاگے تو اُن کی کوشش کے باوجود اُن کا گھوڑا بھی دوسروں کے ساتھ بھاگ نکلا۔ اُن کے ساتھ شاید وہ بھی بچ کر نکل جاتیں لیکن چھاؤنی کے قریب ایک نہر پار کرتے ہوئے اُن کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور گر گیا۔ رسالے کے سپاہی نے، جو اُن کا پیچھا کر رہا تھا، بغیر یہ جانتے ہوئے کہ وہ عورت ہیں اُن پر تلوار سے وار کیا۔ وہ گریں اور پھر اُٹھ نہ سکیں۔ اُس رات اُن کے جاں نثار ساتھیوں نے اس خیال سے اُن کا جسم جلا دیا کہ انگریز یہ ڈینگ نہ مار سکیں کہ اُنہوں نے رانی کو گرفتار کر لیا۔ چاہے وہ اُن کی لاش ہی کیوں نہ ہو۔''(121) لکشمی بائی کی بہادری کی یہ کہانی کبھی فراموش نہیں کی جاسکے گی۔

مندرجہ بالا کے علاوہ بھی بہت سے لوگ تھے جن کے نام بہادری کے کارناموں، مزاحمت کی تنظیم اور بغاوت کی تحریک کے لئے یاد رکھے جائیں گے۔ اس قسم کی ایک شخصیت تھی بخت خاں جو دہلی کی فوجوں کی کمانڈر ان چیف تھے اور جنہوں نے انتظامی کونسل کی تنظیم کی تھی۔ ایک اور تھے احمد اللہ شاہ جن کے متعلق اُن کے دشمن بھی کہتے تھے کہ ''بڑی صلاحیتوں کے مالک، بہت بہادر، راسخ ارادہ رکھنے والے انسان اور باغیوں میں سب سے اچھے سپاہی ہیں۔''(122) الٰہ آباد کے مولوی لیاقت علی نے، جو بہت معمولی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، شہر پر دہلی کے بادشاہ کی طرف سے حکومت کی۔

مرکزی کردار تھے شہنشاہ بہادر شاہ اور نانا صاحب وہ دونوں ہندوستان کی تاریخ کے دو مشہور حکمراں خاندانوں کے وارث تھے۔ بہادر شاہ کے بزرگ ایسی سلطنت پر حکومت کر چکے تھے جس کی شہرت دو سو سال تک پوری دنیا میں رہی تھی۔ نانا صاحب کا تعلق ان پیشواؤں کے خاندان سے تھا جنہوں نے کاویری سے اٹک تک مرہٹہ راج پھیلا دیا تھا۔ بدقسمتی سے یہ نام بہت سی نزاعی بحثوں کا نشانہ بن گئے ہیں۔

بہادر شاہ اور نانا صاحب مزاج کے اعتبار سے بہادرانہ کارناموں سے مناسبت نہیں رکھتے

تھے اور اُنہیں جو رول ادا کرنا پڑا اُس کے انتخاب میں اُن کی مرضی کو دخل نہیں تھا۔ یہ رول محض حالات کی دین تھا۔

جس وقت تحریک کی قیادت کرنے پر بہادر شاہ کو مجبور کیا گیا اُس وقت اُن کی عمر اَسّی سال سے زیادہ تھی۔ پوری زندگی انہوں نے دہلی کے لال قلعہ کے محل میں گوشہ نشینی میں گزاری تھی جہاں تخت پر بیٹھنے کے بعد وہ مصاحبوں میں گھرے رہتے تھے۔ انگریزوں پر اُن کا انحصار تھا جو ذاتی اخراجات کے لئے اُنہیں سالانہ پینشن دیا کرتے تھے۔ اُنہیں سرکاری معاملات کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لئے کہ وہ ایسے بادشاہ تھے جس کی کوئی سلطنت نہیں تھی۔ لیکن اُن میں اہلیت کی کمی نہیں تھی۔ وہ خود بھی ہندی اور اردو کے اچھے شاعر تھے اور شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس عمر میں اور ایک خصوصی پس منظر کے باوجود انہوں نے وہ موقف اختیار کیا جس کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا اُن سے کہیں زیادہ کم عمر رکھنے والے انسان کے لئے بھی دشوار ہوتا۔ لیکن اُنہیں داد دینی پڑتی ہے کہ ایک دفعہ اس پُر خار راستے میں قدم رکھنے کے بعد انہوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ زیادہ تعجب تو اس بات پر ہے کہ انہوں نے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے دہلی کے لوگوں کو متحد کرنے، محصور شہر دہلی میں امن و امان قائم رکھنے، اپنی رعایا کی ہمتیں بڑھانے اور آخر دم تک لڑائی جاری رکھنے کی خاطر اپنی فوجوں کی ہمت افزائی کرنے کی انتھک کوششیں کیں۔ لیکن اُن کو ایک بہت بڑی طاقت سے مقابلہ کرنا پڑا اور اُن کا انجام افسوسناک ہوا۔ اُن کی نظروں کے سامنے اُن کے بیٹوں کو گولیاں ماری گئیں اور انہوں نے اپنی زندگی کے آخری سال اپنی ملکہ کے ساتھ اپنے ملک سے دور جلاوطنی کے عالم میں برما میں گذارے۔

نانا صاحب آخری پیشوا باجی راؤ دوم کا پسر متبنیٰ تھے۔ جب باجی راؤ انگریزوں کا باج گزار ہوگیا تو غلامی کی زنجیریں اُسے گراں گزرنے لگیں۔ نانا ایک آزاد امیر کی حیثیت سے زندگی گزارتے تھے جس کے مشاغل تھے سماجی دلچسپیاں، تفریحات اور کھیل تماشے۔ جب بغاوت نے انہیں ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا تو انہوں نے بادل نخواستہ باغیوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ اُنہیں سیاسی رہنما تسلیم کرلیا گیا تھا لیکن اصل طاقت دوسروں کے ہاتھوں میں

تھی۔ شکست کے بعد اُنہیں نیپال کی سرحد کی طرف جانا پڑا۔ انہوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور بڑی خودداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "جب تک میری جان میں جان ہے اُس وقت تک تم سے لڑائی جاری رہے گی چاہے میں مارا جاؤں، قید ہوں یا پھانسی پاؤں۔ میں جو کچھ بھی کروں گا تلوار کے ذریعے کیا جائے گا۔" اُس کے بعد وہ نیپال کے جنگلوں میں ہمیشہ کے لئے کھو گئے۔

بغاوت ناکام ہوگئی۔ اُس کے رہنماؤں کو پھانسی دے دی گئی۔ ناکامی کی قیمت اُنہیں آزادی اور جائیداد کی ضبطی کی صورت میں ادا کرنی پڑی۔ جانب دار مورخوں نے بدقسمتی سے اُن پر مظالم اور غیر انسانی کارروائیوں کے الزامات لگائے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن میں سے کسی (123) سے نہ اُس قتل عام کا منصوبہ بنایا تھا اور نہ حکم دیا تھا جو اس بغاوت کی تاریخ پر ایک بدنما دھبہ بن گیا ہے۔ اُن کا اصل مقصد تھا بدیسی حکومت کا تختہ اُلٹنا۔ زیادہ شرمناک کارروائیاں یا تو سپاہیوں نے کی تھیں جن پر مذہبی جنون طاری تھا اور جو بہت زیادہ خائف تھے یا اُن بدمعاشوں اور جرائم پیشہ لوگوں نے جنہیں جیلوں سے رہا کر دیا گیا تھا اور جو قتل و غارت کرنا چاہتے تھے۔ اسی کے ساتھ ایسے ہندوستانیوں کی بھی کمی نہ تھی جنہوں نے انسانیت کا ثبوت دیا اور جن کا رویہ قابل ستائش تھا۔ (124)

کمپنی کی فوجوں کی افسروں کی کارروائیاں بھی اتنی ہی غیر انسانی تھیں جن کے ذکر سے بھی دکھ ہوتا ہے۔ وہ بڑے پیمانے پر ناقابل یقین خفیف الحرکاتی کے مرتکب ہوئے۔ جرم کی تفتیش کئے بغیر ہزاروں انسانوں کو پھانسیاں دیدیں۔ جن کو سزائیں دی گئیں اُن کی کسی انسانی جذبے کا پاس کئے بغیر تذلیل کی گئی، گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیئے گئے۔ یہ وہ کہانی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اخلاق اور انسانی جذبات سے نمبر 3 تھے۔ یہ صورت حال زیادہ سنگین شکل اختیار کر لیتی ہے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ وہ نظم وضبط سے بیگانے نہیں تھے بلکہ ایک ایسی منظم حکومت کے تربیت یافتہ افسر تھے جو اپنے مذہب اور تہذیب کی برتری پر اصرار کرتی تھی۔

بغاوت کی ناکامی غیر متوقع نہیں تھی۔ اس کو منفی نظریات نے جنم دیا تھا۔ اس کا محرک کوئی مثبت تخلیقی تصور نہیں تھا۔ اس کے سامنے کسی اعلیٰ سماجی نظام یا نظام کا تصور نہیں تھا۔ وہ تو ایک ہنگامی نشہ تھا نہ کہ لوگوں کی ایک منظم اور مستقل تبدیلی کی کوشش۔ چونکہ یہ ایک بلا مقصد ہنگامی حادثہ تھا اس

99- تتمہ Narrative Events of Allahabad، مورخہ 17 ستمبر 1858ء از ایچ۔ڈی۔ژلک، جوائنٹ مجسٹریٹ شاہجہاں۔

100- کے اور ملیسن، محولہ بالا، جلد دوم، صفحہ 175

101- ایضاً، جلد اول، صفحہ 297

102- پیڈن پاول، بی۔ایچ، The Land Systems of British India، جلد دوم، صفحہ 617

103- کے اور ملیسن، محولہ بالا، جلد دوم، صفحہ 316

104- کوپر ایف The Crisis of the Punjab from May until the fall of Delhi، (لندن 1858ء)، صفحہ 7

105- خارجہ خفیہ مشورہ، نمبر 1-3، 18 دسمبر 1857ء

106- کوپر، محولہ بالا، صفحہ 161

107- ایضاً، صفحہ 162

108- خارجہ خفیہ مشورہ نمبر 79-80، 28 مئی 1857ء

109- پنجاب کے چیف کمشنر کے سیکریٹری کا مراسلہ حکومت ہند کے خارجہ اُمور کے سکریٹری کے نام، 3 اکتوبر 1857ء۔ خارجہ خفیہ مشورہ نمبر 445-452، 18 دسمبر 1857ء کیو براؤن، جے، The Punjab and Delhi in 1857، جلد دوم، صفحہ 200-223

110- خارجہ مشورہ نمبر 87، 89، 29 جنوری 1858ء

111- عدالتی مشورے، 3 ستمبر 1857ء روداد دسمبر 1981A کا اقتباس (مدراس کے ریکارڈ آفس میں فوجی محکمہ 1857ء کی کارروائی کی جلد)

112- مارٹن۔جے۔کمانڈنٹ، محولہ بالا، صفحات 440-445

113- ڈف، اے محولہ بالا، صفحہ 280

114- اقتباس، رسل۔ڈبلیو۔ایچ، محولہ بالا، صفحہ 73

115- کے اور ملیسن، محولہ بالا، جلد دوم، صفحہ 234

116- Freedom struggle in Utter Pradesh، جلد سوم، صفحہ 161

117- ایضاً، جلد اول، صفحہ 374

118- The Friend of India مورخہ 10- ستمبر 1857ء، صفحہ 867، سفر اسلم نمبر 1376، مورخہ 25- ستمبر 1857ء، از قائم مقام چیف سکریٹری، فورٹ سینٹ جارج بنام سی ہیڈن، سکریٹری حکومت ہند، جس میں 150 ویں مدراس نیٹو انفینٹری مقیم مدراس باغیانہ رویے کا ذکر کیا گیا تھا۔

119- ہندوستانیوں پر برطانوی فوجوں کے مظالم اور انگریزوں پر ہندوستانی سپاہیوں کے مظالم کی صرف چند مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ کے A History of Sepoy War in India جلد دوم، صفحات 284، 368، 369 اور بعد کے صفحات۔ رسل، صفحات 43-43 ایڈورڈ ٹامسن Meethu sili of the mèlal، صفحہ 56 خارجہ سیاسی مشورہ، نمبر 28، 30- دسمبر 1857ء (سپلیمنٹ)

120- ہومس، بحولہ بالا، صفحہ 517

121- کے اور ملیسن، بحولہ بالا، جلد پنجم، صفحات 154-155

122- ملیسن، کرنل، جی، بی History of the Indian Mutiny، جلد دوم، صفحہ 541

123- (الف) کانپور میں ہونے والے مظالم میں نانا صاحب کے مبینہ حصے کے متعلق اس بات کو ایک انگریز خاتون مسز ہورنسیٹ کا بیان ثابت کرتا ہے۔ اُس کا داماد، جو برطانوی فوج کا اعلیٰ افسر تھا، ستی چوراہا گھاٹ، کانپور کے حادثے کا شکار ہوا تھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ نانا صاحب نے 108 دوسرے انگریزوں کے ساتھ اُسے بھی باغیوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا تھا اُس نے لکھا ہے "میں نے پہلی مرتبہ اُس شخص کو اس وقت دیکھا تھا۔ اگر کوئی شخص اُس کے متعلق کچھ کہتا ہے یہ اُس کی مرضی ہے لیکن اس قتل عام کے سلسلے میں اُس کو میں ملزم نہیں گردانتی ہوں۔ مجھے تو ایک صاف دل، سیدھا سادا اور خوش اخلاق بتیس سالہ نوجوان معلوم ہوا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر اُس کے حکم کی تعمیل کی جاتی تو نہ کوئی قتل کیا جاتا اور نہ کسی کا مال واسباب لوٹا جاتا۔"

(i) سرگزشت مسز ہورنسیٹ، خانم انگلیسی، در بلوہ ہندوستان (فارسی) مخلوطہ۔ فارسی سے ترجمہ 1311 ہجری (1853ء) اور تہران، از محمد یوسف، اعتماد السلطنت وزیر اطلاعات،

مترجم مخصوصی اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران، ابن محمد جعفر مجرد والو۔
(ii) ایام غدر یعنی مسز ہورنسٹ خانم انگلیسی کی دردناک سرگزشت (مندرجہ بالا کا اردو ترجمہ از مولوی سید جعفر حسین اور مطبوعہ دارالاشاعت پنجاب، لاہور، 1933ء)
(ب) اس طرح جھانسی کی رانی کی بے گناہی 20-اگست 1889ء کو ثابت ہوگئی جب ایک انگریز مارٹن نے اپنے پسر متبنیٰ دمودر راؤ کو لکھا 'تمہاری ماں کے ساتھ نہایت غیر منصفانہ اور بیدردی کا سلوک کیا گیا۔ اُن کے ساتھ کتنا ظلم کیا گیا ہے۔ یہ میرے علاوہ کسی کو نہیں معلوم ہے۔ اُنہوں نے جھانسی کے یورپین باشندوں کے اس قتل عام میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا جو جون 1857ء میں ہوا تھا۔'' پراسنس، جھانسی سنستھان چاپ مہارانی لکشمی بائی، صفحہ 125 سین، محولہ بالا، صفحات 279-280

124- جے ڈبلیو۔ برملے، علی گڑھ کے مجسٹریٹ نے 17-نومبر 1858ء کو لکھا تھا'' کچھ لوگوں کی جانیں حقیقت میں بڑے عجیب انداز سے بچیں۔ جہاں انسانیت سوز کارروائیاں کی جارہی تھیں وہیں کچھ ہندوستانیوں نے بڑی شرافت کا ثبوت دیا۔''

❁❁❁❁❁

اٹھارہ سو ستاون

ابوالکلام آزاد/ ترجمہ: خورشیدہ پروین

آج سے تقریباً پانچ سال قبل انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن (Indian Historical Records Commission) کے سالانہ اجلاس میں، میں نے 1857، کی جسے عام طور پر سپاہیوں کی بغاوت کا نام دیا جاتا ہے، کی ازسرنو تاریخ لکھے جانے پر زور دیا تھا۔ اس وقت بھی مجھے اس بات کا پتہ تھا کہ اس موضوع پر بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اگر ہم ان میں سے صرف مشہور تاریخ دانوں کی کتابوں کو ہی لیں تو ان کی تعداد بھی کافی زیادہ ہے۔ اس کے باوجود مجھے محسوس ہوا کہ ابھی تک اس عظیم جدوجہد کی کوئی معروضی تاریخ نہیں لکھی گئی ہے۔ جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب انگریزوں کے نقطۂ نگاہ کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

ایک عرصے تک اس عظیم جدوجہد کی مقصدیت کو لے کر پورے ہندوستان میں اور باہر بھی عجیب طرح کا تنازعہ بنا رہا۔ اس موضوع پر جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب میں اسے قانون کے مطابق ہی اس وقت کی حکومت کے خلاف ہندوستانی فوج کی بغاوت کا نام دیا گیا ہے۔ انہوں نے یہ تو مانا کہ کچھ ہندوستانی رجواڑوں نے بھی بغاوت کا ساتھ دیا لیکن یہ ایسی حکومتیں تھیں جنہیں لارڈ ڈلہوزی کے ذریعہ قبضہ کئے جانے کی وجہ سے شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ایسے مورخین کا کہنا ہے کہ برٹش حکومت جو اس وقت ملکہ کی قانونی اور جائز حکومت تھی، اس نے بغاوت کو فرو کر دیا اور دوبارہ قانون کی حکومت قائم کر دی۔

اس موضوع پر جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب میں 1857 کے واقعات کو اسی طریقے سے بیان کیا گیا ہے اور اسے کسی دوسرے نقطۂ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ تاہم یہاں یہ

بتانا ضروری ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا جائز حق صرف اتنا ہی تھا کہ وہ مغل شہنشاہ کے دیوان یا ایجنٹ کی حیثیت سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی مالگزاری وصول کرے۔ اس کے بعد سے کمپنی نے جن علاقوں کو حاصل کیا وہ فوج کی فتح کی وجہ سے، لیکن کہیں بھی کمپنی نے شہنشاہ کی ملکیت اور علاقائیت کے اختیار کو چیلنج نہیں کیا اور جب فوج نے کمپنی کے ان حقوق کو ماننے سے انکار کر دیا تو اس نے شہنشاہ سے اس بات کے لئے اپیل کی۔ اس لئے یہ بحث کا موضوع بن سکتا ہے کہ کیا ہندوستانی افواج کی بغاوت کو ملک کی مستحکم حکومت کے خلاف بغاوت یا غداری کا نام دیا جا سکتا ہے؟ یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ جہاں زیادہ تر مصنفین نے ہندوستانی عوام اور خواص کے ذریعہ یوروپین مرد عورت اور بچوں پر کئے گئے مظالم کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے، وہاں بہت کم لوگوں نے اتنی ہی تفصیل سے ہندوستانیوں پر کئے گئے انگریزوں کے مظالم کو بیان کیا ہے۔

میرا اپنا خیال ہے کہ بیسویں صدی کی ابتداء میں اس بغاوت کے سلسلہ میں تین جلدوں پر مشتمل جو تاریخ لکھی گئی، اس کا ذکر ضروری ہے۔ یہ تاریخ بھی مکمل طور پر انہیں دستاویزوں پر مشتمل ہے جو امپیریل ریکارڈس ڈیپارٹمنٹ کے آرکائیوز میں موجود تھی اور جسے اب نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کا نام دیا گیا ہے اور یہ ایک عام بات ہو گئی ہے کہ پچاس سال کے بعد سبھی سرکاری دستاویزوں کو ریسرچ اسکالر کو دکھا دیا جاتا ہے۔ یہ بات بھی یونائیٹڈ برٹین کے اس فیصلے کے بعد رائج ہوئی جو نپولین سے جنگ کے بعد برٹش حکومت نے کیا تھا اور یورپ کے دوسرے ممالک نے بھی یہی رویہ اختیار کیا۔ 1907 میں ہندوستانی بغاوت کے پچاس سال پورے ہوئے اور شاید اس وقت کی حکومت نے محسوس کیا کہ 1857 کی تاریخ سرکاری دستاویزوں کو لے کر لکھی جائے جو اب ریسرچ کے لئے سبھی کو حاصل ہونے والی تھی۔

یہ تاریخ بھی اگرچہ آفیشل ریکارڈ پر مبنی ہے اور اسی طرح سے اس جدوجہد کو بیان کرتی ہے جس طرح انگریزی مصنفین کی لکھی ہوئی کتابیں۔ اس کتاب کی اشاعت میں صرف ایک نیا پہلو سامنے آیا ہے۔ مصنف نے واضح طور پر اظہار کیا ہے کہ جہاں تک اودھ کا تعلق تھا یہاں کی جنگ میں قومی سطح پر بغاوت کے آثار پائے جاتے تھے۔ حال ہی میں کمپنی نے ایک ہندوستانی بادشاہ سے بہت کچھ چھینا تھا اور عوام اس حملے کے زبردست مخالف ہو گئے تھے۔ اور اس لئے وہ کمپنی کے خلاف بغاوت کرنے کو اپنا جائز حق سمجھتے تھے کیونکہ کمپنی نے اودھ کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔ تاہم

اودھ کی بغاوت میں قومی پیمانے پر بغاوت کی چنگاری کا پایا جانا کوئی نیا انکشاف نہیں تھا کیونکہ لارڈ کیننگ نے بھی اپنے سرکاری مراسلوں میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اودھ کی جدوجہد ایک طرح سے قومی پیمانے کی مزاحمت تھی۔ اس لئے کتاب ہذا کے مصنف کو ان باتوں کو دہرانے میں کوئی قباحت نہیں ہوئی، جس کا اعتراف خود لارڈ کیننگ پہلے کر چکا تھا۔ مصنف نے یہ بھی کہا ہے کہ شاید اودھ کے تعقلداروں کے ساتھ اودھ پر قبضے کے بعد جو رحم دلی دکھائی گئی تھی غالباً وہ اسی حقیقت کے اعتراف میں تھی۔

جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں میں نے محسوس کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ 1857 کی تحریک کی ایک نئی اور معروضی تاریخ لکھی جائے۔ 1954 کے موسم خزاں میں میرا ذہن اس موضوع کی طرف دوبارہ متوجہ ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ بغاوت کے صد سالہ جشن کے دوران ہی وہ مناسب موقع ہوگا جب اس کی نئی اور عالمانہ تاریخ لکھی جائے۔ بغاوت کی پہلی چنگاری 10 مئی 1857 کو پھوٹی تھی اس لئے 10 مئی 1957 ہی وہ نیک ساعت ہوگی جب اس جدوجہد کی مکمل اور جامع تاریخ شائع کی جائے۔

II

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اب ان واقعات کو معروضی طریقے پر، جس نے ماضی میں جذبات کو بہت زیادہ مشتعل کر دیا تھا، تفصیل سے لکھنا مشکل کام ہے اور کسی ایک شخص کے لئے یہ آسان بھی نہیں کہ وہ اس میں توازن برقرار رکھ سکے کیوں کہ وہ خود بھی ذاتی رنگ و نسل اور قومیت کے جذبے سے متاثر ہوتا ہے، تاہم اس کی لگاتار کوشش جاری رہنی چاہئے اگر وہ صحیح معنوں میں مورخ بننا چاہتا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ ہندوستان کی آزادی سے قبل اس تحریک کی معروضی تاریخ لکھنا اور بھی مشکل کام تھا۔ اب آج اس کام کو آسان بنانے والے دو اہم محرکات ہیں۔ جن واقعات کو اب بیان کرنا ہے وہ سو سال پہلے وقوع ہوئے تھے، ان کے ساتھ اس وقت جو جذبہ کارفرما تھا، وہ اب تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اب ہم خاص کرداروں کی نفرتوں اور کشمکش کا آسانی سے مطالعہ کر سکتے ہیں کیونکہ اب انہیں کافی وقت گزر چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان واقعات سے سیاسی فائدہ اٹھانے کا لالچ بھی اب ختم ہو چکا ہے۔ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان سیاسی مسئلہ حل کر لیا

گیا ہے اور یہ مسئلہ بات چیت اور معاہدوں کے ذریعے حل کیا گیا ہے۔ جس سے دونوں ملکوں کے درمیان خیر سگالی کا نیا رشتہ بنا ہے۔ وہ تلخیاں جو ماضی میں ہندوستان اور برٹش تعلقات کے درمیان پائی جاتی تھیں، اب ختم ہو گئی ہیں۔ آج کے حالات ایسے ہیں کہ 1857 کے واقعات بغیر کسی تعصب کے معروضانہ طریقے پر بیان کئے جاسکتے ہیں اور اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ جدو جہد میں شامل کسی ایک پارٹی کی غلطی کو معاف کیا جائے اور دوسرے میں غلطی نکالی جائے۔

یہ بھی غور طلب بات ہے کہ اس زمانے کے کسی بھی ہندوستانی نے کوئی ایسی بات تحریر نہیں کی جسے ہندوستانی نقطہ نگاہ سے جدو جہد کی تفصیلات کا نام دیا جا سکے۔ لیکن جب ہم اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ بات حیرت انگیز بھی نہیں لگتی۔ ہم جانتے ہیں کہ بہت زیادہ پُر تشدد طریقے سے اس جدو جہد کو کچلا گیا تھا اور کئی سالوں تک ہندوستان میں دہشت کا ماحول بنا رہا۔ بغیر مقدمہ چلائے سینکڑوں آدمیوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ شمالی ہند کا شاید ہی کوئی ایسا علاقہ ہو جہاں پر رسیوں سے بندھی لاشیں نہ لٹکتی رہی ہوں۔ وہ عوام کو یہ یاد دلاتی رہیں کہ حکومت ایسے انتقام لیتی ہے۔ اس لئے کسی ہندوستانی کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ 1857 کے واقعات کے بارے میں آزادانہ طریقے پر کچھ بول سکے یا لکھ سکے۔ کچھ ایسے ہندوستانیوں نے جو انگریز حکومت کے حمایتی یا ملازم تھے، انہوں نے چند تفصیلات ضرور چھوڑی ہیں لیکن کوئی بھی ایسا شخص جو نڈر ہو کر ان کے بارے میں لکھنا چاہتا، اس کے اندر ایسی ہمت نہیں تھی۔

ہندوستانی ذہن کس طرح تشدد سے خوفزدہ تھا، اس کی مثال صرف ایک شخص مرزا معین الدین سے دی جاسکتی ہے۔ وہ بغاوت کے وقت دلّی کے مضافات میں پولیس کے سب انسپکٹر تھے۔ وہ فارس بھاگ گئے اور دو سال کے بعد واپس آئے۔ سر مٹکاف کے کہنے پر، جس کی زندگی اس نے بغاوت کے وقت بچائی تھی، انہوں نے اپنے تجربات پر مبنی کچھ واقعات کو قلم بند کیا، لیکن یہ مسودہ انہوں نے مٹکاف کو اس شرط پر دے دیا کہ جب تک وہ زندہ ہیں، اسے شائع نہ کیا جائے۔ ان کے اس مسودے میں سرکار کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں ملتا۔ اس میں انہوں نے ان حالات سے نبٹنے میں کیا رول ادا کیا، صرف اسی کی تفصیل ملتی ہے۔ اس وقت بھی ان کے دماغ پر اتنا خوف طاری تھا کہ صرف مندرجہ بالا شرائط کے تحت ہی انہوں نے سر مٹکاف کو اپنا مسودہ دیا جس نے ان سے کئے گئے وعدے کا لحاظ کیا اور معین الدین کی موت کے بعد ہی اس نے اس کا انگریزی میں

ترجمہ کرایا۔ یہ کتاب مٹکاف کی زندگی میں بھی شائع نہیں ہو سکی۔

III

یہ سوال اکثر کیا جاتا ہے کہ اس بغاوت کے لئے کون لوگ ذمہ دار تھے۔ اس طرح کا مشورہ دیا گیا ہے کہ کچھ ایسے لوگ تھے جنہوں نے مل کر منصوبہ بنایا اور ایسی اسکیم وضع کی جس کے تحت اس تحریک کی ابتدا ہوئی تھی۔ میں اس بات کا اعتراف ضروری سمجھتا ہوں کہ اس پہلو پر مجھے شک ہے کیونکہ غدر کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی برٹش حکومت نے اس بات کی بہت زیادہ تفتیش کی تھی کہ اس بغاوت کے اسباب کیا تھے۔ لارڈ سیلس بری نے ہاؤس آف کامنس میں یہ بیان دیا تھا کہ وہ اس بات کو قبول کرنے کے لئے قطعی تیار نہیں کہ اتنے وسیع پیمانے پر پھیلی اتنی طاقت ور تحریک صرف چربی ملی گولی کو لے کر پیدا ہوئی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ جو کچھ سطح پر نظر آتا ہے اس کے پس پشت کچھ اور بھی باتیں تھیں۔ حکومت ہند اور پنجاب کی حکومت نے بھی اس سوال کا مطالعہ کرنے کے لئے بہت سے کمیشن بنائے۔ اس زمانے میں پھیلی سبھی افواہوں کا بغور مطالعہ کیا گیا۔ ایک کہانی یہ بھی مشہور ہوئی تھی کہ چپاتیوں کے اندر رکھ کر اطلاعات بھیجی گئیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک پیشین گوئی تھی کہ ہندوستان میں برٹش حکومت کا خاتمہ جون 1857 میں پلاسی کی جنگ کے سو سال پورا ہونے پر ہو جائے گا۔ بہت زیادہ تفتیش اور جانچ پڑتال کے بعد بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ یہ بغاوت پہلے سے منصوبہ بند تھی اور یہ کہ فوج اور ہندوستانی عوام اس سازش میں مشترکہ طور پر شامل تھے کہ وہ کمپنی کی حکومت کو اکھاڑ پھینکیں۔ میرا یہی خیال ایک زمانے سے تھا اور بعد میں اس سلسلہ میں جو بھی ریسرچ کی گئی اس سے کوئی نئی حقیقت ایسی سامنے نہیں آئی جس سے میرے خیالات میں کوئی تبدیلی ہو سکے۔

بہادر شاہ ظفر مقدمے میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ وہ پہلے سے سوچی سمجھی سازش میں شامل تھے۔ جو بھی گواہیاں پیش کی گئیں، ان سے وہ برٹش حکمراں بھی مطمئن نہیں ہو سکے جو مقدمہ چلا رہے تھے اور اس طرح کی افواہوں کو ہر ذی شعور آدمی صرف افواہ سمجھنے پر مجبور ہے، بلکہ مقدمے کے دوران بھی صرف یہی بات سامنے آئی کہ تحریک سے نہ صرف خود بہادر شاہ بلکہ انگریز بھی حیرت میں پڑ گئے تھے۔

IV

اس صدی کے ابتدائی سالوں میں کچھ ہندوستانیوں نے بھی اس جدوجہد کے بارے میں لکھا ہے۔ لیکن اگر سچ بات کہنی ہو تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ جو بھی کتابیں انہوں نے لکھی ہیں، وہ تاریخ نہیں ہیں بلکہ سیاسی پروپیگنڈہ ہیں۔ ان کے مصنفین نے اس جدوجہد کو ہندوستان کی آزادی کی منصوبہ بند جنگ کا نام دیا ہے جسے ہندوستانی امراء نے برٹش حکومت کے خلاف چلایا تھا۔ انہوں نے چند افراد کو اس بغاوت کو منظم کرنے کا بھی ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ یہ کہا گیا کہ نانا صاحب جو پیشوا باجی راؤ کا جانشین تھا، اس نے تمام ہندوستانی فوجی تنظیموں سے تعلقات استوار کر کے اس کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ نانا صاحب لکھنو اور انبالہ مارچ اور اپریل 1857 میں گئے تھے اور اس کے بعد مئی 1857 میں اس جدوجہد کا آغاز ہوا۔ صرف اتنی سی بات کو اس بات کے لئے وافر ثبوت نہیں مانا جا سکتا۔

اس طرح کے خیالات کس قدر بے بنیاد اور افواہ پر مبنی ہیں، یہ اس وقت واضح ہو جاتا ہے جب اس طرح کے مورخین اودھ کے وزیر علی نقوی خاں کو اس جنگ کے لئے خاص سازش کرنے والا بتاتے ہیں۔ جس کسی نے بھی اودھ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اسے حد سے زیادہ مضحکہ خیز سمجھے گا کیونکہ علی نقی خاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پٹھو تھے۔ یہ وہی شخص تھا جس پر انگریزوں نے اعتماد کر کے انہیں واجد علی شاہ کو اس بات کے لئے تیار کرنے کو کہا تھا کہ وہ اپنی حکومت کو اپنی مرضی سے انگریزوں کے سپرد کر دیں۔ بلکہ برٹش ریزیڈنٹ جنرل آوٹ رام نے علی نقی خاں سے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو انہیں بہت زیادہ انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ علی نقی خاں اپنے اس منصوبے کے لئے اس طرح سے جی توڑ کوشش کر رہے تھے کہ واجد علی شاہ کی ماں کو یہ خوف پیدا ہوا کہ اس طرح کسی بہانے سے وہ تخت حاصل کر لے گا۔ اس لئے انہوں نے حکومت کی مہر کو فوری طور پر اپنے قبضے میں کر لیا اور زنان خانہ میں اسے رکھا اور یہ حکم جاری کر دیا کہ ان کی اجازت کے بغیر یہ کہیں نہیں جا سکتی۔ یہ ساری باتیں لکھنو کے عوام کو معلوم تھیں اور اسی لئے وہ علی نقی خاں کو غدار کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ اس لئے یہ کہنا کہ ایسا شخص بغاوت کے پس پردہ سب سے بڑا سازشی تھا، بالکل ہی غلط ہو جاتا ہے۔

یہ بھی کہا گیا کہ منشی عظیم اللہ خاں اور رنگو باپو جی دونوں نے مل کر اس بغاوت کا منصوبہ بنایا تھا۔ عظیم اللہ خاں، نانا صاحب کا ایجنٹ تھا اور نانا صاحب نے اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے انہیں لندن بھیجا تھا تا کہ وہ ان کے لئے وہ پنشن حاصل کر سکے جو باجی راؤ کو دی جا رہی تھی۔ ہندوستان واپس آنے سے پہلے وہ ترکی گئے جہاں کریمیا کی جنگ میں ان کی ملاقات عمر پاشا سے ہوئی۔ اسی طرح رنگو باپو جی بھی ڈلہوزی کے فیصلے کے خلاف، جس کے مطابق ستارہ کو برٹش حکومت میں شامل کرلیا گیا تھا، اپیل کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔

صرف اتنی سی بات کو کہ وہ الگ الگ مقاصد کے تحت لندن گئے تھے، یہ مان لیا گیا ہے کہ ان دونوں نے مل کر وہاں اس طرح کی سازش رچی۔ یہاں یہ بات بالکل صاف ہونی چاہئے کہ اس طرح کی قیاس آرائیوں کو شہادت نہیں مانا جا سکتا۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان باتوں پر انہوں نے لندن میں کوئی بات بھی کی تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا کہ اس بغاوت کے وہی محرک تھے، جب تک کہ ہندوستان میں بعد میں ہونے والے واقعات کا سلسلہ ان سے نہ مل جائے۔ ایسے رشتوں کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کسی ریکارڈ یا گواہی کی عدم موجودگی میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس بغاوت کے لئے انہوں نے کوئی سازش رچی تھی۔ کانپور کے نزدیک بٹھو پر قبضہ ہونے کے بعد انگریزوں نے نانا صاحب کے سبھی کاغذات اپنے قبضہ میں کر لئے تھے۔ ان کاغذات میں ایک خط عمر پاشا کے نام بھی تھا جو انہیں کبھی نہیں بھیجا گیا۔ اس خط میں انہیں اطلاع دی گئی تھی کہ ہندوستانی فوجیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ نہ تو اس خط میں اور نہ عظیم اللہ خاں کے دوسرے کاغذات میں ایسا کوئی اشارہ ملتا ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ انہوں نے اس بغاوت کے لئے کوئی سازش کی تھی۔

جو بھی ثبوت موجود ہیں ان سے ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں کہ 1857 کی بغاوت نہ تو کسی منصوبہ بند سازش کا نتیجہ تھی اور نہ ہی اس کے پیچھے کوئی سازشی دماغ کام کر رہا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا وہ صرف اتنا کہ کمپنی کی سو سالہ حکومت کے دوران ہندوستانی عوام اس سے ناراض ہو چکے تھے کیونکہ کمپنی نے شروع میں یہ عمل دخل نواب یا شہنشاہ کے نام پر دینا شروع کیا اور بہت دنوں تک ہندوستانیوں کو یہ محسوس ہی نہیں ہو سکا کہ غیر ملکی لوگوں نے یہاں کا اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ اور جب انہیں یہ احساس ہوا کہ خود اپنے ملک میں انہیں غلام بنا لیا گیا ہے تو ایسے حالات پیدا ہو

گئے کہ وہ اس کے خلاف آواز اٹھا سکیں۔

V

اگر یہ پوچھا جائے کہ اس بغاوت کے پھیلنے میں سو سال کی مدت کیوں لگی؟ تو اس کا جواب مندرجہ ذیل حقائق میں مل جائے گا۔ ہندوستان میں برٹش طاقت کے فروغ جیسی کوئی دوسری مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ کسی ایک ملک کے ذریعہ کسی دوسرے ملک پر فوری طور پر فتح پا کر قابض ہونے کا معاملہ نہیں ہے بلکہ کسی ملک میں دھیرے دھیرے داخل ہونے کی کہانی ہے جس میں خود ملک کے عوام نے حملہ آوروں کی مدد کی۔ یہ حقیقت بھی کہ انگریزوں نے فتح برٹش تاج کے نام پر نہیں حاصل کی اور اس وجہ سے وہ اپنے اصل مقصد پر پردہ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر برطانیہ کی حکومت نے شروع سے ہی ہندوستانی معاملات میں دخل اندازی کی ہوتی تو ہندوستانیوں کو یہ احساس ہو جاتا کہ ایک غیر ملکی طاقت ملک میں داخل ہو رہی ہے۔ چونکہ یہ ایک تجارتی کمپنی تھی، اس لئے لوگوں نے اسے اصل حکمراں نہیں سمجھا۔ اسی لئے کمپنی ایجنٹس نے اپنا معاملہ اس طرح طے کیا جس طرح کوئی اور غیر ملکی حکمراں کے ایجنٹس نہیں کر سکتے تھے۔ برٹش تخت کا کوئی بھی ایجنٹ مغل دربار کے شہزادوں اور بااثر لوگوں کے اشارے پر کام کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا۔ کمپنی کے ایجنٹ کو اس طرح کی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے اہل کاروں کے سامنے بھی اسی طرح جھک جاتے جیسے ہندوستانی تجارت پیشہ لوگوں کے سامنے۔ انہوں نے رشوت بھی دی اور بہت سی بدعنوانیاں بھی کیں۔ اور انہیں کبھی یہ خوف نہیں ہوا کہ ان کا بادشاہ انہیں اس کام کے لئے سزا دے گا۔

یہ بھی نوٹ کرنے کی بات ہے کہ کمپنی نے کبھی کوئی مداخلت اپنے نام سے نہیں کی۔ اس نے ہمیشہ اپنے مفاد کو آگے رکھنے کے لئے کسی مقامی سردار کا سہارا لیا۔ اس طرح کمپنی نے جنوب میں کرناٹک کے نواب کے دعوے کی حمایت کرتے ہوئے اپنی طاقت بڑھائی۔ اسی طرح بنگال میں اس نے مرشد آباد کے نواب ناظم کے نام اور حکم کے تحت اپنے اختیارات وسیع کئے۔ حد تو یہ ہے کہ جب بنگال کی اصل حکمرانی اس کے ہاتھ آئی تو بھی اس نے اپنے کو خودمختار حکمراں نہیں سمجھا۔ لارڈ کلائیو نے شہنشاہ سے درخواست کی کہ اسے دیوانی کے اختیارات دے دیئے جائیں اور کئی دہائیوں تک کمپنی نے شہنشاہ کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کیا۔ یہی نہیں بلکہ کمپنی نے

دوسرے صوبے کے گورنروں اور صوبے داروں کے قوانین کی بھی اتباع کی۔صوبوں میں گورنروں کی اپنی مہر ہوا کرتی تھی لیکن انہوں نے خود کو ہمیشہ مغل شہنشاہ کا خادم ہی بتایا۔ کمپنی کے گورنر جنرل کی بھی اپنی مہر ہوتی لیکن اس نے بھی اپنے کو ہمیشہ دلی کے شہنشاہ شاہ عالم کا کادم ہی بتایا۔ گورنر اور صوبیدار دلّی میں شہنشاہ کی آمد کے منتظر رہتے اور جب وہ لوگوں کے سامنے آتا تو جھک کر ان کی تعظیم کرتے، اسے ہدیہ اور تحائف پیش کرتے اور پھر بعد میں شہنشاہ سے خلعت حاصل کرتے۔ گورنر جنرل نے بھی اسی طرح شہنشاہ کی تعظیم کی اور 101 اشرفیوں کی نذر پیش کی۔ اس کے جواب میں شہنشاہ نے انہیں خلعت اور خطاب سے نوازا اور یہ خطاب گورنر جنرل ہمیشہ سارے دستاویزوں میں استعمال کرتا۔ اس طرح ملک میں شہنشاہ کی بادشاہت کا بھرم قائم رکھا گیا۔ لوگوں کو بہت بعد میں یہ احساس ہوا کہ خود کمپنی دھیرے دھیرے اس ملک پر بااختیار حکمراں ہوتی جارہی ہے۔

یہ سلسلہ 19 ویں صدی کی دو دہائیوں تک چلتا رہا۔ اس وقت تک کمپنی کی حکومت دریائے ستلج تک وسیع ہو چکی تھی۔ تب اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ ہسٹنگز کو یہ خیال ہوا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ خود اپنی طاقت کا مظاہرہ کرے اور دھیرے دھیرے شہنشاہ سے اپنا رشتہ منقطع کرلے۔ اس سلسلہ میں اس نے پہلی چال یہ چلی کہ جب کبھی وہ شہنشاہ کے سامنے آئے تو اسے بیٹھنے کی اجازت ملے اور اس کو نذرانے کی روایت سے مستثنیٰ کیا جائے۔ شہنشاہ نے اس کی ان دونوں درخواستوں کو مسترد کر دیا اور کچھ وقتوں تک گورنر جنرل نے کوئی اصرار بھی نہیں کیا۔

پھر کمپنی نے شہنشاہ کی طاقت گھٹانے کے لئے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو دلی سے آزاد ہونے کے لئے اکسایا۔ اس سلسلہ میں حیدرآباد کے نظام سے پہل کی گئی۔ اس سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی خودمختار بادشاہت کا اعلان کر دے۔ نظام اس سے متفق نہیں ہوئے۔ لیکن انگریزوں کو ایسا ایک سہارا اودھ کے نواب وزیر سے مل گیا۔ اودھ نے فوری طور پر بادشاہ کے زیر اثر صوبے سے آزاد ہونے کا اعلان کر دیا اور پھر شہنشاہ سے ساری وفاداری منقطع کر لی۔

1835 تک کمپنی نے اپنے کو خود اتنا مضبوط کر لیا کہ اس نے پہلی بار اپنے سکّے ڈھالے جس میں بادشاہ کا نام نہیں دیا گیا۔ بہت سے لوگوں کو اس سے صدمہ ہوا۔ تب انہیں احساس ہوا کہ شہنشاہ کے ایجنٹ یا تجارت سے نکل کر کمپنی خود ہندوستان کے ایک وسیع علاقے کی مالک بن بیٹھی

ہے۔ 1835 میں ہی ایک فیصلہ اور ہوا کہ عدالتوں کی زبان فارسی کی بجائے انگریزی کر دی جائے۔ان سب عوامل سے لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اب کمپنی کے رتبے میں تبدیلی آ گئی ہے۔اس احساس سے لوگوں کے دماغ پریشان ہو گئے۔اور پریشانی صرف عوام کو ہی نہیں بلکہ مسلح افواج کے لوگوں کو بھی لاحق ہو گئی۔

انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں حالات کا اندازہ ہمیں اس مطالعے سے ہو سکتا ہے جسے ایک معروف برٹش شہری نے اس زمانے میں پیش کیا تھا۔عزت مآب فریڈرک جان شور، سر جان شور کے لڑکے تھے اور مختلف حیثیتوں سے بنگال پریزیڈنسی میں گمنام طریقے سے بہت سے مضامین لکھے۔ یہ انڈین گزٹ کلکتہ سے نکلنے والا ایک روزنامہ تھا اور اس نے 1837 میں ان مضامین کو جمع کر کے 'انڈین افیرز' پر نوٹس کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔اس کتاب کے پڑھنے سے اس زمانے میں ہندوستانیوں کے ذہن کی مکمل عکاسی ہو جاتی ہے۔اس نے بار بار اس بات کو دہرایا کہ گرچہ ظاہری طور پر ہر طرف امن وامان قائم ہے لیکن یہ حالات اس ڈائنامائٹ کی طرح ہیں جن میں ذرا سی چنگاری سے ہر طرف آگ کے شعلے نظر آنے لگیں گے۔ یہ وہی بڑھتی ہوئی بے چینی تھی جو 1857 کی بغاوت کی شکل میں تبدیل ہوئی۔

اس بے چینی کو دو عوامل کی وجہ سے بغاوت میں تبدیل ہونے میں کوئی وقت نہیں لگا۔ایک تو وہ نئی پالیسی تھی جسے مسٹر تھامسن شمالی مغربی صوبے کے لیفٹینینٹ گورنر (بعد میں آگرہ اور اودھ) نے وضع کیا تھا۔شروع میں کمپنی نے اس پالیسی کی حمایت کی تھی کہ زمین داروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جائے جو ہمیشہ سرکار کے حمایتی رہے۔تھامسن کا خیال اس سے جدا تھا۔اس کا خیال تھا کہ بڑے بڑے امراء اور زمینداروں کا وجود کمپنی کے لئے کبھی بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔اس کا خیال تھا کہ اس لئے ایک طبقے کی حیثیت سے زمینداروں کو ختم کیا جانا چاہئے اور سرکار کو چاہئے کہ وہ رعایا سے خود اپنا تعلق قائم کرے۔اس نئی پالیسی کے نتیجہ میں کمپنی نے ہر حیلہ اور بہانے سے کام لیا کہ کسی طرح امراء اور زمینداروں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر دیا جائے، خاص طور سے یہ کہہ کر کہ وہ خود سرکار کے تحت کاشتکار ہیں۔

سب سے زیادہ فیصلہ کن وہ دوسری پالیسی تھی جسے ڈلہوزی نے وضع کیا تھا اور جس میں رفتہ رفتہ ایک کے بعد ایک ہندوستانی ریاستوں کو برٹش علاقے میں شامل کیا جا رہا تھا۔اس میں

ہندوستان، امراء کے آخری دور سے گزر رہا تھا۔ امراء اور زمینداروں کے تحت لوگوں کی وفاداری صرف اپنے امیر یا زمینداروں سے ہوتی۔ اس وقت ملک یا قوم سے وفاداری کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ ایک کے بعد ایک ہندوستانی ریاستوں کو انگریزوں کا باجگزار بنایا جا رہا ہے اور رفتہ رفتہ زمینداری کے نظام کو ختم کیا جا رہا ہے تو اس سے بھی انہیں بہت دھکا لگا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اب کمپنی اپنے اصل رنگ میں سامنے آ رہی ہے اور وہ دھیرے دھیرے ہندوستانی سماجی اور سیاسی نظام کو تبدیل کرتی جا رہی ہے۔ یہ بے چینی اپنے عروج کو اس وقت پہنچی جب اودھ پر کمپنی نے قبضہ کر لیا۔ اودھ ایک ایسا صوبہ تھا جو ستر سالوں سے کمپنی کا حلیف تھا۔ اس پورے عرصے میں اودھ نے کبھی بھی برٹش مفاد کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ اس کے باوجود جب کمپنی نے بادشاہ کو تخت چھوڑنے کے لئے مجبور کیا اور سلطنت پر اپنا قبضہ کر لیا تو لوگوں کو بہت زیادہ صدمہ پہنچا۔

اودھ کی شکست کا سب سے بُرا اثر آبادی کے اسی علاقے پر پڑا کیونکہ بنگال آرمی کے زیادہ تر فوجی اسی علاقے سے بھرتی کئے جاتے تھے۔ انہوں نے کمپنی کی ہر طرح سے وفاداری کے ساتھ خدمت کی تھی اور ملک کے وسیع علاقے میں اس کی حکومت قائم کرنے میں معاون رہے تھے۔ انہیں بھی اچانک احساس ہوا کہ ان کی خدمات کی بدولت کمپنی کو جو اختیار حاصل ہوا ہے اس کا استعمال انہوں نے خود ان کے بادشاہ کو ختم کرنے میں کیا ہے۔ میرے دل میں ذرا بھی اس بات کے لئے شک نہیں ہے کہ 1856 میں جب اودھ پر قبضہ کیا گیا اسی وقت سے فوجیوں میں اور خصوصاً بنگال آرمی میں بغاوت کا موڈ پیدا ہو گیا تھا اور یہیں سے لوگوں نے سوچنا شروع کیا کہ اب کمپنی کی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کا وقت آ گیا ہے۔ بغاوت کے دوران لارنس اور دوسروں نے عام سپاہی کے خیالات کو جاننے کی کوشش کی اور اس نظریے کی حمایت میں بہت سے شواہد موجود ہیں۔ چربی ملی گولیوں کی فراہمی سے فوج میں کوئی بے چینی نہیں پیدا ہوئی لیکن اس نے یہ موقع ضرور فراہم کر دیا کہ دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن کر سامنے آ گئی۔

VI

ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانیوں کے جذبات کا بہت لحاظ کرتی تھی۔ اس نے

ہندوستانی احساسات کا پورا لحاظ رکھا اور اونچی ذات کے لوگوں کے ساتھ بہت اچھا رویہ روا رکھا۔ گورنر جنرل کونسل کے ممبران کی ایک روایت یہ رہی کہ وہ امراء کا اپنے دروازے تک آ کر استقبال کرتے، واپسی میں انہیں رخصت کرنے بھی جاتے اور ایسا ہر اس شخص کے ساتھ کیا جاتا جس کا سماج میں کوئی مرتبہ ہوتا۔ جیسے جیسے وہ طاقت ور ہوتی گئی، اس نے ہندوستانی جذبات کا خیال رکھنا چھوڑ دیا۔ نئے نئے قوانین وضع کئے گئے اور اس بات کا کوئی خیال نہیں کیا گیا کہ اس پر ہندوستانیوں کا تاثر کیا ہوگا۔ تاہم اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ اس نے اس طرح کی حرکت اپنی لاعلمی کی وجہ سے کی نہ کہ کسی تحقیر آمیز جذبے سے۔ سارے معاملات کا نظم گورنر جنرل ایک کونسل کی مدد سے کرتے جس کے سبھی ممبران صرف انگریز ہوتے۔ شاید کونسل میں کسی ہندوستانی کو شامل کئے جانے کا خیال ہی خود کونسل کے لئے بہت حیرت انگیز ہوتا اور کوئی ایسا نمائندہ ادارہ بھی نہیں تھا جس سے حکمراں رعایا کے تاثرات کو سمجھ سکتے۔ اس طرح لوگوں کے خیالات سے واقف ہونے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کمپنی اور اس کی رعایا کے درمیان خلیج بڑھتی ہی گئی۔

VII

1857 کے واقعات کے ضمن میں مختلف بیانات پڑھنے کے بعد چند نتائج آسانی سے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ یہ سوال خود بخود ہی پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بغاوت صرف قومیت کے احساس کی وجہ سے پھیلی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں حصہ لینے والے لوگ قومیت کے جذبے سے سرشار تھے لیکن یہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ جس سے کوئی بغاوت پھیل سکتی۔ حب الوطنی کے جذبے کو لوگوں کے مذہبی جذبات بھڑکا کر تقویت پہنچائی گئی اور لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ چربی ملی گولی کی تشہیر اس کی ایک مثال ہے۔ دوسرے طریقوں سے بھی سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کیا گیا۔ اس کے بعد ہی وہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

جہاں تک چربی ملی گولی کا سوال ہے، فورٹ ولیم میں ملی دستاویزات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کمپنی کے خلاف یہ الزام انصاف پر مبنی تھا لیکن اس کے علاوہ مذہبی مداخلت کے دوسرے الزامات بے بنیاد تھے۔ یہ افواہ بھی بہت آسانی سے پھیلائی گئی کہ کمپنی نے ستی کی رسم کو اس لئے

ممنوع قرار دیا کہ وہ ہندو مذہب سے نفرت کرتی تھی۔ اس الزام کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ ستی کی رسم کو اس لئے ممنوع قرار دیا گیا کہ حکمراں طبقہ اور ہندوستان کے روشن خیال لوگوں کو بھی، جن کی قیادت راجہ رام موہن رائے کر رہے تھے، یہ احساس ہوا کہ یہ ایک غیر انسانی فعل ہے۔ کوئی بھی مہذب حکومت اسے برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ انسانوں کو زندہ جلا دیا جائے۔ اب چونکہ اس جدوجہد کا جوش ختم ہو گیا ہے تو کوئی بھی ہندوستانی اس بات کو وافر جواز نہیں سمجھے گا کہ ستی پر لگائی جانے والی پابندی کمپنی کے خلاف بغاوت کا پیش خیمہ تھی۔

اسی طرح یہ الزام بھی بے بنیاد تھا کہ کمپنی گائے کی ہڈیوں کا سرمہ بنا کر آٹے میں ملا رہی ہے تاکہ ہندو سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ کوئی بھی باشعور آدمی آج اس الزام کو نہیں مانے گا۔ لیکن جس وقت یہ افواہ پھیلائی گئی تو بہت سے فوجیوں کو اس پر یقین ہو گیا اور فوجیوں کی بغاوت میں اس نے فلیتے کا کام کیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے فیصلہ کیا کہ ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم دی جائے اور اس کے لئے انہوں نے بہت سے اسکول اور کالج کھول دیئے۔ یہ کام بھی روشن خیال ہندوستانیوں کی مانگ کی وجہ سے کیا گیا تھا۔ تاہم عام لوگوں نے اس قدم کو بھی یہ سمجھا کہ یہ ہندوستانیوں کو عیسائیت قبول کرانے کے لئے کیا گیا ہے۔ ان تعلیم گاہوں کے اساتذہ کو کالا پادری کا نام دیا گیا اور انہیں سماج میں حقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ لیکن آج کوئی آدمی یہ قبول نہیں کرے گا کہ ان تعلیمی اداروں کی بدولت بغاوت پھیلی۔

VIII

اب 1857ء کے واقعات کو پڑھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوں کہ اس وقت ہندوستانیوں کا قومی کردار بہت پست ہو چکا تھا۔ بغاوت کی قیادت کرنے والے کبھی ایک دوسرے کے ہمنوا نہیں ہو سکے۔ وہ آپس میں رقابت کا جذبہ رکھتے اور ایک دوسرے کے خلاف ہمیشہ سازش کرتے رہتے۔ انہیں کبھی یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ ان کی نا اتفاقی کا بُرا اثر اس کام پر بھی پڑے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لوگوں کی ایک دوسرے سے حسد اور سازش ہی ہندوستانیوں کی شکست کا سب سے بڑا سبب بنا۔

اس جدّ وجہد کے آخری دور میں بخت خاں نے دلّی کی کمان سنبھالی، وہ بہت ایماندار آدمی تھا اور وہ فتح حاصل کرنے کے لئے بے چین بھی تھا، جب کہ دوسرے فوجی سربراہوں نے اس کی شکست کا سامان مہیا کیا اور جب وہ لڑنے کے لئے آگے بڑھا تو ان لوگوں نے اسے کوئی تعاون نہیں دیا۔

یہی حالات لکھنو میں بھی تھے۔ ہندوستانی فوجیوں نے ریزیڈنسی کا محاصرہ کر لیا تھا۔ لیکن سپاہیوں نے محسوس کیا کہ اگر ایک بار وہ اس پر قبضہ کر لیتے ہیں تو پھر حکومت یا اودھ کی ملکہ کو ان کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس لئے ان کی خدمات اسی وقت تک درکار ہیں جب تک یہ جنگ چلتی رہے۔ اسی لئے سپاہیوں نے کبھی فیصلہ کن فتح پانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

اس کے برخلاف انگریزوں نے ملکہ عالیہ کے تئیں پوری وفاداری سے لڑائی کی اور انہوں نے محسوس کیا کہ یہ ایک قومی سانحہ ہے اور انہیں اپنی زندگی اور فتح کے لئے جی توڑ کوشش کرنی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ سوائے چند استثنائی صورت کے جن میں سب سے نمائندہ شخصیت احمد اللہ اور تانتیا ٹوپے کی تھی، زیادہ تر قائدین، جنہوں نے اس جدوجہد میں حصہ لیا، صرف اپنے ذاتی مفاد کی خاطر آگے آئے۔ وہ انگریزوں کے خلاف اس وقت تک کھڑے نہیں ہوئے جب تک کہ ان کے ذاتی مفاد پر ضرب نہیں پڑی۔ حد تو یہ ہے کہ بغاوت شروع ہونے کے بعد بھی نانا صاحب نے یہ اعلان کیا کہ اگر ڈلہوزی اپنا فیصلہ بدل دے اور ان کی مانگوں کو مان لے تو وہ اس سے معاہدہ کر سکتے ہیں۔ جھانسی کی رانی کو بھی اسی طرح کی ذاتی شکایت تھی۔ لیکن یہ اور بات ہے کہ جب ایک بار وہ جنگ میں کود پڑیں تو پھر پیچھے نہیں ہٹیں اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے اپنی جان کی قربانی دے دی۔

جب بغاوت کے قائدین کی یہ حالت ہو تو آسانی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عوام کی کیا حالت رہی ہوگی۔ وہ اکثر تماشائی بنے رہے اور اس وقت جو زیادہ تر طاقتور دکھائی دیتا اس کا ساتھ دینے لگتے۔ ان کے اس رویے کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تانتیا ٹوپے کا کیا حشر ہوا؟ جب اسے شکست فاش ہوئی تو اس نے عہد کیا کہ وہ مدھیہ پردیش میں نرمدا کے پار اپنی جدوجہد جاری رکھے گا۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ ایک بار مراٹھا حلقے میں پہنچ گیا تو لوگ اس کی مدد کریں گے۔ ماورائی طاقت اور چالاکی سے کام لیتے ہوئے اس نے اپنے تعاقب میں آنے

والوں کو چکمہ دیتے ہوئے نرمدا کو پار کرلیا۔ لیکن وہاں جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ کسی گاؤں میں بھی لوگ اسے پناہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ ہر شخص اس کے خلاف تھا اور آخر کار اسے اپناہ لینے کے لئے جنگل کا رُخ کرنا پڑا۔ یہاں بھی اس کے ایک خاص دوست نے نیند کی حالت میں اسے دھوکے سے پکڑوا دیا۔

IX

اب اس عظیم جدوجہد کے دوران جو قتل وغارت گری ہوئی اس کے بارے میں چند الفاظ۔ انگریز مصنفین نے اکثر ہندوستانی سپاہیوں اور ان کے قائدین کے ذریعہ جو غیر انسانی فعل کئے گئے ان کے بارے میں بہت تفصیل سے اور بڑھا چڑھا کر لکھا ہے۔ تاہم نہایت افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ ان میں سے بعض الزامات بے بنیاد تھے۔ یورپین عورتوں اور بچوں کا دلّی، کانپور اور لکھنو میں قتل عام کا دفاع کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ گرچہ نانا صاحب کو اس بات کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ اس نے جنرل وہیلر سے جو وعدہ کیا تھا، وہ اسے پورا نہیں کر سکا۔ کیونکہ اس کا فوجیوں پر کوئی اختیار باقی نہیں رہا تھا جنہوں نے سارے معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ خود انگریز مورخین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جب اس نے ایک بچے کی لاش کو پانی میں تیرتا ہوا دیکھا تو اسے بہت صدمہ ہوا۔ چاہے کچھ بھی ہو وہ ہندوستانی فوجی جو اسے اپنا قائد سمجھتے تھے انہوں نے ہی یہ گھناؤنا جرم کیا تھا۔ اسی طرح سے یہ ان قیدیوں کی بھی ذمہ داری تھی جنہیں جنرل ہیولاک کے اس جگہ پر پہنچنے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ قتل اس بدلے کے جذبے سے کرایا تھا جو انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ الٰہ آباد میں کیا تھا تاہم ایک غلطی کے سبب دوسری غلطی کے کئے جانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ نانا صاحب کو یقیناً ان بے چارے قیدیوں کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔

اگر اس طرح کے گھناؤنے کاموں سے ہندوستانیوں کا ریکارڈ بدنما ہو گیا تو انگریزوں نے بھی کوئی اچھا سلوک نہیں روا رکھا۔ انگریز مورخین نے عام طور پر برٹش افواج کے ان بہیمانہ مظالم کو نظر انداز کیا ہے۔ لیکن کچھ نے اس پر نفریں اور دکھ کا اظہار ضرور کیا ہے جو بدلے کے جذبے سے ہندوستانیوں پر کئے گئے تھے۔ خود ہڈسن کا نام خون کا پیاسا پڑ گیا تھا۔ نیل اس بات پر فخر کیا کرتا

کہ نام نہاد مقدموں کے نام پر اس نے سینکڑوں ہندوستانیوں کو پھانسی کے تختے پر چڑھایا۔ الہ آباد کے آس پاس کوئی ایسا درخت نہیں بچا تھا جس سے کسی ہندوستانی کی لاش نہ لٹکائی گئی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ انگریزوں کو غصہ زیادہ آ گیا ہو۔ لیکن یہی بات ہندوستانی بھی اپنے بارے میں کہا کرتے تھے۔ اگر بہت سے ہندوستانیوں کی اس حرکت کا کوئی جواز نہیں پیش کیا جا سکتا تو یہی بات انگریزوں کے ساتھ بھی صادق آتی تھی۔ مسلمان امراء کو سور کی کھالوں میں زندہ سی دیا جاتا۔ اور پھر زبردستی ان کے گلے میں سور کا گوشت ڈال دیا جاتا۔ ہندوؤں کو لٹکتی تلواروں کے تلے گائے کا گوشت کھانے پر مجبور کیا گیا۔ زخمی قیدیوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ انگریز سپاہی گاؤں میں نکل جاتے اور گاؤں والوں کو پکڑ کر لاتے اور انہیں اتنی اذیت دیتے کہ آخر کار وہ مر جاتے۔ کوئی بھی ملک یا کوئی بھی شخص اس قدر نفرت انگیز پُرتشدد کام نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد بھی وہ اپنے کو مہذب ہونے کا دعویٰ کرے۔

X

1857ء کی بغاوت کے سلسلہ میں مبہم کہانیوں کے پس منظر میں دو باتیں صاف ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس عرصے میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان بہت خاص یگانگت یا اشتراک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ اس پورے عرصہ میں مغل تاج کے تئیں ہر شخص نے اپنی گہری وفاداری دکھائی۔

غدر کی شروعات 10- مئی 1857ء کو ہوئی اور یہ سلسلہ تقریباً دو سال تک چلتا رہا۔ اس دوران دونوں طرف کے سپاہیوں نے بہت سے شاندار اور بہت سے کالے کرتوت کئے۔ بہت زیادہ بہادری کی مثالیں بھی ملتی ہیں اور اسی طرح ناقابل یقین تشدد کے بھی واقعات ملتے ہیں۔ اس دوران ہمیں کہیں بھی کوئی ایک مثال نہیں ملتی جب فرقہ وارانہ بنیاد پر کوئی تشدد ہوا ہو۔ سبھی ہندوستانی ۔۔۔ چاہے مسلم ہوں یا ہندو ۔۔۔ چیزوں کو ایک ہی نظریے سے دیکھتے اور اسی نظریے سے واقعات پر تاثر ظاہر کرتے۔

فرقہ وارانہ جذبات سے یہ بے گانگی، لیڈروں کی کسی خاص کوشش کا نتیجہ نہیں تھی۔ ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ 1857ء کے دوران کسی نے بھی ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوئی کوشش کی ہو۔

صدیوں کی ایک مشترکہ زندگی کے سبب ہندوؤں اور مسلمانوں میں اٹوٹ دوستانہ رشتے قائم تھے۔ اس لئے کسی خاص سبب کے لئے اتحاد کی اپیل کئے جانے کی نہ کوئی ضرورت تھی اور نہ کوئی موقع تھا۔ اور اسی لئے آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ برٹش حکومت سے قبل ہندوستان میں ہندو مسلم کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

حدتو یہ ہے کہ 1857ء سے پہلے انگریزوں نے 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ خود برطانیہ کے تاج نے ہندوستانی حکومت کی باگ ڈور نہیں سنبھالی تھی لیکن سو سال قبل پلاسی کی جنگ کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی زبردست طاقت بن گئی تھی۔ ان سو سالوں کے دوران برٹش افسران نے ہندوستانی سماج کے مختلف عناصر کے اختلافات کو بہت زیادہ ہوا دی تھی۔ کمپنی کے ڈائرکٹرس جو مراسلے بھیجتے اس میں اس بات پر بار بار زور دیا جاتا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرق کیا جانا چاہئے۔ وہ محسوس کرتے کہ مسلمانوں اور ان کی وفاداری پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

ٹاڈ نے Annals of Rajasthan اور ایلیٹ نے ہسٹری آف انڈیا کے تعارف میں صاف صاف لکھا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرق کو بار بار زور دے کر اُجاگر کرتی۔ لیکن یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعلیٰ عہدوں کے افسران ہی ہوتے اور وہ بہت حقارت سے ان ہندو مورّخین کی طرف دیکھتے جو مسلم بادشاہوں کی تعریف کرتے۔ انہیں اس بات پر حیرت ہوتی کہ ہندو مورّخ مسلم بادشاہوں کے انصاف اور غیر تعصبانہ رویے کی بار بار تعریف کیوں کرتے ہیں۔

ٹاڈ کے Annals میں ایسے بہت سے مواد ملتے ہیں جن میں عہد وسطیٰ کی تاریخ کو یہ رنگ دینے کی کوشش کی گئی جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں آپس میں پھوٹ پڑ جائے۔ جہاں کسی واقعہ کے بارے میں دو طرح کا تذکرہ ملتا وہاں صرف اسی واقعہ کو ریکارڈ کیا جاتا جس سے آپسی اتحاد میں پھوٹ پڑ جائے۔ تاہم 1857ء کے واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کی اس زہر افشانی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ عام زندگی مین ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ بھائی چارگی اور ہمدردی کا جذبہ ملتا ہے جس نے سو سالوں کے تفرقہ ڈالنے کی اس کوشش کو ناکام کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ 1857ء کی جدوجہد نے قومی جدوجہد کا رُخ اختیار کرلیا، جس میں کبھی فرقہ وارانہ علیحدگی نہیں

اس برصغیر کو ڈیڑھ سو سال کے اندر ہی مکمل طور پر غلام بنا دینے والی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اراکین نے مغل بادشاہ اکبر کی حکومت کے آخری برسوں میں پرتگالیوں اور ولندیزیوں کی دیکھا دیکھی ہم ہی کیوں پیچھے رہیں والے جذبے کے ساتھ بھارت میں قدم رکھا تھا۔ 1612 میں جہانگیر کے دربار میں کورش بجاتے، بجاتے سر طامس رو کو سورت میں فیکٹری لگانے کی منظوری مل گئی۔ پٹ سن اور مسالے پہنچتے پہنچتے یہ کمپنی چند برسوں میں بارود اور بندوق۔ طمنچوں کی تجارت کرنے لگی، لیکن اورنگ زیب کے دور تک اس کی اتنی ہمت نہیں پڑی کہ وہ بھارت کے سیاسی اکھاڑے میں کودتی۔ کافی عرصے تک فرنگی مدراس تک ہی محدود رہے۔ لیکن اورنگ زیب کے انتقال (1707) فرماتے ہی بھارت کے مرکزی حکومت بے حد کمزور ہو گئی، جس سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی تیار ہی بیٹھی تھی۔ مقصد سے زیادہ سے زیادہ خام مال باہر بھیجنا لیکن جب دیکھا کہ اس ملک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کے سارے حالات بیٹھے بٹھائے اس کے حق میں سازگار ہوتے جا رہے ہیں تو اُس نے چولا بدلا۔ جہاں دو راجاؤں کو لڑتے دیکھی، کمپنی بلّی کے رول میں آ جاتی۔ دکن میں اپنے ارمانوں کو پروان چڑھا کر وہ اورنگ زیب کی وفات کے پچاس سال بعد ہی (1757) پلاسی کے آم کے باغیچے میں اتر پڑی اور تقریباً بیس گنا فوجی صلاحیت والے بنگال کے نواب سراج الدولہ کو ملکی غداروں کے بل پر دس منٹ میں مات دے کر اپنی سازشوں کو آخری روپ دینے میں جٹ گئی۔ اس لڑائی میں اگر نواب کا میر بخشی اور رشتے میں چاچا میر جعفر کا ایک بھی فوجی گولی داغ دیتا تو کمپنی کو مدراس بھاگنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ یا بنگال کے مارواڑی ساہوکار سیٹھ امی چند اور جگت سیٹھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک بڑے افسر رابرٹ کلیو کے لئے اپنی تجوری کا منہ نہ کھول دیتے تو اس کے پاس اپنی فوج کے گھوڑوں کی گھاس تک کے لئے پیسہ نہیں تھا۔ لیکن سب کچھ پہلے سے طے تھا اور نواب کی پچاس ہزار پیدل اور بیس ہزار گھوڑ سوار فوج کمپنی کے ان تین ہزار فوجیوں کے سامنے دُم دبا کر کھڑی رہی، جس کے دو ہزار فوجی بھارتی تھے۔ اتنا ہی نہیں، پچاس بڑی توپوں کا بارود کھلے میں اس طرح پڑا تھا کہ بارش کی پہلی بوچھار میں ہی بھیگ کر لگدی بن گیا۔ بھارت کی ہی نہیں، دنیا بھر کی تاریخ کی سب سے شرمناک جنگوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اسے بھارت ورش کی قسمت کو بدل دینے والی اس جنگ میں دونوں طرف کے کل جمع 523 فوجی کھیت رہے۔ اگلے سو سال کمپنی کی مکاری،

فریب کاری، لوٹ کھسوٹ اور کنیا کماری سے کشمیر اور کٹک سے اٹک تک پھیلے چھ سو سے زائد بھارتی رجواڑوں کے نکمے پن اور تعیش سے لبالب ہیں۔ ان سو برسوں میں ہی انگلستان صنعتی ترقی کے دور سے گزرا کیونکہ اس کی بحریہ بہت طاقتور تھی اور بھارت سے جہازوں میں بھر بھر کر آ رہا تھا خام مال۔ اس دوران انگریزوں نے جو تھوڑی بہت مزاحمت برداشت کی، وہ جنوبی بھارت میں ہی برداشت کی، شمالی ہند کے راجہ تو آپس میں بھی لڑنا بھول چکے تھے۔ جہاں تک راشٹر یا 'راشٹریتا' کا سوال ہے، ہم بھارتیوں کا ان دونوں میں کسی سے بھی کیسا بھی تعلق حضرت عیسیٰ کے چھ سو سال پہلے سے ہی کبھی نہیں رہا تھا ہاں ایک 'ملک' ضرور ہوتا تھا اور ہوتی تھی پیشانی پر لگانے کو اس ملک کی ماٹی۔ جنہوں نے بیسویں صدی کے اکیسویں سال میں بھارتی باشندوں کی آنکھیں کھولیں کہ جھانسی دیش نہیں ہے۔ یہاں انگریزوں کا شکریہ بھی ادا کرنا پڑے گا کہ اپنے مفاد میں ہی سہی، کونے کونے پر نگاہ رکھنے کو انتظامی بندوبست قائم رکھنے کے لئے اُنہوں نے ایک 'مہا دیش' کو 'راشٹر' کا جامہ پہنایا۔

یہ سوچ کر 1857 کا 'سنگرام' بھارت کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے ہوا تھا، تو یہ بات 'آریہ ورت' کے کسی 'پورانک دیش' جس میں سے ہوائی جہاز اڑا کرتے تھے، میزائل چھوڑی جاتی تھیں، کوئی راجہ دس دس ہزار بیٹوں کا باپ ہوا کرتا تھا، جیسی 'مہماؤں' کا اجتماعی نغمہ گانے والوں اور ایشور نام کی کسی نا معلوم اور غیر جسمانی طاقت سے ہمیشہ ڈرے رہنے والوں اور پتھر کے لئے آستھا رکھنے کے لئے کافی سودمند ثابت ہوتی ہے۔ اس پر کیتن مہتہ نے عامر خان کو منگل پانڈے بنا کر 1857 کے پھس پھسے قصے کو اور رنگین اور چمک دمک والا بنا دیا۔

لندن میں ان دنوں ایک شخص چپ چاپ ایک ایسے اصول پر کام کر رہا ہے، جس کے نام سے ہی ہر ایک دور بھاگتا ہے اور بھاگنا چاہتا ہے، وہ ہے حقیقت کا اصول، یعنی جو ہے اُسے کسی پردے مارو تصنع کے بغیر، خلوص سے، جس کا تسلیم کیا جائے۔ اب اگر ہم اس اصول کے ذریعہ 'دواپر' (تریتا اور کلجگ کے بیچ کا زمانہ) کال سے شروع کر سن 1857 کے منگل پانڈے اور ان پانچ چھ ہزار برسوں کے دوران اس کی سرزمین پر جنم لینے والی 'راشٹر بھکت' عظیم ہستیوں کی سرگرمیوں پر نظر ڈالیں تو سامنے جو آئے گا، اُسے قبول کرنے کے لئے دل پر پتھر رکھنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

1857 میں ہوئے اولین 'بھارتی سوتنتر تا سنگرام' (ساورکر نے اپنی کتاب میں یہی نام دیا

ترکوں کا پورا ساتھ دیا۔ یہاں یہ بتانا اس لئے ضروری تھا کیونکہ 17 ویں صدی میں انگریزوں کے آنے تک راجپوت برہمن گٹھ جوڑ بھارت نامی نام نہاد 'راشٹر' کی نام نہاد 'راشٹریتا' کو زبردست نقصان پہنچ چکا تھا۔

چھٹی اور ساتویں صدی میں زبردست تبدیلیاں آئیں جن کے نتیجے میں اس دیش کی مضبوط مرکزی حکومت گپت سلسلے کے آخری دور میں ہی گڈھے میں چلی گئی اور جو بھارت کچھ بڑے سامراجوں میں سمٹا ہوا تھا،ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کئی چھوٹے بڑے راجاؤں کی جاگیر بن گیا۔ یہ ہی وہ دور ہے جب راجپوت ذات پروان چڑھی۔ راجپوت راجاؤں کے چھوٹے بڑے سارے 'دیش راجستھان، گجرات، اتر پردیش، پنجاب اور وسطی ہند میں قائم ہو چکے تھے۔ اس میں چوہان، پرتی بار، سولنکی، پوار، راٹھور، سودیا، مرمار، چیدی، چندیل وغیرہ اہم سلسلے شامل ہیں۔ سب خوب طاقتور تھے، کسی کی فوج ایک لاکھ سے کم نہیں تھی۔ لیکن سب کی تلواریں ایک دوسرے پر ہی چمکتی تھیں ان سب راجاؤں کے دھرم گرو۔ پروہت، منتری برہمن ہی تھے۔ جن کی وجہ سے ہر 'دیش' زبردست کرم کانڈ، اندھ بھکتی اور اندھ وشواسوں کا شکار ہو چکا تھا۔ راجہ کسی دیوتا کا اوتار تھا، تو منتری کسی 'پوراتک' مہارشی کا محمود غزنوی کے حملوں کے زمانے میں 'ویشنوؤں' اور 'شیویوں' میں 'شو بڑا کہ وِشنو' کے بارے میں گھمسان چل رہا تھا۔ راجپوت راجہ بھی ان دو فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ دونوں کے درمیان دشمنی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ سر عام کڑاہوں میں کھولتے تیل میں ایک دوسرے کے مقلدین بھنے جا رہے تھے۔ ہزاروں سال پہلے راجپوت دور میں جب پہلا غیر ملکی حملہ (محمود غزنوی کا) تب سارے ملک کا قریب قریب یہ ہی حال تھا۔

اس دوران دُھر دکن کے چول، چانکیہ اور پانڈے وسطی ہند کی جانیے کھسکے پر راشٹر کوٹ، ہوئسل، یادو اور کاکتیہ ونش کئی معنوں میں راجپوتوں سے زیادہ طاقت ور، شاندار اور زیادہ بڑے علاقوں پر قابض تھے۔ چولوں اور پانڈوں نے تو سمندر پر نکل آج کے انڈونیشیا، تھائی لینڈ اور کمبوڈیا تک پر چڑھائیاں کیں اور چانکیہ ونش کے پُل کیشن نے ہرش وردھن پر پرتاپی راجہ کے گھوڑے وندھیہ کو پار نہیں کرنے دیئے تھے۔ شاندار محل اور مندر بنوانے کی تو جیسے ہوڑ سی مچی ہوئی تھی اِن ونشوں میں۔ لیکن زیادہ تر جنگیں آپس میں ہی لڑی گئیں۔ تلواریں کسی بار ہی دشمن کو نہیں، ان ہی ونشوں کے بیچ چمکتی رہیں اور ایک دوسرے کو کمزور کرتی رہیں۔ ایک کے بعد ایک ونش

سمراٹ سے راجہ اور راجہ سے جاگیردار کی حیثیت میں کھسکتے گئے، جو بچا کھچا تھا 13 ویں صدی میں دلی کی خلجی سلطنت نے مکمل طور پر تہس نہس کر دیا۔ یہی حال بنگال کے پال، شین، اور برہمن راج ونشوں کا ہوا۔ اس میں سے کسی کو دسویں صدی میں مغربی سرحدی صوبہ پر شروع ہوئے ترکوں کے حملوں یا دیش کے، مرکزی مقام پر لڑی گئی لڑائیوں سے کبھی کوئی مطلب نہیں رہا۔ نہ کبھی کسی نے کوئی فوج بھیجی، نہ کوئی لڑنے آیا۔ راجپوت راجاؤں کے دماغ میں کبھی نہیں آیا ہوگا کہ وِندھیا چل پار علاقہ بھی اِسی دیش میں آتا ہے۔

پہلی صدی کے محمود غزنوی کے حملوں کی شروعات کے بعد اگلے ساڑھے آٹھ سو سال تک ہوئی کئی لڑائیوں میں طاقت اور شجاعت کے سامنے دیسی فوجیں دشمن پر بھاری پڑیں لیکن نتیجے میں ہار ہی پلے پڑی۔ وجوہات بھی دیکھ لی جائیں۔ سن 1001 میں افغان محمود غزنوی کو روکنے کے لئے بھارت کے پہلے باب داخلہ ہندوکش کے راجپوت راجہ جے پال نے خاصی تیاری کی تھی۔ پچھلے ساڑھے تین سو سال سے آپس میں ہی مر کٹ رہے راجپوتوں میں جے پال پہلا راجہ تھا (سندھ کا راجا داہر راجپوت نہیں تھا) جس کا مقابلہ غیر ملکی فوج سے تھا اس کی فوج میں تین سو ہاتھی تھے لیکن یہی ہاتھی اس کی شکست کا سبب بنے اور جے پال کے مقابلے آدمی فوج لے کر آئے غزنوی نے اپنے گھوڑ سواروں کی تیز رفتاری کی وجہ سے میدان مار لیا۔ 1008 میں غزنوی پھر اُسی راستے بھارت میں گھسا۔ اس بار اس کا راستہ روکے تھا جے پال کا بیٹا آنند لال۔ پچھلی بار کے مقابلے اور زیادہ زبردست فوج کے ساتھ۔ پہلی ہی مٹھ بھیڑ میں غزنوی کو منہ کی کھانی پڑ گئی۔ آنند پال کی فوج کی مار سے گھبرا کر غزنوی اپنے گھوڑے کا منہ کابل کی جانب موڑنے کو ہی تھا کہ جس ہاتھی پر آنند پال سوار تھا، وہ تیر لگ جانے سے میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اپنے راجہ کو بھاگتے دیکھ اُس کی فوج میں دہشت پھیل گئی۔ پھر ایسی بھگدڑ مچی کہ غزنوی کی اوپر اٹکی سانس نیچے آئی اور اب اس کے سامنے پورا ہندوستان تھا اور ہندوستان میں تھا سومناتھ مندر جس کی لوٹ سے اُس نے پورے افغانستان کا افلاس دور کر دیا اور بھارت پر بار بار حملہ کرنے کے لئے خاصی فوج بنالی۔

اب پانی پت کی اُن تین جنگوں پر بھی نظر ڈالیں، جو بھارت کی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہیں اس لئے نہیں کہ ان تین جنگوں میں سے کسی ایک میں بھی بھارت جیتا ہو، بلکہ یہ تین لڑائیاں بتاتی ہیں کہ آر پار کی لڑائی میں بھارتی راجاؤں کی مت کس طرح ماری جاتی تھی۔ بھارت کی طرف

ہے) کے کئی لڑاکوں کے نام تاریخ میں درج ہو چکے ہیں، جو آج بھی بہت شدت سے یاد کئے جاتے ہیں۔ منگل پانڈے کے علاوہ ان میں خاص ہیں۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر، نانا صاحب، پیشوا، رانی لکشمی بائی، کنور سنگھ، تانتیا ٹوپے، بیگم حضرت محل، جنرل بخت خاں وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کے اور کمپنی کی لال نیلی دھاریوں والی وردی ڈالے دو لاکھ چھبیس ہزار دیسی فوج کے ہوتے ہوئے ایسا نہیں تھا کہ چند ہزار انگریز نوے سال پہلے ہی یہ دیش چھوڑ کر نہ چلے جاتے۔ لیکن جب لڑائی جھانسی نام کے 'ملک' کے لئے ہوگی، چند ہزار پاؤنڈ سالانہ پینشن کے لئے ہوگی، کارتوسوں میں گائے یا چربی کے لئے ہوگی اور دلّی کے اسّی سال کے بادشاہ کی کمر میں کہیں سے تلاش کی جبراً باندھی گئی تلوار سے ہوگی، دلّی کی لڑائی ہارنے کے بعد جسے پٹھان جنرل بخت خاں کے ساتھ لال قلعہ سے بچ کر نکلنا بلکہ انگریزوں کے ہاتھ پڑنا منظور تھا، آرہ کے زمیندار کنور سنگھ کی غوطے کھا رہی زمینداری کے لئے اور جنگلوں میں چھپ کر رہنے کی مجبوری سے ہوگی، اُس اودھ کے اقتدار کے لئے ہوگی، جس کا نواب بدانتظامی کی وجہ سے کلکتہ کے بیٹا برج میں نظر بند ہو دلّی سے انگریزوں کو بھگانے کے بعد دیسی فوج کا کھانا بنانے کے لئے جلتے ہوئے الاؤ اعلیٰ و ادنیٰ ذاتوں میں بٹے ہوں، تو اُسے بھارت کا پہلا 'سوتنتر تا سنگرام' کہہ کر ہم صرف خوش فہمی کو پروان چڑھا سکتے ہیں بلکہ ہم اس خوش فہمی میں جئے بھی جا رہے ہیں۔ ساورکر کے مطابق اگر منگل پانڈے نے کارتوس کو مسئلہ بنا کر شہید ہونے کی جلد بازی نہ کی ہوتی تو یہ لڑائی بہت ہی منصوبہ بند طریقے سے لڑی جاتی تھی اور فتح یقینی تھی۔ اُنہوں نے اس میں آریہ سماج کے بانی رِشی دیانند کا اہم تعاون کا ذکر کیا ہے کہ اُنہوں نے کمل کے پھول اور روٹی کے ذریعہ ملک بھر کے راجاؤں کو اس لڑائی میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی۔ چلئے مان لیا، لیکن یہ اس سے بھی بڑا سچ ہے کہ اس آزادی کی لڑائی میں ملک کے بہت چھوٹے سے حصے نے شرکت کی تھی۔ شمال میں ہمالیہ، مغرب میں افغانستان، مشرق میں برما اور جنوب میں سری لنکا والے تب کے بھارت میں لکھنو سے دلّی اور لکھنو سے آرہ اور وسطی ہند کا بہت چھوٹا حصہ ہی اس 'غبار' میں شامل تھا۔ کل ملا کر اس 'کرانتی' کو تھوڑا بہت لکھنو اور دلّی کے بیچ کی پانچ سو کلومیٹر کی پٹی میں بسے مسلمانوں نے ہی ڈھویا۔ کیونکہ اس ملک کی مرکزی حکومت انگریزوں نے اُن ہی سے چھینی تھی۔ کڑوا سچ یہ بھی ہے کہ انگریزوں کے پیر اس ملک میں جمانے میں مدد کرنے والے ہندو بہت بڑی تعداد میں تھے اور وہ اس لئے ہی سہی، جس کا اُنہیں

بھرپور معاوضہ بھی ملا۔ اُس زمانے کی دو عظیم جنگجو ذاتوں راجستھان کے راجپوت اور پنجاب کے جاٹ سکھوں نے تو اس 'سوتنتر تا سنگرام' کی گندھ اور گردن تک اپنے علاقے میں نہیں گھسنے دی کیونکہ شہنشاہ اکبر اپنے جیتے جی راجپوت راجاؤں کو آگرہ کے مغل دربار میں ہر وقت کمر جھکائے رہنے کی عادت ڈال گیا تھا، یا شاہی خاندان کی عورتوں کے محلوں کی رکھوالی کرنے کا کام سونپ گیا تھا۔ (چوکیداری کا یہ کام جے پور کے رانا سنوائی جے سنگھ، بُندیلہ لوک گیتوں کے نائک ویر چھتر پال اور راٹھوروں کے مہاراجہ جسونت سنگھ نے شاہجہان اور اورنگ زیب کے زمانے میں بخوبی کیا تھا۔) انگریزوں اور ہندو سکھ راجاؤں کا یہ ہنی مون 1947 کے بعد تک بغیر کسی رکاوٹ کے چلتا رہا۔ راجپوت راجاؤں نے ویسے بھی انگریزوں کے خلاف کبھی تلوار اُٹھائی ہی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی تلوار کا رہا سہا پانی اورنگ زیب کے مرتے وقت تک سوکھ چکا تھا۔ بچے سکھ، تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد پنجاب کو ہتھیانے کی کمپنی کی مہموں میں دیسی فوجوں نے کھل کر حصہ لینے سے اُن کے دلوں میں 'پوربیوں' سے بدلہ لینے کی سوچ زیادہ جاندار تھی اور انگریزوں کو تھرا دینے والا مراٹھا، پیشوا باجی راؤ اول کے مرتے ہی کس کا ساتھ دیں...... کس کا نہیں کے کنفیوزن میں آپس میں لڑ بھڑ کر ہی تباہ ہو گئے جبکہ 18 ویں صدی کے آخری بیس برسوں میں حیدر علی یا ٹیپو سلطان کو صرف مرہٹوں کی مدد مل جاتی تو انگریز کب کا بھارت چھوڑ کر بھاگ گئے ہوتے۔ یا 1857 میں صرف گوالیار کے سِندھیا نے ہی آنکھیں تر یدی ہوتیں تو انگریزوں کی خیر نہیں تھی۔

یہاں سے آگے بڑھنے سے پہلے ہم حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے قریب ڈیڑھ صدی پہلے فلسطین میں لڑی گئی ایک ایسی جنگ پر نظر ڈالیں، جس میں بھارت کی اُس زمانے کی اور اس کے ہزار سال بعد تک کے وہ حالات واضح ہو جائیں گے، جو بہت آسانی سے کسی ملک کو غلام بناتے ہیں۔ فلسطین میں کس طرح تیس سال تک یہودی کسانوں نے اپنے بچوں اور عورتوں کو ساتھ رکھ چھرے اور بھالوں کے بل پر، گاؤں گاؤں، گھنے جنگلوں، ریگستانوں، برفیلے پہاڑوں، سمندر کے کنارے بھی ایک جٹ ہو، تو کبھی تتر بتر ہو کر جنگ لڑی تھی۔ دشمن تھا ان کے ملک پر قبضہ جمانے والا طاقت ور یونانی سامراج، جس کے ساتھ مل کر فلسطین کو اجاڑنے میں لگے

ہوئے تھے سیریا کے راجہ اوراس کی فوج۔ یہودی کسان تیس سال لڑ سکے اور کامیاب ہو سکے کیونکہ ان کا سماج اوپر نیچے، دائیں بائیں، آگے پیچھے ایک جیسا تھا، جس میں یقین تو تھا لیکن کسی بھی قسم کی ضعیف الاعتقادی نہیں تھی، نہ کوئی برہمن تھا نہ کوئی دلت۔ پروہت لائق پرستش تھا، لیکن اس کے ساتھ، یہاں تک کہ اس کی تھالی میں کیسا بھی کام کرنے والا شخص بیٹھ کر کھا سکتا تھا، وہ کسی کے بھی جھوٹے گلاس سے پانی کے یا شراب کے دو گھونٹ بھر سکتا تھا۔ اُن کا سب سے بڑا پروہت بھی بیٹھ کر یا دان میں ملے دھن سے زندگی نہیں گزارتا تھا۔ وہ کھیت جوتتا تھا اور جان توڑ کر محنت کرتا تھا۔ سماج میں سب کو سب کچھ کہنے کا حق دیا ہوا تھا۔ گھر، خاندان اور سماج میں عورتوں کو برابر کے حقوق حاصل تھے۔ لڑائی میں شامل ہر شخص سپہ سالار تھا اور ہر شخص فوجی۔ ہر شخص کو بحث مباحثہ کرنے کا پورا حق تھا۔

آیئے، اب ہم کافی پیچھے لوٹ کر کرشن کے 'دُواپر یگ' کا سرسری جائزہ لیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ پانچ ہزار سال پہلے بھی اس ملک کے راجہ ایک دوسرے کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے کیا کچھ نہیں کر گزرتے تھے اور تب کا چلا یہ سلسلہ آگے کے ہزاروں سال بدستور جاری رہا۔ کرشن کے ہاتھوں کنس کے مارے جانے اور متھرا کی گدّی پر قید کر رکھے گئے اس کے باپ اُگرسین کے بیٹھنے سے مگدھ کا صاحب جلال شہنشاہ جراسنگھ بری طرح بوکھلا گیا کیونکہ کنس اس کے مہاسنگھ کا اہم ستون تھا۔ کرشن کو نیست و نابود کرنے کے لئے جراسنگھ کو اپنا ساتھ دینے والے راجاؤں کی بھیڑ کم لگی اور اس نے وسطی ایشیائی قبیلے کے آتائی کالیون کو نیوتہ بھیج متھرا پر حملہ کر دیا۔ کرشن نے آناً فاناً متھرا کے سارے باشندوں کو ہزاروں میل دور دُوارکا بھجوا دیا۔ اور پھر کیسے انہوں نے جراسنگھ کی سازش کو ناکام کیا اور کیسے کالیون کو مارا...... یہ ایک لمبی داستان ہے۔

اس کے بعد کا پہیہ ہزاروں سال بعد آ کر ٹھہرتا ہے۔ جہاں ڈال ڈال پر سونے کی چڑیاں کرتی ہیں بسیرا...... وہ بھارت دیش ہے میرا۔ لیکن یہ اُس بھیا فلم کا گانا ہے، جس میں پورس نے سکندر سے لوہا لیا تھا۔ اسی فلم میں جنگ جیتنے کے بعد سکندر بنے دارا سنگھ نے پنجابی لہجے میں پوچھا...... ''بتاؤ تمہارے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جائے'' تو زنجیروں میں بندھے پرتھوی راج کپور کا

پیشاوری لہجے میں کڑکڑاتا جواب تھا۔ ''جو ایک راجہ دوسرے راجہ کے ساتھ کرتا ہے۔'' حضرت عیسیٰ نے 326 سال پہلے کے بھارت کی مغربی سرحد جہلم ندی کے اس کنارے، جہاں راجہ پرشوتم (پورس) کی جاگیرداری تھی۔ ایران کو جیتنے کے بعد سکندر نے اسی راستے بھارت میں داخل ہونا چاہا، جس کی پورس نے مزاحمت کی۔ لیکن اکیلے دم، اس کی مدد کو اس دیش کا ایک بھی راجہ آگے نہیں آئے۔ پہلے تو سہودر آمبھ نے ہی وشواس گھات کیا، جس کا نام سکندر کو نیوتہ دینے میں لیا جاتا ہے۔ پھر چونکہ سکندر نے دور دراز سرحدی صوبے کے ایک چھوٹے موٹے راجہ پر حملہ کیا تھا، اس لئے مگدھ سمراٹ مہاپد مانند یا دیش کے دوسرے مہمان راجاؤں کی جیب سے کیا جا رہا تھا یا ان پر کون سی آفت آنی تھی، اس سوچ کے ساتھ سب مستی کی نیند سوتے رہے۔ جہلم ندی کے کنارے سکندر کا سامنا کرنے کو رہ گیا اکیلا پورس۔ سکندر کا سامنا کرنے کے لئے پورس فوج کم نہیں تھی۔ دو سو جنگی ہاتھی بھی تھے۔ تیز برسات کی رات میں جب پورس کو قطعی امید نہیں تھی، سکندر کے گھوڑوں نے اُپھنتے جہلم میں قدم رکھے اور بےفکر ہو چلی پورس کی فوج پر حملہ کر دیا۔ سب سے پہلے ہاتھیوں کو ہی نشانہ بنایا اور پگلائے ہاتھیوں نے اپنی فوج کو روندنا شروع کر دیا، یہ جنگ جیت کر سکندر دو سو میل دور بہتی ہوئی گنگا کو پار کر پورے بھارت کی دھول اپنے گھوڑے کھر سے اڑانے کے فراق میں تھا، لیکن اس کے سپہ سالاروں اور فوجیوں نے واپس لوٹنے کے لئے بغاوت کر دی اور سکندر پنجاب سے ہی لوٹ گیا۔ اگر تب بھارت اس کے چنگل میں پھنس جاتا تو ہو سکتا ہے آج بھارت کے بڑے حصے میں یونانی زبان ہی بولی جا رہی ہوتی۔

> یہاں پر ہاتھی نام کی اُس دیوقامت مخلوق کا بھی ذکر کر لیا جائے جو یجمان کا ایہہ لوک سدھارنے اور پرلوک کو سورت بنانے والوں کی روحانی خواہش کی وجہ سے ہندوستانی راجاؤں کی فوج کا ایک طویل مدت تک اہم حصہ رہی۔ کلنجگی راجاؤں کے دماغ میں یہ ہی بھرا گیا کہ ہاتھی دیوتاؤں کے راجہ اِندر کے واہک (بار بردار) اَیراوت کا اوتار ہے، اور راجہ کا مقام اِندر جتنا ہی اونچا ہے۔ گھوڑا تو ملیچھوں کی سواری ہے۔ بدیں وجہ آگے ہوئے کئی باہری حملوں کے سامنے بھارت کو منہ کی اس لئے کھانی پڑی کیونکہ ہاتھی کے ہودے پر سونے کے چھتر کے سائے میں اپنا جھنڈا اپھہرائے

بیٹھا راجہ دشمن کا تیر کھا جاتا، جھنڈا جھک جاتا اور راجہ کو اوندھا پڑا دیکھ جیت
کی لگار پر کھڑی اس کی فوج میدان چھوڑ دیتی۔

پھر قائم ہوا موریہ سامراج۔ جس کے جاہ وجلال سے کچھ سینکڑا سال باہری حملوں سے بچا رہا۔ بھارت۔ ویسے دیش کے اندر آپس میں ہی بھیانک خون خرابہ ہوتا رہا اور جب سمراٹ اشوک نے کلنگ وجے کے دوران ایک بار میں ہی دس لاکھ گردنیں کٹوادیں تو وہ عدم تشدد پسند بن بودھ دھرم کی پناہ میں چلا گیا۔ اس کے بعد شروع ہوا برہمن سماج اور بودھوں کے بیچ ہزار سال تک چلنے والا سنگھرش کیونکہ دونوں کی زبان کو اقتدار سے فائدہ اٹھانے کا چٹخارہ لگ چکا تھا۔ اس سنگھرش میں جس طرح قدم قدم پر دیش کے ساتھ وشواس گھات کیا گیا اس کی وجہ سے ہی بھارت اگلے ایک ہزار سال تک کے لئے غلام بنا۔ موریہ سلسلے کے آخری دنوں میں باہر سے شک اور کشان آئے، پر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پھر گپت سامراج کا سنہرا دور آیا جو ایک سو سال چلا تب ہی وسطی ایشیا کے ہونوں کے تابڑتوڑ حملوں نے گپت سامراج کو تہس نہس کر دیا۔ یہیں سے شروع ہوتی ہے برہمن پرست نظام کی سازشیں۔ برہمن سماج سمراٹ اشوک کے زمانے میں شروع ہوئے بودھوں کے بڑھاوے سے بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے اس کی روزی روٹی کے وسائل پر خطرہ منڈلانے لگا تھا۔ ایشور کا عطا کردہ ذات پات کا نظام، دیوی دیوتاؤں کا خوف، اور سورگ۔ نرک کے نظریات گڑھ، برہمنوں نے ایک ایسے نظام کی بنیاد دیدھ کے جنم سے کافی پہلے ہی ڈال دی تھی جس میں اگلے ہزاروں سال تک پورے ہندو سماج کو اپنے شکنجے میں جکڑے رکھنے کا زبردست مادہ تھا، لیکن جس میں 'راشٹر' کہیں نہیں تھا۔ بودھوں کا جڑ بنیاد سے تاس ہی برہمنوں کا واحد مقصد تھا اور اس کے لئے اس دوران جتنی غیر ملکی ذاتوں نے بھارت پر حملہ کیا، اُنہیں کسی نہ کسی روپ میں برہمنوں کا آشیر واد ملا۔ بدلے میں آگے چل کر بودھوں نے بھی یہ ہی کیا۔ بودھوں کو ملیا میٹ کرنے میں پوری مدد نہ پہنچانے کے لئے برہمن گپت راجاؤں سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس لئے ہن سپہ سالاروں مہرکل اور پھر تومان کی اولاد سے مل وہ بودھوں کو ختم کرنے کے جگاڑ میں لگ گئے اس سے پہلے موریہ راجہ برہ درتھ اور کشان سلسلے کے نامی گرامی سمراٹ کنشک کو تو خود ان کے برہمن وزیر ہی گلا دبا کر پرلوک بھیج چکے تھے کیونکہ وہ دونوں بودھ تھے۔ برہمنوں نے جنگلی ہُنوں کو کایا کلپ کیا اور اُنہیں راجپوت لفظ سے نوازا۔ اس کے بعد بودھ مقلدین سمراٹ ہرش وردھن

کے زمانے کو چھوڑ اگلے دو سو سال برہمنوں کا زمانہ بُتوں کو اپنی مرضی کے مطابق بناتے گزرا۔ ساتویں صدی کے وسط میں جب حضرت محمدؐ سرزمین عرب پر اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے۔ شمالی بھارت کا ایک بڑا حصہ راجپوت راجاؤں کی آغوش میں آ چکا تھا اور بودھ دھرم عشرت کدوں میں سمٹتا جا رہا تھا۔ بودھ بھکشوؤں کے قتل کا سلسلہ تو مہاتما بدھ کی زندگی میں ہی شروع ہو چکا تھا، راجپوتوں کے پیر جمانے کے ساتھ ہی ان پر قہر برپا کرنا شروع کر دیا اس کا بدلہ بودھوں نے اسلام کی تبلیغ کرتے ہوئے عرب حملہ آوروں کا ساتھ دے کر لیا۔ حالانکہ کئی بودھ پھر سے ہندو دھرم میں آنے کے لئے تیار تھے، لیکن اُس دروازے پر برہمنوں نے تالے جڑ دیئے تھے۔ اسلام کی شروعات میں ہی اس جھگڑے کا خمیازہ اٹھانا پڑا اسندھ کے راجہ داہر کو۔ جب خلیفہ کے فرمان پر اس کے بھتیجے محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا تو اُسے بودھوں کا ساتھ ملا۔ داہر مارا گیا اور سندھ عربوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ جس سے افغانستان سے لے کر پنجاب تک کا حصہ غیر ملکیوں کے بے روک ٹوک گھسنے کا راستہ بن گیا۔ جبکہ کبھی یہ ہی علاقہ بودھ دھرم کا گڑھ تھا برہمنوں سے دشمنی کی وجہ سے بودھوں نے حملہ آوروں کو کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ان کا استقبال ہی کیا۔

چونکہ برہمنوں کے لئے بودھ ملیچھ ہی تھے ہندو دھرم میں ان کی واپسی ناممکن تھی جس کا خمیازہ قریب ایک ہزار سال پہلے کشمیر کو بھگتنا پڑا۔ آٹھویں صدی میں سندھ کو ہتھیانے کے بعد عربوں کے حملے کشمیر پر شروع ہوئے لیکن 713 میں سمراٹ چندر پیڑھ نے، 724 میں سمراٹ للیتادتیہ نے عربوں کو شکست دی۔ سن 754 میں بھی عرب حملہ ناکام رہا۔ تقریباً دو سو سال بعد محمود غزنوی نے بھی کشمیر پر دوبارہ حملہ کیا لیکن دونوں بار شکست سے دوچار ہوا۔ پھر اس نے کشمیر کے نام سے توبہ ہی کر لی۔ اُسی کشمیر میں صوفیوں کا داخلہ ہو چکا تھا۔ ملا مولوی بھی قدم رکھ چکے تھے، اسلام مذہب کی ہلکی سی ہوا بہنے لگی تھی، تب ہی وہاں تبت سے فرار ایک راجکمار رنچن آ پہنچا۔ راجہ سہ دیو نے اُسے پناہ دی۔ وہ ہندو دھرم اپنانا چاہتا تھا، لیکن کشمیری پنڈتوں نے صاف منع کر دیا۔ مجبور ہو کر رنچن اسلام دھرم میں شامل ہو گیا اور پھر کشمیر کا ثقافتی اور مادی کایا کلپ کرنے میں اُس نے

سے بھاری بھرکم فوجوں کے سہارے لڑی گئی ان جنگوں میں کئی دیسی راجہ برسوں بعد ایک ساتھ ہوئے، لیکن تینوں جنگوں میں 'راشٹر' کا نام ونشان نہیں تھا۔ تینوں میں شکست نے اس دیش کا مستقبل پیچھے میں دھکیل دیا۔ پانی پت کی پہلی لڑائی میں ایک طرف تھا ظہیرالدین بابر، جس نے سمرقند اور وسطی ایشیائی علاقوں میں لڑی گئی زیادہ تر جنگوں میں مات کھانے کا ریکارڈ بنایا تھا۔ آخر کار اُسے کوئی ٹھور ٹھکانہ تلاش کرنے کے لئے ایران کے شاہ کی منت سماجت کرنی پڑی لیکن اس کی پٹری وہاں بھی نہیں بیٹھی اور اُسے بھاگ کر کابل آنا پڑا۔ کابل اس کے لئے سازگار ثابت نہیں ہوا لیکن وہاں سے جاتا تو کہاں جاتا! تب ہی اُسے بھارت پر حملہ کرنے کے لئے کئی دیسی طاقتوں نے مدعو کیا۔ ان میں پنجاب کے صوبیدار دولت خاں لودی اور دلّی کے اہم سردار ہندو بیگ کے علاوہ میواڑ کے رانا سانگا بھی تھے۔ یہ سب کسی نہ کسی وجہ سے سلطان ابراہیم لودی سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ ان سب کو امید تھی کہ باہر کی مدد سے ابراہیم لودی کو بیدخل کر کے حکومت کی بندر بانٹ لیں گے۔ لیکن در در کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے تنگ آ گئے بابر کا ارادہ بھارت کو ہی اپنا ٹھکانہ بنانے کا تھا۔ شروع کے چھٹ پٹ حملوں کے بعد 1526 کے ماہ اپریل میں بابر اپنی بارہ ہزار فوج کے ساتھ پانی پت کے میدان میں آ ڈٹا لیکن جب اس نے لودھی کا لاؤ لشکر دیکھا تو اس کی روح فنا ہو گئی۔ اُسے صرف اُن توپوں کا سہارا تھا جو بھارت میں پہلی بار گولہ باری کرنے جا رہی تھیں۔ چند ہی گھنٹے چلنے والی اس جنگ میں لودی کی ایک لاکھ سپاہیوں کی فوج باہر کی توپوں کی گولہ باری سے مکمل طور پر بکھر گئی اور مع سلطان میدان جنگ سے بھاگنے لگی، جبکہ بابر فتح کے بارے میں آخر تک پُر یقین نہیں تھا۔ ابراہیم لودی مارا گیا اور آگرہ و دلّی پر قبضہ کر کے بھارت میں بابر کا رک جانا رانا سانگا کو راس نہیں آیا۔ اُس نے سب ہی راجپوت راجاؤں کو اکٹھا کر کے چنگیز خاں اور تیمور کی آل اولاد کو سیکر کے پاس کنہوا میں للکارا۔ ایک سال بعد بابر کے سامنے پھر ایک لاکھ گھوڑ سواروں اور پانچ سو ہاتھیوں کی فوج تھی۔ اتنا ہی نہیں، پہلی بار بہت سے راجپوت راجہ ایک جھنڈے تلے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ بابر کے لئے اس بار کرو یا مرو کا معاملہ تھا۔ اُس نے اپنے سپہ سالاروں کو خدا کا واسطہ دیا۔ شراب چھوڑنے کی قسم کھائی اور کھول دیئے اپنی توپوں کے دہانے۔ ادھر رانا سانگا نے ایک سال پہلے ہوئے ابراہیم لودی کے حشر سے کوئی سبق نہیں سیکھا تھا، وہی تلوار، وہی بھالے، وہی گھوڑے، وہی ہاتھی۔ توپوں کی مار سے بابر نے اپنی ایک

چوتھائی سے بھی کم فوج سے ایک لاکھ سے زیادہ لشکر کو زمین سنگھا دی۔ اور اب ترک، منگول کے مخلوط خون والا ونشن بھارت میں دھنس چکا تھا۔ گھا گرا کے کنارے 1529 کی تیسری لڑائی میں اُس نے افغانوں کو اگلے 10 سال کے لئے مکمل طور پر نیست و نابود کر دیا۔

پانی پت کے میدان جنگ میں دوسرا بھارتی کھیت رہا راجہ وکرم دتیہ عرف راؤ ہیمو، جس کی ہار نے بھارت میں مغل حکومت کو مکمل طور پر قائم کر دیا۔ ہیمو یہ جنگ جیتنے ہی والا تھا لیکن ہاتھی کے ہودے نے سب ملیا میٹ کر دیا۔ سن 1556 کے آخری دنوں میں ہوئی اس جنگ سے پہلے تک مغل حکومت صرف دلّی آگرہ تک ہی محدود تھی۔ دو تین سال پہلے ہی ملک کے ایک بڑے حصے پر پٹھان شیر شاہ سوری کی حکومت رہی تھی اور ان دنوں مغل سلسلے کا دوسرا بادشاہ ہمایوں بھاگ کر ایران میں پناہ لئے ہوئے تھا۔ وہ وہاں تقریباً دس سال تک رہا۔ مغلوں کے نصیب نے کروٹ لی، شیر شاہ سوری کالنجر کی لڑائی میں ختم ہوا اور ہمایوں کو پھر آگرہ کے تخت پر بیٹھنے کا موقع ملا لیکن وہ فوراً ہی راہی ملک عدم ہو گیا۔ اُسے کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا اس لئے ملک کا بڑا حصہ افغانیوں کے زیر اثر تھا۔ شیر شاہ سوری کی کمزور آل اولاد کا وزیر اعظم تھا راؤ ہیمو۔ غیر ملکی مغلوں کو دیش سے بھگانے کے لئے زبردست مہم چلائی راؤ ہیمو نے۔ اور افغانوں کے ساتھ ساتھ بہت سے راجپوت راجاؤں کو بھی اپنے ساتھ کر لیا۔ پہلے ہی جھٹکے میں آگرہ اور دلّی کے ہاتھ میں آتے ہی وانک راؤ ہیمو نے وکرم دتیہ کا جامہ اوڑھا اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ اس دوران ہمایوں کا 12 سال کا بیٹا محمد جلال الدین اکبر اپنے سرپرست بہرام خاں کے ساتھ جالندھر میں پھنسا ہوا تھا۔ یہ سن کر کہ راؤ ہیمو کے پاس پچاس ہزار گھوڑ سوار، ایک ہزار ہاتھی، 51 توپیں اور شاندار فوج ہے گھبراہٹ کی وجہ سے اکبر نے کابل جانے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن بہرام خاں اڑ گیا اور صرف بیس ہزار گھوڑ سواروں کے بل پر مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ میدان جنگ بنا وہی پانی پت جہاں تیس سال پہلے اکبر کے دادا بابر نے ابراہیم لودی کو روندا تھا، ہیمو دلّی سے چلا اور اکبر جالندھر سے۔ لیکن بیچ ہیمو کی اپنی ہی بیوقوفی سے ساری ہی توپیں دشمن کے ہاتھ لگ گئیں۔ لیکن تب بھی ہیمو کا پلڑا بھاری تھا۔ لڑائی شروع ہوتے ہی دیسی فوج اکبر کی فوج پر ٹوٹ پڑی اور ایک وقت ایسا آ گیا جب ہیمو کی جیت یقینی ہو چلی تھی لیکن تب ہی ہاتھی کے ہودے پر بیٹھے جنگ کی کمان کر رہے ہیمو کی آنکھ میں ایک تیر جا گھسا اور وہ ہودے پر گر پڑا، اٹھنے کی کوشش کی لیکن تب تک راجپوت فوج میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ ہیمو پکڑ کر

بہرام خاں کے پاس لایا گیا اور اس نے ایک وار سے ہیمو کی گردن اُڑا دی۔

پانی پت کی تیسری جنگ افغانیوں اور مراٹھاؤں کے مابین لڑی گئی۔ افغان حملہ آور احمد شاہ ابدالی اس جنگ سے پہلے ایک بار مغل حکومت کی دھجیاں اڑاتے ہوئے دلّی کو بری طرح لوٹ کر ہزاروں عورتوں بچوں مردوں کو اونٹوں پر لاد کر کابل کے بازاروں میں بیچ چکا تھا۔ اس نے پھر بھارت پر چڑھائی کی، لیکن اس بار اس کا راستہ روکے کھڑے تھے ایک لاکھ مراٹھا فوجی۔ فرانسیسی توپوں اور بندوقوں سے لیس۔ فیصلہ کن جنگ کے لئے پھر پانی پت کا ہی انتخاب ہوا۔ میدان جنگ میں ابدالی کے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں مراٹھا فوج کھائی۔ خندق کھودے تیار بیٹھی تھی۔ دونوں فوجیں بجائے لڑنے کے ایک دوسرے کا محاصرہ کر بیٹھ گئیں اور ہلکی پھلکی جھڑپوں کے علاوہ دو مہینوں تک دیکھا دیکھی چلتی رہی۔ گڑبڑی یہاں سے شروع ہوگئی۔ ابدالی نے مقامی کمک کے لئے پیچھے کی کھڑکی کھلی رکھی جبکہ مراٹھاؤں کی رسد وغیرہ کی سپلائی کے سارے راستے بند ہو گئے۔ 4 جنوری 1761 کو جنگ شروع ہوئی لیکن نتیجہ وہی نکلا ابدالی کے گھوڑ سواروں نے مراٹھاؤں کو دوڑا دوڑا کر مارا۔ اس ہار کے ساتھ ہی ملک بھر میں قریب تیس سال سے جاری مراٹھاؤں کا دبدبہ مکمل طور پر ختم ہوگیا۔ یہاں ہار کی وجہ مراٹھا سرداروں کی آپسی رنجش تھی۔ مراٹھا کمان کے سپہ سالار سداشوراؤ بھاؤ کی اپنے بھتیجے وشواس راؤ سے نہیں بن رہی تھی، جو پیشوا بالا جی وِشوناتھ کا بیٹا تھا۔ ہولکر سندھیا سے خار کھائے بیٹھا تھا، تو گائکواڑ بھونسلے اپنی اپنی چلا رہے تھے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مراٹھاؤں کو شمالی ہند کے کسی راجہ سے کوئی مدد نہیں ملی اُنہوں نے برسہا برس جس طرح مغل بادشاہ اور شمالی بھارت کے راجاؤں سے رنگداری وصولی، اس کی وجہ سے کیا سکھ، کیا جاٹ، کیا روہیلے اور کیا راجپوت سب ہی ان سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ جبکہ ابدالی کو جاٹوں اور روہیلوں سے وقت وقت پر مدد ملتی رہی۔

ادھر 1757 میں پلاسی کی جنگ جیت کر انگریزوں کے حوصلے بلند تھے ہی، مراٹھاؤں کی اس شکست نے ان کا ارادہ بھارت کو پوری طرح ہتھیانے کا بنا دیا۔ تین سال بعد ہی انگریزوں نے مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی، اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور بنگال کے میر قاسم کی تکڑی کو بکسر کی جنگ میں ہرا کر ایسے معاہدے کے لئے مجبور کیا کہ بھارت کے ایک بڑے حصے کی دیوانی اس کے ہاتھ لگ گئی یعنی بھرپور پیسہ اور رُتبہ اب دونوں اس کی مٹھی میں تھے اس لڑائی کے بعد ہی انگریزوں

نے بھارت کے ایک سے ایک طاقتوروں کی مٹی پلید کرنی شروع کی۔ پہلے پیشوا کو نشانہ بنایا، پھر سندھیا کو ہولکر کو اور سب سے آخر میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد سکھوں کو۔ مغل بادشاہت تو پہلے سے ہی بیدم تھی۔ انگریزوں نے نظام کو پہلے ہی اپنا پٹھو بنا لیا تھا اس دوران انگریزوں کا ارادہ میسور کے حیدرعلی اور اس کا بیٹا ٹیپو سلطان ہی بھانپ سکے، لیکن اُنہیں انگریزوں کے خلاف کسی بھی جنگ میں کسی بھی دیسی طاقت کا تعاون نہیں ملا۔

ابھی کچھ اور۔ پھر پیچھے لوٹ کر ذرا اس ہیرو کی تصویر پر بھی نظر ڈال لیں، جس پر ہر بھارتی کو فخر ہے اور جو جلد ہی بالی ووڈ کی شان بننے جا رہا ہے۔

بھارت پر کئی حملے بول کر اور سومناتھ کے مندر کو پوری طرح لوٹ کر محمود غزنوی 1030 میں مر کھپ گیا۔ اس کے بعد اگلے ڈیڑھ سو سال تک بھارت غیر ملکی حملوں سے بچا رہا۔ لیکن دیسی راجاؤں کی آپسی مار کاٹ جاری رہی اور اُنہوں نے اگلے غیر ملکی حملوں سے نمٹنے کی کیسی بھی پالیسی نہیں بنائی، جبکہ بھارت کا باب داخلہ اس کے ہاتھ سے غزنوی کے زمانے میں ہی نکل چکا تھا۔ بارہویں صدی کے آخری برسوں میں اجمیر کا راجہ پرتھوی راج چوہان شمالی بھارت کی بڑی طاقت بن چکا تھا اور اس کی حکومت دلّی تک پھیلی تھی۔ اس نے ہی پانڈوؤں اور تومر راجاؤں کے بعد تیسری بار دلّی بسائی تھی، جو قلعہ رائے پتھوڑا کے اردگرد پسری ہوئی تھی۔ ہندوستانی تاریخ کا درخشاں ستارہ پرتھوی راج چوہان دلّی پر حکومت کرنے والا آخری ہندو راجہ تھا اس کے بعد اگلے ساڑھے سات سو سال تک دلّی ترکوں، افغانیوں، مغلوں اور انگریزوں کے زیر اقتدار رہی۔ جس وقت چوہان فوج گجرات کی اینٹ سے اینٹ بجا رہی تھی اور آلہا اودل جیسے نامی بہادروں والے مہوبہ کو روند رہی تھی، اس وقت افغانستان میں محمد غوری تیزی سے پاؤں پسار رہا تھا اور اب اس کے نشانے پر تھا بھارت۔ اس نے غزنوی کی آل اولاد کو ختم کر کے حکومت حاصل کی تھی۔ 1185 میں جب اس نے آخری غزنزیوں سے لاہور، ملتان اور سیالکوٹ چھینے، تب ہی راجپوت راجاؤں کو سمجھ جانا چاہئے تھا، جس کی روایت بھارت میں کبھی نہیں رہی تھی۔ اس بیچ جموں وغیرہ کے راجہ کی دعوت پر غوری پنجاب کے ادھر بھی اپنی فوجوں کے ساتھ آتا رہا، اور لوٹ پاٹ کر واپس لوٹ جاتا۔ 1191 میں محمد غوری ایک بڑی فوج لے کر بھارت میں گھس آیا اور تھانیشور کے قریب نرائن کے میدان جنگ میں اس کا مقابلہ پرتھوی راج چوہان نے بہت بہادری سے کیا۔ اس نے نہ

صرف غوری کو مات دی بلکہ اُسے گرفتار بھی کر لیا۔لیکن اپنے وزراء کے لاکھ سمجھانے کے باوجود اس نے غوری کو رہا کر دیا۔اس جنگ میں میواڑ کے رانا داول متھان سنگھ سمیت تقریباً ڈیڑھ سو راجپوت راجاؤں نے پرتھوی راج کا ساتھ دینے کے لئے اپنی فوجیں اتاری تھیں۔اب آتا ہے وہ دور جس کے بارے میں چوہان راجہ کے بھاٹ کوی چند بردائی نے 'کاویہ نامہ' ہی لکھ مارا ہے اور اپنے راجہ کا موازنہ اِندر سے کیا ہے۔ پرتھوی راج کی طرح ایک اور طاقتور راجہ جے چند اس زمانے میں تنوج پر حکمراں تھا، جس کی ایک خوبصورت بیٹی تھی سینوگتا۔ان دونوں راجاؤں میں شروع ہی سے کبھی نہیں پٹی دونوں کسی رشتے میں بھائی بھی لگتے تھے۔ پرتھوی راج اور سینوگتا میں چکر چل گیا، اس کا پتہ لگتے ہی جے چند نے سینوگتا کا سوئمبر رچا ڈالا، ظاہر ہے، اس میں پرتھوی راج کو نہیں بلایا گیا۔ لیکن عاشق نے زور مارا اور چوہان راجہ بغیر فوج کے سو کے قریب بہت ہی معتبر اور تلوار کے دھنی سرداروں کے ساتھ قنوج جا پہنچا اور سوئمبر سبھا سے سینوگتا کو اٹھا کر لوٹ آیا۔ جے چند کی فوج نے اس کا پیچھا کیا۔اپنی سلطنت تک پہنچتے پہنچتے چوہان راجہ کے سب ہی سردار جے چند کی فوج کو روکنے کے چکر میں مارے گئے جس کا خمیازہ جلد ہی چوہان کو اٹھانا پڑا۔

ادھر، اپنی ہار سے بوکھلائے غوری نے اگلے سال پھر پرتھوری راج چوہاں کو للکارا اور دونوں کی فوجیں نرائن میں آ ڈٹیں۔اس بار بھی سارے راجپوت راجہ سامنے تھے لیکن چوہان کی حکمت عملی کی ایک ایک خبر غوری تک پہنچا رہا تھا جے چند۔1192 کی اس جنگ میں راجپوتوں کی ساری بہادری دھری کی دھری رہ گئی اور غوری نے نہ صرف میدان مارا بلکہ پرتھوی راج چوہان اور زیادہ تر سردار اور دوسرے راجپوت راجاؤں کو موت کے گھاٹ بھی اتارا۔ یہ ہار بھارت کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی اور محمد غوری نے بجائے لوٹ پاٹ کرنے کے اپنے غلام قطب الدین ایبک کو چھوڑ دیا۔یہیں سے شروع ہوا بھارت کو غلام بنانے کا۔غلام سلسلہ کی شروعات۔ پرتھوی راج چوہان کی اس ہار کی ایک اہم وجہ تھی ساری فوج کو یکبارگی میدان جنگ میں جھونک دینا۔جبکہ غوری نے فوج کا ایک بڑا حصہ محفوظ رکھا اور جب شام کو غوری نے میدان میں تازہ دم محفوظ فوج کو اتارا تو راجپوتوں میں لڑنے کی طاقت نہیں رہ گئی تھی۔

میدان جنگ میں فوج کے چار پانچ حصے کر کے ایک کو ریزرو میں رکھنے کی سوچ کسی بھی راجپوت راجہ کی کبھی رہی ہی نہیں۔اور بدیں وجہ قریب ہزار سال کی تاریخ میں بھارت کا ایک بھی

راجہ کسی غیر ملکی طاقت کو مات نہیں دے سکا صرف ایک نام سامنے آتا ہے جس نے بہادری کے ساتھ ساتھ دماغ کا بھی استعمال کیا وہ تھا مراٹھا شیواجی، جس نے اورنگ زیب جیسے صاحب جلال بادشاہ کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ سننے میں یہ بات چونکانے والی لگے گی، لیکن یہ آخری سچ ہے کہ 1971 میں بنگلہ دیش جنگ میں بھارتی فوجوں نے ہزار سال بعد کوئی جیت حاصل کی تھی۔

اور آخر میں ایک ایسی جنگ پر لکھی گئی پوتھی کی وہ سطریں، جو بتاتی ہیں کہ کیسریا بانا پہن کر لڑ مرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میدان جنگ میں مرمٹ کر سورگ جانے اور پیچھے محل میں ٹسوے بہاری سو پچاس مہارانیوں کو آگ میں بھسم ہو جانے کی تحریک دینے کے بجائے دشمن کا کیسے بھی خاتمہ کرنے کے جذبے کے ساتھ اسی دھرتی پر ہوئی تھی وہ جنگ...... ہاورڈ فاسٹ کے قلم سے فلسطین میں دو ہزار سال سے زیادہ پہلے تیس سال تک لڑی گئی اس جنگ آزادی کی شروعات کا حصہ......

"آنے دو اُنہیں ہم کو ڈھونڈتے ہوئے! بھیجنے دو ہمارے خلاف اپنی فوجیں! فوج بکری کی طرح پہاڑوں پر نہیں چڑھ سکتی۔ ہم چڑھ سکتے ہیں! ہر چٹان کے پیچھے اور ہر درخت کی شاخوں میں ایک تیر چھپا ہو! ہر چوٹی پر بڑے بڑے پتھر جمع رہیں! ہم کبھی سامنے سے اُن کا مقابلہ نہیں کریں گے، کبھی ان کو روکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ لیکن ہم برابر اُن پر وار کرتے رہیں گے، کرتے رہیں گے، کرتے رہیں گے یہاں تک کہ ہمارے تیروں کے ڈر سے ان کی رات کی نیند حرام ہو جائے گی، پھر ان کی ہمت نہیں ہوگی کہ کسی تنگ درّے میں گھس بھی سکیں اور پھر سارا یوڈیا ان کے لئے ایک بڑا سا جال بن جائے گا! لانے دو اُنہیں اپنی فوجیں ہماری دھرتی پر...... ہم تو پہاڑوں پر ہوں گے! اور پھر آنے دو اُنہیں پہاڑوں پر...... ہر چٹان جاگ اُٹھے گی! پھرنے دو اُنہیں ہماری تلاش میں، ہم کہرے کی طرح پھیل کر ہوا میں پگھل جائیں گے! اور جب وہ اپنی فوجیں کسی درّے کے بیچ میں سے نکالنے کی کوشش کریں گے تو ہم ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے، جیسے سانپ کے کئے جاتے ہیں۔"

❁❁❁❁❁

1857ء کے چار باغی

گوتم بہادر/ترجمہ: پروفیسر طفیل ڈھانہ

تاریخ کچھ نہیں کرتی، یہ بے انتہا دولت پر قبضہ نہیں کرتی، یہ جنگیں شروع نہیں کرتی، یہ انسان ہے، ہاں زندہ انسان جو یہ سب کچھ کرتا ہے۔ جو لڑتا ہے اور قبضہ کرتا ہے۔ تاریخ انسان کی طرح ذاتی وجود نہیں رکھتی جو انسان کو اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ تاریخ انسانی ہمہ گیری کے علاوہ کچھ نہیں، جس پر وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے کاربند ہوتا ہے۔

(مارکس اور اینگلس۔ مقدس خاندان)

I- تعارف

اب تک 1857 کی بغاوت کا مطالعہ کرنے کے لئے تاریخ کو جانچنے کے جتنے بھی اہم نقطہ ہائے نظر اپنائے گئے ہیں مجرمانہ غفلت کے حامل پائے گئے ہیں۔ ایس بی چودھری، جو کہ ایک نامور قوم پرست تاریخ دان ہے، کہتا ہے کہ یہ زمیندار سرداروں کا طبقہ تھا، جس نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی قیادت کی، کیونکہ فطری طور پر وہی لیڈر تھے۔

آر سی ماجمدار کا نقطہ نظر بھی یہ ہے کہ تعلقہ دار اور زمیندار، جو کہ کسانوں میں انتہائی قابل احترام تھے، بغاوت کو شروع کرنے اور عوام میں لے جانے والے راہنما تھے۔ ایرک سٹوکس جس کا موقف بغاوت میں عوامی شمولیت کے مقامی اسباب کے حوالے سے قابل توقیر ہے، نے بھی 1857 کی دیہی علاقوں میں بغاوت میں اعلیٰ ترین اشرافیہ کا بنیادی کردار بیان کیا ہے۔ کیونکہ اس میں عوام کی اکثریت کا کردار معمولی تھا اور زیادہ تر لوگوں نے اپنی ذاتوں کے سرداروں کے

احکامات کی پیروی کرتے ہوئے بغاوت میں شرکت کی۔ انقلابی تاریخ دانی کے زمرے میں بھی بنیادی موقف مختلف نہیں رہا۔ برمودے سین گپتا، جوکہ ایک مارکسی دانشور ہے، نے عظیم بغاوت کی تاریخ نانا صاحب، لکشمی بائی اور بہادر شاہ ظفر وغیرہ کی کارروائیوں اور کامیابیوں کے حوالے سے لکھی ہے۔ کیونکہ اس کی نظر میں یہ فیوڈل سردار حقیقی راہنما تھے۔ حتیٰ کہ انقلابی دانشور، سروج دتا، جونکسل باڑی انقلابی تحریک کا لیڈر تھا، کی جانب سے پبلک مقامات پر نصب مفکرین کے مجسمے ہٹا کر وہاں انقلابی رانی لکشمی بائی اور تانتیا ٹوپے کے مجسمے نصب کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اپنے اعلیٰ ترین مقاصد کے باوجود انقلابی نوعیت کی تاریخ نویسی بھی اس نقطہ نظر کے دائرہ فکر سے مختلف نہ ہو سکی جو سرمایہ دار قوم پرستوں اور لبرل تاریخ دانوں نے اختیار کیا تھا۔

ان تمام تحریروں میں جو نظر انداز ہو گیا ہے وہ عام لڑاکا اور سامراجی حکمرانی کے خلاف اس کا تصور اور کردار ہے۔ اس کے برعکس زیر نظر تحریر 1857 کے چند ایسے باغیوں کا کردار سامنے لانے کی کوشش ہے جو تاریخ دانوں کی جانب سے نظر انداز کئے گئے ہیں یا ایک معمولی ذکر سے زیادہ کچھ نہ کہہ کر ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا۔ میں ان میں سے چار کے بارے میں بیان کرتا ہوں۔۔۔ ایک چھوٹا زمیندار، ایک کاشتکار جس کا تعلق کسانوں کی وسیع برادری سے تھا، ایک غریب قبائلی نوجوان اور ایک مولوی۔ ان چاروں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ بغاوت میں عام لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور اس دور کی انقلابی شخصیات کی ذہنی کیفیت کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ یہ اس قسم کے لیڈر تھے جو روایتی بااثر جاگیرداروں سے مختلف تھے۔ ان کا شمار ایسے راہنماؤں میں ہوتا تھا جن کے بارے میں سہارنپور کے ایک صاحب علم ضلعی آفیسر نے کہا، یہ چند ایک غیر معمولی سرگرم لوگ تھے جو بغاوت شروع ہونے کے ساتھ سامنے آئے اور مختلف علاقوں میں تحریک کو منظم کیا۔

II- شاہ مل

شاہ مل بجرولی کا رہائشی تھا جو کہ پرگنہ باروت کے مشرقی حصے میں ایک بڑا گاؤں تھا۔ گاؤں کی زمین جمنا ندی سے نکلنے والے بجوارا اور کشن پور راجباہوں کے ذریعے سیراب ہوتی تھی۔ وہ گاؤں کے ایک حصے کا ملک تھا جو بغاوت کے وقت دو پٹیوں پر مشتمل تھا۔ جو کہ کلوا اور بھولی یا سدون

کہلاتی تھیں۔ معروف باغی لیڈر شاہ مل کا کنٹرول صرف پہلی پتی پر قائم تھا۔ اس میں بھی کئی دوسرے حصہ دار شریک تھے جیسا کہ سیس رام وغیرہ۔ جو اس کی سرگرمیوں سے علیحدہ رہے۔ لہٰذا جب بغاوت دبادی گئی تو ان کے مفادات محفوظ رہے۔ دوسری پتی نے بھی بغاوت میں حصہ نہ لیا جس میں چار تھوک تھے لہٰذا حسب روایت اس کے بارے میں بھی قرقی نہ کرنے کے احکامات جاری کئے گئے۔

تحصیل باروت، اپنی گہری رنگت والی اچھی زمین کے باعث قابل ذکر زرخیزی اور آبپاشی کے لئے وافر ذرائع کی وجہ سے ضلع کا سب سے زیادہ خوشحال پرگنہ شمار ہوتا تھا۔ ٹی سی پلوڈن نے اپنی رپورٹ میں اس کی خوشحالی کے بارے میں بہت واضح طور پر لکھا تھا۔ رپورٹ کے مطابق یہاں غیر موزوں زمین کا بہت تھوڑا حصہ تھا۔ جو کہ کل کے 1/6 کے برابر تھا۔ پرگنہ کا پورا رقبہ جمنا، سندھ اور کرشنا دریاؤں سے نکلنے والی چھوٹی نہروں سے سیراب ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے یہاں گنے، کپاس، گندم اور مکئی جیسی نفع بخش فصلوں کی کاشت ہوتی تھی۔ تمام رقبہ ترقی پذیر تجارتی علاقے میں شامل تھا۔ باروت، نیونی اور سردھانہ اچھی منڈیاں تھیں جو کہ میرٹھ، شملہ، کندھارا، باغ پت، ٹاندھا اور دہلی کے ساتھ منسلک تھیں اور یہاں پر جنس کی فروخت کے لئے سہولت موجود تھی۔

یہاں آبادی گنجان تھی اور زیادہ تر جاٹ کاشتکاروں پر مشتمل تھی جو کہ چھپرولی، باروت، کتانہ اور بروانہ کے بالائی حصے میں واحد حکمران تسلیم کئے جاتے تھے۔ سٹوکس نے معاشرے میں جس بھائی چارے کے بارے میں لکھا ہے۔ وہ اس علاقے میں پوری طرح عمل پذیر تھا۔ کیونکہ جیسا کہ آبادکاری رپورٹ میں بتایا گیا، اس بڑی زرعی آبادی میں چھوٹے کاشتکاروں کی ایک بڑی اکثریت پائی جاتی تھی۔ حقیقی اعتبار سے یہاں 975 زمینداری محل تھے جبکہ ان کے مقابلے میں 2,235 پٹہ دار اور بھائی چاری کاشتکار تھے۔ بڑے کاشتکار تو شاہ مل جیسے زمیندار تھے اور ان کو تقریباً آدھی زمین خود کاشت کرنی پڑتی تھی۔

اس علاقے میں بہت کم ایسا تھا کہ دیہاتوں کے مالکان اراضی اور کاشتکار مختلف ذاتوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ فوربس نے لکھا، چونکہ تمام چاروں ذاتوں سے تعلق رکھنے والے مالکان کسی نہ کسی حد تک زراعت سے منسلک تھے۔ غالباً اس صورت حالات کا منطقی نتیجہ تھا کہ کاشتکاروں کا طبقہ مالکان اراضی پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا۔ یہاں بڑی تعداد میں چمار تھے جو زرعی

مزدوروں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگرچہ وہ آبادی میں جاٹوں سے کم نہیں تھے مگران کو کاشتکاری سے خارج کر دیا گیا تھا۔ یہ بات اہم ہے کہ 1857 کی بغاوت میں چماروں کو کسی نے لائق توجہ ہی نہیں سمجھا۔

انگریزوں کی فتح کے بعد باروت کا علاقہ بیگم سامرو کی حکمرانی میں دے دیا گیا۔ اس حوالے سے یہ الزام سامنے آیا کہ ایک بالادست ٹاگو وزیر نے جاٹ مالکان سے ناروا سلوک کیا۔ 1836 کے بعد جب علاقے پر انگریزوں کا اقتدار مستحکم ہو گیا، پلوڈن نے آبادکاری کے دوران، توازن جاٹوں کے حق میں بدل دیا۔ پھر بھی تخمینہ میں کاشتکاروں پر بوجھ بڑھ گیا۔ ایک آبادکاری آفیسر کے مطابق، اس کے باوجود جاٹ کسانوں نے مطالبات قبول کر لئے۔ زراعت کی ترقی میں قابل ذکر اضافہ ہوا، مگر مالکانہ حقوق کی نوعیت زیادہ بہتر و مناسب نہ تھی۔ لہٰذا آبادکاری نظام کے خلاف غم و غصہ تکلیف دہ نوعیت کا حامل تھا۔ آبادکاری آفیسر کو باغ پت میں چھوٹے مالک کسانوں کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے لکھا کہ دوبارہ آبادکاری کی غرض کے پیش نظر انہوں نے اپنی اچھی فصل تباہ کر دی۔ چھوٹے کاشتکار مالکان کی نظر میں آبادکاری کی ہر سکیم پوری طرح ناقابل اطمینان تھی اور وہ اس کو ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے تبدیل کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ یہ کالونیل حکومت کا آئینی مکاّ تھا جس نے آخرکار ان کو آبادکاری سکیم قبول کرنے پر مجبور کیا، جو انہوں نے بالآخر نہ چاہتے ہوئے برداشت کر لی۔ بورڈ کی ہدایات اپنی نوعیت کے اعتبار سے باغ پت اور باروت کے منحرف مالک کسانوں کے خلاف تھیں۔

''اگر زمیندار اور کاشتکار اپنے زیر قبضہ زمین پر طے شدہ لگان کے مطابق پٹہ حاصل کرنے اور اس پر عمل درآمد کی قبولیت پر تیار نہ ہوں تو آپ یہ زمین ایسے زمینداروں اور رعیت کو دیں گے جو زمین کاشت کرنے پر تیار ہوں یا اس زمین کو خالی رکھیں گے۔ دوسری صورت میں منحرفین کو بتا دینا ہوگا کہ پٹہ کے بغیر زمین کاشت کرنے کی صورت میں تمام فصل پر قبضہ کر کے حکومت اس فصل کو اپنے طور پر فروخت کر دے گی۔''

یوں سیاسی دھمکی اور ریاستی قوت کا استعمال آبادکاری نظام کے نفاذ میں اہم کردار کا حامل تھا۔ لہٰذا عوام پر اس کے اثرات کو شماریاتی کلیوں کی مدد سے جانچا نہیں جا سکتا۔ میرٹھ ضلع کے باغ پت اور باروت جیسے علاقوں میں ایسی وجوہات کی بنا پر پیدا ہونے والے ذہنی دباؤ اور پریشانیوں

کے بارے ریکارڈ 1840 اور 1850 کی دہائیوں کی شہادتیں موجود ہیں۔ اس میں ناگزیر طور پر پرانے مالکان سے زمین چھین لینے کی دھمکی شامل تھی۔ جس میں زمین کی نیلامی کے ذریعے اجنبی لوگوں کو پتی میں شامل کرنے کا دباؤ قائم ہوتا تھا، جو ایک دوسرے کے ساتھ روایتی طور سے نسلی تعصبات رکھتے تھے۔ البتہ ضلع کے تمام علاقوں میں جو کہ لگان کے ناروا تخمینے اور مالکانہ حقوق کی نامناسب منتقلی کے باعث ناانصافیوں کا شکار ہوئے تھے، باغیانہ ردِعمل برابر اور ایک جیسا نہیں تھا۔ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ اس نقطہ کو سمجھنے کے لئے کہ مسلح بغاوت کیوں ایک علاقے میں شروع ہوتی ہے اور دوسرے میں نہیں، فوری معاشی نفع ونقصان سے آگے گہرائی تک نظر ڈالنا اہم ہے۔

شاہ مل کی بغاوت ایک مقامی مسئلہ کے طور پر شروع ہوئی۔ یہ بات سامنے آئی ہے کہ صرف باولی اور باروت دیہاتوں کے پڑوسی جاٹ تھے جو بغاوت میں انگریز حکومت کے خلاف سرگرمی سے لڑے۔ پھر بھی جنگ کی شدت اہم درجہ تک پہنچ گئی۔ جس کا اقرار انگریز کمشنر نے اس طرح کیا۔

"ضلع کے اس حصے میں بغاوت کا علم باروت کے شاہ مل نے بلند کر رکھا ہے۔ بھگتا اور ساجا اس کے دو بہادر ساتھی ہیں۔ ان کے ساتھ 60 دیہاتی شامل ہوئے۔ جنہوں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ مرکزی راہنماؤں کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔" ان دیہاتی راہنماؤں میں زیادہ تر نمبردار تھے۔ مثال کے طور پر جیرم، بادن اور گلاب جو بالترتیب جوہری، جور ماوا اور جعفر آباد کے نمبردار تھے۔ شاہ مل کے باغی دستوں کے نمایاں کمانڈر تھے۔ باروت کے نمبرداروں، جیسا کہ شان سنگھ اور بدھ سنگھ، بھی اپنے ساتھیوں سمیت باغیوں میں شامل ہو گئے۔ ساٹھ افراد جن کے نام سامنے آئے ان میں نمبرداروں کی تعداد بیس سے کم نہیں تھی۔ جو شاہ مل کے ساتھ مشترک نکتہ پر اتفاق کر چکے تھے۔ اس میں پتی دار یعنی حصہ دار بھی شامل ہوئے۔ جیسا کہ کرن اور اور برجس، جو ڈاگوٹا کے حصہ دار تھے اور جنہوں نے اس کا ساتھ دیا اور سردھا کے تحصیل دار اور ایک گاؤں ڈالا پر حملہ کیا۔ باروت کے ہرگوپال اور سرسالی کے مہر چند نے بھی ایسا ہی کردار ادا کیا۔ لیکن اس کے ساتھ سماجی طور پر کمزور لوگ بھی شریک ہوئے۔ جیسا کہ کالو اور دلسو کلی، جو کہ ایک غریب سکھ شیام سنگھ کے بیٹے تھے۔ وہ ڈھکولی کا رہائشی جاٹ تھا۔ جس نے باغی دستوں کی کمان سنبھالی۔ اس کے علاوہ کندھورا کا راجی اور جیون پور کا ہردیال گجر شاہ مل کے پیروکار تھے۔ مگر محسوس ہوتا ہے کہ وہ حصہ

داراور نمبردار نہیں تھے۔

اس طرح شاہ مل کو گاؤں کے سرکردہ لوگوں اور علاقے میں چھوٹے زمینداروں کی حمایت حاصل تھی۔ نمبردار کی اصطلاح گاؤں کے سرکردہ فرد کے لئے ہوتی تھی جس کو ریونیو جمع کرنے کی ذمہ داری دی جاتی تھی۔ درحقیقت گاؤں کے کئی ایک افراد یہی فریضہ کچھ مختلف طریقے سے ادا کرتے تھے۔ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی جانب سے منتخب ہوتے تھے اور ان کو کچھ فیصدی تک ریونیو جمع کرنے کی اجازت ہوتی تھی۔ ان کے ذریعے سے ریاست کاشتکاروں کے ساتھ رابطہ قائم رکھتی تھی، ان کو قرضہ فراہم کرتی تھی اور ان کی ضروریات سے آگاہ ہوتی تھی۔ البتہ دوسرے تمام چھوٹے مالکان کی طرح وہ بھی مالیاتی مطالبات اور سروے و آبادکاری کی مشکلات کا شکار ہوتے تھے۔ آسیہ صدیقی نے اس نکتے کی وضاحت کی ہے کہ کس طرح سے یہ گروہ معاشی ترقی اور اپنی زمینوں سے محروم ہوجانے جیسے امکانات کی گرفت میں جکڑے ہوتے تھے۔ ان میں زیادہ تر غریب تھے یا پھر دوسرے کاشتکاروں کی نسبت قدرے بہتر حالت میں تھے۔ دوسری جانب کوئی اچھا موقع ملنے پر وہ ریاست کے ساتھ تعلق کا فائدہ اٹھا کر اپنی دولت بڑھاتے تھے۔ بغاوت کے دوران یہ گروہ ریاست کی جانب سے ریونیو کے مطالبات اور مداخلت کی پریشانی اور اپنی خواہشات کے زیر اثر شاہ مل کے گرد جمع ہوگئے۔

10 مئی 1857 کو میرٹھ میں بغاوت شروع ہونے کے ساتھ ہی باروت میں انگریزی سرکار کے حکومتی اختیارات ختم ہوگئے، جب کاشتکاروں کی ایک بڑی تعداد نے لوٹ مار کا سلسلہ شروع کردیا اور بہت سے پرانے مالکان نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی زمینوں پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ اس موقع پر پہلی بار 12 اور 13 مئی کو شاہ مل نے بنجاروں (تاجروں) کی ایک پارٹی پر حملہ کیا اور ان کو لوٹ لیا۔ یہ پہلی کھلی لوٹ مار کا آغاز تھا۔ اس کے بعد تحصیل باروت پر حملہ کر کے اس کو لوٹا اور تباہ کردیا۔ اس کے بعد اسے دہلی سے آنے والے احکامات کے تحت اس علاقے کا صوبیدار بنا دیا گیا۔ مئی اور جون میں اس نے اپنی پوزیشن مستحکم کرلی۔ باولی کی طرح دوسرے جاٹ دیہات اس کے ساتھ اپنی کاشتکار آبادیوں سمیت شامل ہونے لگے۔ اس کی قوت میں اور بھی اضافہ ہوا جب میرٹھ جیل کے قیدی اس کے فوجی دستوں میں شامل ہوگئے۔ ایک سرکاری اہلکار نے اس بارے بتایا ہے کہ وہ کس طرح طاقتور بن گیا۔

شاہ مل ایک جاٹ (سکھ) تھا۔ اس نے کچھ لڑاکو لوگوں کو جمع کیا اور دہلی کے باغیوں سے مدد حاصل کر کے اس نے اتنی طاقت حاصل کر لی کہ اسے تحصیل باروت پر حملے کر کے لوگوں کو لوٹنے کا حوصلہ مل گیا۔ پھر اس نے باغ پت کے مقام پر جمنا کا کشتیوں کا پل تباہ کر دیا۔ اس نے میرٹھ سے باغیوں کی فوجی مدد کے ساتھ جمنا کا پل پھر تباہ کر دیا جو مسٹر جے۔ کیمپ بل نے دوبارہ تعمیر کیا تھا اور اس کی حفاظت کے لئے جھینڈ راجا کا فوجی دستہ متعین کیا تھا۔ اور ان تمام کامیابیوں کے بعد بالآخر اس نے چوراسی دیہاتوں پر اپنی حکمرانی قائم کر لی، جو جاٹوں کے دیہات تھے اور عام طور سے چوراسی دیس کہلاتے تھے۔ بغیر کسی سابقہ حیثیت کے، باغی سرکار کے ساتھ وابستگی کے باعث وہ اہمیت کا حامل باغی بن گیا۔ وہ اپنے علاقے سے سامان ضروریات جمع کر کے باغیوں کو امداد فراہم کرنے لگا۔ اس نے ہیڈ کوارٹر کیمپ اور میرٹھ کے درمیان براہ راست رابطہ منقطع کر دیا اور جب اس پر حملہ کیا گیا تو اس نے پورے ملک کے ساتھ شمال اور مغرب میں جنگ لڑنے کی دھمکی دی۔

ایک اور اہلکار نے اس کے بارے لکھا۔۔۔ وہ ماوے قبیلے کا جاٹ تھا۔ وہ پرگنہ باروت کا حاکم بن گیا اور اپنے لئے راجا کا لقب اختیار کیا۔ اس نے باروت کے علاوہ جمنا کے بائیں کنارے پر تین چار مزید پرگنے فتح کر لئے۔ اس طرح اس علاقے کے لوگ اور دہلی میں موجود فوج اس کے محاصرے میں آ گئی۔

ایسی رپورٹیں ایک مقامی لیڈر کی اہمیت نمایاں کرتی ہیں، جو ولی داد خاں کے برعکس، کوئی وراثتی اعزاز نہیں رکھتا تھا۔ لیکن بغاوت کے خلاف فوجی کارروائی میں کسی رکاوٹ سے کم ثابت نہ ہوا۔ اس نے بغاوت کا آغاز تحصیل باروت باغ پت بازار میں قتل و غارت اور لوٹ مار سے کیا۔ دونوں جگہیں انگریزوں کی حکمرانی اور دولت کی علامتیں تھیں۔ اس حوالہ سے وہ مثالی کردار کا حامل نہ تھا۔ لیکن کئی دوسرے ایسے لوگوں سے آگے بڑھ کر اس نے قوت کا مقامی نوعیت سے اعلیٰ تصور قائم کیا اور اپنے علاقے سے باہر دوسری قوتوں سے اتحاد کیا۔ اس نے دہلی میں سرگرم باغیوں سے رابطہ قائم کرنے کے لئے اپنے سفیر بھیجے۔ بلوچ پورا کے ایک بلوچ نبی بخش کا بیٹا اللہ دتا کو شاہ مل نے آفیسر مقرر کر کے دہلی بھیجا تاکہ وہ انگریزوں کے خلاف جنگ کے لئے وہاں سے مدد اور فوجی حاصل کرے۔ باغ پت کے تھانیدار وزیر خاں نے بھی بادشاہ کو اس مقصد کے لئے درخواست

ارسال کی۔ نور خاں کا بیٹا مہتاب خاں باغ پت میں ایک اور رابطہ تھا۔ یہ ایسے لوگ تھے جن کے دہلی میں دوست موجود تھے اور اس کے بارے میں بادشاہ کو آگاہ کرتے تھے۔ ان لوگوں کی وجہ سے ہی شاہ مل کے بارے میں نکتہ نظر بنا کہ وہ باغیوں کے مقصد کو تقویت دینے والا آدمی تھا۔ اس نے انگریزی فوجوں کے درمیان قائم رابطے کاٹ دیئے، اپنے علاقے کے دیہاتوں کو متحرک کیا اور کئی دوسرے معاملات میں دہلی کے باغیوں کی نظر میں اپنا کردار اہم ثابت کیا۔ جن کے لئے یہ علاقہ سٹرٹیجک اہمیت اختیار کر گیا جو تربیت اور سپلائی کے لئے اہم بیس بن گیا۔ ایسا رابطہ جو ایک مقامی باغی اور دہلی میں باغیوں کی مرکزی قیادت کے درمیان قائم ہوا، ڈنلوپ نے نظر انداز نہیں کیا۔ جس نے کسی قدر خوف محسوس کرتے ہوئے لکھا۔۔۔ اگر ہم دشمنوں کے خلاف اور دوستوں کی مدد کے لئے طاقت سے بھرپور اقدامات نہیں کرتے تو ہم لوگوں کی اکثریت سے مکمل طور پر کٹ جائیں گے۔ وہ لوگ جو ابھی تک ہم پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں ہماری واضح عدم دلچسپی کے باعث متنفر ہو رہے ہیں اور آج کی بغاوت اور شورش انقلاب کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ البتہ علاقے میں سارے دیہات شاہ مل کے حامی نہیں تھے۔ ولیم کی رپورٹ کے مطابق 15 جولائی تک بغاوت آپریشن شروع ہونے سے قبل بہت سے جاٹوں نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ شاہ مل کی حمایت کرنے کو تیار نہ تھے بلکہ اس کے برعکس شاہ مل کی گرفتاری میں معاونت فراہم کرنا چاہتے تھے۔ ڈنلوپ نے ایک راجپوت گاؤں دیولہ اور دوسرے برکہ کا ذکر کیا ہے جو دونوں انگریزوں سے دوستانہ تعلق رکھتے تھے۔ کیونکہ ان کو شاہ مل کی جانب سے حملے کا خطرہ تھا۔ حقیقت میں دیولہ کا راجپوت نیول سنگھ ڈنلوپ کے رضا کار دستوں کا اہم چغلی خور اور مخبر تھا جو شاہ مل کے خلاف 15 جولائی 1857 کو حرکت میں آ گئے تھے۔ دیولہ اور بسوادھا دونوں دیہاتوں نے انگریزی سرکار کو لگان کی قسطیں ادا کر دیں۔ شاہ مل نے ایسا نہیں کیا اور 3000 لڑاکوں کے ساتھ حملہ کر کے ان دیہات کو لوٹنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ اپنے منصوبہ پر عمل کے کس قدر قریب تھا انگریزوں کو اس کا اندازہ 17 جولائی کو ہوا جب انہوں نے بسوادھا گاؤں پر قبضہ کیا۔ جو مسلمان گجروں کا گاؤں تھا۔ ان کو یہاں 8000 ہزار من اجناس خوردنی کا ذخیرہ ملا جس میں زیادہ مقدار گندم اور دالوں کی تھی جو کہ دہلی میں باغیوں کے لئے جمع کیا گیا تھا۔ شاہ مل ایک رات قبل اس گاؤں میں موجود تھا مگر بروقت یہاں سے بچ کر نکل گیا۔ انگریزی فوج نے گاؤں کے تمام مردوں کو قتل کر دیا گیا اور اسلحہ

تباہ کر دیا۔ جبکہ دہلی سے آئے ہو دو غازی مسجد کے اندر بے جگری سے لڑتے رہے۔ لیکن شاہ مل کی اتھارٹی اتنی مضبوط تھی کہ دیولہ کے لوگوں نے کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا جو مال غنیمت کے طور پر اکٹھی کی گئی تھیں کیونکہ ان کو شاہ مل کے انتقام کا خوف تھا۔

فرانسس کوہن کا مطالعہ ہمیں ایک اور مثال فراہم کرتا ہے کہ انگریزوں کے اتحادیوں کو خاص طور سے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ کوہن بیگم سومرو کے علاقے میں ایک عیسائی تحصیلدار تھا اور اس نے دہلی کے فرار عیسائی قیدیوں کو پناہ دے کر اپنا مذہبی فریضہ ادا کیا۔ اس لئے گجروں اور شاہ مل کے ساتھیوں نے اس کے خلاف ایکشن لیا۔ اس کی 8000 روپے سے زیادہ مالیت کی جائیداد لوٹ لی گئی اور اسے قیدی بنالیا گیا۔ اس کے بعد 600 روپے تاوان حاصل کر کے اسے رہا کر دیا گیا۔

شاہ مل نے دریائے جمنا پر واقع محکمہ انہار کے ایک آفیسر کا بنگلہ اپنے دفتر میں تبدیل کر دیا جس کو اس نے انصاف مرکز کا نام دیا۔ یوں اس نے اپنے احکامات پر عمل درآمد کے لئے سرکار کا دفتر قائم کر لیا۔ اس نے جاسوسی کا متوازی نظام قائم کیا۔ جس پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ڈنلوپ نے لکھا: ''جاسوسی کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے، جس کا مظاہرہ باغیوں نے ہر موقع پر کیا، وہ ان لوگوں میں بھی دوست تلاش کرنے میں کامیاب رہے جو بغاوت کے ساتھ وابستہ نہیں تھے۔'' جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں شاہ مل بسوا دھا پر اچانک حملے سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کے نام سلیک رام اور لال پھلسن کی طرف سے لکھا ہوا خط ملا، جو مینگا گاؤں میں اس کے قابل اعتماد ساتھی تھے اور فوجی قوت کی تفصیلات سے آگاہ کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ معلومات میرٹھ سے حاصل کی تھیں۔ ان کو گرفتار کر کے جاسوسی کی سزا کے طور پر پھانسی لگا دی گئی۔ کمشنر نے لکھا۔ ان ذہین باغیوں اور جاسوسوں نے مجسٹریٹ کے قریبی حلقوں میں گھس کر شاہ مل کے خلاف منصوبہ بندی اور فوجی قوت کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں اور جاسوسی نظام کے ذریعے یہ خبر شاہ مل تک پہنچا دی۔ نتیجہ کے طور پر 129 فوجیوں پر مشتمل دستے کو کئی گھنٹوں تک ہزاروں کی تعداد میں باغیوں کا سامنا کرنا پڑا اور صرف انتہائی پختہ عزم اور بہادری نے پارٹی کو مکمل تباہی سے بچا لیا۔ جاسوسوں کو پکڑ لیا گیا اور پھانسی لگا دیا گیا۔ اس طرح کے ایجنٹ تھے جن کی مدد سے شاہ مل نے ایک حساس مرکزی تنظیم تشکیل دی۔ اس کے اہلکار رات کو ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک جاتے تھے اور لوگوں کو انگریزوں کے خلاف بغاوت میں شامل ہونے کی تحریک دیتے

تھے، جیسا کہ ڈنلوپ نے بعد میں اس کے بارے میں لکھا تھا۔ عملی طور پر یہ تنظیم مرکزی قیادت کی معاون تھی جو دوستوں اور دشمنوں کی پہچان کرنے میں معاونت فراہم کرتی تھی اور دشمن کے حملے سے بچنے میں مدد دیتی تھی۔

جنگی مہم کے خاتمے کے باعث حالات نارمل ہونا شروع ہوئے تو حکومت نے اس بات پر غور کرنا ضروری سمجھا کہ ان لوگوں میں واضح امتیاز کیا جائے جو دہلی اور روہیل کھنڈ کی مرکزی قیادت کے ساتھ وابستہ ہوئے اور دوسرے جنہوں نے فوجی بغاوت کے نتیجہ میں حکومتی رٹ کمزور ہو جانے کے باعث علاقائی طور پر کسی بھی مہم جوئی میں اپنی ذاتی آزادی اور بالادستی قائم کرنے کے لئے جنگ میں شرکت کی اور شاہ مل اور اس کے ساتھیوں کو دوسری صف میں شامل کرتے ہوئے اہلکاروں نے اس بغاوت کے سیاسی کردار کی نوعیت پر توجہ مرکوز کی۔ باغیوں کے مخالفین کی نظر میں فوجی بغاوت کے بعد حکومتی رٹ کا خاتمہ، علاقائی بالادستی حاصل کرنے کی جدوجہد اور اپنی آزادی قائم رکھنے کی مزاحمتی لڑائی غدری حالات کے سیاسی اشارے تھے۔ دوسری صف میں شامل لوگوں سے متعلق، ڈنلوپ، جو کہ ایک شاطر تجزیہ کار تھا ایسی علامات دیکھ چکا تھا، جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس علاقے میں حکومتی عدم دلچسپی کے باعث یہ نکتہ نظر تیزی کے ساتھ پھیل گیا کہ برطانوی حکمرانی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی تھی۔ اور جیسا کہ دہلی پر قبضے کی جنگ جاری رہی اور باغیوں کی قوت، جو شاہ مل کی حمایت کررہی تھی، برابر توازن میں تھی، ڈنلوپ نے کہا، لوگ یہ جاننے کے لئے بے چینی میں مبتلا تھے کہ ان کے راج اور ہماری حکومت کے درمیان لڑائی میں جیت کس کی ہوگی۔

ان رپورٹوں میں دو قوتوں کے درمیان امتیاز کی کیفیت، یعنی ان کی جیت یا ہماری فتح، اس رویئے کے بارے میں آگاہ کرتی ہیں جو معاشی نفع ونقصان سے آگے اقتدار کے تصور سے متعلق تھا۔ البتہ اس جدوجہد کے کئی پہلو دوسرے ہیں جن کے بارے میں سرکاری نکتہ نظر کچھ بیان نہیں کرتا۔ ان انفرادی وجود کے حامل دیہاتوں میں شاہ مل کیسے لیڈر بن کر ابھرا؟ دیہی علاقے میں بالادستی حاصل کرنے کے لئے جو جدوجہد ہوئی اس میں شاہ مل کو کامیابی کس طرح حاصل ہوئی۔ یہ ایسے سوالات ہیں جو کسانوں کی بغاوت پر قلم اٹھانے والا کوئی تاریخ دان نظرانداز نہیں کرسکتا۔ درحقیقت دو تاریخ دانوں ایرک سٹوکس اور رانا جیت گوہا نے اپنی تحقیق میں ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ شاہ مل کے بارے میں اپنی بحثوں میں انہوں نے بغاوت میں کسانوں

کے اتحاد و نفاق کی وجوہات پر روشنی ڈالی ہے۔ سٹوکس گروہی رفاقتوں کو اتحاد کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ ایسی قربتوں کی بنیاد پر مقامی نوعیت کی گروہ بندی پیدا ہوئی جس میں علاقائی اور خاندانی بنیادوں پر قائم گروہ شامل ہوئے، جیسا کہ ٹپا اور کھپا جن میں بہت سے ایک دوسرے کے کٹر مخالف تھے۔ یوں باردت سلاکلین جاٹوں کا مرکز تھا جنہوں نے شاہ مل اور سوراج مل کی قیادت میں دراصل اپنے ہمسایہ چتوال جاٹوں کے خلاف پرانی دشمنی کو نئے سرے سے زندہ کر دیا تھا۔ سٹوکس کی رائے میں یہ گروہی اور علاقائی تعلقات تھے اس کے علاوہ پرانی دشمنیوں کی روایت تھی جس کی بنیاد پر شاہ مل کو دیہاتوں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ گویا قرار دیتا ہے کہ اپنی زمینوں کے ساتھ تعلق ایسی مہموں کے پیچھے مثبت کردار تھا جس نے باغیوں میں تحریک پیدا کی۔ جن کا مظاہرہ کسانوں کی اکثریت نے کیا جب فوجی بغاوت نے انہیں اس کا موقع فراہم کر دیا۔ اس کے علاقائی تصور میں جغرافیائی اور سماجی حلقہ اثر شامل تھا۔ بیشمار مثالیں پیش کرتے ہوئے وہ حملوں کے اہداف کی مقامی جہتوں پر زور دیتا ہے۔ بغاوت کی اس مقامی خصوصیت نے جزوی طور پر جنگ کو طول دینے میں آبادی کے نسلی تضادات سے قوت حاصل کی۔ علاقے میں مختلف ذاتوں اور نسلی گروہوں کی علاقائی تقسیم نے بغاوت کی تحریک کو مخصوص علاقے میں خاص ذاتوں تک پھیلانے اور محدود کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ شاہ مل کے معاملہ کو خاص طور سے گجروں کی باغی تحریک بیان کرتا ہے جس نے اتر پردیش کے شمال مغربی ضلع کو لپیٹ میں لے لیا۔ اس میں گجر عنصر کا کردار خصوصی طور سے نمایاں تھا کیونکہ حملے خاص طور سے جاٹوں کے دیہاتوں پر کئے گئے جو واضح طور پر قانون پسند اور امن پسند رویئے اپنائے ہوئے تھے۔

یہ دونوں موقف اپنے طور پر رہنمائی کے حامل ہیں۔ دراصل بغاوت کے دوران اس علاقے میں جاٹوں اور گجروں کے درمیان سخت لڑائیاں ہوئی تھیں اور کسی حد تک ان تضادات نے انگریزوں کے ساتھ وفاداری اور دشمنی کا تعین کرنے میں کردار ادا کیا۔ میرٹھ چھاؤنی سے 16 میل کے فاصلے پر گجروں کا ایک گاؤں سیکری کشیدگی میں سرگرم ہوا اور دوسرے دیہاتوں کی زمین پر قبضہ کرنے لگا۔ تین گجر دیہاتوں سیکری، نوگلہ، اور دیولہ کی مشترکہ فوج نے جاٹوں کی اس فوج کو شکست دے دی جو اپنے دفاع کی غرض سے بیگم آباد کے گاؤں اور بازار میں اکٹھی ہو رہی تھی۔ یہ واقع 8 جولائی کو وفادار جاٹوں کی حفاظت کے لئے آنے والی سرکاری فوج کی آمد سے پہلے ہوا۔ گجروں

کو فتح حاصل ہوئی کیونکہ وہ بہتر طور پر مسلح تھے۔ ان کے درمیان نفاق زیادہ نہیں تھا اور وہ تشدد کی ایسی کارروائیوں کے عادی تھے۔ یہ نسلی گروہوں کے تعصبات کی ایک واضح مثال ہے۔ لیکن شاہ مل کی تحریک ایسے رجحانات سے آگے نکل گئی۔ اگرچہ وہ خود ایک جاٹ تھا۔ اور اس کے ولی عہد اور آنے والے عہدیدار اس کے اپنے رشتہ دار تھے۔ پھر بھی گجر اس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ اس کی فوج میں مختلف ذاتوں سے تعلق رکھنے والے دیہاتی شامل ہو گئے تھے۔

درحقیقت، ڈنلوپ کے لئے 'جو ردِ بغاوت فوج کا کمانڈر تھا' کسی گاؤں کی ذاتوں اور گروہوں کے بارے میں معلوم کئے بغیر یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ گاؤں حکومت کا حامی تھا یا کہ مخالف۔ دو مخالف دیہات چوبارہ اور جعفر آباد جہاں ٹاگا برہمن اور بااثر مسلمان رہائش پذیر تھے انگریزی فوج کی آمد سے قبل خالی ہو گئے تھے۔ بسوادھا جہاں شاہ مل نے اجناس کا ذخیرہ رکھا ہوا تھا انگریز مخالف مسلمانوں کا گاؤں تھا۔ گوجروں کا ایک گاؤں بشپوری شاہ مل کے غلط اقدامات میں سرگرم رہا تھا۔ ڈنلوپ نے ایک سپاہی کا ذکر کیا جس نے شاہ مل کی فوج میں شامل ہونے کے لئے رسالہ چھوڑ دیا، کیونکہ وہ ایک مسلمان تھا۔ ایک بار پھر گجر گاؤں آہیرا کے لوگ کوہن پر حملہ کرنے والوں میں نمایاں تھے اور انہوں نے شاہ مل کے تمام اقدامات میں سرگرمی سے حصہ لیا، جس میں باروت اور باغ پت کو لوٹنے سمیت ایک اہم ترین پل کی تباہی شامل تھی۔ سوراج مل نے ایک جاٹ گاؤں سرسالی سے مدد حاصل کی جبکہ ملرپور کے باغیوں کی قیادت سفید داڑھی والا ایک سکھ کر رہا تھا، جو شاہ مل کی فوج میں شامل ہونا چاہتے تھے۔

ایسے وسیع اتحادوں کے بارے میں منطقی اشارہ چوراسی دیس تصور میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایسی اصطلاح ہے جو شاہ مل کے پیغامات میں بار بار استعمال ہوتی ہے۔ ولیم کے بیان کے مطابق باغی راہنما نے 84 دیہاتوں کی آبادی کو، جو کہ جاٹوں کے دیہات تھے اور چوراسی دیس کہلاتے تھے، سرکار کی حمایت کرنے سے روکنے کی کوشش کی۔ برکہ کے دیہاتیوں نے ڈنلوپ کو مشورہ دیا کہ وہ جلد از جلد علاقے سے بھاگ جائے کیونکہ شاہ مل کی طرف سارا چوراسی دیس انگریزوں کے خلاف کھڑا ہو رہا تھا۔ ثانی الذکر کی رضاکار آرمی کے ساتھ فیصلہ کن لڑائی سے ایک رات قبل اس کے پیامبروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ چوراسی دیس میں ہر جگہ پہنچ گئے تھے۔ وہ ہتھیار اٹھانے کے قابل ہر شخص کو اپنی مدد کے لئے پکار رہے تھے اور اعلان کر رہے تھے کہ

شامل کل غیر ملکی زرد رنگ والے حملہ آوروں کے خلاف فیصلہ کن جنگ کرنے والا تھا۔ جس میں وہ دشمن کو تباہ کر دے گا یا خود مر جائے گا۔ اور اس کی موت کے بعد سجا رام نے چوراسی دیس کے جاٹوں کو متحد کرنے کی کوشش کی، جبکہ ڈنلوپ نے سارے چوراسی دیس کے لئے اپنے سرکاری خطاب میں لوگوں کو ہتھیار ڈالنے کے لئے کہا۔ یوں بغاوت اور ردِ بغاوت کے پیغامات برابر قوت کے ساتھ لوگوں تک پہنچائے گئے۔

چوراسی دیس باغیوں کے تصور بارے انتہائی اہم مثال پیش کرتا ہے۔ چوراسی یا Eighty Four ملک میں ایک ایسے علاقے کی نشاندہی کرتا ہے جس کے اتنی تعداد میں دیہاتوں پر ایک مخصوص قبیلے کا قبضہ تھا۔ یہ ایک تصور ہے جو گروہی آبادی کے خاندانی رشتوں پر مشتمل برادری کی علاقائی بالادستی کی نمائندگی کرتا تھا۔ نہ صرف جاٹوں بلکہ دوسری ذاتوں میں بھی یہ تصور قائم تھا جو اتر پردیش میں آباد تھیں یہ حقیقت محسوس ہوتی ہے کہ آبادی میں اضافے کے باعث ابتدائی گاؤں سے چھوٹے دیہاتوں نے جنم لیا ہوگا اور علاقے میں اپنا اثر ورسوخ بڑھاتے ہوئے خاص نسلی گروہ کے نئے افراد نے ایسے دیہاتوں کی بنیاد رکھی ہوگی جو اس تصور کی تشکیل کا سبب ہوگا۔ میرٹھ میں جاٹوں کا ہر بنیادی گروہ، جیسا کہ گٹوالا، بلیان اور سلاکلین، ایک ایسے علاقے کا دعویدار تھا جس میں چوراسی دیہات موجود تھے۔ علاقے کی نشاندہی ابتدائی طور پر کھاپوں سے ہوتی تھی۔ کھاپ بھی دیہاتوں پر مشتمل اکائی تھی جو ایک دوسرے کے ساتھ یوں منسلک ہوتے تھے کہ ان میں آباد لوگ ان دیہاتوں کو آباد کرنے والے آبا و اجداد کی اولاد شمار ہوتے تھے۔ ایسے وراثتی گروہ خاندانی نسب کی بنیاد پر اپنے تھوک بنا لیتے تھے اور ایک دوسرے کے مالکانہ حقوق کی حوصلہ شکنی کرتے تھے۔ تھوکوں نے جب مشترکہ فیصلے کرنے والی تنظیم کی شکل اختیار کی تو اس کونسل کو کھاپ کہا جانے لگا۔ کھاپ کا نام ایک طاقتور ذات اور گروہ کی بنیاد پر اختیار کیا گیا لیکن جب بھی کوئی مشترکہ نوعیت کا فیصلہ ہوتا دوسرے گروہوں کے تھوکوں کو اس سے باہر نہیں رکھا جاتا تھا۔ ایک کھاپ کو چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا جیسا کہ 'گنوانڈ'۔ لیکن اس کے عدالتی اختیارات چوراسی دیہاتوں تک تسلیم کئے جاتے تھے، اگرچہ کھاپ میں شامل دیہاتوں کی تعداد حقیقی طور پر اس سے کم بھی ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر بلیان کھاپ کے اختیار میں دیہاتوں کی تعداد چون سے زیادہ نہیں تھی۔ کیونکہ چوبیس دیہات پٹھانوں کے قبضے کی وجہ سے

بے آباد ہو گئے تھے۔اس کے باوجود یہ علاقہ بیلیان کھاپ کی چوراسی کہلاتا تھا۔لہٰذا نسلی گروہ کی آبادی علاقائی رقبہ سے مطابقت رکھتی تھی۔ یوں لوگوں کی اجتماعی یادداشت میں چوراسی دیس کا تصور برابر اہم نوعیت کا حامل تھا۔لہٰذا اس علاقے کے جاٹوں کی تاریخ جو کہ اٹھارہویں صدی کے واقعات پر پنڈت کالا رام بھٹ نے لکھی تھی۔اس کی رو سے بیرونی حملہ آوروں کے بارے میں سیاسی فیصلے اور دہلی سلطنت کے قیام سے ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت کو کھاپ کی میٹنگ کے فیصلوں کی روشنی میں دیکھا جاتا تھا۔اس تاریخ میں بار بار باروت کا ذکر ایسے مقام کی حیثیت میں ہوا تھا۔جہاں ایسے فیصلے کرنے کے لئے پنچائیت کی میٹنگ ہوتی تھی جو تمام گروہوں اور دیہاتوں میں قبول کئے جاتے تھے۔باولی اور سرسالی دوسرے ایسے دیہات تھے جہاں کونسل مسلمانوں اور مغلوں کے خلاف کارروائی کے فیصلے کرتی تھی۔

اس تاریخ میں سچائی جو کچھ بھی ہو یہ حقیقت واضح ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک اس علاقے کے جاٹ کھاپ جیسی سیاسی اکائی کی بنیاد پر سوچنے لگے تھے اور ان اکائیوں کے حوالوں سے ماضی میں کئے جانے والے مشترکہ اقدامات پر مشتمل یادداشتیں محفوظ کرنے لگے تھے۔جن دیہاتوں کے نام تاریخ میں نمایاں تھے بغاوت کے بھی اہم مراکز بن گئے تھے۔1830 کے قریب ایلیٹ نے راجپوتوں اور جاٹوں کی چوراسیوں کا ذکر کیا جو مربوط وجود رکھتی تھیں۔اس نے پگ باندھنے کی ایک تقریب کا مشاہدہ کیا جو کہ کھاپوں کے پنچوں کے لئے دیس برادری کی جانب سے عزت واحترام کا مظاہرہ تھا۔پھر بغاوت کے کئی عشروں بعد تک دوسرے آفیسروں کو بھی مخصوص علاقوں کی جمع بندی کرتے ہوئے اس تصور کا تسلسل تسلیم کرنا پڑا، جن کو جاٹ دیس کا نام دیتے تھے۔لہٰذا شاہ مل کی جانب سے حملہ آوروں کے خلاف چوراسی دیس کے دفاع کے لئے آواز دوحقائق یعنی شجرۂ نسب اور روایت پر اٹھائی گئی اور اس نے اپنے علاقے کے لوگوں کے لئے قابل فہم بات کی۔کیونکہ وہ کالونیل دور سے بھی قبل ریاست کے خلاف مشترکہ مزاحمت کی روایت سے آگاہ تھے۔یوں باغی لیڈر کے سامنے یہ راستہ کھلا تھا کہ وہ اپنے علاقے کی اجتماعی یادداشت کو نشر لگا کر حمایت حاصل کرتا، روایت کے تقدس کی بنیاد پر جس پر وہ اپنی حاکمیت قائم کرنے کا دعویدار تھا۔اور اسی متبادل کی بنیاد پر وہ انگریزوں کو بیرونی مداخلت کار (زرد چہرے والے حملہ آور) اور چوراسی دیس کا تقدس پامال کرنے والے، جو کہ اس کے آباواجداد اور قبیلے کا ملک تھا،

ثابت کر سکتا تھا۔

ہماری بحث کا جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے یہ ہے کہ یہاں بغاوت کے لئے تحریک پیدا کرنے کی کئی ایک جہتیں تھیں۔ ابتدائی طور پر نسلی بنیادوں پر قائم آبادیوں کا معاشرتی تصور اور علاقائی اکائی میں بیرونی قوت کی دراندازی کے خلاف سخت نفرت نے باغی اتھارٹی کے لئے مقبولیت پیدا کی۔ البتہ یہ علاقہ صرف ایک جغرافیائی تصور نہیں تھا۔ یہ اجتماعی شعور کا حصہ تھا اور قبیلے کی تاریخ و یادداشت میں برقرار تھا باغیوں نے جس کو متحرک کرنے کی کوشش کی تھی۔ البتہ اس نوعیت کی تحریک میں یہ بات کسی طرح بھی یقینی نہ تھی کہ کھاپ میں موجود ہر گاؤں مزاحمت کی جدوجہد میں شریک ہو جاتا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، بسودھا سے فرار کے بعد شاہ مل نے گاؤں گاؤں تحریک پیدا کر کے اتنی قوت جمع کی اور انفرادی طور سے 60 دیہات تھے جو شاہ مل کی فوجوں میں شامل بتائے گئے تھے۔ (اگرچہ ان میں سے اکثر نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا جب دہلی پر قبضہ کے بعد انگریزوں کی فتح یقینی ہو گئی تھی)۔

البتہ شاہ مل کے اپنے گاؤں کے دوسرے تھوک علیحدہ رہے۔ ردِ بغاوت کارروائیوں کے دوران ڈنلوپ نے دیکھا کہ کس طرح کچھ دیہات دشمن تھے اور دوسرے گومگو کی حالت میں یا دوستانہ تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا اس کو پتہ چلا کہ دیولہ اور حسودھا جیسے دیہات اپنے ذمہ لگان کی قسطوں کی ادائیگی میں ٹھیک حد تک معقول تھے جبکہ بولاتی منحرف گاؤں تھا اور گجروں کا بشیوری، جس نے شاہ مل کی تمام غلط کاریوں میں سرگرمی سے شرکت کی تھی اس قدر خطرناک تھا کہ تباہ کر دینے کے لائق تھا۔ اور پھر برکہ گاؤں درست تھا، جب کہ اس کا ہمسایہ گاؤں مانی فٹ، جہاں شاہ مل اور اس کے کچھ اہم ساتھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ یقینی طور پر ایسا نہیں تھا۔ لہٰذا کوئی واحد سبب، جیسا کہ فرقہ، دشمنیاں، نسلی گروہ یا ذات باغیوں کی تحریک میں پائے جانے والے تغیرات کی تشریح نہ کر سکتا تھا۔ ثانی الذکر کو سمجھنے کے لئے ہمیں اتحادوں اور مخالفتوں کے بارے میں مختلف فریقوں کے نکتہ نظر پر لازمی غور کرنا چاہئے۔ جن میں ان کے کوڈز کو بنیاد بنانا چاہئے اور کوڈ میں علامتی تعلق کی تبدیلیوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اس پر دہلی میں موجود حکمرانی کی پیوند کاری ہوتی تھی۔ جاٹ قبیلوں کے بارے میں پہلے سے رائے پائی جاتی ہے کہ وہ دہلی پر حکمران فریق کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کرتے ہیں۔ ہمارے معاملے میں شاہ مل اور دہلی کی باغی قوت دونوں ایک دوسرے کی

ضرورت تھے۔ ہر ایک دوسرے کی قوت اور اہمیت سے آگاہ تھا، اور ان دونوں قوتوں کے درمیان قائم اتحاد بظاہر بیرونی حکمرانی کے خلاف سخت نفرت کی بنیاد پر قائم تھا۔ میرٹھ کے کمشنر نے اس پر خاص توجہ دی کہ شاہ مل کی ہلاکت کے بعد اس کے چند ایک پیروکاروں نے کس طرح ہمارے خلاف سخت ترین دشمنی جاری رکھی۔ اپنی نفرت کا اظہار کرنے کے لئے کس طرح انہوں نے ایک سڑک کو کھود کر اس پر ہل چلا دیئے۔ کیونکہ ان کی نظر میں یہ ایک فرنگی سڑک تھی۔ جبکہ سٹوکس رائے دیتا ہے کہ لکسور کے جاٹ کھاتر کے چوہان راجپوت ایک دوسرے کے خلاف روایتی دشمنی کے باوجود برطانوی حکومت کے خلاف نفرت کے سوال پر ایک دوسرے کے اتحادی تھے۔ نفرت پہلا نکتہ تھا جو شاہ مل کی بغاوت میں اولیت رکھتا تھا اور اس کی ہلاکت کے بعد نمودار ہونے والے واقعات میں واضح طور پر اس کو مرکزی اہمیت حاصل رہی۔

دہلی کو کمزور کرنے کے لئے شاہ مل کا خاتمہ اہم تھا۔ گورنمنٹ نے شاہ مل کی گرفتاری میں مدد دینے یا اس کا سر قلم کرنے کا انعام 1000 روپے رکھا تھا۔ جولائی میں اس کے خلاف ردِ بغاوت فوجی کارروائیوں کے نتیجہ میں عوامی مزاحمت پیدا ہوگئی۔ جس میں مسلح لوگوں کا ایک بڑا گروہ شامل ہو گیا جس میں سات ہزار افراد شامل تھے۔ اور ایک آفیسر کے خیال میں، جس نے اس کا عینی مشاہدہ کیا تھا، ایسا لگتا تھا کہ سارا ملک مزاحمت میں کھڑا ہو رہا تھا۔ دیسی ڈھول، جو کہ دیہاتیوں کے لئے اکٹھا ہونے کی علامت ہے، ہر جانب بج رہے تھے اور ہجوم کے ہجوم حرکت میں دیکھے گئے تھے۔ ڈنلوپ جو فوجی کارروائی کی قیادت کر رہا تھا، شاہ مل کی مقامی قوت نے اسے فرار ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ اپنے عمل پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اس نے کہا دیہاتیوں سے فرار، خواہ وہ کس تعداد میں تھے، اس کے وقار کو لگنے والا جھٹکا تھا۔ کیونکہ شاہ مل کے ساتھیوں نے محاورہ کے مطابق، جس میں ہندوستانی زبان بڑی خود کفیل ہے، بہادری کے ساتھ مجھے سوکھے پھول پیش کئے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے بھگتہ کے حملے سے بچ نکلا، جو باغی کا بھتیجا تھا، اور باروت تک اس کا پیچھا کیا گیا۔ وہاں باروت کے جنوب میں واقع باغ میں خاکی رسالہ، جو کہ رضا کاروں کو دیا گیا نام تھا، اور شاہ مل کے ساتھیوں کے درمیان جم کر لڑائی ہوئی۔ جس میں باغی لیڈر شہید ہو گیا۔ اکیلا سپاہی جس نے باغی کو شہید کیا اپنی بہادری کو یوں بیان کرتا ہے۔

میں نے کچھ فاصلے پر، نیزوں سے مسلح دو گھڑ سواروں کو اتنی تیزی سے بھاگتے دیکھا جتنی

تیزی کے ساتھ ان کے گھوڑے بھاگ سکتے تھے۔ میں نے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھا اور دو منٹ پیچھا کرنے کے بعد ان کو جالیا۔ گھڑسوار جو میرے قریب تھا، جس کے بارے میں مجھے تصور بھی نہیں تھا کہ وہ شاہ مل ہو سکتا تھا، اس کی تلوار گر پڑی، لیکن ابھی تک نیزا اس کے پاس تھا۔ اس کی پگ کے بل کھل کر زمین کو چھو رہے تھے۔ فوجی نے اس کی کمر پر دو فائر لگائے۔ ایک لمحے میں اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے، جب میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اٹھ سکتا تھا، اس نے مجھے خطرے سے دوچار کر دیا اور مجھے دو زخم لگائے۔ دوسرے وار سے میں مر سکتا تھا اگر اس کے نیزے پر میرا ہاتھ اچانک نہ پڑتا جو وہ پوری قوت کے ساتھ بڑھا رہا تھا اور اس لمحے عظیم بیگ، ایک سوار پہنچ گیا۔ جس نے اپنا نیزہ اس کو گھونپ دیا اور وہ کراہتے ہوئے اور سوار کو گالیاں دیتے ہوئے گر پڑا۔ اس کا جسم ٹکڑوں میں کاٹ کر پار کر کے حکم پر سر علیحدہ کر لیا گیا، جو اس کو پہچانتا تھا۔

اب باغی لیڈر شاہ مل کا سر ایک علامت بن گیا۔ یہ انگریزوں کی بڑی کامیابی تھی اور اس فتح کی نمائش کرنے کی ضرورت تھی۔ قوت اور حکمرانی کی دو علامتوں کے ساتھ فوجی دستے نے علاقے میں مارچ کیا۔ جس کے بارے میں ڈنلوپ نے لکھا۔ ''ہم نے رضا کار فوج کے بینر کے طور پر ایک چھوٹا ریشمی یونین جیک اٹھایا اور موقع کی مناسبت سے دوسری علامت شاہ مل کا خون آلودہ سر نیزے کی نوک پر اٹھایا ہوا تھا، تاکہ علاقے کے لوگوں کو بتا دیا جائے، جو اس کے سخت چہرے کے پر اعتماد خطوط کو اچھی طرح پہچانتے تھے، کہ ایک پرانا قانونی مجرم، جو ان کا لیڈر تھا ہلاک کر دیا گیا تھا۔

باغیوں کی نظر میں شاہ مل کا سر آزادی کی علامت اور عزم کی نشانی تھی۔ ادھر ایسی رپورٹیں مل رہی تھیں کہ راجپوت اور دیگر شاہ مل کا سر حاصل کرنے کے لئے حملے کی تیاری کر رہے تھے۔ ڈنلوپ کی فوج باغیوں کی جانب سے مستقل خطرے میں تھی، جس کی قیادت سوراج مل اور بھگتہ کر رہے تھے۔ جو دیہاتی علاقے کو متحرک کر رہے تھے۔ ڈنلوپ نے لکھا کہ مادی جاٹوں کے ایک بڑے جتھے نے نیچے فورڈ تک ان کا پیچھا کیا۔ ان کو امید تھی کہ ہم سے شاہ مل کا سر چھین لینے کا مناسب موقع ان کے ہاتھ آ سکتا تھا۔ باغی شہید ہو گیا مگر بغاوت زندہ رہی۔ شاہ مل کے ساتھیوں نے شکست ماننے سے انکار کر دیا اور وہ مظفر نگر، روہیل کھنڈ اور اودھ کے باغیوں کی صف میں شامل ہو گئے۔

III- دیوی سنگھ

دیوی سنگھ متھرا میں واقع ٹپہ رایا کا رہائشی ایک دیہاتی باغی تھا۔ اس کا پہلا دشمن ایک سوانح نگار مارک تھارن ہل تھا۔ وہ متھرا میں مجسٹریٹ تھا جس نے اس کی سوانح لکھی اور اس میں مقامی لوگوں کے رویئوں کی عکاسی کے ساتھ اس وقت کے ملکی حالات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ لیکن دیہاتی علاقے میں بغاوت کی تمام تر ذمہ داری کسی سوانح نگار تک محدود نہیں تھی۔ ذاتی زندگی میں دیبی سنگھ نے محدود عرصے کی جدوجہد میں اچھی کامیابی حاصل کی تھی۔ تھارن ہل نے تحریر کیا کہ اس کامیابی کے سفر میں کئی مضحکہ خیز واقعات رونما ہوئے جن کے باعث نتائج بالکل برعکس نوعیت کے بھی ہو سکتے تھے۔ ہندوستان کے بڑے خاندان ایسے ہی معمولی آغاز کی بنیاد پر قائم ہوئے ہیں۔ وہ چودہ دیہاتوں پر حکمران تھا۔ ایک لارڈ کی حیثیت سے جب رنجیت سنگھ نے فتوحات کا آغاز کیا وہ 25 دیہاتوں سے زیادہ کا مالک نہیں تھا۔

دیوی سنگھ کا مختصر اور مضحکہ خیز کیریئر ہمارے لئے اہم ہے۔ کیونکہ اس کی بغاوت میں کسی نوعیت کی بیرونی مداخلت اور امداد شامل نہیں تھی۔ یہ ایک چھوٹے علاقے رایا میں مکمل طور پر کسانوں کا مسئلہ تھا۔ جو 1860 تک پرگنہ ماٹ میں شامل تھا اور اس کے بعد پرگنہ مہابن کا حصہ بن گیا۔ یہ دیہاتوں کے درمیان مصروف منڈی کے حامل قصبے کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ علاقے میں جاٹوں کے مخصوص طرز رہائش کی نمائندگی کرتا تھا۔ رایا میں زمین کاشتکاری کے قابل نہیں تھی لیکن یہ 21 جاٹ دیہاتوں کا تسلیم شدہ مرکز سمجھا جاتا تھا۔ جو اس ابتدائی گاؤں سے پیدا ہوئے تھے۔ گاؤں کا نام اس کی بنیاد رکھنے والے جاٹ رائے سین کے نام پر تھا، جو گودھا گوت کے جاٹوں کا جدامجد تھا۔ اسی گوت کے جاٹ تھے جو اس علاقے میں بالادست کاشتکار تھے۔ ٹپہ رایا میں حکمرانی کی سب سے نمایاں علامت پرانا قلعہ تھا جو جمشید بیگ نے تعمیر کرایا تھا اور ہتھرس کے ٹھاکر دیا رام نے انیسویں صدی کے شروع میں اس کی دوبارہ تعمیر و مرمت کرائی تھی۔ ثانی الذکر کا اس علاقے پر کنٹرول ختم ہو گیا جب 1817 میں اس پر انگریزوں نے غلبہ پا لیا۔ لیکن پھر بھی اس خاندان کا علاقے میں اثر و رسوخ غالب رہا اور ٹھاکر گوبند سنگھ، جو کہ اس کا بیٹا تھا، کی مغلوں کے ساتھ وفاداری کے نتیجے میں 1857 میں اس خاندان نے کافی حد تک اپنی سابقہ قوت بحال کر لی۔ جب

بغاوت ہوئی تو ٹپہ رایا تحصیل تھی اور وہاں پولیس اسٹیشن قائم تھا۔ لیکن اس سے زیادہ اہم یہ تھا کہ یہاں بنیوں کا غلبہ ہو چکا تھا۔ جانکی پرساد، جمنا پرساد، موتی لعل اور کشن داس بڑے مہاجن تھے جو اس قصبے میں رہائش پذیر تھے۔ یہ ان کے پختہ گھر تھے جو اس جگہ پر سب سے نمایاں عمارتیں تھیں، اور ایک بڑا آموں کا باغ جس میں جامن کے درخت تھے بائیس بگھوں تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ باغ کشن داس کی ملکیت اور ٹپہ کی خوبصورتی تھا۔ گوکل داس سیٹھ، جو بغاوت کے اختتام پر تیار کی گئی اہم مہاجنوں کی فہرست میں اول تھا، رایا میں رہتا تھا جہاں علاقے میں ابھرتے ہوئے بنیا خاندان کا سربرلہ نانڈا رام مقیم تھا۔ رایا کے اردگرد کا علاقہ اس طرح زرخیز نہیں تھا، جس طرح کہ باروت کا علاقہ تھا۔ یہاں زمین کم معیاری تھی اور آبپاشی نہروں کی بجائے کنوؤں کے ذریعے ہوتی تھی۔ آبادی میں جاٹ سب سے بڑی برادری تھے جو صرف زراعت سے وابستہ تھے۔ پرگنہ مہابن میں ٹپہ رایا اور اس کے دیہات شامل تھے۔ وہاں 1870 تک 22 فیصدی جاگیری زمین اور 35 فیصدی رقبہ قابض رعیت اور رضا کار مزارعوں کی صورت میں جاٹ کاشت کرتے تھے۔ مالک جاٹوں اور مزارع جاٹوں کی شکل میں وہ پورے علاقے میں 58 فیصدی رقبہ کاشت کرتے تھے۔ ہر گروہ ایک گنجان آبادی کی صورت میں رہائش پذیر تھا۔ رعیت سنکھ میں آباد تھے، دوسرے سونائی میں اور گودھے ریا میں۔

دیہی آبادکاری کی تاریخ اور ملکیت کی نوعیت میں کمیونٹی اور گوت کے بارے میں روایات مضبوط ہوتی تھیں۔ ایک آبادکاری آفیسر نے لکھا، یوں محسوس ہوتا کہ تمام جاٹ حصہ دار، حقیقی یا فرضی طور پر ایک باپ کی اولاد ہیں جو کہ اسٹیٹ کا بانی تھا۔ جس طرح نسل کی آبادی میں اضافہ ہوا پرانے گاؤں سے دور تک کاشتکاری وسیع ہوگئی۔ لہٰذا چھوٹے دیہاتوں کی صورت میں حصہ داروں کی نئی آبادیاں اپنے کھیتوں کے قریب بسالی گئیں۔ انہوں نے اپنی علیحدہ کاشتکاری شروع کر لی لیکن آبائی گاؤں میں ان کا حصہ موجود رہا۔ جاٹوں کے علاوہ کہیں دوسری جگہ یہ روایت نہیں تھی۔ جس میں آبائی گاؤں کی شاخیں جو علیحدہ آبادیوں کی صورت اختیار کرنے کے بعد بھی اپنے قدیم گاؤں سے تعلق قائم رکھتی تھیں۔ یہ روایت عملی طور پر ریا اور سونائی میں سب سے زیادہ مستحکم تھی۔ ریا کے ساتھ 24 آبادیاں تھیں جن میں 12000 ایکڑ اراضی زیر کاشت تھی۔ یہاں ایک علاقہ پرانے 14 دیہاتوں پر مشتمل تھا جو کہ چودہ طرف کہلاتا تھا۔ دوسری آباد اس کی شاخیں تھیں۔ ٹپہ

اور سونائی کا اپنے قصبہ آریا کھیرا کے ساتھ رابطہ بھی اسی نوعیت کی تاریخ پر قائم تھا۔ یہ 18 دیہاتوں کا اہم مرکز تھا۔ یہ نین سن تھا جس نے کھیرا کی بنیاد ڈالی تھی اور اس کے بیٹوں اور پوتوں نے اس کے اردگرد آبادیاں قائم کی تھیں اور وہ ان آبادیوں کے مالک تھے۔ لیکن آریا کھیرا کا بازار سب کی مشترکہ ملکیت قرار پایا اور یہاں کوئی نئی دوکان تعمیر کرنے کے لئے سارے لوگ مشورے میں لازمی شامل ہوتے تھے۔ ساری برادری کے لوگوں پر چیت کے مہینے میں منائے جانے والے تہوار پھل دلی میں شمولیت بھی فرض تھی۔ تمام زرخیز زمین گودھا گوت کے جاٹوں کے زیر کاشت تھی۔

لہٰذا اس علاقے میں کمیونٹی یا برادری کا احساس برادرانہ آبادکاری اور ملکیتی نظام کے تحت قائم رہا۔ اس کے پیچھے تاریخ، روایت اور ثقافتی عناصر بھی موجود تھے۔ کھیرا جو کہ بنیادی طور پر رہائشی کالونی نہیں تھی۔ لیکن اس کے بارے میں سب جانتے تھے یہ وہ ابتدائی گاؤں تھا جس سے دوسرے دیہاتوں نے جنم لیا تھا۔ یہ برادری کے آغاز کی زندہ مثال تھی اور اس میں برادری کے بڑوں کی مشترکہ ملکیت سے ابتدائی ایکا ظاہر ہوتا تھا۔ ہر علاقے میں برادری کے ایک مخصوص کنبے کی اکثریت تھی۔ جس کا اپنا ایک مقامی گاؤں یا قصبہ تھا، اس کو وہ اپنے مشترکہ آباواجداد کی ابتدائی بستی سمجھتے تھے۔ لہٰذا روایت کے ساتھ جب ملکیت ایک مخصوص برادری کے ہاتھوں میں مرتکز ہوتی ہے تو ایسے شعور کو جنم دیتی ہے جو اجتماعی عمل کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، جیسا کہ اجتماعی مسلح مزاحمت۔ اراضی کاشت کرنے کا طریقہ مکمل طور پر بھائی چارہ نوعیت کا تھا۔ 1830 میں دیہاتوں کو چھوٹی اکائیوں یعنی پتیوں میں تقسیم کردیا گیا تھا اور یہ پتی دار تھے جو اب آبادکاری افیسر کے لئے اہم تھے۔ پتی داروں کی حیثیت ملکیتی معاہدوں کی بنیاد پر استوار تھی۔ کچھ ایسے تھے جن کی ملکیت میں 500 بگھہ تک زمین تھی جبکہ دوسرے 60 بگھہ تک رکھ سکتے تھے۔ بغاوت سے بیس برس قبل تک البتہ پتی داروں اور بسواداروں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے۔ سٹوکس کا کہنا ہے کہ ریاست کی جانب سے ریونیو میں اضافہ اور اس کے علاوہ انتظامی طریقہ کار کے ساتھ آبادکاری کا لائحہ عمل اس کشیدگی کا باعث اہم اسباب تھے۔ مثال کے طور پر آبادکاری نظام میں ہر حصہ دار کی ملکیت کا واضح تعین خاص مقصد تھا۔ اگرچہ ٹپہ رایا اور سونیہ میں تعینات آبادکاری افسر جے۔ جی۔ ڈیڈ نے اعلیٰ افسران کو یہ نظام نافذ کرنے پر قائل کرنے کے لئے اپنا موقف پیش کیا۔

ایک غیر تقسیم شدہ پتی اور غیر تقسیم شدہ ملکیت یورپ میں ملکیت کے تصورات سے مختلف

نظام تھا۔ لیکن لوگوں نے اس نظام کی مشکلات کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ یہ نظام جو مشترکہ ملکیت کو خاندانوں میں تقسیم کرتا ہے خاندانوں میں جھگڑوں کا باعث ہوگا لہٰذا معاشرتی فلاح کے حوالہ سے اس میں کوئی خوبی نہیں تھی۔ لیکن بورڈ نے مالکانہ حقوق کا اندراج خاندان کے ممبران کی مشترک ملکیت کے طور پر کرنے کا فیصلہ کیا اور دیہاتوں کی ملکیت کو نئے معیار کے مطابق پیمائش کر کے علیحدہ کرنے پر اصرار کیا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ملکیتی نظام کا یہ طریقہ درست تھا اور تمام لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے اہم تھا۔

آبادکاری نظام کی غیر لچکدار نوعیت میں ریونیو کا بڑا اضافہ کر کے اس کو مزید مشکل بنا دیا گیا۔ ٹپہ رایا کی آبادکاری رپورٹ میں ڈیڈ نے نشاندہی کی کہ زائد تخمینہ کے باعث کسانوں کو اپنی زمین رہن رکھنی پڑتی تھی تاکہ وہ سرکاری لگان ادا کر سکتے۔ چونکہ ٹیکس کے نفاذ میں اکثر اوقات گاؤں کی پیداواری صلاحیت کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا تھا جس کا واضح نتیجہ مالک کسانوں کی زمین سے محرومی کی صورت میں نکلا۔ گورنمنٹ کو اس طرح پہنچنے والا نقصان بروقت ریلیف کی صورت میں پیش آنے والے خسارے میں زیادہ تھا۔ اس میں انفرادی طور پر نازل ہونے والی پریشانی ناقابل بیان تھی جو کہ بار بار اور لاتعداد مرتبہ زمین کے انتقال کے باعث تھی۔

مزید ڈیڈ نے زرعی انتشار کی اس کیفیت کا ذکر کیا جو 1830 تک علاقے میں پائی جاتی تھی۔ پیداوار میں کمی واقع ہونے کے باعث نیل کی فیکٹری سے قرضوں کا حصول تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ کپاس کی قیمت بہت گر گئی تھی۔ 50 روپے من سے 20 روپے من تک، جیسا کہ ڈیڈ کے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ دیہاتی بنیوں نے پیشگی دینے سے ہاتھ کھینچ لیا جس کے نتیجے کے طور پر تمام پرگنہ میں ذہنی دباؤ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس بدحالی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ کنوؤں کی بڑی تعداد بیکار ہو گئی جس پر علاقے کی آبپاشی کا انحصار تھا۔ آگرہ ڈویژن (اور خاص کر متھرا ضلع میں) کنوؤں کی تعداد میں کمی کا تعلق براہ راست خشک سالی کے باعث واٹر ٹیبل کا نیچے گرنا اور درکار وسائل کی کمی تھی۔ اس میں زیادہ دشواری بھائی چارہ وکاشت اور غیر ملکیتی مزارعوں کے لئے تھی کیونکہ ادائیگیوں کے ضمن میں ہر ایک برابر کا ذمہ دار تھا۔ 1846 تک سونیا اور رایا کے پیداواری علاقے، خشک سالی اور زائد تخمینہ کی وجہ سے، اس قدر سکڑ گئے تھے کہ مقامی آفیسر ٹیلر نے ریونیو میں کمی اور تخمینہ پر فوری نظر ثانی کو ضروری سمجھا۔ اس کے باوجود رایا میں اس آفیسر نے گیارہ

علاقوں کے لگان میں کوئی تبدیلی نہ کی حتیٰ کہ دوعلاقوں کے ریونیو میں اضافہ کردیا۔ انیس میں سے صرف چھ علاقوں کے لگان میں معمولی تبدیلی ہوئی۔ یہ صرف 2 فیصدی کمی تھی۔ جنگ کے اختتام پر موقع کا مشاہدہ کرتے ہوئے تھارن ہل مقامی آبادی میں پائے جانے والے اتفاق رائے سے بہت متاثر ہوا۔ جس میں اشرافیہ اور عام لوگ برابر شریک تھے۔ ضلع کی اس آبادی پر مرتب ہونے والے اثرات بہت شدید تھے۔

ان حالات میں بیرونی خریداروں کے باعث بھائی چارہ کمیونٹی کی زمین سے بے دخلی کے نتیجہ میں جنم لینے والی معمولی مزاحمت وقت کے ساتھ ختم ہوگئی۔ یہ قرضہ دینے والے چند خاندانوں کے اجتماعی قتل سے کئی برس قبل کا واقع ہے۔ نندا رام ایک معمولی تاجر تھا جس کی قسمت کا ستارہ 1838 کے قحط میں گیہوں کی اچھی قیمت ملنے کے باعث چمک اٹھا تھا، وہ ان پہلے لوگوں میں شامل تھا جو سودی قرضے دینے کے لئے اس علاقے میں داخل ہوئے۔ اس نے یہاں وسیع جائیداد بنالی جس میں منڈی کے علاوہ ٹپہ رایا کے کئی دیہات شامل تھے۔ جیسا کہ اچارو، چوراہنی، ناگل، گگو، ڈھاکو اور تھانہ امر سنگھ وغیرہ۔ اس کے علاوہ پرگنہ نے علاقے میں جگ دیس پور برہمن فیملی کا عروج دیکھا جنہوں نے اس آبادی میں جب کاروبار شروع کیا تو ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن پھر ان کی قسمت کا ستارا بھی چمکا۔ وہ پیشہ کے لحاظ سے ساہوکار تھے۔ لیکن انہوں نے ایک بڑی جاگیر بنالی جو زیادہ تر رہن پر لی گئی زمینوں پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ گوکھرالی کی پشاوری برہمن فیملی تھی۔ یہ خاندان مہابن پرگنہ میں کئی دیہاتوں کا مالک تھا، جبکہ پرگنہ کے بقیہ دیہاتوں میں ہر جگہ ان کی چھوٹی بڑی ملکیت تھی۔ اس خاندان کے سیاسی رابطے موجود تھے۔ اس خاندان کے زیادہ تر افراد تحصیلدار تھے جبکہ ایک کلیان سنگھ 1857 میں 17ویں رجمنٹ کا رسالہ دار میجر تھا۔ ایک بنیا جبکال کسورے جس کو سماجی احترام حاصل نہیں تھا قصبے میں نیل کی ایک فیکٹری کا مالک تھا۔ یہ دولت مند خاندان جنہوں نے انیسویں صدی کے پہلے نصف تک ٹپہ رایا کے بھائی چارہ دیہاتوں میں کسانوں کی ملکیتی اراضی کے مالکانہ حقوق حاصل کر لئے۔ ڈھکو کی بنیاد ڈھوکالہ جاٹوں نے رکھی۔ جاٹ سب سے بڑی کاشتکار برادری تھے۔ لیکن جمنا پرساد نے ابتدائی آباد کاروں کی نسل سے ملکیتی حقوق خرید لئے تھے۔ ناگل کی بنیاد رکھنے والا رام سنگھ جاٹ تھا۔ اس میں بھی جاٹوں کا حصہ بنئے نے خرید لیا تھا۔ اس طرح تروا اور سارس بوہروں کے ہاتھوں میں چلے

گئے۔ اچھرو میں ان کا حصہ نندا کشور اور جمنا پرساد نے خرید لیا جو دونوں رایا میں بنئے تھے۔ اس لئے یہ اہم ہے کہ بغاوت کے دوران ان دیہاتوں نے رایا قصبے پر حملہ کرنے میں حصہ لیا۔

انیسویں صدی کے وسط میں جائیدادوں کے رہن اور انتقال کو انتظامی اقدامات کے ذریعے جس پیمانے پر فروغ دیا گیا وہ چھوٹی سطح کا نہیں تھا۔ ابتدائی طور پر بھائی چارہ دیہاتوں میں رہن کی باقاعدہ قانونی دستاویزات تیار نہیں ہوتی تھیں۔ بھائی کھاتہ میں صرف اندراج کافی سمجھا جاتا تھا۔ جب رقم واپس کر دی جاتی تو گواہ کی موجودگی میں اندراج ختم کر دیا جاتا تھا۔ اور اس میں قبضہ واپس لینے کے لئے مدت کی کوئی پابندی عائد نہیں تھی۔ 100 برس کے لئے رہن رکھی ہوئی زمین اسی طرح واپس حاصل کی جا سکتی تھی جس طرح ایک برس کے لئے رہن رکھی گئی زمین۔ لیکن بغاوت ختم ہونے کے بعد اس روایت کو ختم کرنے کے لئے قانون سازی کی گئی اور رہن و انتقال کا اندراج رجسٹری کے معاہدہ سے پہلے لازمی قرار پایا تا کہ اس کو عدالت میں ایک قانونی دستاویز کے طور پر قبول کیا جا سکتا۔

جس طرح ونگ فیلڈ نے پیش گوئی کی تھی اس ایکٹ نے ساہوکاروں کی پوزیشن بے انتہا مضبوط کر دی۔ جنہوں نے اپنی دولت اور سول عدالتوں میں تعلقات کی بنیاد پر، اس ایکٹ کو رہن اور انتقال کے ضمن میں بھائی چارہ کمیونٹی کے خلاف بہت استعمال کیا۔ یوں اس میں حیرانی کی بات نہیں کہ بغاوت کے دوران اس علاقے میں ساہوکار عوام کے تشدد کا نشانہ بنے اور اسٹوکس کی جانب سے برعکس دلائل کے باوجود، اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ بنیوں کے خلاف نفرت کی وجہ زمینوں کا تیزی سے ساہوکاروں اور تاجروں کو انتقال تھا جو برطانیہ کے لینڈ ریونیو نظام کے تحت عمل میں آیا۔

تھارن ہل جو اس وقت متھرا ضلع کا مجسٹریٹ تھا ایسے بلوؤں پر حیران ہوا جو دیہی علاقوں میں اچانک ہی شروع ہو گئے۔ بغاوت کی اطلاعات اور دہلی میں بادشاہ کا سرکاری اعلان مقامی آبادی تک پہنچ چکا تھا۔ دفعتاً پورا ملک انتشار کا شکار ہو گیا۔ بغاوت کی اطلاع تیزی کے ساتھ پھیل گئی اور پورا ملک یک دم بغاوت پہ اتر آیا اور اس کو کہنا پڑا کہ ایک مہینہ قبل پورا ملک ہر طرح پر امن تھا۔ کسی خاص وجہ کے بغیر اچانک بدامنی کا پھیل جانا بہت غیر معمولی واقع تھا اور یہ حکومت کے لئے خاص توجہ کے ساتھ غور کرنے کا موضوع ہے۔

اس کی نظر میں بغاوت میں شدت اور تیزی اور دیہاتی علاقوں میں حکومتی رٹ کا خاتمہ سمجھ میں نہ آنے والا عمل تھا۔ پھر بھی اس نے اس طرز عمل کو بیان کرنے کی ہمت کی۔ یوں کوار دلدار علی خاں ایک بڑا زمیندار اپنے گاؤں کے لوگوں کے ہاتھوں پرگنہ کی منڈی میں قتل ہوا۔ 23 مئی کو اس کا ایک رشتہ دار، جس کے پرگنہ نوح جھیل میں کئی دیہات تھے اپنے گھر کے اندر بند کر دیا گیا۔ کئی اور لوگ قتل ہوئے اور کئی ایک پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ جن کے بارے میں بنیادی معلومات اب مجھے یاد نہیں ہیں اور اس بیان کی رو سے سارے ضلع میں بدامنی پھیل گئی تھی۔

تھانے اور محکمہ مال کے دفاتر ہر جگہ خالی کرا لئے گئے تھے اور اگر کہیں عملے کو رہنے کی اجازت ملی تو وہ سخت پریشانی میں مبتلا رکھے گئے۔ بنیوں کو لوٹا گیا، یہ نئے مالکان اراضی بے دخل کر دیئے گئے اور قتل کئے گئے اور دہلی کے بادشاہ کو معاشرے اور قانون کا سرپرست قرار دیا گیا۔ دیہاتوں میں بغاوت کی بے قابو قوت نے جس نئی صورت حالات کو جنم دیا اس میں عام لاقانونیت کے علاوہ کوئی دوسری چیز موجود نہیں تھی۔ جس نے لوگوں کی انفرادیت اور بغاوت کی خصوصیت کا خاتمہ کر دیا۔

البتہ ہمارے لئے ایسی خصوصیات علاقے میں سماجی کشیدگی کی وجوہات کا پتہ لگانے کے لئے اہم ہیں مثال کے طور پر دلدار خاں کے دیہات بہادن وارا میں تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مالکان کی اکثریت کو بے دخل کر کے اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کی کوشش میں لگا تھا۔ یوں جاٹوں کے ساتھ اس کا تضاد پیدا ہوا۔ جیسا کہ ہاروے نے بیان کیا وہ عیاش، تشدد پسند اور ناپسندیدہ زمیندار تھا جو اپنے ماتحتوں اور ہمسایوں کے ہاتھوں انجام کو پہنچ گیا۔ واقعاتی طور پر متھرا ضلع میں بلوے کا پہلا واقع تھا اور اس کا مقام وہ پرگنہ تھا جس میں رایا واقع تھا۔

تھارن ہل اپنی فوج کے ساتھ علاقے میں امن کی بحالی کی خاطر، رایا میں مقیم رہا۔ اس کے اردگرد چاروں اطراف میں برطانوی اقتدار ختم ہو گیا تھا۔ چند میل کے دائرے میں پانچ چھ زمینداروں نے آزادی کا اعلان کر کے اپنے لئے راجہ کا لقب اختیار کر لیا اور بادشاہ دہلی کے ساتھ وفاداری کا اعلان کر دیا۔ یہ تاثر کہ انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تھا عام پھیل گیا تھا۔ دیہاتی علاقوں کے عوام میں یہ بات عام ہو گئی کہ ملک سے انگریزی حکومت ختم ہو گئی تھی۔ ڈنلوپ نے میرٹھ میں اسی صورت حالات کا مشاہدہ کیا۔ بعد میں تھارن ہل نے اس نکتہ کی وضاحت کی کہ کس

طرح عوامی رائے میں یہ تصور پیدا ہو گیا کہ انگریزوں کی حکومت کی جگہ مغل بادشاہ کی حکومت دوبارہ قائم ہو گئی تھی۔ ان کی تمام گفتگو شاہی محل میں تاجپوشی کے بارے میں ہوتی تھی اور وہ سوچتے تھے کہ پرانی حکومت کس طرح بحال ہو جائے گی۔ جو کچھ میں نے سنا۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا جس پر پہلے کبھی توجہ نہیں دی تھی وہ یہ تھا کہ پرانی حکومت کی شان وشوکت نے لوگوں کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ لوگوں کو اپنی روایات سے کس قدر محبت تھی اور وہ اپنے حکمرانوں کے بے حد وفادار تھے۔ یہ سب جس سے ہم ناآشنا تھے لوگوں کے دلوں میں محفوظ تھا۔ یوں ہندوستان سے انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دیئے جانے کی خبر نے لوگوں کو پرانی روایت زندہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ جس کا اظہار انہوں نے بادشاہ کے ساتھ وفاداری کا اعلان کرتے ہوئے کیا۔ انگریزوں کو شکست دے کر ملک پر ہندوستانی عوام کا راج قائم کرنے کا تصور۔ یہ دہلی میں مرکزی حکومت اور قریب ترین بغاوت کے مرکز تک متبادل حکومت کا خیال تھا، جو ہندوستان کی سیاسی فضا پر چھایا ہوا تھا۔ اس نوعیت کی سیاسی کشیدگی اور اعلیٰ تصورات کی فضا تھی جس میں اندازاً مئی کے اختتام اور جون کے آغاز تک ٹپہ رایا میں بغاوت پھوٹ پڑی۔

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ بغاوت کا آغاز چودہ طرف یعنی رایا کے مضافاتی دیہاتی مرکز کے بڑے زمینداروں اور لوگوں کی جانب سے قصبے پر حملے سے ہوا۔ اچھرو لارو کے زمیندار مثلاً دھنی رام اور شش رام (سری رام) میلسی، ساوے اور سراس کا اکبر اور چین سکھ اور تروا کے جاٹ نمبردار حملہ آوروں میں نمایاں نام تھے۔ اس حوالہ سے چودہ طرف کا کردار خاص طور سے اہم تھا۔ تھارن کے مطابق ماضی میں یہ چودہ دیہات واحد ریاست میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اس نے لکھا۔

ہماری پچاس سالہ حکومت کے دوران وہ ایک سے دوسرے ہاتھ اور پھر آگے فروخت ہو چکے تھے اور مالکان کی حیثیت سے صرف کاشتکاروں میں بدل کر رہ گئے تھے۔ لیکن ابھی تک وہ سابقہ بالادستی کی روایت سے وابستہ تھے اور ایسے موقع کے انتظار میں تھے جب وہ روایتی حیثیت بحال کر سکتے۔ بغاوت پھوٹ پڑنے کی صورت میں وہ موقع پیدا ہو گیا تھا اور انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ ہر گاؤں میں وہ نو دولتیوں پر حملہ آور ہوئے۔ جن میں سے اکثریت نے فرار کا راستہ اختیار کیا اور باقی ماندہ نے مزاحمت کی۔ ان لڑائیوں میں ڈے جی سنگھ نے کمان سنبھالی۔ بالآخر دیبی سنگھ کے ہم ذات ساتھیوں نے کامیابی حاصل کر لی اور اپنی

سابقہ حیثیت بحال کرلی۔ جب یہ ہو گیا تو دیبی سنگھ ان کا راجہ بن گیا۔

یہ اس طرح ہوا کہ ایک کسان بادشاہ بنایا گیا۔ جس نے اپنی حکومت کا جواز جاٹوں کی قدیم روایت سے اخذ کیا۔ اس روایت کا نفاذ دیوی سنگھ کے زرد لباس کی صورت میں ظاہر ہوا، جو اس نے اپنے رتبہ کی خاص پہچان کے طور پر منتخب کیا۔ زرد رنگ جو ہندوؤں میں شہنشاہیت کی علامت تھا۔ حتیٰ کہ اس کو مخاطب کرنے کے لئے عام دیہاتی جو زبان استعمال کرتے تھے، وہ بوسیدہ القابات کی طویل لڑی پر مشتمل تھی (جس پر تھارن ہل نے طنزیہ ریمارکس دیئے تھے) جو کہ قدیم مشرقی سماج کی ضرورت رہی تھی۔ مثال کے طور پر، عنایت کرنے والا، دولت بانٹنے والا، غریبوں کا خیر خواہ عظیم راجہ دیوی سنگھ، چودہ دیہاتوں کا شہنشاہ، جنگی فاتح وغیرہ۔

لیکن، اگرچہ راجہ نے انگریزی حکومت کے اصولوں اور اداروں کو ختم کر کے، اپنی شہنشاہیت کی بنیاد قدیم روایت پر استوار کی، پھر بھی حکومت چلانے کے لئے اس کو کسی حد تک انگریزی حکومت کے اصولوں اور اداروں پر انحصار کرنا پڑا۔

قصبے میں داخل ہوتے ہی دیبی سنگھ ایک سکول کی عمارت میں گیا جو حال ہی میں ہماری حکومت نے تعمیر کی تھی۔ اس میں اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا۔ اس نے اپنی آزاد حکومت قائم کی جس کی تشکیل انگریزی ماڈل کے مطابق کی گئی۔ اس نے بورڈ آف ریونیو تشکیل دیا، انصاف کے لئے سپریم کورٹ قائم، کمشنر، مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ تعینات کیا۔ آخری عہدے کے لئے اسے اپنے علاقے میں کوئی مناسب طور سے تربیت یافتہ آدمی نہ ملا تو اس نے علاقے میں تعینات سابقہ آفیسر کو واپس آنے کی درخواست کی اور اس کو زیادہ تنخواہ کی پیشکش کی۔

اپنی حکومت کا ڈھانچہ تیار کراتے ہوئے، خاص طور سے اقتدار اعلیٰ کے ضمن میں اس نے تباہ کن نکتہ نظر اختیار کیا۔ حقیقت میں دیوی سنگھ نے بہت واضح طور پر باغی شعور کی پسماندگی کا مظاہرہ کیا۔ ابھی تک باغی اپنی آزاد دنیا بسانے کی اہلیت کا مظاہرہ کرنے میں ناکام تھے۔

ایسی رکاوٹوں کے باوجود نئی حکومت کافی حد تک مستحکم اور واضح ظاہر ہوتی ہے، اگرچہ سادہ، اور انتظامی طور پر سابقہ طرز پر قائم تھی۔ تھارن ہل کے مطابق دیوی سنگھ ہر روز صبح سویرے قصبے میں آتا، سکول میں اپنے ہیڈ کوارٹر میں اپنی کرسی پر بیٹھتا، درخواستیں وصول کرتا، شکایات سنتا اور فیصلے لکھواتا۔ یہ کام ختم کرنے کے بعد سارا دن وہ بنیوں کو لوٹتا۔ یہ رویہ اس نے اپنی پالیسی کے طور پر

اختیار کیا۔ جس پر پورا قصبہ اس کی معاونت کرتا۔ ساہوکاروں کے ساتھ مالی معاملات کا فیصلہ غالباً اس بغاوت کی نمایاں خصوصیت تھی۔ حقیقت میں جو عمل نئی حکومت کی ریاستی قوت کے اظہار کا ایک طریقہ بن گیا۔ یہ فیصلہ کرنے اور سزا دینے کا اختیار تھا۔ ہر روز ایک بنیا راجہ کی عدالت میں پیش کیا جاتا، اس پر جرح ہوتی، اس کی دولت کا اعلان ہوتا اور اس کو رہن کی تمام دستاویزات اور معاہدوں سے دست برداری کا فیصلہ سنایا جاتا۔ اگر اس کا رویہ لائق اطمینان ہوتا تو اس کو چھوڑ دیا جاتا۔ دوسری صورت میں اس کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ لیکن اس خیال کے ساتھ کہ اس کو کوئی شدید چوٹ نہ لگائی جائے۔ کیونکہ تھارن اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ ایسا کوئی کیس سامنے نہیں آیا تھا جس میں کسی بنئے کو خطرناک زخم لگایا گیا۔

یہ کوئی جسمانی نوعیت کی سخت سزا نہیں تھی بلکہ مالی طور پر کمزور کرنا زیادہ اہم مقصد تھا جو کہ دیوی سنگھ کے پیش نظر تھا تاکہ رایا میں بنیوں کو غیر اہم بنا دیا جائے۔ ان کی دکانیں اور اس کے علاوہ گھر بھی اس خاص نوعیت کے تشدد کی وجہ تھے۔ ہر دوکان مکمل طور سے لوٹ لی گئی تھی اور نہ صرف لوٹا گیا بلکہ اس کے ساتھ دوکان تباہ بھی کر دی گئی۔ دروازے توڑ دیئے جاتے، برآمدے گرا دیئے جاتے، فرش کھود دیئے جاتے اور دیواروں میں بڑے بڑے سوراخ کر دیئے جاتے تھے۔ جو کچھ سامان بھی اٹھایا جا سکتا تھا، سب دیہاتوں میں پہنچ گیا تھا اور باقی گلیوں میں پھینک دیا گیا تھا۔ سڑکیں پھٹے ہوئے بہی کھاتوں، ٹوٹی ہوئی بوتلوں، مرتبانوں اور صندوقچوں کے ٹکڑوں کے علاوہ فرشوں اور برآمدوں کے ملبے سے ڈھکی ہوئی تھیں رہائشی گھروں کے ساتھ اس سے بھی برا سلوک کیا گیا تھا۔ چھپائے گئے خزانوں کی تلاش میں گھر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں توڑ دیئے گئے تھے۔ تمام گھر توڑ کر ملبے کا ڈھیر بنا دیئے گئے۔ ایسے معاملات کے بارے میں قانونی کارروائی عام طور سے بنئے کو آزاد کر دینے پر ختم ہو جاتی تھی، کیونکہ زہر کی تھیلی کے بغیر کوبرا کی طرح دستاویزات سے محروم بنیا بھی بے ضرر ہو جاتا تھا۔

یہ لوٹ مار ہی تھی جس کے جلو میں بغاوت کا آغاز ہوا تھا۔ مقامی تھانہ کے مطابق چنے اور نمک کے چھکڑے ٹپہ رایا میں ایک ہجوم نے لوٹ لئے تھے جس میں 6000 ہزار افراد شامل تھے۔ اور لوٹ مار جو کہ بغاوت کا بنیادی عمل تھا لوگوں کی جانب سے سرگرمی سے بغاوت میں شامل ہونے کی وجہ بنا۔ جس کی قیادت دیوی سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ کسی بھی دوسری وجہ سے زیادہ اہم یہ

اجتماعی لوٹ مار کا سلسلہ تھا۔ جس نے بڑی کامیابی سے لوگوں میں دیوی سنگھ کے گرد جمع ہونے کی تحریک پیدا کی۔ تھارن ہل نے واضح طور پر ساہوکاروں پر حملوں کی عوامی دلچسپی کی تصدیق کی ہے۔ جب دیوی سنگھ نے ساہوکاروں کے بہی کھاتوں کو ضائع کرنے کا اعلان کیا، تمام تر آبادی کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوگئیں، اور راجہ نے ساہوکاروں کی دوکانیں اور گھر منصوبہ بندی کے ساتھ لوٹ لئے تھے، جس کا سارا قصبہ اس کے ساتھ تھا۔

لیکن دیوی سنگھ نے ایمپائر کی قوت کا اندازہ نہیں کیا۔ اس کے خیال میں نوآبادیات مقامی نوعیت کا مسئلہ تھا اور پولیس کو علاقے سے باہر دھکیل کر اس نے سوچا کہ حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا تھا۔ ناسمجھداری کا یہ عالم تاریخی حوالہ سے ناگزیر تھا، جس نے بہت جلد اس کی اس چھوٹی سی بادشاہت کی جان لے لی۔ کیونکہ مسلح کسانوں کی جنگجوئی زیادہ تر بنیوں کے ساتھ مالی معاملات کا مسئلہ طے کرنے کے لئے تھی۔ مقامی لوگوں کی وفاداری 1857 تک مغلوں کے ساتھ تھی اور دیوی سنگھ کی پہلی خواہش، تھارن ہل کو، جو ضلع مجسٹریٹ تھا، اس پناہ سے محروم کرنا تھا جو اس نے متھرا شہر کے ایک بڑے ساہوکار کے گھر میں حاصل کر رکھی تھی۔ اس وجہ سے تھارن ہل نے رایا کو عبرت کی مثال بنانے پر اکسایا۔ اس کو محاصرے کی کیفیت سے آزاد کرانے کے لئے جو فوجی دستہ آگرے سے آیا تھا، تھارن ہل نے اس دستے کی مدد سے 15 جون کو باغی گاؤں پر حملہ کیا۔ جہاں اس نے دیبی سنگھ اور رام سنگھ کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی۔ اس سے ٹپہ رایا میں حکومت کے خلاف مختصر راج کا خاتمہ ہوگیا اور یوں نومبر کے ابتدائی دنوں میں علاقے پر انگریزی اقتدار کی بحالی شروع ہوگئی۔

دیبی سنگھ کی مہم کا دورانیہ مختصر تھا اور اس میں رونما ہونے والے واقعات مضحکہ خیز تھے جیسا کہ تھارن ہل نے اپنی رپورٹ مکمل کرتے ہوئے دیہاتی راجہ کے بارے میں لکھا۔ اس معمولی سی بغاوت کے خاتمے کے نتیجے میں اسے اس حقیری بات کا پتہ چلا کہ دیوی سنگھ کی مزاحمت میں بہت معمولی نوعیت کی دشمنی پائی جاتی تھی۔ وہ شکل وشباہت میں عام آدمی نظر آتا تھا۔ جب گرفتار ہوا اس کو دوسرے کسانوں میں پہچاننا دشوار تھا۔ اس کی قوت کا مرکز ایک عام گاؤں تھا، بہت بڑا اور غربت میں جکڑا ہوا۔ یہ محض مٹی کی بنی ہوئی جھونپڑیوں کا ایک مجموعہ تھا۔ گرفتار کرنے والوں کے ہاتھ جو واحد دستاویز لگی وہ اس کے ایک دیہاتی ساتھی کا خط تھا۔ جس میں اس نے چند روپوں کی

مرچ اور اسی قدر چینی اور سبزیوں کی خرید بارے آگاہ کیا تھا۔

لیکن یہ واضح عمومی رویہ ہے، جس کا ایک تاریخ دان نے جو انتظامی آفیسر بن گیا تھا نے مضحکہ اڑایا، انڈین ہسٹری کے طالب علم کو اس کی نوعیت سمجھنے اور اس کا اقرار کرنے کی طرف توجہ دینی چاہئے، کہ قیادت جوجدوجہد کے دوران عوام کی اکثریت میں اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہوتی ہے اس پر وہ تمام اثرات موجود ہوتے ہیں جو عوام میں سے اعلیٰ قیادت تک پہنچنے کے دوران مرتب ہوتے ہیں۔

IV- گونو(GoNoo)

دوآبہ کے اچھے زرعی علاقوں کی مانند چوتا نگپور کے قبائلی علاقے بھی 1857 کی بغاوت کے زیر اثر آ گئے تھے۔ لیکن یہاں باغی فوجیوں کی تعداد بہت معمولی تھی۔ قبائلی عوام اور ان کے سرداروں نے بغاوت کی صورت میں سرکار کو پریشان کن مزاحمت دی۔ البتہ جب بغاوت نے رفتار پکڑ لی تو سردار پیچھے ہٹ گئے اور مزاحمت کی قوت نچلے طبقوں سے نمودار ہوئی۔ گونو، ایک کول، سنگھ بھوم میں ایک عام کاشتکار تھا۔ 1857 کے واقعات نے اس کو ایک باغی لیڈر بنا دیا۔ وہ 1857 کے باغی کرداروں میں کم تریں سماجی حیثیت رکھتا تھا۔ ہم اس کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ جو معلومات مجھے حاصل ہوئی ہیں وہ بہت کم اور مختلف واقعات کی نمائندہ ہیں۔ سنگھ بھوم کو دریائے سجائی تقسیم کرتا تھا۔ جنوبی حصے پر براہ راست انگریزوں کی حکومت تھی۔ جبکہ یہ علاقہ بوراہٹ کے راجہ کی جاگیر میں شامل تھا اور اس کے خاندان کے لوگوں میں منقسم تھا۔ البتہ یہ لوگ مقامی باشندوں پر کم سے کم حکمرانی کا استعمال کرتے تھے۔ سرکہ کول جاگیردار سرداروں کے لئے فوجی خدمات انجام دیتے تھے اور لوٹ مار کے علاوہ فتح سے ہاتھ لگنے والے مال غنیمت میں، معاوضہ کے طور پر، ایک حصہ حاصل کرتے تھے۔

راجہ ان پر اپنے معمولی اختیار پر مطمئن تھا جو انہوں نے قبول کیا ہوا تھا اور بطور کاشتکاران سے کوئی لگان وصول نہیں کرتا تھا۔ کولوں کے لئے بنیادی معاشرتی اکائی گاؤں اور برادری تھی۔ کولاہن جاگیر میں دیہات مشترکہ ملکیت کی بنیاد پر قائم کمیون تھے۔ جب کہ زمینداری اور درمیانی نوعیت کے مالکان بھی یہاں منطقی نتیجہ کے طور پر ظاہر ہو گئے تھے۔ کول کا حق ملکیت انتہائی ناقابل

تبدیل تھا جیسا کہ برادری کے ساتھ اس کا سماجی رشتہ۔ ڈالٹن نے کہا، ان کے نظریہ میں نسلوں تک اپنی زمین کی ملکیت سے محروم رہنے کے باوجود ان کے مالکانہ حقوق میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جس طرح کہ خونی رشتوں میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

کولوں کے دو ادارے قائم ہو چکے تھے۔ 1- مانکی اور مونڈا اور 2- کلی۔ مونڈا اپنے گاؤں کا سردار ہوتا تھا۔ لیکن وہ لوگوں کے درمیان محض رابطے کا ذریعہ تھا اور اس کے پاس کوئی بڑی ملکیت نہیں ہوتی تھی۔ ایسے دیہاتوں پر مشتمل علاقہ، جس میں عام طور پر سات سے بارہ دیہات شامل ہوتے تھے۔ پیر یا ہو کہلاتا تھا۔ اس علاقے کا راہنما مانکی کہلاتا تھا۔ مانکی کا عہدہ غالباً علاقے کے بڑے گاؤں میں آباد سردار کی خاندانی وراثت تھی۔ وہ راجہ کے لئے فوج تیار کرنے میں فوجی کمانڈر کا عہدہ سنبھال سکتا تھا اور دیہاتوں کی جانب سے راجہ کے دربار میں نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ البتہ اس کے حقوق عام رعایا سے زیادہ مختلف نوعیت کے نہیں تھے اور ایک صاحب علم آفیسر کے مطابق، کولاہن کے اندرونی علاقے میں برطانوی عمل داری سے قبل، کوئی حقیقی سردار یا بادشاہ نہیں تھا۔ دیہاتوں کی اکثریت میں کلی یا برادری کا دستور نافذ ہوتا تھا، جو کسی ایک خاص علاقے کا انتخاب کر کے وہاں آباد ہوتی تھی۔

1831 کی کول بغاوت کے بعد نوآبادیاتی حکومت نے پوراہٹ بادشاہ سے 15 پیر چھین لئے اور اس کے بعد 11 دوسرے اپنے قبضہ میں لے کر جنوبی کولاہن پر حکومت قائم کر لی جبکہ شمالی علاقہ راجہ کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ اس علاقے میں حکومت نے مانکی اور مونڈا کو باقاعدہ سرکاری حیثیت دی۔ جن کو ریونیو جمع کرنے اور امن وامان کے نگران کے طور پر تعینات کیا گیا۔ یہ عہدیدار ایک حکومتی کمیشن کے ماتحت تھے۔ وہ سرکاری اہلکار بن گئے اور وہ حلف اٹھا کر اس کی ذمہ داری نبھانے کا وعدہ کرتے۔ حلف گورنر جنرل کا نمائندہ لیتا تھا۔ حلف نامہ درج ذیل نوعیت کا تھا۔

''یہ کہ وہ کسی راجہ، زمیندار یا اس کے ماتحت کا حکم، وہ زبانی ہو یا کہ تحریری، وصول نہیں کرے گا اور اس پر عمل نہیں کرے گا۔ یہ نئی حکومت کے ساتھ ان کی وفاداری کا معاہدہ تھا۔ مانکی کے انتخاب میں اس کا مقامی اثر ورسوخ پیش نظر رکھا جاتا لیکن تعیناتی کا آخری اختیار گورنمنٹ کے پاس تھا۔ کوئی بھی جو نامناسب دکھائی دیتا حکومت اس کو برخواست کر سکتی تھی۔''

ان پیروں میں حکومت نے کاشتکاروں پر ٹیکس نافذ کیا۔ جس کی شرح بیلوں کی ایک جوڑی

پر آٹھ آنے تھی۔1844 اور 1850 کے درمیانی عرصہ میں حکومت نے کئی بار کلیوں کے ٹیکس میں اضافہ کرنے اور کاشت زمین پر ٹیکس وصول کرنے کی کوشش کی۔ایسی سرکاری مداخلتیں کولوں میں بے چینی پیدا کرنے کا باعث ہوئیں۔لہٰذا مانکیوں نے ایک معاہدہ کیا جس میں آٹھ آنے کی جگہ ایک روپیہ ٹیکس دینے پر اتفاق ہوا اور حکومت نے کوئی انکوائری کرنے اور 12 برس تک کوئی نیا ٹیکس نافذ نہ کرنے کا وعدہ کیا۔اس مالیاتی ایڈجسٹمنٹ کے نتیجہ میں سربراہوں کو زیر کاشت رقبہ کی سالانہ رپورٹ مرتب کرنے کی مصیبت سے نجات مل گئی۔اور اپنی رعیت پر ٹیکس نافذ کرنے کے لئے تخمینہ کا اختیار ان کے پاس آ گیا۔لیکن یہ معاہدہ خدشات وخطرات سے پاک نہیں تھا۔کوئی مونڈا جو معاہدہ کے تحت نیا ٹیکس ادا کرنے سے انکاری ہو، اس کا پٹہ ختم کیا جا سکتا تھا۔اور نئے قانون کی خلاف ورزی کرنے والے دیہاتوں پر نیا تخمینہ نافذ کیا جا سکتا تھا۔یہ شق بھی شامل کر دی گئی کہ علاقے میں کسی بھی نوعیت کی مداخلت کی روک تھام کے لئے فوجی قوت میں اضافہ کیا جائے گا۔ اس معاہدے اور دھمکی کی ملی جلی کیفیت میں ریونیو 1857 سے قبل ہی دوگنا بڑھ چکا تھا۔1837 تا 1854 یہ رقم بتدریج 5,108 روپوں سے بڑھ کر 8,523 روپیہ سالانہ تک پہنچ چکی تھی۔لیکن 1854 کے برس میں یہ رقم 7000 روپے تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے علاقوں کی نسبت یہاں تخمینہ نرم تھا اور یوں انگریزی اہلکاروں کا نکتہ نظر یہ بن گیا کہ جوتا نگپور میں 1857 کی بغاوت کی وجہ سرکہ کولوں کی جبلت میں شامل جنگجوئی کی فطرت کا اظہار تھا۔جس حقیقت کو تسلیم کرنے میں وہ ناکام ہوئے یہ تھی کہ نوآبادیاتی حکومت نے روایتی اداروں میں مداخلت کی اور اس کوشش میں نئے حالات پیدا کر دیئے۔تحریری حلف نامہ، کمشنر کے سالانہ دورے، ٹیکس کی باقاعدہ ادائیگی کا نظام، پیداواری تخمینہ میں اضافہ اور تخمینہ لگانے کے طریقہ کار میں تبدیلی ایسے اقدامات سے ایک زیادہ منظم اور مضبوط نظام تشکیل ہوا جو کہ پرانی قسم کے بے قاعدہ سماجی نظام سے بہت مختلف تھا۔پرانے مانکی اور مونڈا اس نئے نظام میں دیوان بن گئے جن کے پاس پولیس کے اختیارات بھی تھے۔جس کے نتیجہ میں 1857 کے حالات میں مانکیوں کا گروپ تقسیم کا شکار ہو گیا۔ایک بڑی تعداد نے اپنی پرانی وفاداریوں کا جھنڈا بلند کر دیا جبکہ کچھ ایسے تھے جنہوں نے نئے آقا کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ حقیقت میں، جو رپورٹ مرتب ہوئی اس کے مطابق 1857 کی بغاوت میں شامل وہ لوگ ہوئے

جو پرانے دور میں پوراہت کے راجہ کے ساتھی تھے۔ جس کے نتیجہ میں مانکی کو منتخب کرنے کا اختیار دوبارہ عوام کے پاس آ گیا۔ نوآبادیاتی حکومت نے ان کو پولیس اختیارات دے کر ایسے جرائم پر قابو پانے کی ذمہ داری دی تھی جو نئے حالات میں جرائم قرار دیئے گئے تھے۔ جیسا کہ جادوگرنیوں کو سزا دینا، جو کہ درحقیقت سنگھ بھوم کے روایتی سماج میں جرم نہیں تھا۔ لہٰذا کولوں کے قدیم سماج میں روایتی اداروں کی توڑ پھوڑ اور اشتراکی نظام میں قائم رشتوں میں مداخلت ایسے اسباب تھے جنہوں نے اس علاقے کو 1857 کی بغاوت کے لئے تیار کیا۔

بغاوت کا آغاز جوتانگپور میں رام گڑھ کے فوجی دستوں کی شورش سے ہوا۔ لیکن کولوں نے فوجیوں کی باغیانہ کارروائیوں کی مخالفت کی۔ کیونکہ وہ لوٹے جانے والے خزانے کو اپنا حق سمجھتے تھے اور ان کی نظر میں رام گڑھ کے فوجیوں کا تعلق ان کے علاقے سے نہیں تھا اور خزانہ لوٹنا ان کا حق نہیں تھا۔ جبکہ اس موقع پر پوراہت اور کھرساون کے سرداروں کی روایتی رقابت بھی سامنے آ گئی اور پوراہت کے مہاراجہ ارجن سنگھ جس کا کردار اس جدوجہد میں جو شروع ہو گئی تھی، بے یقینی کی کیفیت کا مظہر تھا۔ وہ گومگو کی کیفیت میں تھا۔

کبھی وہ جاگیرداروں کے مفادات کی حفاظت کے لئے ان کے ساتھ وفاداری نبھاتے ہوئے حکومت کے لئے خدمات انجام دیتا اور کبھی وہ بغاوت میں شامل ہوتا جس میں غیر مقامی لوگ بھی شریک تھے اور وہ ان کا مخالف تھا۔ جب وہ کوئی فیصلہ کن موقف اختیار کرنے میں ناکام رہا تو نتیجہ میں نچلے طبقے کے لوگوں نے اس کے خلاف ایکشن لینے کا فیصلہ کیا۔ جگو دیوان اور اس کے ساتھیوں نے یہ مسئلہ نبٹانے کی تیاری شروع کر دی۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ مغل بادشاہ کے ساتھ وفاداری کا اعلان کر دیا گیا تھا حالانکہ بادشاہ سے اس کی منظوری حاصل نہیں کی گئی تھی۔ جنگ کا تیر، جو کہ جنگی اتحادوں اور وفاداریوں کے پیغامات بھیجنے کا روایتی طریقہ تھا، گھومنے لگا، اس میں انگریزی حکومت کی جانب مانکیوں کو جاری کی جانے والی وارننگ کی پوری طرح خلاف ورزی کی گئی۔ 20 نومبر کو راجہ پر حملہ کیا گیا لیکن وہ بچ کر بھاگ گیا۔ جگو دیوان جس کو اس حملے کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا، اس کے خلاف حکومتی افسران نے مختصر مقدمہ چلا کر اس کو پھانسی دے دی اور اس جگہ بازار میں اس کی لاش کو شام تک لٹکائے رکھا۔ ان حالات تک بغاوت کا نقشہ مکمل تبدیل ہو چکا تھا، جیسا کہ ایک سرکاری اہلکار نے بیان کیا، اور اس میں غیر مقامی عنصر کا کردار ختم ہو گیا تھا۔ اس

صورت میں رام گڑھ کے سپاہیوں کی شورش کولوں کی بغاوت کی مقامی نوعیت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نئی صورت حال میں نئے باغی لیڈر کے طور پر گونو نمودار ہوا۔ اس عمل کی حقیقت گونو کے نکتہ نظر میں کیا تھی اس کا اندازہ گونو کے بیان سے کیا جا سکتا ہے جو مقدمہ کی سماعت کے دوران ریکارڈ کیا گیا۔

بغاوت سارے ملک میں پھیل چکی تھی۔ تمام مانکی اور مونڈھے راجہ کے پاس گئے، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ راجہ نے ہم سے پوچھا کہ ہمارا ارادہ کیا تھا۔ ہم نے جواب دیا کہ صاحب فرار ہو گئے ہیں اور اب آپ ہمارے حکمران ہیں، ہم آپ کے ساتھ رہیں گے۔ اس کے بعد راجہ نے خطاب کیا اور کہا دیکھو چکرادھ پور اور پوراہت والے شکاریوں کی طرح میرے پیچھے لگے ہیں اور میں جنگل میں چھپنے پر مجبور ہوں۔ ایسی صورت میں آپ کیا کریں گے۔ کیا آپ میرے لئے جنگ لڑیں گے۔ ہم نے کہا ہم جنگ لڑنے کو تیار تھے اور ہم نے اس کی قسم اٹھائی۔ پھر اس نے سارے بھینے اور دھاروے اکٹھے کئے، ان کو تنخواہ کے ساتھ اسلحہ فراہم کیا اور یوں ایک فوج کی تشکیل ہو گئی۔ ہم نے اجودھیا کی جانب سرائے خیلا کے چکدھر سنگھ کے خلاف لڑنے کے لئے مارچ کیا، جو پوراہت کے راجہ کا روایتی رقیب تھا۔

واضح طور پر تحریک نچلے طبقے نے شروع کی، اپنے سرداروں کی قیادت میں لوگوں نے راجہ سے درخواست کی کہ وہ تمام علاقے کی قیادت کا روایتی کردار ادا کرے۔ جب یہ تصور عام ہو رہا تھا کہ انگریزوں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا تھا اور عام لوگوں، سربراہوں اور بادشاہ کے درمیان پرانے روایتی تعلقات بحال ہو گئے تھے۔ راجہ نے اپنے طور پر ماتحت لوگوں سے حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی اور جب اس کو حمایت حاصل ہو گئی تو اس نے مسلح کارروائی کا حکم جاری کر دیا۔ یوں لوگوں کی خواہش اور راجہ کے فیصلہ میں پیدا ہونے والی ہم آہنگی کے نتیجہ میں بغاوت کا آغاز ہوا جو کہ تمام کمیونٹی کا متفقہ فیصلہ تھا۔

ڈالن کی تحقیق کے مطابق گونو سنگھ بھوم یا سرکہ کولوں میں پوراہت کے سابق راجہ کا سب سے سرگرم اور قریبی ساتھی تھا۔ اس نے ان لوگوں اور ان کے سردار کے درمیان فاصلہ پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ایک گواہ نے تصدیق کی کہ وہ کولاہن کے تمام لوگوں کا لیڈر تھا جو راجہ کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتے۔ جبکہ ایک رائے کے مطابق ہر ایک کی زبان پر اسی کا نام تھا۔ اور

بار پیر کے مانکی کے مطابق کول جنہوں نے سارنگ سارا گوٹھ میں انگریزی فوج کی مزاحمت کی گونو کے احکامات پر عمل کرتے تھے۔

گونو ابتدائی طور پر بار پیر کے کولوں کا لیڈر بن کر سامنے آیا۔ وہ بار پیر میں جونتی گڑھ کا رہائشی تھا۔ ڈالن کی رائے میں اس علاقے میں بغاوت کی روایت چلی آ رہی تھی اور یہ علاقہ ایسا تھا جو انتشار میں بری طرح متاثر ہوا تھا۔ یہاں ہر طرح سے لوگوں کو متحرک کرنے والا گونو ہی تھا۔ لوگ اس کو لیڈر مانتے تھے۔ جیسا کہ بعد ازاں اس نے بیان کیا۔ راجہ نے بنتر یا اور بار پیر میں لوگوں کو جمع کرنے کے لئے اپنے سفیر بھیجے۔ میں بار پیر میں پہنچ چکا تھا اور کولوں سے سنا تھا کہ انہوں نے صاحب لوگوں کو شکست دے دی تھی۔ اس کے بعد تمام مانکیوں اور مونڈھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑنے کا پختہ عزم کیا اور ہم سارنگ سارا گھاٹ پر جمع ہوئے۔

البتہ گونو نے کوردیہا میں اپنی حاکمیت قائم کر لی۔ وہ تین جنگجوؤں میں ایک تھا (میں دوسرے رگودیو اور ایک شام کرن تھا) جنہوں نے اپنے عملی مقاصد پورے کرنے کے لئے ارجن سنگھ کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ جب کہ اس نے پوراہت کی شکست کے بعد اس علاقے میں پناہ حاصل کر رکھی تھی۔ یہاں عملی طور پر راجہ باغی فوج کی قید میں تھا جس میں بار پیر کے کولوں کی اکثریت تھی۔ وہ صاحب لوگوں کے خلاف مزاحمت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ لیکن لوگ اس رویئے کی بنا پر تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے انگریزوں کے خلاف لڑنے کا عزم ظاہر کرتے تھے۔ اس کی کمزور ذہنی کیفیت نے اس کو مشکوک بنا دیا اور باغیوں کی جانب سے اسے تضحیک کا نشانہ بننا پڑا۔ اس کے اردگرد صرف فوجی (مسلح گارڈ) رکھے گئے تھے، جن کے ذمہ اس کی حفاظت تھی اور لوگ اُس کی بڑی تضحیک کرتے تھے اور کوئی اس کا احترام نہ کرتا تھا اور نہ ہی اس کی رائے پر کوئی توجہ دینے کو تیار تھا۔

باغی فوج کی سپریم کمان میں ایک اہم فرد ہونے کی حیثیت سے، جس نے راجہ کی جگہ اپنی حاکمیت قائم کر لی تھی، گونو کے ذمہ غداروں اور مخبروں کو کنٹرول کرنے کا فریضہ تھا۔ انگریزی حکومت کی حمایت سے نو آبادیاتی انتظامیہ مانکیوں کو مقامی حکومت میں شامل کرنے کا لالچ دیتی تھی۔ لہٰذا ان کی ایک خاصی تعداد انگریزی حکومت کو باغیوں کے خلاف اطلاعات فراہم کرنے کی غرض سے جاسوسی میں ملوث پائی جاتی تھی۔ رگودیو اور گونو ان کا خاتمہ کرنے کے متمنی تھے۔ ہڈو

مہاتو ان کے حکم پر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ اس کے بارے میں میراب (ایک جاسوس جو اطلاعات فراہم کرتا تھا) ہونے کا شعبہ تھا۔

گونو کے بارے میں رائے ہے کہ اس نے قبائلی لوگوں میں منافق عناصر کو مزاحمت میں تعاون پر مجبور کرنے کے لئے اجتماعی بغاوت کی دھمکی کا استعمال بھی کیا تھا۔ اس ضمن میں چنی پور پیر کے مانکی کا حلف نامہ ایک دلچسپ مثال سامنے لاتا ہے، جو اصل میں انگریزی سرکار کے ساتھ وفاداری نبھا رہا تھا۔

''میں چنی پور پیر کا مانکی ہوں۔۔۔وہ کولوں کی فوج کے ساتھ چنی پور جلانے کے بعد میرے گاؤں میں آیا۔ اس وقت گاؤں میں کافی بڑی مقدار میں چینی چکر دھر پور کو فراہم کرنے کے لئے گڈوں پر موجود تھی پڑی تھی۔ گڈوں والے فوری طور پر فرار ہو گئے جب انہیں معلوم ہوا کہ چنی پور جلا دیا گیا تھا۔ اس نے مجھے چینی کے گڈوں میں جوڑنے کے مطلوبہ تعداد میں گائیں فراہم کرنے کا حکم دیا۔ اس نے گائیں اور قلی فراہم نہ کرنے کی صورت میں دیہاتوں کو جلا دینے کی دھمکی دی۔ لہٰذا گاؤں کا تحفظ کرنے کی غرض سے میں نے اس کے دونوں مطالبے پورے کر دیئے۔۔۔اس موقع پر باغیوں کا ایک بہت بڑا دستہ گونو کے ہمراہ تھا۔ وہ سارے گاؤں میں پھیل گئے اور ہر گھر کو خوراک اور شراب فراہم کرنے کا حکم دیا۔ گونو ان کا لیڈر تھا۔ ان سب کی زبان پر یہی الفاظ تھے، میں نے گونو کو پہلے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ کہتے تھے یہ ہے گونو۔ ہمارا لیڈر۔ کیا تم اس کو نہیں جانتے اور تم نہیں جانتے کہ اگر تم نے حکم کی تعمیل نہ کی تو وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔

گونو ہمارا لیڈر، جس کی یہ پہچان بن چکی تھی، کو اپنی معمولی حیثیت سے گونو کو اس مقام تک پہنچنے کے لئے طویل سفر طے کرنا پڑا تھا۔ اس کا والد متا بار پیر کے گاؤں چون پٹیر کا مونڈھا تھا۔ گونو چیباسہ سکول میں طالب علم تھا، لیکن اس کو بچپن سے جاننے والے ایک فرد نے بتایا کہ جب وہ سکول سے فارغ ہوا۔ غربت کا سایہ اس پر گہرا تھا۔ لہٰذا وہ برے کاموں میں ملوث ہو گیا، جیسا کہ چوری وغیرہ۔ قبیلے کے ایک دوسرے آدمی نے بھی اس کی ایسی غیر اخلاقی حرکتوں کا ذکر کیا۔ وہ برے کردار کا حامل تھا۔ بغاوت میں حصہ لینے کی وجہ سے اس کا باپ جیل میں مر گیا۔ اس کے بھائی کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں کہ ایک بدکردار آدمی کسانوں کی بغاوت میں لیڈر بن گیا۔ سانٹل بول میں دومن ڈاکو دومن داروغہ بن گیا تھا اور حال میں 1970 کی دہائی کے

دوران ڈاکورامیشور آہیر سادھورامیشور میں تبدیل ہو گیا تھا، جو بھوج پور کا معروف کسان لیڈر تھا۔ وہ عمل جس میں ایک خارجی بغاوت جو تانگپور کے کسانوں کی بغاوت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اسی عمل کے دوران ایک غریب اور بدکردار کول تبدیل ہو کر کسان لیڈر بن گیا تھا۔ خطوط جو کہ کوردیہا سے برچ نے قبضہ میں لئے تھے جن میں شامل دہلی کے بادشاہ نانا صاحب اور کبیر سنگھ کے حوالے موجود تھے، ان سے ہلکا سا اشارہ ملتا ہے کہ سنگھ بھوم کی قبائلی آبادی اس عمل سے کسی حد تک وابستہ تھی۔ اور مذکورہ لیڈروں سے مدد کی ہلکی سی امید رکھتی تھی۔ یہ نوآبادیاتی حکومت کی اعلیٰ درجے اور مقامی درجے پر پوراہٹ کے راجہ کی معذولی تھی جس نے مقامی سطح پر باغیوں میں متبادل حکومت کا تصور قائم کیا اور قانون شکن خاندان کے ایک قانون شکن فرد کو لیڈر کا کردار ادا کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ البتہ اس قانونی اختیار کو ابھی اس قانونی قوت کے سامنے اپنی حیثیت منوانے کی ضرورت تھی جس اتھارٹی کو بغاوت ختم کرنے کا جتن کر رہی تھی۔

گونو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بغاوت کے دوران وہ سنگھ بھوم کا سردار بن گیا تھا اور اس نے مانکی کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اسی طرح نکلتا تھا۔ لیکن وہ دعویٰ کرتا تھا کہ اس نے یہ عہدہ راجہ کے حوالے سے حاصل کیا تھا جبکہ اس کے دور کا نظام ختم ہو چکا تھا۔ ایک گواہ نے، اس پر مقدمہ کی سماعت کے دوران بیان دیا تھا کہ وہ اس کے گھر ایک تحریر لے کر آیا تھا جو اس کے مطابق راجہ کی جانب سے حکم نامہ تھا۔ اور اس نے ہم سے پوچھا کہ کیا ہم اس کی تعمیل کرتے ہوئے مزاحمت کے لئے لوگ جمع کرنے پر تیار تھے۔ اس نے کسی دوسرے شخص کو بتایا کہ وہ راجہ کی جانب سے سنگھ بھوم کا سردار بنا دیا گیا تھا اور راجہ نے اس کو پگڑی اور گھوڑا عطا کیا تھا۔ جب گونو نے گرفتاری کے موقع پر بیان دیا کہ وہ لیڈر نہیں تھا بلکہ محض راجہ کا ایک پیروکار تھا۔ وہ اپنی کارروائیوں سے منکر ہونے کی کوشش نہیں کر رہا تھا بلکہ ایک کول باغی کی حیثیت سے اپنے سیاسی شعور کی پسماندگی کا اظہار کر رہا تھا۔

V۔ مولوی احمد اللہ شاہ

دیوی سنگھ اور گونو کے برعکس مولوی احمد اللہ شاہ تاریخ دانوں کی نظر میں کافی نمایاں ہے وہ ان مولویوں میں ایک تھا جنہوں نے 1857 کی بغاوت میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔ ان میں

معروف لوگ بھی شامل تھے جیسا کہ الہ آباد کے مولوی لیاقت علی اور دہلی کے فضل حق خیر آبادی۔ ان میں غیر معروف مولوی اور علماء بھی شامل تھے جن کے نام باغیوں کی سرکاری فہرست میں شامل تھے۔ جو برطانوی انتظامی افسران نے علی گڑھ یا بند شہر یا روہیل کھنڈ کے قصبوں کے بارے میں تیار کی تھی۔ دراصل ان کا کردار بغاوت میں مشکوک تھا لہٰذا حکومتی افسران نے شمال مغربی صوبوں کے ہر ضلع کے بارے میں ایسے افراد کی فہرست تیار کی جن کو معافی ناموں کے عوض زرعی زمین الاٹ کر دی گئی۔ اس حوالہ سے یہاں مولوی احمد اللہ کے کردار پر بحث نہایت موزوں ہوگی جو کہ 1857 کی بغاوت میں عوامی کردار کو سمجھنے میں ہماری مدد کرے گی۔

مولوی کرناٹک کے ایک خوشحال گھرانے کا فرد تھا۔ اس نے حیدر آباد سے تعلیم حاصل کی اور چھوٹی عمر میں ہی اس نے چل پھر کر تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے دور دراز تک سفر کیا اور سعودی عربیہ کے علاوہ ایران اور انگلستان میں بھی گئے۔ اس کا روحانی پیشوا محراب شاہ تھا، جو گوالیار میں معروف پیر تھا۔ وہ شمالی ہندوستان اور راجپوتانہ کے اکثر علاقوں میں پہنچا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کی تبلیغ کرتا رہا۔ نومبر 1856 میں وہ لکھنو میں تھا جہاں اس کے جلسوں میں لوگوں کی بڑی تعداد شریک ہوتی تھی۔ ایک اخبار کی رپورٹ کے مطابق یہاں اس نے انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ کوتوال کے حکم سے اس کو شہر سے نکال دیا گیا۔ کوتوال نے لوگوں کو اس کے جلسوں میں جانے سے منع کیا اور اس کے سفر پر پابندی لگا دی۔

ایک ہم عصر تجزیہ نگار اس کو آگرے کا صوفی بیان کرتا ہے۔ جس کے مریدوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ وہ پالکی میں سفر کرتا تھا جس کے آگے ڈھول بجایا جاتا تھا اور اس کے پیچھے مریدوں کی لمبی لائن میں اس کا ذکر ہوتا تھا۔ اس کے مرید ہجوم کے سامنے جلتی ہوئی تار کول کھانے کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان کے بارے میں مولوی کا اعلان تھا کہ ایسے لوگ آنے والے کل میں کارنامے سرانجام دیں گے اور موت کے بعد جنت میں بسیرا کریں گے۔ لوگوں میں وہ ڈنکا شاہ یا نقارہ شاہ کے نام سے معروف تھا، جس کا مطلب ڈھول والا مولوی لیا جاتا تھا اور شہر میں بے چینی سے دوچار کرنے والی افواہیں عام گردش کرتی تھیں۔

لکھنو سے مولوی فیض آباد چلا گیا جہاں اس نے قصبے کی سرائے میں ساتھیوں کے ساتھ ڈیرا لگایا اور یہاں لوگوں کا ہجوم اس کا دیدار کرنے لگا۔ حکومت کو شک ہوا کہ فقیر کی جانب سے واضح

شہادتیں مل رہی تھیں جن سے ظاہر تھا کہ وہ لوگوں میں نفرت پھیلانے اور بدامنی پیدا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ دروازے پر اور اندر لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ جب فقیر سے کہا گیا کہ وہ اپنے ہتھیار حکومت کے حوالے کردے تو اس نے جواب دیا کہ وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ہتھیار اس کو مرشد نے دیئے تھے۔ جب اس سے کہا گیا کہ وہ اس قصبے کو چھوڑ دے تو اس نے جواب دیا کہ وہ اپنی مرضی سے جائے گا۔ 17 فروری کو ایک آفیسر نے فوجیوں کے دستے کی مدد سے مولوی کو گرفتار کرلیا۔ اس موقع پر تصادم ہوا جس میں مولوی زخمی ہوا اور اس کے تین مرید ہلاک ہو گئے۔

مولوی کی سرگرمیاں ایسے ماحول میں جاری رہی تھیں جس میں تناؤ اور کشیدگی کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ جب سے واجد علی شاہ کو کنارے لگا دیا گیا تھا، جہادی جنگ کے بارے گفتگو عام ہوگئی تھی۔ پھر 8 جون 1857 کو باقاعدہ توپ خانہ اور مقامی بری دستوں میں بغاوت پھوٹ پڑی اور مولوی جو جیل میں بھی اپنے حامیوں سے محروم نہیں تھا جیل سے رہا کرالیا گیا اور اس کو باغیوں کا لیڈر منتخب کیا گیا۔ اس نے بائیسویں مقامی بری بٹالین کے باغی دستوں کی فیض آباد سے لکھنو تک قیادت کی۔ 20 جون کو چناہٹ کے مقام پر ایک فیصلہ کن جنگی معرکہ ہوا جس میں سرہینری لارنس کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مولوی بہادری کے ساتھ لڑتا رہا اور اس کے پاؤں پر زخم آیا۔ خاص توجہ دینے والی بات یہ ہے کہ اس لڑائی میں باغی فوجی اور نچلے طبقے کے لوگ شریک تھے۔

ایک ہم عصر گواہ نے ان کی سرگرمیوں کے بارے میں لکھا ہے۔ جب وہ شہر میں داخل ہو گئے۔ سب سے پہلا کام جو شہروں اور قصبے کے بیکار لوگوں نے کیا وہ یہ تھا۔ صبح سویرے جب وہ شہر میں داخل ہوئے انہوں نے سب کچھ لوٹ لیا جو ان کے ہاتھ لگا۔ اچانک رومی دروازے سے ایک شہری نے اپنے لوگوں کو غصے سے کہا، لوٹ مار کے شغل میں نہ پڑو۔ توپوں پر قبضہ کرو اور ان پر ماچھی بھوان (لکھنو کا پرانا قلعہ) کا نشانہ لو، اپنی کمریں کس لو اور لڑو۔ اس سے ہماری اچھی شہرت بنے گی۔ لوگ کہہ اٹھیں گے کہ نچلے طبقے کے غریب لوگوں نے کس طرح انگریزوں کی عظیم فوج کا مقابلہ کیا۔ ہر ایک اس بات کو سمجھ گیا اور لڑنے کے لئے تیار ہو گیا۔

پہل کاری میں نچلے طبقے کے لوگوں کو فخر کا احساس ملا جو عام حالات کے دوران ان کا حق نہیں سمجھا گیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا بغاوت کی لڑائی میں وہ عظیم لوگوں کی طرح سوچ سکتے تھے بڑے لوگوں کا مقابلہ کرسکتے تھے۔ انہوں نے بھوان کا محاصرہ کیا اور اس پر گولہ باری کی۔ یوں

انہوں نے انگریزی فوج کو یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ 2 جولائی کے دن شہری محل میں داخل ہو گئے۔ جہاں دوسرے عام لوگ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے جو شہر کے مختلف حصوں سے آئے تھے اور محل میں لوٹ مار شروع ہو گئی جو شام تک جاری رہی۔ اعلیٰ طبقے کے ایک شہری نے اس بارے اپنے مشاہدے میں لوگوں کے جوش و خروش کو اس طرح بیان کیا ہے۔

اپنی غیر متوقع فتح سے حوصلہ پا کر نچلے درجے کے شہریوں نے بے انتہا انتقامی کارروائیوں کا ارتکاب کیا۔ انہوں نے بندوقیں حاصل کیں اور ماچھی بھوان کے سامنے آ گئے۔ انہوں نے ایک مورچہ منشی الطاف حسین کے بنگلہ میں قائم کیا جو بھیم کے تکیہ میں واقع تھا۔ دوسرا مورچہ ایک درخت کے نیچے قائم کیا جو ہسپتال کی مخالف سمت میں کھڑا تھا۔ انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ اگرچہ یہ لڑائی معمولی نوعیت کی تھی پھر بھی شہریوں نے اپنی حدود کو پھلانگنا شروع کر دیا جب انہوں نے فقرے بازی اور مذاق کرنے کا وطیرہ اختیار کیا۔ پھر گورنمنٹ کی اجازت سے انہوں نے ایک مقامی رجمنٹ قائم کی۔ وہ ہر امیر آدمی کے دروازے پر گئے اور دھمکیاں دے کر پیسہ حاصل کیا۔ جو انہوں نے اپنے لئے بہترین اقسام کے کھانوں پر بے دریغ استعمال کیا۔ وہ دوکانوں سے حلوہ پوڑی اور مٹھائیاں بلا معاوضہ اٹھا لیتے تھے۔ انہوں نے ہر درجہ کے لوگوں کی تضحیک کی۔ انہوں نے بارود اور دوسرا دھماکہ خیز مواد آتش بازی کی دوکانوں سے اٹھا لیا اور ان کو بہت کم قیمت ادا کی۔ وہاں کوٹھی سکول کے باغیچے میں بھوسے کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ جس کو انہوں نے آگ لگا دی۔ اس طرح انہوں نے شہر کے اندر جگہ جگہ آگ لگائی۔ انہوں نے کابل کے رہائشی میر بکر علی کو گرفتار کیا اور امام باڑا کے دروازے پر لا کر تلوار کے ساتھ اس کے ٹکڑے کر دیئے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ انہوں نے اس شخص کی اس طرح بے حرمتی کیوں کی جو پست خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ شہر میں ننگی تلواریں ہاتھوں میں لئے گھومتے تھے۔

صورت حالات کا یہ بیان بغاوت کے ماحول کی کچھ نشاندہی کرتا ہے۔ مصنف کی رائے ہے کہ یہ نچلے طبقے کے لوگوں کا ہجوم تھا جو اپنی حدود سے گزر گیا اور بالآخر ان کے اندر کی غلامی نے اپنا اظہار پوری طرح سے کر دیا۔ انہوں نے اپنے فوجی دستے قائم کئے اور ایسی زبان اور رویئے اختیار کئے جن کی وجہ سے چھوٹے اور بڑے کو مخاطب کرنے کے اخلاقی اصولوں کا خاتمہ ہو گیا۔ شہریوں کے مزاج میں بدتمیزی اور نمود و نمائش کا عنصر غالب تھا۔ جن کا اظہار ان کی ایسی

کارروائیوں سے ہوتا، جیسا کہ اپنی علیحدہ پلٹنوں کی تیاری، دولت مندلوگوں کو دھمکی دے کر ان سے رقم بٹورنا، ننگی تلواریں لے کر گھومنا اور ایک سید کو قتل کر دینا، آگ لگانا، اپنی بڑائی ظاہر کرنا اس کے علاوہ کھانے پینے کے معاملے میں لطف اندوز ہونے کا احساس یعنی ذائقہ دار خوراک کا انتخاب کرنے پر توجہ دینا ایسے مظاہرے تھے جن میں جشن منانے کا عنصر غالب دکھائی دیتا تھا۔ ایسی طاقت کے حصول کا جشن امن کے زمانے میں غریب لوگوں نے جس کا خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ یہ لکھنو کے غریب اور مظلوم طبقوں کی طرف سے آزادی کی خوشیاں منانے کا منظر تھا جس سے مولوی کی حمایت ظاہر ہوتی تھی۔ یہ اس کے بد دماغ پیروکار تھے، جیسا کہ ایک شریف شہری نے ان کے بارے تضحیک کے انداز میں کیا تھا۔ لیکن جلد ہی اس کی اتھارٹی کو برجیس قادر کی قائم کردہ پارٹی نے چیلنج کر دیا جس کی قیادت حقیقی اعتبار سے بیگم حضرت محل اور ماموں خاں کے پاس تھی۔ ثانی الذکر کی نظر میں مولوی کی عوامی مقبولیت شاہی خاندان کے لئے خطرناک حیثیت رکھتی تھی۔ مولوی ایک عوامی کمانڈر تھا اور باغی اس کے ساتھ تھے۔ وزیر خان نے کہا کہ اپنی بہادری اور عوام میں تقدس کی وجہ سے بیگم نے اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے خوف محسوس کرتے ہوئے اس کو اپنی اتھارٹی کے خلاف ایک خطرہ محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اس نکتہ نظر کے پیش نظر اس نے مولوی کے اثر ورسوخ کو ختم کرنے کے لئے اپنی پارٹی تشکیل دی اور جو اقدامات اس نے ترتیب دیئے ان میں براہ راست حملہ کرنا بھی شامل تھا۔ مولوی نے دارالحکومت خالی کر دیا اور اپنے ساتھیوں سمیت شہر کے مضافات میں واقع گارڈن ہاؤس منتقل ہو گیا۔ سول آبادی سے متعلق اس کی فکرمندی نے بھی شاہی پارٹی کو پریشان کر دیا۔ لہٰذا انہوں نے اس اعلان کو بھی مولوی کے خلاف استعمال کیا۔ مولوی نے اعلان کیا کہ کوئی بھی فرد جو سول آبادی کو لوٹنے میں ملوث ہو واجب القتل تھا اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک خوبصورت عمارت میں رہائش پذیر ہوا جو اشرافیہ کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس نے شاہی خاندان کی تمام رسومات اور القابات اختیار کر لئے۔ اس سے شاہی خاندان کے محل میں ناگواری پیدا ہوئی۔ لہٰذا ریاستی افواج کو مولوی کے اعلان کے خلاف بھڑکایا گیا جو کہ ان کو براہ راست متاثر کرتا تھا۔ مولوی کے خلاف ڈاکہ زنی کا ارتکاب کیا گیا اور اسے ذلیل وخوار کر کے عمارت خالی کرالی گئی۔

یہ نکتہ نظر بھی پیش کیا جاتا ہے کہ حسین آباد کے داروغہ احمد علی کو مولوی کی گرفتاری کا حکم دیا گیا

تھا۔اس واقعے میں مسلسل پانچ گھنٹے لڑائی ہوئی اور مولوی نے پسپائی کی راہ اختیار کر لی۔سقوط دہلی کے بعد جب فضل حق خیر آبادی لکھنو آئے اور ماموں خاں کی مہم میں شریک ہوئے تو احمد اللہ شاہ کی قوت کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کی مدد حاصل کی گئی۔وہ اس فوج میں بھی شامل ہوئے جو شاہی خاندان کی جانب سے مولوی کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کی گئی تھی۔ان کارروائیوں کے نتیجہ میں اس کا اثر ورسوخ کسی حد تک کم ہوا۔لیکن ہیولاک کی فتح اور کانپور میں شکست کے بعد اس نے فوج میں اپنی قوت دوبارہ بحال کر لی۔ بیلی گارڈ پر حملے کی کمان اس نے خود کی جہاں انگریزی فوج محاصرے میں آ چکی تھی۔اب بہادری میں اس کی شہرت بہت بلند ہو چکی تھی جس سے شاہی حکمران مکمل طور پر محروم تھے۔

درحقیقت مولوی کی کامیابی میں،اس کی انفرادی بہادری اور کردار کی اثر پذیری یعنی اپنے ساتھیوں کا انتخاب کرنے میں اس کی دانشمندی کے علاوہ دو عناصر خاص اہمیت رکھتے تھے۔پہلی بات یہ تھی کہ مسلمان اس کا خدا کا پسندیدہ اور منتخب بزرگ ہونے پر پختہ یقین رکھتے تھے۔یہ ایسا عقیدہ تھا جو مذہب کے تمام فرقوں سے منسلک لوگوں میں ہوا کی طرح پھیل گیا تھا۔اس عقیدے کو اس کی پیش گوئیوں کی تصدیق پر تقویت حاصل ہوئی جو کہ صوبے میں باغیوں کی عارضی کامیابیوں کی صورت میں پوری ہو گئی تھیں۔مولوی نے انگریزوں کی حکومت کے خاتمے کی پیش گوئی کی تھی۔ کوز تھے،جو کہ ایک انگریز آفیسر تھا،نے بھی اس کے فوجیوں میں مذہبی عقاید کے متعلق تحریر کیا،جو یقین رکھتے تھے کہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ایک گولی لگنے سے اس کا انگوٹھا علیحدہ ہو گیا۔ اس کے باوجود وہ اپنے عقیدے پر قائم تھے۔وہ واضح طور پر اپنے پیروکاروں کو یقین دلا چکا تھا کہ اس کے کوڑے اور رومال میں جادو کے اوصاف پائے جاتے تھے،وہ دیوتا کا سایہ تھا،اور مکمل فتح کے بارے میں اس نے جو پیش گوئیاں کر رکھی تھیں۔ان میں کہا گیا تھا کہ آخرکار فوج سمندر تک علاقے کو فتح کر لے گی اور اس کے ڈھول کا نقارہ لندن میں بجے گا۔اس نے یہ تمام پیش گوئیاں ایک روحانی بزرگ ہونے کے ناطے کیں اور مولوی ہر طبقے کے لوگوں میں یہ تصور قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔اس نے شاہی خاندان کو تنہا کر دیا۔

ایک روحانی بزرگ کے ناقابل تسخیر ہونے اور اس کی پیش گوئیوں پر عقیدے کی بنیاد عام لوگوں کی اکثریت کے مذہبی و سیاسی شعور کی وجہ سے مضبوط تھی۔اپنے شعور میں نئی حقیقت سے

ہمکنار ہونے کے نتیجہ میں ایک آدمی ماورائی قوت کا حامل انسان کامل بن گیا تھا۔ لہٰذا اگرچہ اس کو زخم لگا پھر بھی مولوی کو انگریزی ہتھیار کو بے اثر کردینے والا سمجھا جاتا تھا۔ وہ خود بھی ایسی شعوری کیفیت کے زیر اثر تھا کیونکہ وہ خود کو اللہ کا براہ راست نمائندہ تصور کرتا تھا۔ وہ اپنے مقدر کے بارے میں خود اپنے کردار کی اہمیت تسلیم نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا اس کا کردار خدا کی جانب سے متعین تھا جس میں اس کی منصوبہ بندی کو کوئی دخل نہیں تھا۔ سیاسی عمل کی وجوہات مذہبی نکتہ نظر سے بیان کی جاتی تھیں۔ یہ صرف عصری شعور تھا جس سے وہ آگاہ نہیں تھا یا پھر اس نے اپنے آپ کو فنا کر لیا تھا۔ یہ کوئی روحانی بزرگ ہی ہو سکتا تھا جو بے انتہا طاقتور قوت کے خلاف فتح کی نوید سنا سکتا تھا اور باغی اپنی روحانی فکر میں جنت کو شاندار حقیقت سمجھ سکتے تھے۔ یہ سہانا خواب وہ نظریاتی بنیاد تھی جس پر بڑی حد تک مولوی کی اتھارٹی قائم ہوئی تھی۔ یہ ایک بڑی وجہ تھی کہ لکھنو میں انگریزوں کے خلاف مزاحمت انتہائی جوش وخروش کے ساتھ جاری رہی۔

مولوی کی لیڈرشپ کی دوسری اہم وجہ شاہی خاندان سے غداری کا خوف تھا۔ یہ اشرافیہ کی چالوں کا خوف تھا۔ اس نے اس خوف کا ذکر فوجیوں کے ساتھ بھی کیا۔ شاہی خاندان کے بارے میں فوجیوں میں پائے جانے والے رویئوں کا ذکر کمال الدین۔ حیدر حسینی نے کچھ اس طرح کیا ہے۔

''ہر روز تلنگے خاص بازار کی دوکانوں پر دائرے بنا کر بیٹھ جاتے اور وہ ڈفلی بجاتے ہوئے مل کر بھجن گاتے۔ وہ ہر ایک کی تضحیک کرتے۔ وہ مرزا برجیس قادر کو محل سے بلاتے، اس کو گلے لگاتے اور اعلان کرتے کہ تم کنہیا ہو۔ اپنے باپ کی طرح گناہگار نہ بنو۔ اپنے پگڑی والے ساتھیوں سے محتاط رہو ورنہ تم ضائع ہو جاؤ گے۔''

اپنے پگڑی والے ساتھیوں سے محتاط رہو۔۔۔ یہ ایک وارننگ تھی۔ اس اشرافی کے بارے میں بداعتمادی ظاہر کرنے کی جو اس کے ساتھ لیڈر دکھائی دیتے تھے۔ درحقیقت مولوی کی جانب سے یہ رویہ ان کے خلاف تھا کیونکہ وہ بزدل تھے اور غداری کر سکتے تھے۔ اس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ انگریزوں کی ابتدائی کامیابی کے بعد وہ بیگم کے وزیر شرف الدولہ کو قتل کرنے کی سازش کر چکا تھا۔ اس کے خلاف الزام تھا کہ اس نے برطانوی فوج کو حملہ کرنے میں مدد فراہم کی تھی۔ برطانوی سپاہی ڈولیوں میں بیٹھ کر اندر داخل ہو گئے تھے مگر وہ حملہ ناکام ہو گیا تھا۔ اشرافیہ

میں ایک دوسرے پر بداعتمادی کو سمجھ کر اس خیال کو بھی درست کہا جا سکتا ہے جس کے مطابق عوام اور اشرافیہ کے مفادات باہم وابستہ تھے اور اس بنیاد پر اشرافیہ عوام کا فطری راہنما طبقہ تھی۔ اشرافیہ کی جانب سے دغابازی کا مستقل خوف اس خیال کو بالکل برعکس نوعیت میں ظاہر کرتا ہے۔ اس شبہ کی بنیاد، جو کہ حقیقت تھی یا نہیں، عوام میں پائی جانے والی اس رائے پر استوار تھی کہ شاہی خاندان کو باغی عوام کے ساتھ پوری طرح اتفاق نہیں تھا۔ یعنی اس کے مفادات وہ نہیں تھے جو کہ باغیوں کو جنگ میں لے جا رہے تھے اور یوں ضروری ہے باغی شاہی خاندان کی غداری پر نظر رکھیں۔ ایسے جذبات بنیادی طور پر معاشرے کے طبقاتی تضادات کی نمائندگی کرتے ہیں جو کہ طبقات میں منقسم معاشرے میں اہم ہوتے ہیں۔ اگرچہ انگریزوں کے خلاف جنگ میں عوام شاہی خاندان کے ساتھ تھے مگر باغی تضادات کی کیفیت کو بھی سمجھتے تھے۔

دوسری طرف اپنی مذہبی جبلت اور جدوجہد سے حاصل ہونے والے تجربات کی بنیاد پر انہوں نے مولوی پر اعتماد قائم کر لیا اور اس نازک موقعے پر جب دہلی اور اودھ کے درمیان حالات میں بگاڑ زیادہ ہوا۔ جس کی قیمت باغیوں کو زیادہ ادا کرنی پڑی۔ دشمن فوج کی جانب سے مسلسل ایڈوانس کے پیش نظر 8 دسمبر 1857 کو باغیوں نے مولوی کو اپنا کمانڈر منتخب کر لیا۔

نومبر 1857 اور فروری 1858 کے درمیان باغی فوجیوں نے عالم باغ میں جنرل اوترم کی پوزیشن پر 3 حملے کئے۔ چوتھے حملے کی کمان مولوی نے خود کی جو بہت کامیاب رہا۔ لکھنو 14 مارچ کو فتح ہو گیا لیکن مولوی پورے استقلال کے ساتھ شہر کے دل میں واقع حضرت عباس کے مزار میں موجود رہا۔ 21 مارچ کو لوگرڈ نے سخت مزاحمت کے بعد یہ آخری مورچہ فتح کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ مگر مولوی نے احتیاط کے ساتھ پسپائی کر کے محمدی کو مضبوط مورچہ بنا لیا اور یہاں سے انگریزی فوج کا مقابلہ کرنے کی منصوبہ بندی کی۔ اپنے پیر کے نام پر کمان سنبھالنے کے بعد اس نے تعلقہ داروں کو حکم نامہ ارسال کیا کہ وہ فوج جمع کریں اور آنے والی جنگ میں فوجی فراہم کرنے کا انتظام کریں۔ حکم ناموں میں اس نے اخلاقی اور مادی اتحاد کی انتہائی ضرورت پر زور دیا۔ اس نے اعلان کیا کہ اگر تعلقہ دار انگریزوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوں گے تو ان کی آدھی آمدنی پر پانچ برسوں کے لئے ٹیکس معاف ہو گا۔ اور اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کو سزا دی جائے گی۔ اس نے زور دے کر کہا کہ جنگ جیتنے کے لئے ان کا مکمل تعاون انتہائی ضروری ہے تاکہ انگریزوں

کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دیا جائے۔اور یوں بہادری کے ساتھ اپنے آپ کو ہماری سرکار کی سرپرستی کے لائق ثابت کرنے کا عملی مظاہرہ کریں۔

البتہ مولوی کی یہ کوشش کہ وہ تعلقہ داروں کو ساتھ ملا کر دوبارہ سے غلبہ حاصل کرے ناکام ہوئی۔اس کو محمدی میں قائم مورچہ بھی خالی کرنا پڑا اور وہ پایان کی جانب پیچھے ہٹ گیا۔ یہاں مقامی راجہ جگن ناتھ سنگھ کی فوج کے ساتھ تصادم کے باعث وہ 15 جون 1858 کو شہید ہو گیا۔ ایک سرکاری آفیسر کے مطابق راجہ دوہرے چہرے کا مالک تھا(کیونکہ اس نے باغیوں کے ساتھ کئی بار فریب کاری کی تھی۔لیکن اجتماعی طور پر اس کا رجحان انگریزوں کی طرف تھا)۔اس نے مولوی کا سر کاٹ کر(جو بلدیو سنگھ کے حکم پر کاٹا گیا جو راجہ کا بھائی تھا) شاہجہان پور کے مجسٹریٹ کو پیش کیا اور انعام کے 50,000 روپے وصول کئے۔ یوں ایک بہادر اور بااثر باغی لیڈر کی مہم کا خاتمہ ہو گیا۔اس کے بعد عام جلوس میں نوآبادیاتی حکومت کی قوت کا مظاہرہ کیا گیا۔

''مولوی احمد اللہ شاہ کا سر، جس کی پایان اور شاہجہان پور کے لوگوں نے تصدیق کی، عام لوگوں کو دکھانے کے لئے کوتوالی دروازے کے سامنے رکھ دیا گیا اور اس کا جسم لوگوں کی موجودگی میں جلا کر خاک دریابرد کر دی گئی۔''

خون آلود سر کی نمائش ایسا خراج تحسین تھا جو راجہ نے اپنے انتہائی خوف زدہ مخالفین میں سے ایک کو پیش کر دیا۔ چھوٹے سے قصبے کے منتظم نے سکھ کا سانس لیا جس نے سر کو تھیلے میں ڈالا۔اس نے اپنے اعلیٰ افسر کو لکھا۔''مجھے خوشی ہے کہ ایک باغی لیڈر، جس کو اپنی ذات پر بہت غرور تھا، اپنے ساتھیوں پر حیران کن اثر رکھنے کی وجہ سے انتہائی خطرناک دشمن تھا، اب منظر سے غائب ہو گیا ہے۔''

اپنے بہترین پیروکاروں کی قوت کے ساتھ مولوی کن مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں مصروف رہا اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہم ایک پمفلٹ کو دیکھ سکتے ہیں جو فتح اسلامی کے عنوان سے خفیہ طور سے شائع کیا گیا تھا۔ یہ پمفلٹ کسی کا نام ظاہر کئے بغیر چناہٹ کی جنگ کے بعد شائع کیا گیا۔ جب احمد اللہ شاہ کا اثر و رسوخ بلند ترین ہو چکا تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ آیا یہ پمفلٹ انہوں نے خود لکھا تھا۔لیکن زبان و زماں کے لحاظ سے یہ پمفلٹ براہ راست اس کی اکثر پالیسیوں اور خیالات کی بھرپور نمائندگی کرتا تھا۔ مثال کے طور پر جہاد پر اصرار، قرآنی قوانین کے حوالے،

بلاتمیز قتل و غارتگری کے خلاف وارننگ، غیر ملکی حکمرانوں پر پوری قوت سے حملہ کرنے کی تلقین اور انگریزوں کے خلاف مکمل جنگ لڑنے کا پختہ ارادہ۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں یہ اس کی پالیسیوں اور مقاصد کی نمائندگی کرتا تھا۔ اعلان نامہ کی صورت میں لکھا گیا یہ پمفلٹ بغاوت کے سیاسی اور قومی تصورات کو پھیلانے کا ایک ذریعہ تھا۔ جس طرح کہ مولوی کے روحانی فرمودات ایسے ہی مقاصد کے حامل ہوتے تھے۔ یقینی طور پر اس پمفلٹ کا مقصد یہ تھا اس کو اودھ اور لکھنو میں عوامی اجتماعات میں پڑھا جائے۔ اعلان نامہ میں لکھا گیا تھا۔

''اس موقع پر اودھ میں کوئی بھی حکومت کا وفادار انتہائی خطرناک ہے اور یہ جلا دینے کے قابل پمفلٹ ہے کیونکہ اس کے مندرجات پر عام لوگوں کو پورا یقین ہے جو کہ نتیجہ کے طور پر انگریزوں کے خلاف بہت مشتعل ہو چکے ہیں۔''

پمفلٹ جس زبان میں لکھا گیا وہ مذہبی تھی، اس کا مطلب مذہب سے دوری سے مراد، زندگی، جائیداو، گھر اور بالآخر عزت سے محرومی بیان کیا گیا تھا۔ مذہب کے بارے میں پریشانی کا اظہار دراصل زندگی کی حقیقی پریشانیوں کا اظہار ہوتا ہے اور یہی عمل درحقیقت زندگی کی پریشانیوں کے خلاف احتجاج کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا مظلوموں کے مسائل و پریشانیوں کا اظہار اور محروم لوگوں کے جذبات کی ترجمانی کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ غیر ملکی حکمرانوں سے مذہب کو خطرہ ہے اور مذہب کی حفاظت بنیادی ضرورت ہے۔ اس میں نوآبادیاتی حکومت سے قبل کے دور کو مذہبی آزادی کا دور قرار دیا گیا تھا۔ اس سے پہلے مسلمان بادشاہ ہندوؤں کی جائیداد، زندگی اور بچوں کی حفاظت اسی طرح کرتے تھے جس طرح وہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرتے تھے (وہ اس کو اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے)۔ جب برطانوی حکومت میں ملعون عیسائی مسلمانوں اور ہندوؤں کو عیسائی بنانے کی مہم چلا رہے تھے۔

عیسائیت کو پھیلانے کی نام نہاد منصوبہ بندی کو سیاسی رنگ دیا گیا تھا۔ انگریز راج کی مذہبی تعصب پر مبنی منصوبہ بندی کو انگریزی انتظامیہ کے سیکولر نظام پر الزامات کے ذریعے ثابت کیا گیا تھا۔ یہ ایسی حکومت تھی جو لاقانونیت اور تشدد کے ذریعے قائم تھی۔ اے بھائیو اس وقت ملعون عیسائی معصوم مسلمان بھائیوں کا قتل عام کر رہے ہیں، ان کی جائیدادیں لوٹ رہے ہیں، ان کے گھروں کو آگ لگا رہے ہیں، ان کے بچوں کو گھروں میں قید کر رہے ہیں، کئی ایک موقعوں پر وہ

ان کو جلا دیتے ہیں...... موجودہ تصادم کو اجتماعی قتل عام کی مہم کا ایک مرحلہ بیان کیا گیا تھا۔ جس کی منظوری ملکہ برطانیہ نے دی تھی۔ پمفلٹ میں بیان کیا گیا تھا کہ ملکہ سے یہ منظوری جنگ شروع ہونے سے پہلے حاصل کر لی گئی تھی۔

''ملعون انگریز حکومت نے غیر مذہبی ملکہ وکٹوریہ کو لکھا تھا: اگر آپ ہمیں ہندوستان کے سو مولویوں میں پندرہ اور سو پنڈتوں میں سے اتنے ہی پنڈت اور اس کے علاوہ پانچ لاکھ کی تعداد میں ہندو اور مسلمان باغی سپاہیوں اور کسانوں کو ہلاک کرنے کی اجازت دے دیں۔ تو ہم مختصر وقت میں ہندوستان کے تمام لوگوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس تنگ نظر اور بے شرم کتیہ نے ہندوستانیوں کا معصوم خون بہانے کی منظوری دے دی۔''

ملکہ پر اس نوعیت کی براہ راست الزام تراشی، جو کہ انتہائی غیر پارلیمانی الفاظ میں کی گئی، اس دور کی ہم عصر ایسی تحریروں سے، فتح اسلامی کو بالکل علیحدہ کر دیتی ہے۔ مہربان ملکہ وکٹوریہ۔۔۔ جو کہ اس صدی میں وقوع پذیر کسان بغاوتوں میں اپنے کردار سے عوام میں اچھی شہرت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس کی مذمت اس طرح کی گئی تھی کہ اسے تنگ نظر اور بے شرم کتیہ کہا گیا۔ یہ اس روایت سے انحراف ظاہر کرنے والے الفاظ تھے جو کہ تمام تر نوآبادیاتی دور میں بادشاہ سے عام فوجی اور انتظامیہ تک تسلسل کے ساتھ قائم چلی آ رہی تھی۔ اس پمفلٹ کو ڈرافٹ کرنے میں اگر مولوی کا ہاتھ ہوتا تو وہ انگلینڈ اور وہاں کے اداروں کے بارے میں معلومات کے ذریعے جزوی طور پر ضرور اس بات کی تشریح کر سکتا تھا کہ نوآبادیاتی دور کے تمام اداروں کو مکمل تباہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر تھی، تو بھی اس اعلان نامہ میں تحریر کا مفہوم غیر ملکی حکمرانوں کی حکومت مکمل طور پر ختم کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور اس میں ملکہ اور حکومتی اہلکاروں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کرتا۔

انگریزوں کو تباہ کر دینا، سیاسی اور مذہبی فریضہ ہے۔ جس کا اعلان اس علاقے سے ہوا ہے اور یہ تمام ہندوستانیوں کے لئے ہے۔ ہندو اور مسلمان، مرد اور عورتیں سب کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ اس جدوجہد میں شامل ہو جائیں۔ البتہ اس جدوجہد کے دوران دشمنوں اور دوستوں کے درمیان امتیاز کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ دشمنوں کی جائیدادیں لوٹ لینا قانونی طور پر غلط نہیں تھا۔ لیکن باغی سپاہیوں کو ہندوستانیوں کی جائیدادیں لوٹنے سے منع کیا گیا تھا۔ خاص طور

سے ان علاقوں میں جو فتح کئے جاتے تھے۔ اس کی ہدایت کی گئی کہ ایسے لٹیروں کو فوری سزا دی جائے اور لوٹی ہوئی جائیداد مظلوم خاندان کو واپس لوٹائی جائے۔ عوام کی اجتماعی قوت کو ایک دوسرے کی بجائے براہ راست دشمنوں کے خلاف صف آرا کرنے کے لئے اس کی محتاط منصوبہ بندی بیان کی گئی تھی۔ جس میں ایسے تضادات کی نشاندہی کی گئی تھی جو باغی سپاہی عموماً نظر انداز کر دیتے تھے۔

البتہ قوانین کی ایک اور فہرست جو مسودے میں بیان کی گئی تھی وہ راہنماؤں اور پیروکاروں کے لئے ہدایات پر مشتمل تھی۔ جدوجہد کے لئے لیڈر شپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فریضہ ہم پر عائد ہوتا ہے کہ اپنے لیڈر یا سردار کا انتخاب کریں اور پھر انگریزوں کو تباہ کرنے کے لئے لیڈر کے احکامات پر عمل کریں۔ جہاں لیڈر کا انتخاب ہوگا وہاں مذہبی جنگ کے آغاز کا اعلان کیا جائے گا۔ لیڈر کس قسم کا ہونا چاہئے؟ اس حوالے سے ہدایات مذہبی اور گروہی نوعیت کی حامل تھیں۔ کوئی بھی مسلمان سردار جس میں لیڈر شپ کی چند ایک خوبیاں بھی ہوں اگر وہ شریعت محمدی کے تقاضوں پر پورا اترتا ہے تو ضرورت کے تحت اس کو لیڈر بنایا جا سکتا تھا۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکے موجودہ سرداروں سے الجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے احکامات کی تابعداری اور قوت میں اضافہ کرنے کی ضرورت تھی۔ صرف ایسا علاقہ جہاں کوئی سردار موجود نہیں باغی اپنا سردار نامزد کر سکتے تھے۔

لیڈر شپ کی ترتیب درجہ بندی کے اصول پر قائم تھی۔ سردار کو فوج کے اندر افسران نامزد کرنے کا اختیار تھا۔ اس طرح ایک بتدریج کمان قائم ہوتی تھی۔ جو خدا سے بادشاہ کے سرداروں اور ان کے ماتحتوں سے عوام تک پہنچتی تھی۔ درحقیقت ایسی لیڈر شپ پر اصرار اور قدیم و روایتی سرداروں کو قبول کرنے کا حکم ایک خاص نوعیت کی سیاسی نظام کی جانب اشارہ کرتا تھا۔ کیونکہ جدوجہد کے دوران، کئی جگہوں پر، قیادت کے نئے دعویدار پیدا ہوئے تھے اور کئی حلقوں سے جدوجہد کے مختلف مقاصد سامنے آنے لگے تھے۔ لیکن ابھی تک قیادت کا عام مقبول نظام وضع نہیں ہو پایا تھا۔ لہٰذا ایک تنظیم قائم کرنے کی ضرورت کا احساس پایا جاتا تھا۔ البتہ یہ متبادل قیادت جو پیش کی گئی تھی ہرگز عوامی مساوات پر قائم نہیں تھی۔ اس کو کمان اور ماتحتوں کی تابعداری کے اصول پر قائم کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو کہ سرداروں اور افسران کے ذریعے روبہ عمل میں ہو سکتی تھی۔ اور اس نظام کو قرآنی و شرعی حوالوں سے مقدس بنایا گیا تھا۔ لہٰذا مارکس کے الفاظ میں کہا جا

سکتا تھا کہ ''تمام مردہ نسلوں کی روایت اس طرح زندہ کی گئی جس طرح کوئی خوبصورت خواب دیکھا جاتا ہے۔ پھر بھی اس اعلان نامے میں، حقیقی عملی صورت میں، عوام کے مقاصد کو مکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ مسلح جدوجہد کے تجربات نے مصنف پر دباؤ ڈالا کہ وہ غیر ملکی حکمرانی کے خلاف عوام کی اجتماعی جدوجہد کو پیش نظر رکھے اور بغاوت کی منطق نے اس کی قلم پر اثرات مرتب کیئے جو تدریجی درجہ بندی کے تحت کنٹرول ہوتی تھی اور منظوری حاصل کرتی تھی۔ بغاوت کے اس تصور میں ہر کوئی حصہ دار تھا اور ہر فرد خود فیصلہ لینے کا اختیار رکھتا تھا۔''

''تمام لوگ وہ مرد، عورت یا بچے ہیں، جن میں غلام لڑکیاں، غلام اور بوڑھی عورتیں شامل ہیں کو ملعون عیسائیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہیئے۔''

اس کے لئے ان کو اپنی بندوقیں، کاربینیں اور پسٹل استعمال کرنا چاہیئے۔ بالکونیوں سے تیر برسا کر اور پتھروں، اینٹوں، زمین میں گڑے پائپوں، پرانے جوتوں اور تمام دیگر اشیاء جو ان کو میسر ہوں ان کو استعمال میں لانا چاہیئے۔ ان کو چاہیئے کہ وہ انگریزوں کو پتھر برسا کر ہلاک کر دیں بالکل اسی طرح جس طرح سے ابابیلوں نے ہاتھیوں پر سوار سرداروں کو ہلاک کر دیا تھا۔ باغی فوجیوں، اشرافیہ دوکانداروں اور تیل فروخت کرنے والوں اور شہر کے تمام دیگر لوگوں کو باہم متحد ہو کر ان کے خلاف بیک وقت حملہ کرنا چاہیئے۔ کچھ کو چاہیئے کہ وہ ان کو بندوقوں، پستولوں اور کاربینوں سے اور تیروں، تلواروں اور خنجروں سے ہلاک کریں۔ کچھ ان کو نیزوں پر اچھال دیں۔ کچھ مجاہدانہ دلیری سے ان کے ہتھیار چھین لیں۔ کچھ ان کو گردن سے دبوچ لیں۔ کچھ ان کو کمر سے پکڑیں۔ کچھ براہ راست ہاتھا پائی کے ذریعے ہوشیاری کے ساتھ دشمن کے ٹکڑے کر دیں۔ کچھ کو چاہیئے کہ وہ چمچوں کے ساتھ حملہ آور ہو جائیں۔ کچھ ان کو گھونسے ماریں۔ کچھ ان کی آنکھوں میں مٹی ڈالیں۔ کچھ ان کو جوتوں سے پیٹیں۔ کچھ ان پر مکوں کی بوچھاڑ کر دیں۔ کچھ ان کو ناخنوں سے زخمی کر دیں۔ کچھ ان کو زمین پر کھینچیں۔ کچھ ان کے کان کاٹ لیں، کچھ ان کی ناک توڑ دیں۔ ایسی صورت حال میں وہ کچھ بھی بگاڑنے کے قابل نہ ہوں گے، بیشک ان کی تعداد لاکھوں میں ہو۔

انگریزوں کے خلاف عوامی مزاحمت کے اس تصور میں لیڈر کا کردار ختم ہو جاتا ہے۔ محرک ہر آدمی کا اپنا ہونا چاہیئے اور یوں فتح کو یقینی بنایا جا سکتا تھا۔ یہاں ایک طرف تو سردار پر بالواسطہ اعتماد تھا اس کی مکمل تابعداری کی ہدایت تھی۔ دوسری عوامی مزاحمت کی تحریک تھی جس میں نچلے طبقے

کے لوگ بھی شامل ہونے کے پابند تھے۔اعلان نامے میں اس دوہرے کردار نے اس کو یگانہ بنادیا تھا۔کردار کا یہی دوہرا پن تھا جس نے مولوی احمد اللہ شاہ کو روحانی لیڈری عطا کردی تھی۔

VI-نتائج

یہ بیانیہ ضروری طور پر مرحلہ جاتی اور ٹوٹی پھوٹی کیفیت کا حامل ہے۔اس موضوع کا دائرہ عمل وسیع ہے جبکہ کرداروں کا صرف خاکہ ہی پیش کیا جاسکا ہے۔اس کے باوجود یہ مرحلہ جاتی بے ربط واقعات پر مشتمل ہے پھر بھی بیانیہ 1857 کے بارے میں اس موقف کی تائید کرنے کا مواد پیش کرتا ہے، جس کی رو سے گرامسی نے قرار دیا تھا کہ اس میں عوامی سطح پر شعوری طبقاتی قیادت متحرک تھی۔طبقاتی بنیادوں پر متحرک جنگجوؤں کی تعداد کافی تھی۔مولوی کا موازنہ گونو سے نہیں ہو سکتا تھا اور شاہ مل کے سیاسی عزائم ایسے نہیں تھے جن کے حصول کی جدوجہد دیوی سنگھ کررہا تھا۔ مولوی کے علاوہ دیگر میں زیادہ تر اپنی سرگرمیوں میں مقامی جدوجہد تک محدود تھے۔اپنے طویل سیاسی تجربہ اور نظریاتی وسعت کے باعث مولوی کے سامنے دوسروں کی نسبت میدان وسیع تھا اور وہ بڑے سیاسی پلیٹ فارم پر متحرک ہوسکتا تھا۔دیوی سنگھ، گونو اور شاہ مل کی پرورش اور جدوجہد مختلف نوعیت کے سماجی ومعاشی حالات میں ہوئی تھی۔ان حالات نے کسی حد تک ان کی سرگرمیوں اور ان کی قیادت میں جدوجہد کی شکل کا تعین کیا تھا۔وہ ایک دوسرے کو جانتے نہیں تھے، اس کے باوجود وہ ایک تاریخی مرحلہ میں جس میں وہ ہم عصر تھے، ایک ہی دشمن کے خلاف مورچہ زن ہوئے۔یہ بغاوت کی منطق اور مشترکہ مفادات کا کمال تھا۔

ان کی لیڈر شپ محدود مدت کے لئے تھی۔وہ ایک تحریک کی پیداوار تھے اور تحریک کے خاتمے کے ساتھ ہی ان کی اہمیت بھی جاتی رہی۔لہٰذا ایک سرکاری اہلکار کی نظر میں شاہ مل عام آدمی کی حیثیت سے بلند ہوکر اہم لیڈر بن گیا۔دیوی سنگھ نے کوئی اہم کامیابی حاصل نہ کی تھی۔گونو ایک آوارہ گرد انسان تھا۔مولوی کی زندگی کے بارے میں درحقیقت گورنمنٹ کچھ نہ جانتی تھی۔ان باغیوں کا غیر متوقع طور پر قیادت کی صورت نمودار ہونا اور جنگی کارناموں کی محدود مدت سے ایس این سین جیسے نصابی تاریخ دانوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ 1857 کے واقعات معمولی نوعیت کی اتفاقیہ بات تھی جس کو کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔جبکہ ڈنلوپ جیسے عسکری تاریخ دان نے ان کو موسمی لیدر

قرار دے کر تعصب کا اظہار کیا۔ لیکن جس طرح کہ اس بیانیہ سے واضح ہوتا ہے کہ ان لیڈروں کا کردار اتفاقیہ نہیں تھا بلکہ عوامی بغاوت کا لازمی حصہ تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو مسلح بغاوت کے ذریعے منوایا اور انہوں نے جدوجہد میں ایسے مقاصد کو محرک بنایا جو بالادست طبقوں نے کبھی تسلیم نہ کئے تھے۔ یہ لائحہ عمل اختیار کرتے ہوئے انہوں نے اس قدغن کو توڑ ڈالا جو سیاسی اور ثقافتی میدانوں میں بالادست طبقوں نے لگا رکھی تھی۔ یوں انہوں نے آزادی کی جدوجہد پر اپنی طبقاتی مہر ثبت کر دی۔ انتہائی کم عرصے میں ان کی لیڈرشپ کا مستحکم ہو جانا ظاہر کرتا تھا کہ باغیوں کے پے درپے حملوں نے نو آبادیاتی نظام کی چولیں ہلا ڈالی تھیں۔

ان باغیوں کا امتیاز یہی تھا کہ وہ عام کسانوں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ دیوی سنگھ اپنے ساتھیوں میں کھڑا ہوا مشکل سے پہچانا جا سکتا تھا۔ شاہ مل دیگر چھوٹے زمینداروں میں سے ایک تھا۔ گونو ایک عام کول تھا۔ حتیٰ کہ مولوی بھی کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ وہ کچھ نہ کچھ عربی اور فارسی زبان جانتا تھا۔ انہوں نے جنگی حکمت عملی کا جو مظاہرہ کیا اس کی بنیاد ہر روز جاری جدوجہد کے تجربات پر استوار تھی۔ یہ ان کا بنیادی تاریخی علم تھا۔ یہ انگریزی حکومت کی قوت کا مظاہرہ تھا جو ان کے قرب و جوار میں ہوتا تھا۔ جس کا درست اندازہ کر کے وہ اپنی حکمت عملی وضع کرتے تھے۔ صرف مولوی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے وہ انگریزی قوت کے اندازوں پر حکمت عملی کا تعین کرنے سے بلند نظر تھا۔ جس کی وجہ اس کا مذہبی حوالے سے قائم سیاسی نقطہ نظر تھا۔ اس کے باوجود وہ صرف جہاد اور پرانے سماجی نظام کی بحالی کا نعرہ ہی بلند کر سکا جو کہ سرداری نظام پر مشتمل تھا۔ اپنے سماجی تجربہ کی بنیاد پر وہ اسی نظام کو انگریزی حکومت کے متبادل کے طور پر پیش کر سکتا تھا۔ ہمارے تمام باغی اپنے مقصد کے ساتھ پوری طرح مخلص تھے۔ ان کے دم سے ہی جنگ آزادی 1857 میں حقیقی قوت پیدا ہوئی اور اس میں مصالحت کا رویہ ختم ہو گیا۔ لیکن دنیا کے بارے میں جزوی اور عملی تفہیم میں کمی کی وجہ سے اس تحریک کی قوت لازمی طور پر محدود ہوئی۔

ان باغیوں کی قوت اور کمزوریوں کے بارے درست طور معلومات کی بنیاد پر ہم بغاوت میں ان کا کردار سمجھ سکتے ہیں جو کہ گھڑے گھڑائے فارمولوں سے آگے قدم بڑھانے سے ممکن ہو سکتا ہے۔ وہ محض کسی روایتی تحریک کے تسلسل کا اضافی کردار نہیں تھے جو نو آبادیاتی دور کے بعد اعلیٰ طبقوں میں اقتدار کی بندر بانٹ کے نتیجہ میں ختم ہونے والی تھی۔ نہ ہی وہ اعلیٰ طبقہ کے زیر کنٹرول

کھلونے تھے جن کو اس طبقے نے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جس نے اس تاریخی معرکہ میں کوئی کردار ادا نہیں کیا نہ ان کو کسی اومنی بس میں سوار بے نام لوگوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ کی نئی تحقیق میں اہم کام معروضی حقائق میں ان باغیوں کے کردار کی تلاش یقینی ہے۔ یہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا۔ جس کی رو سے مخصوص تاریخی حالات جن میں ہم زندگی گزارتے ہیں، انسان کی ہی تشکیل ہوتے ہیں۔

❁❁❁❁❁

فضل حق خیر آبادی اور 1857ء

جمال ملک/ترجمہ و تلخیص: ڈاکٹر ناظر محمود

بہت عرصے تک 1857ء کی جنگِ آزادی کو 'سپاہی بغاوت' کہا جاتا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نو آبادیاتی تاریخ نویسی کے تناظر میں کہا جاتا تھا جس سے بعد میں قوم پرست مورخین نے اختلاف کیا جو ان واقعات کو انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی سمجھتے تھے۔

لیکن یہ بات حیرت انگیز ہے کہ 1857ء کی تاریخ کے دونوں بیانات میں فضل حق خیر آبادی (1797-1861ء) پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ وہ نو آبادیاتی دور کے اولین سیاسی قیدیوں میں سے تھے اور انہوں نے نہ صرف کچہری کے سربراہ کے عہدے سے استعفیٰ دیا بلکہ مبینہ طور پر انہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا۔ اور اس کے علاوہ آزاد ہندوستان کے لئے 'جمہوری اصولوں' پر مبنی پہلے آئین کا مسودہ بھی تیار کیا۔

دینیات اور علومِ اسلامیہ کے اسکالر ہونے کے علاوہ وہ عربی کے بڑے ادیب بھی تھے۔ اپنے علمی تبحر کی بنا پر انہیں علامہ کہا گیا اور ایک بڑے صوفی کا درجہ دیا گیا۔ فضل حق خیر آباد 1857ء کی جنگِ آزادی کا کوئی ثانوی کردار نہیں تھے لیکن پھر بھی انہیں مورخین نے نظر انداز کیا ہے۔

گو کہ علامہ خیر آبادی اردو اور فارسی ادب میں اب بھی زندہ ہیں انہیں مقامی زبانوں کی تاریخی تحریروں میں ڈھونڈنا مشکل کام معلوم ہوتا ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ خطوط، خودنوشت تحریروں، قید میں لکھے جانے والی عبارات اور مقامی زبانوں کی تحریروں کی مدد سے یہ سمجھا جائے کہ آیا یہ بغاوت پرانے نظام کی

بحالی کی جدوجہد تھی یا کچھ اور۔۔۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ علامہ خیر آبادی پر گفتگو ہمیں یورپی اور غیر یورپی نقطہ ہائے نظر سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔

ہندوستانی مسلم اسکالر فضل حق خیر آبادی (1797-1861ء) اودھ کے ایک ممتاز علماء گھرانے سے تھے۔ فرنگی محل اور الہ آباد کے علماء کی طرح خیر آبادی بھی 'عقلی علوم' (معقولات) اور وحدت الوجود کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے جس کی تشریح ابنِ عربی (وفات 1240ء) نے کی تھی۔

سترہویں صدی کے بعد اس عالمانہ روایت کو نقش بندیوں کی مجددیہ شاخ نے بڑی حد تک رد کر دیا۔ البتہ قادریہ سلسلے سے تعلق رکھنے والے علامہ خیر آبادی کو اس روایت کا آخری علم بردار کہا جا سکتا ہے۔ علامہ خیر آبادی کے بیٹے عبدالحق (وفات 1899ء) دہلی کالج میں پڑھاتے تو تھے لیکن اپنے والد سے کم درجے کے عالم تھے۔ فضل حق خیر آبادیؒ کے والد فضل امام (وفات 1828ء) بہت نمایاں قلم کار تھے۔ اُس دور میں خیر آبادیوں جیسے علمائے اودھ اور شاہ ولی اللہ (وفات 1792ء) کے جانشین علمائے دہلی کے درمیان خوب مناظرے اور مباحثے ہوا کرتے تھے۔

علمائے دہلی اصلاحِ دین کے معاملے میں محمد بن عبدالوہاب (1703-1792ء) کے پیروکار تھے۔ جبکہ فضل حق خیر آبادی جیسے علماء انگریزوں کی ملازمت بھی کرتے تھے اور اُنہیں بمشکل ہی اصلاح پسند کہا جا سکتا تھا۔

دراصل علامہ خیر آبادی مغل طرزِ حکومت سے لگاؤ رکھتے تھے اور شاید اسی لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے باوجود برطانوی حکومت پر تنقید کرتے تھے۔

1857ء کی جنگِ آزادی کچلنے کے بعد برطانوی حکام نے قتل و غداری کے جرم میں فضل حق خیر آبادی کو جزیرۂ انڈمان یا کالا پانی جلاوطن کر دیا۔ اور پھر انگریزی میں لکھنے والے مؤرخین نے اگلی نصف صدی تک اس عالم کو بھلائے رکھا۔ کئی عشروں بعد ان کی ہمہ جہت شخصیت کو ایک مجاہد اور عالم کے طور پر اہمیت دی گئی۔ صرف کچھ عرصہ پہلے ہی انہیں جدوجہدِ آزادی اور اسلامی علمیت کی ممتاز شخصیت کے طور پر مانا گیا ہے۔ اسی لئے جزائر انڈمان اور نکوبار کے وقف بورڈ کے سربراہ نے پورٹ بلیئر کے قبرستان پر یہ تفصیلی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ واضح رہے کہ اب علامہ کا مزار

ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے ایک مقدس مقام بن گیا ہے۔ درج ذیل عبارت علامہ خیر آبادی کے مزار پر لکھی گئی ہے۔

''علامہ خیر آبادی 1797ء میں خیر آباد (پرانا اودھ) کے علماء کے ایک خوش حال گھرانے سے پیدا ہوئے جو سیتا پور (یو پی) کے قریب واقع تھا۔ علامہ دینیات اور اسلامیات کے نامور عالم ہونے کے علاوہ عربی زبان و ادب کے بھی ماہر تھے۔ ان کی فصاحت و بلاغت کے اعتراف میں اُنہیں 'علامہ' کہا جاتا تھا۔ وہ اپنے وقت کے ایک عظیم صوفی بھی تھے۔ علامہ کے آباء و اجداد ایران سے آنے والے نامور اسلامی علماء میں سے تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی اسی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ علامہ کا شجرۂ نصب بتیس نسلوں پر حضرت عمر فاروق سے جاملتا ہے۔ فضل حق خیر آبادی دہلی اور لکھنو کی کچہریوں کے سربراہ بھی رہے۔ بعد میں وہ استعفیٰ دے کر انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے 1857ء میں دہلی آزاد ہونے پر دہلی کا انتظام چلانے کے لئے ایک آئین بھی مرتب کیا تھا۔ انہوں نے مغل شاہزادوں اور دہلی کے لوگوں کو انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر اکسایا تا کہ سرزمینِ ہند پر سے اُن کی بالادستی کا خاتمہ کیا جاسکے۔

1857ء میں انہوں نے ایک فتوی جہاد بھی جاری کیا جس پر بعد میں اُنہیں غداری کا الزام لگا کر گرفتار کیا گیا۔ لکھنو کی عدالت میں مقدمے کے دوران اُنہوں نے بلا تردد اپنے جرم کا اعتراف کیا اور اُنہیں اکتوبر 1859ء میں عمر قید کاٹنے کے لئے پورٹ بلیئر (کالا پانی) بھیج دیا گیا۔

انہوں نے مقامی زبانوں اور عربی میں کئی کتابیں لکھیں۔ پورٹ بلیئر میں سزائے قید کے دوران انہوں نے کپڑے اور کاغذ کے ٹکڑوں پر کوئلے اور پنسل سے دو اہم ترین سیاسی تحریریں لکھیں۔ ایک ''الصراۃ الہندیہ'' اور دوسری ''الفتنہ الہندیہ''۔ انہوں نے یہ مسودے ایک اور سیاسی قیدی مفتی عنایت احمد کاکوروی کے ہاتھ اپنے بیٹے کو خیر آباد بھجوائے۔ الصراۃ الہندیہ عربی میں ہے اور 1857ء کی جنگِ آزادی کا احوال بتاتی ہے۔

الفتنہ الہندیہ عربی شاعری کی دو طنزیہ تحریروں (قصیدوں) پر مشتمل ہے جن کا اختتام حضرت محمد کی شان میں لکھی گئی نعتوں پر ہوتا ہے۔ یہ دونوں تحریریں پورٹ بلیئر کے زندان میں اُن پر

گذرے والے ظلم وستم کی داستان ہیں۔علامہ کا انتقال 12-فروری 1861ء میں پورٹ بلیئر میں ہوا اور انہیں وہیں سپردخاک کیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ کوئی شخص مزار کے قریب اپنے جانوروں کو چرا رہا تھا کہ اُسے قریبی پیپل کے نیچے نیند آ گئی۔اس نے خواب میں مؤذن کو اذان دیتے دیکھا۔اذان کے بعد ایک سفید ریش فقیر نے وضو کے لئے پانی مانگا پھر نماز ادا کی۔اُس دن کے بعد چرواہے نے روز اس جگہ چراغ جلانا شروع کر دیا۔شاید یہ چرواہا کوئی قیدی تھا جو رہائی کے بعد وہیں ایک گاؤں میں رہ گیا۔

نسل و مذہب سے قطع نظر روزانہ سینکڑوں لوگ درگاہ پر آتے ہیں۔جن میں غیر مسلموں کی بھی بڑی تعداد ہوتی ہے۔انڈمان کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ مزار پر آنے سے اُن کی مشکلات دور ہو جائیں گی۔مرادیں پوری ہونے پر وہ عزیز و اقارب کو درگاہ پر بلاتے ہیں اور لنگر کا اہتمام ہوتا ہے۔دراصل علامہ فضل حق خیر آبادی کا مزار ان جزائر پر ہندو مسلم یکجہتی کا اظہار ہے۔

علامہ کے بارے میں یہ خیالات تعریف وتوصیف سے مزین ہیں۔اس لئے ان خیالات کا پس منظر جاننا ضروری ہے۔اس لئے بھی کہ علامہ کے بارے میں دو مکاتبِ فکر کے درمیان تنازعات رہے ہیں۔

یہ مکاتبِ فکر اُنیسویں صدی میں ظہور پذیر ہوئے تھے۔ایک تو 1830ء کے قریب یمن سے آنے والا اہلِ حدیث مکتب فکر۔جس کے کارکن جہادی تحریک میں تو شامل رہے مگر 1857ء کے بعد سرگرم عمل نہیں رہے۔اس گروہ کی اصلاح پسندی نے امام ابنِ تیمیہ (وفات 1328ء)، شاہ ولی اللہ اور غیر عالم محمد اشوکانی (1834-1760ء) جیسے علماء سے فیض حاصل کیا۔یہ لوگ کسی فقیہ کو نہیں مانتے اور صوفیانہ اور لوک مذہبی رسومات کے خلاف ہیں۔نہ ہی یہ مزاروں کی زیارت کو جاتے ہیں اور حتیٰ کہ حضرت محمد کی قبر پر جانے کو بھی بدعت میں شمار کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی سارے اختیارات علماء کو دینے کے بجائے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اجتہاد کی اجازت دیتے ہیں۔یہ لوگ تقلید کی مخالفت کرتے ہیں اور خود کو غیر مقلد کہتے ہیں۔انہیں بنیادی طور پر مسلمان تاجروں، زمین داروں اور علماء کی حمایت حاصل ہوئی جن کے لئے یہ لوگ مختلف سماجی اور علمی رابطوں کا

باعث بنے۔ ان کی ایک نمایاں منتظم اور مالی معاونت فراہم کرنے والی شخصیت صدیق حسن خان القنوجی (90-1832ء) کی تھی جنہوں نے بھوپال کی بااثر بیگم سے شادی کی جب کہ ان کی عملی رہنمائی یمن سے آنے والے کئی مہاجر علماء نے کی۔

اہلِ حدیث کی اس تحریک کو نسبتاً شہری اور تجارتی حلقوں کی حمایت حاصل ہوئی اور اس کے ردِعمل میں ایک حنفی تحریک چلی جس کا آغاز 1867ء میں دہلی کے قریبی علاقے دیوبند سے ہوا۔ دیوبند کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لئے ہم یہاں اس پر زیادہ گفتگو نہیں کریں گے۔ البتہ ایک تیسرا گروہ بھی تھا جو اس لڑائی کا بڑا فریق بنا۔

یہ مکتب فکر بھی حنفی تھا اور خود کو اہلِ سنت والجماعت کہلاتا ہے (یعنی حضرت محمد اور ان کی جماعت (برادری) کی سنت پر عمل کرنے والے)۔ چونکہ اُن کے مرکزی عالم احمد رضا خان (1855-1922ء) بریلی میں پیدا ہوئے اس لئے یہ لوگ حرفِ عام میں بریلوی کہلائے۔

یہ تحریک شمالی ہندوستان کے نسبتاً زری علاقوں میں زیادہ سرگرم تھی۔ اہلِ حدیث اور دیوبندیوں کا جھکاؤ احمد سرہندی (1564-1624ء) کے ''وحدت الشہود'' اور نقش بندی سلسلے کی طرف تھا۔ جبکہ بریلوی ابنِ عربی کے پیچیدہ فلسفے ''وحدت الوجود'' کی ہندوستانی تشریح اور قادریہ سلسلے کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔ اُن کے خیال میں حضرت محمد خدا کے نور سے بنے ہیں اور زندہ اور ہر جگہ موجود ہونے کے علاوہ علم الغیب بھی رکھتے ہیں۔ بریلوی خود کو سُنّی کہتے ہیں اور سُنّتوں پر عمل کرنے کے دعوے دار ہیں۔ یہ لوگ صوفیاء کے مزاروں پر مختلف رسومات ادا کرتے ہیں۔ اور قادری سلسلے کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی بغدادی (وفات 1166ء) کا عرس بڑے اہتمام سے مناتے ہیں۔ بریلویوں کے خیال میں خدا سے معافی طلب کرتے ہوئے انہیں حضرت محمد کی مدد درکار ہے۔

علامہ فضل حق خیر آبادی کے بارے میں بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتب کے درمیان اختلاف دراصل 1820ء کے عشرے میں اصلاح پسندوں اور برطانوی ملازمت کرنے والی ہندوستانی اشرافیہ کے مابین رسہ کشی کا اظہار ہے۔ اس لئے علامہ خیر آبادی کی سوانحِ حیات سے ہم شاہ ولی اللہ کے ماننے والے اصلاح پسندوں (جنہیں ہندوستانی وہابی بھی کہا جاتا ہے) اور خیر آبادیوں جیسے تقلید پسند برطانوی ملازم اشرافیہ کے درمیان اختلافات کو سمجھ سکتے ہیں۔

ان اختلافات کا آغاز اس وقت ہوا جب شاہ اسماعیل (وفات 1831ء) نے حضرت محمد کی حیثیت کے بارے میں تقویت الایمان نامی کتاب لکھی۔ شاہ اسماعیل کی یہ تحریر بھی اس کتاب کی طرح ہے جو اٹھارہویں صدی کے حنبلی عرب مصلح محمد بن عبدالوہاب نے کتاب التوحید کے نام سے عربی میں لکھی تھی۔

محمد بن عبدالوہاب کی طرح شاہ اسماعیل بھی منقولات یا روایتی علوم کا مرکز حضرت محمد کی احادیث کو قرار دیتے ہیں۔ وہ صوفی یا ولی قسم کے لوگوں کی عزت وتکریم کے شدید مخالف ہیں اور فقہ کے مختلف مکاتب کو رد کر دیتے ہیں۔ مختلف رسومات کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ شاہ اسماعیل نے تو یہ تک لکھا ہے کہ اگر خدا چاہے تو مزید ایک اور محمد خاتم الانبیاء پیدا کر سکتا ہے مگر وہ زمین پر دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس دلیل کے ساتھ شاہ اسماعیل نے اُس صوفیانہ خیال کی شدید مذمت کی جس کے تحت حضرت محمد نور کی شکل میں ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ اس کے برعکس علامہ خیر آبادی کا کہنا تھا کہ حضرت محمد کا جانشین یا ثانی ملنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اور خاتم الانبیاء کی ایک اور تشکیل خدائی قدرت سے بھی باہر ہے۔ علامہ خیر آبادی نے وہابیت کے خلاف فارسی میں ایک کتابچہ بھی لکھا اور اسے اپنے ہم عصر علماء کے دستخطوں سے جاری کیا۔

بریلویوں نے علامہ خیر آبادی کی تمام تحریروں کو دوبارہ شائع کر کے اپنے مکتب فکر کی بنیادیں اُنیسویں صدی کے آغاز سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس طرح فضل حق خیر آبادی اور اُن کے خاندان پر اپنا حق جتایا ہے۔ ویسے تو دیو بندی بھی علامہ خیر آبادی سے کارناموں کو مانتے ہیں۔

علامہ کے والد فضلِ امام کی تحریریں عرصے تک دیو بند کے مدرسوں میں پڑھائی جاتی رہیں اور نامور دیو بندی مئورخ محمد میاں نے فضل حق کے علمی و سیاسی کارناموں کو بہت سراہا ہے۔ اس کے برعکس اہلِ حدیث علامہ خیر آبادی کی ادب اور عقلی علوم میں خدمات کو تو مانتے ہیں لیکن اُن کی دنیا داری پر معترض ہیں۔ اُن کے مطابق علامہ خیر آبادی اہلِ حق کے خلاف بیہودہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ اور علوم السلاف سے ناواقف ہیں اور ایسی بدعتوں کے مرتکب ہوتے ہیں جو اہلِ حق کے لئے ناقابلِ قبول ہیں۔

اہلِ حدیث اور بریلوی دونوں مکاتب فکر نو آبادیاتی دور کے ایسے ماخذ پر انحصار کرتے ہیں

جوعلامہ خیرآبادی کی شخصیت کوسادہ اور غیر جانب دار طریقے سے پیش نہیں کرتے۔علامہ کے مزار کی او پر پیش کی گئی تحریر ایک ایسا ہی نمونہ ہے جو وقف بورڈ کے سربراہ کی طرف سے لکھی گئی ہے۔

فضل حق کی ابتدائی زندگی کے بارے میں معلومات ہمیں اُن کے خطوط سے بھی ملتی ہیں جو انہوں نے اپنے والد اور کمپنی کے پہلے صدر الصدور فضل امام خیرآبادی (وفات 1828ء) کو لکھے۔ان خطوط سے ہمیں 1818ء سے 1822ء کے حالات کا پتا چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسے برطانوی ملازمت میں آئے اور اُن کے برطانوی سیاست دانوں سے تعلقات کیسے تھے۔ اُن برسوں میں علامہ نے اپنے برطانوی حکام کے ہمراہ ایک سرشتہ دار کے طور پر دہلی کے گرد و نواح کے سفر بھی کئے۔ان خطوط سے نوآبادیاتی تعلقات اور باہمی تصورات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔مثلاً پانچ ذی قعد 1231ھ بمطابق 1816ء کے ایک عربی خط میں علامہ لکھتے ہیں کہ انہیں بہت سی عبارات کی نقول بنانی پڑیں اور حکام کے سامنے کھڑے ہوکر اپنی مرضی کے خلاف ایک ہی جیسے کام بار بار کرنے پڑے۔وہ انگریزوں کے گستاخانہ رویے کی شکایت کرتے ہیں کہ حکام نے ان کے ساتھ حفظِ مراتب کا خیال نہیں رکھا۔علامہ استعفیٰ دینے میں اس لئے پس وپیش کرتے رہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔

1827ء کی ایک تحریر میں وہ نوآبادیاتی ہندوستان کی حالت اور خاص طور پر خیرآباد کی خوش حالی کے زوال پر ماتم کرتے ہیں۔بدقسمتی سے یہ عبارت نامکمل ملی اور پہلی بار 1926ء میں یعنی کوئی سو سال بعد شائع ہوئی۔ یہ تحریر انہوں نے اہلیانِ دہلی کی طرف سے حکمرانوں کولکھی تھی اور ہندوستانیوں کے سماجی و معاشی زوال کی طرف توجہ دلائی تھی۔اس تحریر میں وہ زوال کا ذمہ دار برطانوی اشیاء کی ہندوستان میں بلا روک ٹوک آمد کوقرار دیتے ہیں۔اُن کے مطابق ہندو اور مسلمان جو اب تک صنعت وتجارت، زراعت اور انتظامیہ میں کام کرتے رہے تھے اب بے روزگاری کا شکار ہورہے تھے جبکہ انگریز زمینوں اور تجارت پر قبضے کررہے تھے۔کسان ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے اور کاریگر بھی زوال کا شکار تھے۔کھڈیوں پر کام کرنے والی عورتیں کمپنی کی اجارہ داری کے باعث صنعتی مصنوعات کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں۔

مزید یہ کہ دہلی کے گورنر چارلس مٹکاف نے چوکیداری ٹیکس لگا کر دہلی کی گلیوں پر پھاٹک لگا

لوگ قوم کے ''باغی وغدار'' کے زمرہ میں آتے ہیں۔اور لطف یہ ہے کہ آج اُن ''سندات'' اور ''کارناموں'' کو چھپایا جارہا ہے۔

ع　　　ہائے اس زد و پشیماں کا پشیماں ہونا

(غالب)

اب حالات نے پلٹا کھایا ہے آج مجاہدین 1857ء کے کارناموں کی تلاش ہورہی ہے۔ ان کی کوششوں کو سراہا جارہا ہے ان کی قربانیوں کی بنا پر ان کو خراج عقیدت پیش کیا جارہا ہے۔ ممکن ہے بعض اس کو ''لاحاصل'' سمجھیں لیکن حقیقت میں اسی جذبہ پر قومی عزت ووقار کی ٹھوس بنیاد قائم ہے۔

ان سطور کو عنوانِ تمہید بناتے ہوئے یہاں جنگِ آزادی 1857ء کے ایک بہادر اور جانباز مجاہد مولانا فیض احمد بدایونیؒ کا ذکر کرنا مقصود ہے جنہوں نے جنگِ آزادی 1857ء میں حصہ لے کر ملک وقوم پر اپنی جان فدا کردی اور بقائے دوام حاصل کی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

(حضرت مظہر جانجاناںؒ)

خاندان

مولانا فیض احمد کا تعلق بدایوں کے مشہور عثمانی خاندان سے تھا اس نامور خاندان کے بزرگ محمد دانیال قطری لاہور و دیوبند ہوتے ہوئے عہد شمسی میں بدایوں آکر عہدۂ قضا پر متمکن ہوئے۔(1) اس خاندان میں ہر زمانہ میں نامی گرامی عالم و فاضل پیدا ہوئے انہوں نے عہدۂ افتاء وقضاء کو زینت بخشی ہے۔قاضی رکن الدین (المقتول 683ھ/1240ء) قاضی سعد الدین المعروف بہ قاضی سعد بے گواہ (التوفی 677ھ/1288ء) مولوی مرید محمد (التوفی 1099ھ/1687ء) مفتی عبدالغنی (التوفی 1201ھ/1794ء) بحر العلوم مولانا محمد علی (التوفی 1197ھ/1782ء) مفتی محمد عیوض بدایونی ثم بریلوی، مولانا عبدالمجید (التوفی 1263ھ/1846ء) مولانا فضل رسول (التوفی 1289ھ/1872ء) مولانا عبدالقادر (التوفی 1319ھ/1901ء) مولانا

عبدالمقتدر (المتوفی 1334ھ/1919ء) حکیم مولانا عبدالقیوم (المتوفی 1318ھ/1900ء) اور مولوی حکیم عبدالماجد (المتوفی 1350ھ/1931ء) وغیرہ وغیرہ اپنے اپنے عہد میں اس خاندان کی نامور ہستیاں گذری ہیں۔(2)

مولانا فیض احمد کے بزرگوں میں مولوی مرید محمد بن ملا عبدالشکور نے عہد عالمگیری میں قوم نانگہ سے زبردست جہاد کیا جبکہ انہوں نے سورج کنڈ (بدایوں) کے مقام پر عہد غزنوی کی تعمیر شدہ ایک مسجد کو شہید کر دیا تھا۔ مولوی مرید محمد نے اپنے مدرسہ کے طلباء نیز دوسرے لوگوں کے ہمراہ موقع پر پہنچ کر مفسدین کو کیفر کردار کو پہنچایا اور مسجد کو دوبارہ تعمیر کرا دیا۔(3) اسی طرح مفتی محمد عیوض بن مفتی درویش محمد بدایونی۔ مفتی بریلی نے سب سے پہلے روہیل کھنڈ میں انگریزوں سے 1232ھ/1816ء میں جہاد کیا۔ مفتی محمد عیوض کی قیادت میں بہت قلیل عرصہ میں پیلی بھیت، رامپور، آنولہ، سرولی، شیر گڑھ اور شاہجہانپور سے قریب پانچ ہزار سے متجاوز مجاہدین جمع ہو گئے۔ میدان شہر کہنہ متصل زیارت حضرت شاہ داناولیؒ میں معرکہ عظیم ہوا۔ اول مجاہدین کا پلہ بھاری رہا۔ آخر میں انگریزوں کی مراد آباد سے نئی تازہ دم فوج پہنچ گئی اور انگریز کامیاب ہوئے۔ مفتی محمد عیوض دوسرے سربرآوردہ حضرات کے ساتھ ٹونک تشریف لے گئے۔ نواب امیر خاں والئی ریاست نے بڑی قدر ومنزلت فرمائی اور وہیں مفتی صاحب کا انتقال ہوا۔ غرض یہ حریت وآزادی کے اثرات تھے۔(4)

مولانا فیض احمد کے پردادا بحر العلوم مولانا محمد علی عالم اجل وفاضل بے بدل تھے۔ مولانا قاضی مستعد خاں دہلوی اور قاضی مبارک گوپاموی (المتوفی 1162ھ/1784ء) سے علم منقول و معقول حاصل کیا۔ دہلی و بدایوں میں ایک مدت تک درس دیا۔ نواب آصف الدولہ نے چند قطعات آراضی اور موضع شادی پور کی سند دی۔ جس پر مولانا فیض احمد کے صاحبزادے حکیم سراج الحق کے زمانہ تک عمل رہا۔(5) مسجد خرما و مدرسہ قادریہ کی مرمت وتعمیر کرائی 1197ھ/1782ء میں انتقال کیا۔(6) مولانا بحر العلوم کا وصال لکھنو میں ہوا۔ جنازہ بدایوں لایا گیا۔ عیدگاہ شمسی بدایوں جانب شمال دفن ہوئے۔ ان کے صاحبزادے مولوی شمس الدین (مولانا فیض احمد کے دادا) فقہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ آپ کو بھی معافیات وآراضیات کی سندات نوابان اودھ وغیرہ سے حاصل تھیں۔(7) شرح وقایہ پر آپ نے حاشیہ لکھا(8)۔ 1196ھ/1781ء میں

اپنے والد کے سامنے انتقال کیا۔مولانا شمس الدین کے صاحبزادے مولانا حکیم غلام احمد نے (مولانا فیض احمد کے والد) علم منقول ومعقول علمائے بدایوں سے حاصل کیا۔اوراس کے ساتھ فن طلب میں کمال حاصل تھا۔(9) ہزاروں مریض آپ سے شفا پاتے تھے۔بڑے خوش نویس اور تیر انداز تھے۔نواب ڈھاکہ کے یہاں مرشدآباد میں ملازم تھے اور وہیں 5-ذی الحجہ 1226ھ میں انتقال کیا۔ملفوظات معینی میں آپ کے متعلق تحریر ہے۔(10)

''مولوی غلام احمد فاضل وحکیم وحافظ وخوش نویس وتیرانداز بود۔''

مولانا فیض احمد کے نانا حضرت مولانا عبدالمجید فاضل زمانہ عالم یگانہ تھے۔بحر العلوم مولانا محمد علی ومفتی عبدالغنی (11) سے تعلیم وتربیت حاصل کی۔اور پھر ملک العلماء ومولانا نظام الدین سھانوی بانی سلسلہ نظامیہ کے شاگرد مولانا ذوالفقار علی ساکن دیوہ سے علوم منقول ومعقول حاصل کئے اور حضرت اچھے میاں مارہرویؒ (المتوفی 1235ھ/1819ء) سے اجازت وخلافت تھی۔ 1263ھ/1846ء میں انتقال کیا۔(12) مولانا فیض احمد کے ماموں مولانا فضل رسول ابن مولانا عبدالمجیدؒ بھی بڑے عالم وفاضل تھے۔مولانا نورالحق(13) فرنگی محل (المتوفی 1238ھ/ 1822ء) حکیم ببر علی خاں موہانی۔شیخ عبداللہ مکّی، شیخ عابد مدنی (المتوفی 1257ھ/1841ء) وغیرہ سے مختلف علوم وفنون کی تحصیل فرمائی۔کچھ دنوں سرشتہ دار عدالت بدایوں رہے۔آپ کو ''ردّوہابیت'' میں خاص شہرت حاصل ہے۔اس سلسلہ میں سیف الجبار اور بوارق محمدیہ خاص طور سے مشہور ہیں۔آپ کے تلامذہ کا سلسلہ وسیع ہے۔آپ کے شاگردوں میں مولوی خرم علی ملہوری، مولوی عنایت رسول چریاکوٹی۔مولوی سخاوت علی جونپوری، مولوی عبدالفتاح گلشن آبادی۔اور مولوی فیض احمد بدایونی خاص شہرت رکھتے ہیں۔انتقال 1289ھ/1872ء میں ہوا۔(14)

پیدائش

مولانا فیض احمد بن حکیم غلام احمد مولوی محلّہ شہر بدایوں میں 1223ھ/1808ء میں پیدا ہوئے۔خدا کی قدرت کہ آپ کی عمر قریب تین سال کے ہوگی کہ والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔اور یتیمی کا داغ لگا مگر آفریں آپ کی والدہ کو کہ جنہوں نے آپ کی تربیت باحسن وجوہ فرمائی کیوں نہ ہو آخر ایک عالم وشیخ کی بیٹی تھیں۔

تعلیم و تربیت

مولانا کو قدرت نے شروع ہی سے وہ دل و دماغ بخشا تھا کہ جس پر آپ کے ہمدرس طلباء کو رشک آتا تھا۔ جو چیز ایک دفعہ پڑھ لی یاد ہو گئی۔ اور ایک مرتبہ نظر سے گذر گئی دل پر نقش ہو گیا۔ تحقیق و تدقیق آپ کا حصہ تھا۔ اہل خاندان خیال کرتے تھے کہ مستقبل قریب میں یہ بچہ فخر خاندان ہوگا۔

بالائے سرش زہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

والدہ نے اس ہونہار بچے کو اپنے بھائی مولانا فضل رسولؒ کے سپرد کر دیا۔ آپ نے نہایت محبت اور ناز و نعم سے پرورش فرمائی۔ مولانا فیض احمد نے تمام علوم منقول و معقول اپنے ماموں اور شفیق استاد مولانا فضل رسولؒ سے صرف چودہ سال کی عمر میں حاصل فرمائے۔ اور پندرہویں سالگرہ سے قبل آپ کو اجازت درس مل گئی۔ دوسرے فنون مروجہ خطاطی، شعر و شاعری وغیرہ میں بھی آپ نے کمال حاصل کیا۔ ایک قلیل عرصہ میں آپ کا شہرہ ہو گیا۔ اور تشنگان علم نے اس منبع علم و فضل کی طرف رخ کیا۔ مولانا فضل رسول آپ کی لیاقت و قابلیت پر مہر تصدیق ثبت فرماتے ہوئے ملفوظات معینی میں لکھتے ہیں۔

''بفضلہٖ تعالیٰ فیض احمد مذکورہ کہ ہمشیر زادہ و نور دیدہ و لخت دل و قوت بازوئے خاکسار است جامع کمالاتِ انسانی است در علوم مروجہ بر معاصرین بالادست و عقیدت و محبت صحیحہ باغبان و محبوب خدادارد۔ اللھم زد اثر طین الکمالی کہ دارد ہمینکہ بخدمات جلیلہ حکام دنیا تضیع اوقات می کند۔ اللہ تعالیٰ انجام بخیر فرماید چونکہ حبل المتین محبت دوستان خدادار دامیہ ما است۔'' (15)

صاحب تذکرہ علمائے ہند ''مولوی رحمٰن علی'' لکھتے ہیں۔ (16)

''مولوی فیض احمد بدایونی بن حافظ غلام احمد بن مولوی شمس الدین بن مولانا محمد علی بدایونی ولادت دے در حدود دوازدہ صد و بست و سہ ہجری

رو داد جملہ علوم عقلی و نقلی، بخدمت خال خود مولوی شاہ فضل رسول
بدایونی بکمال تحقیق و تدقیق تحصیل نمودہ مرید مولانا شاہ عبدالمجید
جد مادری خود بود تشریح کمالات علمیہ و حالات قدسیہ دے دریں مختصر
گنجائش ندارد۔'' ص 165، ص 166

بیعت

جب مولانا نے علوم ظاہری سے فراغت حاصل کر لی تو علوم باطنی کا خیال آیا۔ حضرت اچھے میاں مارہرویؒ کے خلیفہ اجل آپ کے نانا حضرت مولانا عبدالمجیدؒ مسند رشد وہدایت پر جلوہ افروز تھے۔ آپ نے سلسلہ قادریہ برکاتیہ میں اپنے نانا صاحب سے بیعت فرما کر علوم باطنی کی تکمیل کی۔

درس وتدریس

آپ نے جب مسند درس کو سنبھالا تو ایک عالم مستفید ہوا۔ طلباء سے ایک خاص تعلق خاص ہوتا تھا۔ ان کی خبر گیری اور بسا اوقات ان کی مدد کرنا آپ کے معمولات سے تھا۔ دوران ملازمت میں بھی آپ طلباء کو درس دیتے تھے۔ اور یہ اس دور کی خصوصیات سے تھا۔ آپ کے تلامذہ کا شمار دشوار ہے۔ بدایوں کے مقامی تلامذہ مولوی صبیح الدین عباسی، قاضی شمس الاسلام، مولوی سید دولت علی نقوی قبائی، مولوی حکیم غلام صفدر، مولوی محمد اسحٰق صدیقی۔ مولوی محمود بخش صدر الصدور، مولوی کرامت اللہ منصف، مولوی محمد حسین، مولوی نجابت اللہ، خلیفہ غلام حسین، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد سعید، مولوی نور محمد وغیرہ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ (17) بیرونجات کے شاگردوں میں مولوی سید احمد حسن (18) عرشی قنوجی، مولوی عبدالصمد قنوجی، مولوی فضل احمد فرخ آبادی، مولوی سراج احمد واولاد احمد سہسوانی کے نام ملتے ہیں۔

آگرہ میں دوران ملازمت جنھوں نے تعلیم پائی۔ المنین مولوی سید اولاد علی اکبر آبادی اور مولوی باسط علی کے نام نمایاں ہیں۔

ملازمت

آغاز ملازمت کی تاریخ کا صحیح تعین تو نہ ہو سکا مگر خیال ہے کہ کچھ دنوں مسندِ درس کو بدایوں

سنبھالا چونکہ آپ کے ماموں صاحب سرشتہ دار رہ چکے تھے۔ لہٰذا اسی تعلق کی بنا پر آپ نے بھی انگریزی ملازمت اختیار کی ہوگی۔ اور پھر اہلیت و قابلیت کے اعتبار سے آپ اس کے مستحق بھی تھے، بدایوں کے ایک رئیس چودھری تفضل حسین فاروقی (19) (ولد محمد عظیم) زمیندار سرائے چودھری کے ایک خاندانی قضیہ کے تصفیہ میں پنچایت میں دوسرے عمائدین کے ساتھ ساتھ مولانا فیض احمد صاحب کی بھی مہر راقم کی نظر سے گذری۔ یہ واقعہ و فیصلہ 1252ھ/1836ء کا ہے۔ اس سے خیال گذرتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس وقت تک قیام بدایوں ہی ہوا گرچہ یہ یقینی نہیں لیکن اس سے یہ امر تو واضح ہے کہ شہر کے معاملات نزاعی میں آپ سے رجوع کیا جاتا تھا۔ اور آپ ان کو باحسن وجوہ نبٹاتے تھے۔ آپ کی مہر بشکل مستطیل تھی اور اس میں ''فیض احمد'' مندرج تھا۔ آپ کے آغاز ملازمت کے سلسلہ میں صاحب اکمل التاریخ بھی خاموش ہیں۔ اور ''تحفہ فیض'' میں تو صرف اشارہ ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ ملازمت کا آغاز بدایوں ہوا ہو جو زیادہ قرین قیاس ہے پھر آپ آگرہ پہنچے ہوں۔ آگرہ اس وقت صوبہ کا صدر مقام تھا۔ صدر نظامت آگرہ میں اول آپ مسل خواں پھر پیشکار ہوئے اور آخر میں بورڈ آف ریونیو میں سرشتہ دار ہو گئے۔ فرائض منصبی نہایت دیانت، محنت اور راستبازی سے انجام دیتے تھے۔ حکام بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ (20) اسی زمانہ میں ولیم میور نے جو کہ وہاں مجسٹریٹ علاقہ فوج تھا اور بعد کو لیفٹیننٹ گورنر صوبہ یو۔ پی (1868ء۔1872ء) ہوا۔ آپ سے عربی پڑھی۔ اس متعصب انگریز گورنر یو۔ پی نے کذب و افترا سے بھری ہوئی مشہور کتاب ''لائف آف محمد'' لکھی۔ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک پر ناروا حملے کئے ہیں اور جس کا جواب بڑے مدلل طریقے پر سر سید احمد خاں نے دے کر اس وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا۔

قیام آگرہ

مولانا فیض احمد نے اخلاق بڑا وسیع پایا تھا۔ اہالیان وطن کی آپ بڑی مدد کرتے تھے۔ بدایوں کا جو شخص پہنچا اور جس کام میں مدد کا خواستگار ہوا۔ اس کی حتی الوسع امداد کی۔ قیام و طعام کی کفالت کرتے بعض اوقات ان مصارف کے لئے قرض کی ضرورت ہوتی۔

صاحب اکمل التاریخ لکھتے ہیں۔

''باوجود ثروت و وقار کے دل فقیرانہ، مزاج شاہانہ تھا۔ فقراء سے محبت غرباء سے الفت، طلبہ کے شائقین اور علم کے شیدائی تھے، شاگردوں کی تمام ضروریات کے خود متکفل ہوتے تھے۔ سلسلہ درس وتدریس اقامت آگرہ میں برابر جاری رہا۔

آگرہ اس وقت علماء فضلاء کا مرکز تھا۔ مفتی انعام اللہ خاں وکیل سرکار، مولوی کریم اللہ خاں صدر الصدور، مولانا قاسم دانا پوری، مولانا غلام امام شہید، مولوی امام بخش وکیل صدر، مولوی حافظ ریاض الدین مفتی شہر، شیخ محمد شفیع اللہ الہ آبادی مولوی منصب علی وکیل، مولوی عظیم الدین، مولوی محمد باسط علی، مولوی محمد معین الدین، مولوی شیخ اعتقاد علی وکیل، مرزا اسد علی بیگ وکیل، سید باقر علی ناظم محکمہ دیوانی، مفتی عبدالوہاب گوپاموی، مولوی نور الحسن، سید رحمت علی، مولوی طفیل احمد خیر آبادی، مولوی فیض احمد بدایونی اور مولوی ڈاکٹر وزیر احمد خاں۔ جیسے حضرات موجود تھے۔(21) اور جن کی نشست اکثر مفتی انعام اللہ خاں کے یہاں ہوتی تھی۔ مفتی صاحب کا مکان اہل علم کا مرکز بنا ہوا تھا۔ دراصل اس وقت آگرہ میں ان حضرات کے اجتماع پر آسمان کو بھی رشک آتا ہوگا۔ آخر الذکر حضرات مولانا فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر محمد خاں (22) میں بہت خصوصی تعلقات تھے۔ دونوں بڑے فاضل اور علم وفضل کے شیدائی تھے طبائع کی مناسبت اور خیالات کی یکسانیت نے دونوں کو اتنا قریب کر دیا تھا کہ مثل ایک جان دو قالب کے تھے ہر کام میں ایک دوسرے کے معین مددگار اور سہیم وشریک رہتے تھے اور یہ پیمان وفا ایسی نیک ساعت میں بندھا تھا کہ آخر دم تک مولانا فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر خاں ایک دوسرے کے ساتھ رہے اور پھر دونوں نے مفقود الخبری کی چادر اوڑھ کر انگریزی حکومت کو منہ نہ دکھایا۔

مناظرہ مابین مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ہمدوش مذہب عیسوی نے بھی فروغ حاصل کیا اور ہر ممکن صورت سے اس مغلوب ملک کو مذہبی حیثیت سے بھی فتح کرنے کی کوشش کی۔ کمپنی کی تائید واعانت سے مذہب مسیحی کی تنظیم اور ترقی عمل میں آئی۔ ملک کے طول وعرض میں ہر جگہ اس تنظیم کے آثار قائم کئے گئے۔ چرچ، مشن سوسائٹی، بائبل سوسائٹی، مشن فنڈ، مشن

اسپتال، مشن کالج اور مدارس جا بجا قائم ہوئے۔ مذہبی کتابوں اور رسائل کی اشاعت کے ذریعہ ہندوستانیوں کے رجحانات وعقائد سب سننے کی کوشش کی گئی۔ غرض یہ وہ زمانہ تھا کہ عیسائیوں نے ہندوستان میں اسلام کے خلاف زبردست مہم جاری کر رکھی تھی۔ 1854ء میں پادری فنڈر (REVD. C.C.P. FONDAR) یورپ سے ہندوستان آیا۔ یہاں اُن نے اور اس کی جماعت نے دل شکن تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کی کتاب ''میزان الحق'' نے خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا۔ پادری فنڈر نے آگرہ کو مناظرہ کا گڑھ ٹھہرایا۔ کیونکہ آگرہ ہی اس وقت علماء کا مرکز تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر یہاں کسی طرح فتح ہوگئی تو عیسائیت کی تبلیغ میں بڑی مدد ملے گی۔ اس نے مشاہیر علماء کو چیلنج دیا۔ مجلس علماء میں مشورہ ہوا۔ مولانا فیض احمد کے دوست ڈاکٹر وزیر خاں نے چیلنج قبول کرلیا، اور مذہب عیسوی کے مشہور ماہر و مناظر مولوی رحمت اللہ کیرانوی (23) جو کہ عرصہ سے پادری مذکور سے خط وکتابت کر رہے تھے بلائے گئے انہوں نے چھلی اینٹ آگرہ میں قیام کیا۔

ضروری انتظامات کے بعد 11- رجب 1270ھ مطابق 10- اپریل 1854ء بروز پیر کڑہ عبدالمسیح آگرہ میں مناظرہ کا پہلا اجلاس اہل اسلام کی جانب سے مناظر اول مولوی رحمت اللہ عثمانی کیرانوی اور مناظر دوم ڈاکٹر وزیر خاں تھے۔ جن کے معین و مددگار مولانا فیض احمد بدایونی تھے۔ عیسائیوں کی طرف سے مناظر اوّل پادری فنڈر اور مناظر دوم پادری فرنچ تھے۔ مجلس مناظرہ میں مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی، مسٹر کرسچن سکنڈ صوبہ بورڈ، مسٹر ولیم میور مجسٹریٹ علاقہ فوج، مسٹر لیڈل ترجمان حکومت پادری، ولیم گلبن، مفتی ریاض الدین، مولوی حضور احمد سہسوانی، مولوی امہ اللہ مختار راجہ بنارس، مولوی قمر الاسلام امام جامع مسجد آگرہ، مفتی خادم علی مہتمم مطلع الاخبار، مفتی سراج الحق، مولوی کریم اللہ خاں بچھرایونی، پنڈت جگل کشور، راجہ بلوان سنگھ (بنارس)، قاضی حکیم فرخند علی گوپاموی، مولوی سراج الاسلام نیز اور بہت سے علماء عمائدین اور روسائے شہر موجود تھے۔ (24)

شرائط مناظرہ میں یہ خاص شرط تھی کہ مغلوب کو غالب کا مذہب اختیار کرنا ہوگا۔ تین روز تک مناظرہ ہوا۔ پادری فنڈر کو انجیل کی تحریف کا اقرار کرنا پڑا۔ اور اس نے شکست فاش کھائی۔ اور آگرہ سے راہ فرار اختیار کر کے سیدھا یورپ پہنچا۔ اس مناظرہ کی پوری کیفیت ''البحث

الشریف فی اثبات التنسیخ والتحریف'' کے نام سے وزیر الدین نے مرتب کر کے حافظ عبداللہ کے اہتمام سے 1270ھ ہی میں فخر المطابع شاہجہان آباد میں ولی عہد مرزا فخرو کے صرفہ وحکم سے چھپوا کر اکناف و اطراف ہند میں تقسیم کرا دیا تھا اور اسی مناظرہ اکبر آباد کو چھوٹی تقطیع پر حصہ اول ''مباحثہ مذہبی'' اور دوسرا حصہ ''مراسلات مذہبی'' کے نام سے سید عبداللہ اکبر آبادی نے منشی محمد امیر کے اہتمام سے مطبع منعمیہ اکبر آباد سے 1270ھ میں چھپوایا۔ پہلا حصہ فارسی میں تقریری مناظرہ کی روداد ہے۔ اور دوسرے حصہ میں ڈاکٹر وزیر خاں اور پادری فنڈر کا تحریری مناظرہ اردو میں ہے۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ مولوی رحمت اللہ کی کتاب اظہار الحق کے حاشیہ پر مطبوعہ ہے جو کہ مطبع محمودیہ قاہرہ مصر سے 1317ھ میں طبع ہوا ہے۔ غرض اس تاریخی مناظرہ میں مولانا فیض احمد بدایونی نے ڈاکٹر وزیر خاں کو ہر قسم کی مدد دی اور ان کی کامیابی کے ممد ہوئے۔ اور یہ دوران ملازمت میں بڑا کام تھا۔

جامع مسجد آگرہ کا ایک خاص واقعہ

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ مذہبی انحطاط بھی شروع ہوا۔ جس کے مفصل حالات جابجا ہمیں تاریخوں میں ملتے ہیں۔ نواہی کی کثرت اور اوامر سے پہلوتہی مسلمانوں کی زندگی کے عام واقعات تھے۔

1835ء میں صدر نظامت کا دفتر آگرہ منتقل ہوا۔ علماء کی اچھی خاصی تعداد صدر نظامت کے سلسلہ میں منتقل ہو کر آگرہ آئی جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے مفتی انعام اللہ خاں وکیل سرکار نیز دوسرے علماء جب پہلی مرتبہ آگرہ کی شاہی جامع مسجد میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے گئے تو دیکھا کہ نمازیوں کی تعداد صرف ساٹھ یا ستر افراد پر مشتمل تھی یہ شہر آگرہ کا حال تھا جو کہ دور مغلیہ سے مسلمانوں کا مرکزی شہر چلا آ رہا تھا۔ ذرا جامع مسجد آگرہ کا بھی حال سنئے۔ اندر کا صرف صدری دروازہ نمازیوں کے لئے کھلا ہوا تھا باقی تمام دروازے بند تھے۔ کبوتر پلے ہوئے تھے اور باقاعدہ مسجد خاص میں سوت کی رسیاں بنی جاتی تھیں یہ ناگفتہ بہ حالات تھے۔ (25) مسجد کی تمام دوکانیں پیش امام اور متولیوں نے ہندو بنیوں کے پاس رہن رکھ دی تھیں۔ اور اوقاف کی آمدنی خوب اڑاتے تھے۔ مولانا فیض احمد رسوا بدایونی صاحب، کلکٹر آگرہ مسٹر فنلے کے پیشکار تھے۔ کلکٹر ان کی

حسن کارگذاری اور لیاقت کا بہت معترف تھا۔ مولانا فیض احمد بدایونی کو جامع مسجد آگرہ کی دوکانوں پر ہندوؤں کے مالکانہ قبضہ کا بہت افسوس تھا چنانچہ آپ نے ایک روز کلکٹر آگرہ مسٹر فنلے سے جامع مسجد آگرہ کی دوکانوں کے رہن ہونے اور ہندوؤں کے قبضہ کا ذکر کیا اور دوکانوں کے واگذاشت ہونے کی درخواست کی۔ کلکٹر نے قانونی مجبوری کا عذر کیا۔ مولانا فیض احمد بدایونی نے عرض کیا کہ قانون کی رو سے ہی دوکانیں ہندوؤں کے قبضہ سے نکل سکتی ہیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ ہندوؤں کی اصل رقم معہ سود کے جوڑی جائے اور برسوں سے جوان کا دوکانوں پر قبضہ و تصرف ہے۔ اس کے بدلہ میں شرح مروجہ سے کرایہ لگا دیا جائے۔ کلکٹر کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ مولانا فیض احمد بدایونی کی تجویز کے مطابق عمل درآمد ہوا۔ دوکانیں ہندوؤں کے قبضہ سے نکل آئیں اور کچھ رقم بھی ہندوؤں کے ذمہ بہ سلسلہ کرایہ واجب الادا نکلی۔ مولوی سعید احمد صاحب مارہروی مئولف ''امرائے ہنود'' نے جامع مسجد آگرہ کے اس مقدمہ کی پوری مسل ملاحظہ فرمائی ہے جس سے مولانا فیض احمد بدایونی کی مساعی جمیلہ کا حال معلوم ہوا۔ (26)

مولانا فیض احمد صاحب بدایونی کا یہ کارنامہ جامع مسجد آگرہ کے سلسلہ میں بڑا اہم ہے۔ دوکانوں کے واگذاشت ہونے کے بعد مسجد کے انتظام کو درست کیا گیا۔ کبوتر بازوں کی سرگرمیوں اور رسی بٹنے کی لعنت کو ختم کر کے مسجد کی درستی و مرمت کرائی گئی اور مسجد کے انتظام کے لئے لوکل ایجنسی آگرہ کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت آج تک جامع مسجد آگرہ کا انتظام ہے۔

آگرہ میں شاہ احمد اللہ کی آمد

مولانا سید احمد اللہ (27) شاہ نواب چنا پٹن کے صاحبزادے اور ابوالحسن شاہ گولکنڈہ کی اولاد سے تھے۔ عالم فاضل اور فنونِ حرب کے ماہر تھے۔ یورپ نیز دوسرے ممالک اسلامیہ کی سیر کی وسیّد قربان علی جے پوری اور حضرت محراب شاہ قلندر گوالیاری سے اجازت وخلافت حاصل تھی اس وقت برصغیر کی سیاسی حالت عجیب دور سے گذر رہی تھی۔ مسلمان تباہ و برباد ہو رہا تھا اس کی عزت و ناموس غیر محفوظ تھی۔ انہدام مساجد اور تذلیل وتحقیر اسلام عام بات تھی۔ حضرت شاہ احمد اللہ شاہ نے انگریز کے خلاف جہاد کا مسلسل ارادہ قائم کر کے اول دہلی کا رخ کیا وہاں عجیب ہنگامہ تھا بادشاہ مجبور شاہزادے اور امراء مدہوش وعیاش۔ علماء سرکار کمپنی کے عہدوں پر ممتاز۔ محکمہ قضاء

ٹوٹا کسی نے احتجاج تک نہ کیا۔ علماء اور شیوخ طریقت اپنے اپنے کام میں مصروف۔ حضرت احمد اللہ شاہ نے اول مشائخ طریقت اور علماء کرام سے رجوع کیا۔ وقت کی نزاکت کا احساس دلایا مگر ان کے رونے دھونے کو کسی (28) نے نہ سنا صرف مفتی صدرالدین آزردہ (29) نے کچھ آمادگی ظاہر کی۔ بعد مشورہ تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے شاہ صاحب کو معہ ایک خط کے آگرہ روانہ کیا۔ حضرت شاہ صاحب وہ خط لیکر مفتی انعام اللہ خاں بہادر (30) وکیل سرکار کے پہنچے انہوں نے بڑی قدر و منزلت کی یہاں علماء و فضلاء کا اجتماع تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ شاہ صاحب کی بڑی عزت ہوئی محفل سماع اور وعظ کا دور شروع ہوا۔ اور شاہ صاحب کو یہاں اپنے خواب کی تعبیر نظر آنے لگی۔ بہت لوگ معتقد ہو گئے۔ یہاں تک کہ حکومت کو بھی فکر ہوئی مگر کچھ نہ کر سکی۔ مولانا فیض احمد بدایونی اور ڈاکٹر وزیر خاں نے حضرت شاہ صاحب سے رازدارانہ باتیں کیں۔ اور دونوں نے حضرت شاہ صاحب کو معاونت کا یقین دلایا۔

مفتی انتظام اللہ شہابی لکھتے ہیں۔

''ہر ایک نے شاہ صاحب کو آنکھوں پر جگہ دی۔ مولوی فیض احمد عثمانی بدایونی و ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی جیسے لوگ شاہ صاحب کے گرویدہ ہو گئے۔''

(ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء)

حکومت نے حضرت شاہ صاحب کے معتقدین اور علماء (عہدیداران صدر نظامت) پر ایک جھوٹا مقدمہ چلا کر ان علماء کو منتشر کرنا چاہا۔ اور اس بہانہ سے حضرت احمد اللہ شاہ کے کام میں رکاوٹ ڈالنا چاہی۔ مگر اس ولسن گردی (31) سے تمام ملزمین بے داغ چھوٹے۔ خدا کی قدرت سے اس زمانہ میں ہنومان گڈھی کا حادثہ فاجعہ پیش آیا۔ مہنتوں نے مسجد میں اذان بند کر دی۔ مسجد کے ایک حصہ کو نقصان پہنچایا۔ شاہ اودھ سے رجوع کیا گیا۔ مگر صدائے برنخاست جولائی 1855ء میں شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح نے مسلمانوں کی ایک جمعیت کے ہمراہ بیراگیوں سے مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔ اس خونیں حادثہ اور ہتک ناموس اسلام کے بعد مولوی امیر علی امیٹھوی نے علم جہاد بلند کیا مگر اودھ کی بے غیرت حکومت کو ہوش نہ آیا اور نوابی فوج اور گوروں کی پلٹن نے گھیر کر سب کو شہید کر دیا۔ مسلمانوں کی حکومت میں خالص اسلامی مسئلہ پر مسلمانوں کی اس بیدردی سے

خونریزی۔آسمان تھرا اٹھا زمین کو زلزلہ آیا۔(32)

حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب نے آگرہ میں یہ خبر سنی مولانا فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر خاں سے مشورہ ہوا اور ان کو بعض ہدایات دے کر معہ معتقدین کے شاہ صاحب کانپور پہنچے۔مولوی عظیم اللہ (33) سے گفتگو ہوئی۔پھر لکھنو و فیض آباد پہنچے۔شاہ صاحب نے تقاریر کے ذریعہ ایک آگ لگادی۔مریدین کا اجتماع ہونے لگا۔حکومت اودھ کو خطرہ پیدا ہوا۔حاکم فیض آباد نے فوجی قوت سے روکنا چاہا۔آخر مقابلہ ہوا اور شاہ صاحب قید ہو گئے۔

حضرت شاہ احمد اللہ شاہ صاحب کی اسیری کی خبر جب آگرہ پہنچی تو مریدین و معتقدین میں برہمی پھیلی۔مولوی فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر خاں خاص طور سے سخت پریشان ہوئے اور موقعہ کا انتظار ہونے لگا۔

انقلاب 1857ء

انگریزوں نے ملک میں یہ طوفان مچا رکھا تھا۔امراء پریشان، رعایا ناخوش اور ملک تباہ ہو رہا تھا۔راجے، نواب برباد، نظام تعلیم معطل و منصب قضاء معزول اور سب پر طرہ یہ ہوا کہ عیسائیت کی تبلیغ کی پوری پوری کوشش کی گئی۔حکومت اودھ ختم ہوئی۔راجے نواب بیدخل ہوئے۔برائے نام شاہ دہلی کے خطاب کی ضبطی کی نوبت بھی پہنچی۔غرضکہ یہ حالات تھے کہ چربی کے کارتوسوں کا فوج میں رواج ہوا۔جس نے بارود پر آگ کا کام کیا۔11- مئی 1857ء کو میرٹھ کی فوجوں نے بغاوت کی اور دہلی کی جانب بڑھیں۔شاہ دہلی نے خودمختیاری کا اعلان کیا۔فیض آباد میں مولوی احمد اللہ نے مجاہدین کی کمان سنبھالی اور حضرت محل کی معاونت کی۔روہیلکھنڈ میں نواب خان بہادر خان نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے سرداری و قیادت کے فرائض انجام دیئے۔ان خبروں کے پہنچنے پر آگرہ میں شروع میں کچھ حالت قابل اطمینان رہی، مگر جب میرٹھ اور دہلی کی فوجوں کی بغاوت اور مجاہدین کے معرکوں کی خبر آگرہ پہنچی۔کالون صاحب لیفٹیننٹ گورنر بہادر نے سب فوج ہندوستانی اور انگریزی کو جمع کر کے فہمائش کی اس کا اثر چند روز رہا۔آخر آگرہ کی سپاہ بھی باغی ہوگئی اور مجاہدین سے مل گئی اور آزادیٔ وطن میں کوشاں ہوئی، انگریزوں نے قلعہ کو جائے پناہ قرار دیا۔ماہ جون میں یہاں بھی واقعات شروع ہوئے۔جولائی میں تیزی آئی۔

مجاہدین فوج کی سرپرستی ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی نے کی مگر جب حالات کا گہرا جائزہ لیا اور دہلی سے پیام وسلام کے ذریعہ طلبی ہوئی تو کچھ مسلح سپاہ کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی دہلی روانہ ہو گئے۔

مفتی انتظام اللہ شہابی لکھتے ہیں۔

> ''ڈاکٹر وزیر خاں مردانہ وار میدان میں نکل آئے۔ آگرہ میں جو فوج فدائیوں کی آئی اس کی سرپرستی ڈاکٹر صاحب نے کی۔ انگریز قلعہ بند ہو گئے۔ یہ (ڈاکٹر وزیر خاں) مولوی فیض احمد بدایونی کو ساتھ لے کر دہلی پہنچے۔''

(غدر کے چند علماء)

واقعات دہلی

دہلی میں بہادر شاہ نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ مولانا فضل حق خیر آبادی(34) نیز دوسرے علماء دہلی پہنچ چکے تھے۔ جنرل نجف خاں معہ روہیلہ فوج کے بریلی سے دہلی پہنچ چکے تھے۔ دہلی میں ہنگامہ آرائی تھی۔ اہالیان شہر دو جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک بہادر شاہ کا طرفدار اور دوسرا حکومت کمپنی کا وفادار۔ فوج لالچ میں گھری تھی۔ ین کی جماعت میں روہیلوں ت حو جنرل بخت خاں کے زیر کمان تھی سب سے یادہ بہادر اور مجاہدانہ جذبہ سے سرشار تھی اور داد شجاعت دے رہی تھی۔ جنرل بخت خاں کے مشورے سے علامہ فضل حق خیر آبادی نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں جہاد کی اہمیت وضرورت پر تقریر کی اور جہاد کا استفتار مرتب کر کے پیش کیا۔ جہاد کے فتوی کی تیاری میں جنرل بخت خاں کی کوشش خاص تھی۔ مفتی صدر الدین صدر الصدور دہلی۔ مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی۔ مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی۔ سید مبارک شاہ رامپوری۔ محمد سعید خاں نے اپنے اپنے دستخط اور مواہیر سے فتوی کو مرتب ومزین کیا۔(35) اس فتوی کی نقول اکناف واطراف ملک میں دم کے دم میں شائع ہو گئیں۔ اور اس کی اشاعت سے ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔

دہلی میں جنرل بخت خاں کی فوج کی حالت سب سے اچھی تھی۔ بادشاہ کو جنرل بخت خاں

پر بڑا اعتماد تھا۔ جلوت وخلوت میں ہر وقت کی بادشاہ کی باریابی کی اجازت تھی۔ جنرل بخت خاں کو لارڈ گورنر بنایا گیا تھا۔ انہوں نے اپنی معاونت ومشورہ کے لئے ڈاکٹر وزیر خاں کو اپنے ساتھ رکھا۔ مولوی فیض احمد بدایونی مرزا مغل کے پیشکار مقرر ہوئے۔ جنرل بخت خاں کو ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی پر بڑا اعتماد تھا۔ چونکہ مرزا مغل کی حالت مشتبہ تھی اور وہ حضرت محل اور مرزا الٰہی بخش کی سازشوں کے شکار بنے لہٰذا ان کی حالت سے باخبر رہنے کی وجہ سے مولوی فیض احمد بدایونی کو ان کا پیشکار مقرر کیا گیا ہوگا۔ مفتی انتظام شہابی نے ''ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء'' میں لکھا ہے کہ مولوی فیض احمد بدایونی دہلی میں مجسٹریٹ بھی بنائے گئے۔ لیکن اس کی تصدیق کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوئی۔

ہنگامہ کارزار

دہلی میں جنرل بخت خاں نے بڑے معرکے سر کئے۔ انگریزی فوج نے ہر جگہ اس بہادرو جانباز جنرل سے شکست کھائی۔ دراصل جنرل بخت خاں کی فوج بہت باقاعدہ اور بہادر تھی۔ اس کی تصدیق بطور عینی شاہد کے مرزا ظہیر دہلوی کے روزنامچہ غدر سے ہوتی ہے ایک دوسری شہادت سنئے۔

> ''جنرل صاحب کی قیادت میں عوام نے سر دھڑ کی بازی لگا کر بے جگری سے اپنے خون کی ہولی کھیلی اور ان کو معلوم ہو گیا کہ مقابلہ کسی معمولی دشمن سے نہیں ہے۔ فوج باغی نے بڑی سختی اور مضبوطی سے فوج انگریزی پر حملہ جاری رکھا اور کوئی تدبیر و دقیقہ ان کے وہاں سے نکال دینے میں اور غارت کرنے میں باقی نہیں چھوڑا۔ دشمنوں نے اپنی مورچہ بندی ایک بہت اچھے موقعہ پر باغات اور مکانات کی آڑ میں کی تھی۔ توپیں بہت عقلمندی کے ساتھ سر کیں۔ اور اس سرعت سے آگ برسائی کہ ایک لمحہ کے لئے بھی توقف نہ تھا۔''

رسالہ تاریخ بغاوت ہند بحوالہ ''1857ء کے ہیرو'' از سیدہ انیس فاطمہ، بریلوی ولیم فورس لکھتا ہے۔

''محاصرہ کے زمانہ میں باغیوں نے متعدد حملہ کئے اور یہ باغیوں کی لیاقت کا اچھا ثبوت ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم کسی معمولی دشمن سے مقابلہ نہ کر رہے تھے۔ ان حملوں کی تعداد 36 تھی۔ ان میں سے ہر ایک نہایت ہی منظم اور با قاعدہ اقدام اور حملہ تھا۔ ان کے علاوہ بے شمار حملے دور افتادہ چوکیوں اور ہراول پر ہوئے۔ یہ ہمارے آدمیوں کے قریب بہت کم آتے تھے اور یہ بھی جب ان پر اچانک حملہ کر دیا جاتا تھا۔ مگر روزانہ جنگ آزما ہوتے تھے۔ ان کی مستقل جرأت و بہادری سے کوئی چیز بازی نہیں لے جاسکتی تھی۔''

غدر عظیم کا تذکرہ بحوالہ ''1857ء کے ہیرو'' از سیدہ انیس فاطمہ، بریلوی

مرزا مغل کا دل صاف نہ تھا۔ اور وہ دشمنوں اور غداروں کے کہنے سے جنرل بخت خاں سے بدظن ہو کر انگریزوں کی طرف جھکنے لگے۔ کشمیری گیٹ کا مورچہ مرزا مغل کے سپرد تھا۔ جس میں ایک حصہ فوج کی کمان ڈاکٹر وزیر خاں کے سپرد تھی، اور اسی حصہ فوج میں مولوی فیض احمد بدایونی بھی شریک معرکہ تھے۔

ڈاکٹر وزیر خاں کے زیر کمان سپاہیوں نے بڑی جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا مگر کشمیری گیٹ پر مرزا مغل نے شکست کھائی۔ جنرل بخت خاں کے کہنے پر ڈاکٹر وزیر خاں اپنی فوج کو لے کر علیحدہ ہو گئے ورنہ گرفتاری کا اندیشہ تھا۔ جنرل بخت خاں مقبرہ ہمایوں پہنچ کر بادشاہ سے ملے اور صورت حال سے مطلع کیا۔ مقبرہ سے نکلنے کو کہا، زینت محل نے باز رکھا۔ بادشاہ اگر اس وقت مقبرہ سے باہر نکل آتے تو صورت حال کی تبدیلی کی قوی اُمید تھی۔ کمپنی کی فوج نے 19- ستمبر 1857ء کو شہر دہلی پر ہڈسن کی کمان میں مکمل قبضہ کر لیا۔ جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی وغیرہ نے دہلی چھوڑ دی۔

مولوی عبدالشاہد خاں شروانی لکھتے ہیں۔

''بادشاہ جو اس درمیان میں قلعہ سے نکل کر مقبرہ ہمایوں میں پناہ گزیں ہو چکے تھے معہ متعلقین گرفتار کر کے قلعہ میں نظر بند کر دیئے گئے۔ تین شاہزادوں کو قلعہ میں داخل ہوتے ہی گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اور ان کے

سروں کو خوان پوش سے ڈھک کر خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے بطور تحفہ پیش کیا گیا۔ انہیں میں مرزا مغل بھی تھے۔ جنرل بخت خاں اپنی فوج اور توپ خانہ کو نکال لے گئے۔ بادشاہ سے کہا کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں مگر وہ زینت محل اور مرزا الٰہی بخش کے ہاتھ میں کھلونا بن چکے تھے۔ آمادہ نہ ہوئے۔ جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد وغیرہ سب لکھنو چلے گئے۔''

باغی ہندوستان ص 157 از مولوی عبدالشاہد خاں شروانی

ورود لکھنو

جب فیض آباد میں مولوی سکندر شاہ اور ان کی جماعت کو شکست ہوگئی تو مولوی سیّد احمد اللہ شاہ لکھنو روانہ ہوئے۔ اور مولوی احمد سبط مولوی غلام علی کی جماعت کو بڑی تقویت پہنچائی اور سب کو مجتمع کیا۔ جولائی 1857ء میں مرزا برجیس قدر کی تخت نشینی ہوئی۔ ممو خاں (ناصر الدولہ علی محمد خاں) تمام سیاہ وسپیدہ کا مالک ہوا۔ حضرت محل والیہ مقرر ہوئیں۔ رعایا مولوی امیر علی کے واقعہ ہنومان گڈھی سے بدظن تھی، اس پر ممو خاں کے ظلم مستزاد۔ مولوی احمد اللہ شاہ اہالیان اودھ کی امیدوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ حضرت محل نے بھی شاہ صاحب سے خصوصی تعلقات پیدا کئے آٹھ ماہ گزر گئے۔ دلی۔ آگرہ۔ کانپور میں انگریزوں نے قبضہ جما کر لکھنو کا رخ کیا۔ تمام سرداران جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد بدایونی، مولوی عظیم اللہ کانپوری، نواب تفضّل حسین فرخ آبادی (36)، نانا راؤ (37)، شہزادہ فیروز شاہ (38)، مولوی لیاقت علی الہ آبادی (39)۔ قاضی سرفراز علی شاہجہانپوری وغیرہ وغیرہ مختلف مقامات سے آ کر شاہ احمد اللہ صاحب سے آملے۔ پہلا معرکہ نواب گنج میں ہوا مجاہدین کامیاب ہوئے اور رصد خانے کی کوٹھی پر قبضہ کرلیا۔ مچھی بھون کو اڑا دیا۔ غرض لکھنو پر شاہ صاحب کا پورا پورا عمل ہوگیا، بیلی گارد پر بھی قبضہ ہو گیا تھا کہ ممو خاں کی مخالفت و نالائقی سے پسپا ہونا پڑا۔ آخری معرکہ عالم باغ میں ہوا۔ جنرل مارٹن نے مورچہ قائم کیا۔ جنرل بخت خاں مقابل ہوئے۔ ایک مورچہ پر یوسف خاں اور ممو خاں مقرر ہوئے چکرا ولی کوٹھی پر خود شاہ صاحب نے معہ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی نے

مورچہ سنبھالا۔ حضرت محل بھی موجود تھیں۔ انگریزی فوج سے ڈٹ کر مقابلہ ہوا۔ مجاہدین نے بڑی داد شجاعت دی جب شاہ صاحب نے اپنا مورچہ بگڑتا دیکھا تو مورچہ بدل دیا۔ اور آخری جنگ عیش باغ میں ہوئی۔ حضرت محل اور ممو خاں گھبرا گئے۔ اور حضرت محل 16- مارچ 1858ء کو مرزا برجیس قدر کو لے کر نکل کھڑی ہوئیں۔ جس سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ شاہ صاحب معہ اپنے رفقاء ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی میدان میں ڈٹے رہے اور بڑی بہادری سے لڑتے رہے۔ آخرش موقعہ کی نزاکت دیکھ کر شاہجہانپور چلے گئے چونکہ شاہ صاحب کے ہمراہ تحریک کے بڑے بڑے سردار موجود تھے۔ نواب خان بہادر خاں نے بریلی سے لکھا کہ پچاس ہزار روہیلہ متابعت کو تیار ہیں تشریف لائیے، شاہ صاحب نے شاہجہانپور چھوڑنا مناسب نہ سمجھا مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے ان سرداروں کو روہیلکھنڈ کے مختلف اطراف میں پھیلا کر مختلف مورچوں اور مقامات پر مجاہدین کی مدد اور قیادت کے لئے بھیج دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی گنگا کو عبور کر کے بدایوں پہنچے۔

معرکہ بدایوں (ککرالہ)

بدایوں میں نواب خان بہادر خاں کی طرف سے 17- جون 1857ء کو عبدالرحمٰن خاں ناظم اور نیاز محمد خاں (40) سپہ سالار فوج مقرر ہوئے اور سابق ملازمان کو ان کی جگہ برقرار رکھا گیا اور نئے تقررات بھی ہوئے اور ناظم نے بہت خوبی سے ضلع کا انتظام کیا۔ بلوائیوں کی سرکوبی کی اور مفسدین کو کیفر کردار کو پہنچایا۔ ہرملال سنگھ ساکن بکینہ دھپودھام (41) کا لقب اختیار کر کے راجپوتوں کی ایک جماعت لے کر شہر بدایوں پر چڑھ آیا۔ سرحد پر لڑائی ہوئی آخر شکست کھا کر بھاگ گیا۔ (42)

نومبر 1857ء تک تمام ضلع بدایوں پر نواب خان بہادر خاں کا قبضہ ہو گیا۔ نیاز محمد خاں نے فتح گڑھ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ 20- جنوری 1858ء میں ککرالہ (43) کے لوگوں کی مدد سے فرخ آباد میں داخل ہوا۔ بدایوں چھوڑے ایک ہفتہ ہوا تھا کہ مسٹر ہوگرانٹ نے چھاپہ مارا اور کامیاب ہوا۔ شروع اپریل 1858ء میں محسن علی خاں (44) جو کہ نواب فرخ آباد کا معاون خصوصی تھا شاہجہانپور سے ہوتا ہوا بدایوں آیا، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد بدایونی اور فیروز

شاہ شہزادہ بدایوں پہنچ چکے تھے۔ مجاہدین میں جوش وخروش پیدا کرنے کی غرض سے مولوی فیض احمد بدایونی نے فتویٰ جہاد کی نشر و اشاعت کی۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ تین سو تازہ دم سپاہی بریلی سے آ گئے۔ حکیم سعید اللہ (45) اور ان کے کچھ ساتھی آنولہ سے آ کر شریک ہوئے تھے۔ انگریزی فوج سے سخت مقابلہ ہوا۔ مجاہدین کے مورچہ ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد بدایونی اور فیروز شاہ شہزادہ سنبھالے ہوئے تھے۔ مولوی محمد سلیمان بدایونی اپنے گرانقدر مقالہ ''بدایوں کا جہاد حریت 1857ء'' میں معرکہ ککرالہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''انگریزی فوج نے آدھی رات کو ککرالہ کی طرف کوچ کیا۔ ان کے ساتھ موضع چاند برائی کا ایک ہندو جاسوس اور دوسرا موضع رٹھول کا ایشری پرشاد تھا نصف مسافت طے کر کے دم لیا تا کہ پیدل فوج بھی آ کر ان سے مل جائے۔ پیدل فوج آ گئی تو اس کو حکم دیا کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر چلے جلدی کی ضرورت نہیں اور اپنا کوچ توپ خانہ اور سواروں کے ساتھ جاری رکھے یہاں تک کہ ککرالہ ایک میل رہ گیا۔ یہ صبح صادق کا وقت تھا کہ مجاہدین کا ایک گروہ آتا نظر پڑا جنھوں نے چار توپیں گراپ کیس لیکن کوئی انگریز زخمی نہ ہوا۔ انگریزوں نے جوابی توپوں کے فیر کیے۔ مجاہدین نے موقعہ پا کر انگریزی فوج کو تلواروں پر رکھ لیا اور کلابہ کلا لڑنا شروع کیا۔ انگریزی فوج نے مجاہدین کی شمشیر زنی کی تاب نہ لا کر پسپائی شروع کر دی اور درختوں کی آڑ لے کر توپیں چلانے لگے اس سے مجاہدین کا اتلاف جان کافی ہوا۔ اس بے ترتیبی اور بدنظمی میں بہت دیر میں معلوم ہوا کہ جنرل پینی غائب ہے۔

مقامی روایت ثقہ حضرات کی یہ ہے کہ انگریزوں کی آمد پر گولہ انداز نے ایسا گولہ نشانہ پر مارا کہ جنرل پینی کا سر اُڑ گیا۔ بڑی تلاش سے اس کی نعش ملی۔ دیکھا بازو پر ایک زخم گولی کا تھا اور کسی مجاہد کی تلوار اس کا خون پی چکی تھی۔ توپوں کی آواز سن کر سورج نکلنے پر کرنل جونس معہ پیادہ فوج کے موقع پر آ گیا۔ مقامی روایت ہے کہ اس فوج کے آنے سے ککرالہ کے مجاہدین انگریز کی فوج کے بیچ میں پھنس گئے اور ایک ہزار مجاہدین شہید ہوئے۔ شہزادہ نے کچھ سامان اور آدمی لے کر ککرالہ سے پچھم اور موضع گھوائی سے پورب ایک جھاڑی دار ٹیلہ کی آڑ سے مورچہ لگایا پھر بھی ناکامی ہوئی۔ مجاہدین بدایوں کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ توپ خانہ نے دور تک ان کا تعاقب کیا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر بدایوں کا کہنا ہے کہ یہ امر تحقیق شدہ ہو گیا کہ یہ سرفروش جماعت ڈاکٹر وزیر خاں

اکبرآبادی اوران کے رفقاء (مولوی فیض احمد بدایونی اورشہزادہ فیروزشاہ) کی تھی۔''

نکرالہ کے معرکہ کے بعد شہزادہ فیروز شاہ، مولوی فیض احمد بدایونی اورڈاکٹر وزیرخاں وغیرہ بریلی پہنچے۔ فیروزشاہ شہزادہ نواب خان بہادر خاں کے پاس رہ گئے اور مولوی فیض احمد وڈاکٹر وزیر خان شاہ صاحب احمد اللہ کے پاس شاہجہانپور چلے گئے۔

شاہجہانپور

شاہجہانپور میں نواب خان بہادر خاں کی جانب سے نواب غلام قادر خان (46) ناظم مقرر ہوئے تھے ایک سال انتظام کیا۔ ملحقہ اضلاع ومرادآبادو بدایوں وغیرہ سے انگریز کامیاب ہوکر شاہجہانپور پہنچے۔ ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی، مولوی فیض احمد بدایونی، جنرل بخت خان نیز دوسرے سردار پھر شاہ صاحب کے پاس پہنچ چکے تھے۔ 28-اپریل 1858ء کونکچوریہ کے مقام پر انگریزوں سے مقابلہ ہوا۔ کمانڈر فوج نواب نظام علی خاں ساکن شہباز نگر (47) تھے نظام علی خان نے انگریزی فوج کے چھکے چھڑادیئے اور آخر میں جام شہادت نوش کیا۔ انگریز کامیاب ہوئے شہر کی حفاظتی فوج احمد اللہ شاہ کے سپرد تھی۔ جب انگریز شاہجہانپور کی طرف بڑھے تو شاہ صاحب نے شہر خالی کردیا۔ انگریز فوج پرانی جیل میں دس بندی کرکے مورچہ زن ہوگئی۔ شاہ صاحب نے تین روز کے بعد پلٹ کر حملہ کردیا اور یہ حملہ 3- مئی سے 9- مئی 1858ء تک جاری رہا۔ محصورین کی حالت نہایت نازک ہورہی تھی۔ جنرل جونس ایک فوج لیکر آموجود ہوا۔ انگریزی فوج شاہ صاحب کے مضبوط مورچہ پر حملہ نہ کرسکی اور بے ترتیب لڑائیاں ہوتی رہیں کہ اس عرصہ میں شاہ صاحب کی مدد کو فیروزشاہ اور حضرت محل کی فوجیں آگئیں۔ 15- مئی 1858ء کو شاہ صاحب نے دہس پر سخت حملہ کیا مگر جنرل جونس ثابت قدم رہا۔ 18- مئی 1858ء کو سر مکالن کمبل بریلی سے فوج لے کر پہنچ گیا۔ شاہ صاحب موقعہ کی نزاکت دیکھ کر مع ہمراہیوں کے قصبہ محمدی چلے گئے۔

قصبہ محمدی میں قیام حکومت

قصبہ محمدی پر شاہ احمد اللہ صاحب نے قبضہ کرلیا۔ چاروں طرف دہس بندی کی ان کی حکومت قائم ہوگئی کابینہ مرتب ہوئی۔ وزیر دفاع جنرل بخت خاں، قاضی سرفراز علی قاضی القضاۃ

اور نانا راؤ پیشوا دیوان مقرر ہوئے اور اراکین کونسل میں مولوی لیاقت علی الہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی تھے۔ فیروز شاہ نے پہلے اختلاف کیا پھر انہوں نے بھی شرکت کرلی۔ شاہ صاحب کا خطبہ وسکہ جاری ہوا۔(48)

سکہ

زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ

حامی دین محمد احمد اللہ بادشاہ

احکام شرع کا نفاذ ہوا مگر فلک کج رفتار کو یہ ادا کب پسند تھی ایک مہینہ بھی نہ گذرا کہ سر کالن کمبل نے قصبہ محمدی پر حملہ کر دیا۔ سخت مقابلہ ہوا۔ انگریزی فوج کی طاقت اور فیروز شاہ کے اختلاف سے شاہ صاحب کو ناکامی ہوئی۔ محمدی کو چھوڑنا پڑا۔ کچھ لوگ نیپال کی طرف نکل گئے۔ 5-جون 1858ء کو شاہ صاحب پھر نمودار ہوئے۔ بلدیو سنگھ راجہ پوایاں کے کہنے میں آ گئے اکیلے ہاتھی پر سوار تھے راجہ کی گڑھی پر پہنچے۔ راجہ نے پھاٹک بند کر لیا۔ ہاتھی نے دو تین ٹکر ماریں۔ راجہ کے ملازمین نے اوپر سے باڑھ ماری۔ ایک گولی شاہ صاحب کے لگی فوراً جاں بحق ہو گئے۔ سر کاٹ کر لاش پھونک دی گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔(49)

سر کشتہ بر نیزہ می زد نفس

کہ معراج مرداں ہمیں است بس

مولوی فیض احمد بدایونی کی روپوشی

احمد اللہ شاہ صاحب کی شہادت کے بعد سر گروہ مجاہدین منتشر ہو گئے۔ کانپور۔ فرخ آباد۔ مراد آباد۔ بدایوں۔ بریلی اور شاہجہانپور وغیرہ پر مکمل طور سے انگریز کا قبضہ ہو چکا تھا۔ مخبروں کی بن آئی تھی۔ جنرل بخت خاں شہزادہ فیروز شاہ، ڈاکٹر وزیر خاں نیز دوسرے سر برآوردہ حضرات نے راہ فرار اختیار کی۔ فیروز شاہ شہزادہ اور ڈاکٹر وزیر خاں مکہ معظمہ پہنچے۔ مولانا فیض احمد کے متعلق مشہور ہے کہ نیپال کی طرف چلے گئے اور یہ یقینی بات ہے کہ اگر مولوی فیض احمد معرکہ محمدی سے بچ گئے تو یقیناً ڈاکٹر وزیر خاں کے ساتھ رہے۔ ڈاکٹر وزیر خاں اور فیروز شاہ شہزادہ کی فراری کے متعلق قیصر التواریخ جلد دوم میں ہے کہ ”شہزادہ، شاہ احمد اللہ شاہ کی وفات کے بعد سندیلہ پہنچا۔ کئی جگہ مقابلہ ہوا

تالیف قصیدہ مدح یکے از حاکم دنیا (ملکہ وکٹوریہ) نمودہ بودند وشب مخملی بالطبع نشستہ چند اشعار متعلق مدح او تصنیف ہم فرمودند کہ ناگاہ بعنایت الٰہیہ وتوجہات حضور غوث رضی اللہ عنہ مولانا تحریر آں قصیدہ ناتمام را ترک نمودہ فوراً چاک ساختند ونیت کفارہ ہماں وقت وہموں جلسہ تحریر قصیدہ اولیں ہدیہ قادریہ کہ مشتمل بریکصد ویازدہ شعر باچناں صنائع لفظیہ ومعنویہ قلم برداشتہ پرداختند ومن بعد بعینہ قصائد ہدیہ قادریہ ہم در چند جلسہ تالیفِ نمودند وتصنیف فرمودند۔''

(تحفہ فیض، ص8)

اور ان قصائد عربیہ کی تعریف اعیان ومشاہیر بغداد نے کی اور آپ کی عربی نظم ونثر کو سراہا۔(57) غرض مولانا پچھلی صدی میں برصغیر میں عربی کے صاحب طرز شاعر گزرے ہیں۔(58) شعرا میں آپ کے مستفیض مولوی فضل الدین قیسؔ، مولوی غلام شاہد فداؔ، مولوی احمد حسین وحشتؔ، مولوی نیاز احمد نیازؔ اور مولوی اشرف علی نفیسؔ وغیرہ مشہور لوگ گذرے ہیں۔(59) جناب مولوی عبدالقدیر صاحب بدایونی فروری 1955ء میں کراچی تشریف لائے تھے تو موصوف نے مولانا فیض احمد بدایونی کا اردو، فارسی اور عربی کلام بطور نمونہ سنایا تھا۔قصیدہ قادریہ کے بھی بہت سے اشعار سنائے تھے مگر افسوس کہ اس دوران میں بوجہ مولوی صاحب کی مصروفیات کے ان نوادرات کی نقل کا موقعہ نہ ملا۔اور اب باوجود مسلسل خطوط بھیجنے کے بھی مولوی صاحب نے بدایوں سے کوئی جواب معلوم نہیں کیوں مرحمت نہ فرمایا۔ورنہ نمونہ کلام عربی بھی ہدیہ ناظرین کیا جاتا۔

تصنیفات

مولانا فیض احمد تصانیف کثیرہ کے مالک تھے،طبیعت میں استغناء بدرجہ کمال تھا،اکثر مسودات وتحریرات شاگرد لے گئے اور ان کی واپسی نہ ہوئی بعض مسودات غدر میں ضائع ہوگئے اس طرح اکثر تصانیف مشہور نہ ہوئیں۔(60) آپ کی تصانیف سے علم کلام میں رسالہ تعلیم الجاہل ہے جو شاہ محمد اسحٰق دہلوی کی کتاب تفہیم المسائل کے جواب میں لکھا گیا ہے۔حاشیہ شرح ہدایت الحکمۃ صدر الشیرازی نیز تعلیقات علیٰ فصوص الفارابی ہیں۔اس کے علاوہ مجموعہ نثر وقصائد عربیہ

موسومہ ہدیہ قادریہ ہے یہ بے مثل خزینہ وگنجینہ کمالات ہے۔اس میں ایک ہزار ایک سو گیارہ نثر کے فقرے ہیں اور اسی طرح ایک ہزار ایک سو گیارہ اشعار عربی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی منقبت میں ہیں ہدیہ قادریہ کو حضرت مولانا عبدالقادر بدایونیؒ نے طبع کرادیا تھا۔جس پر حاشیہ مولانا عبدالمقتدر صاحب بدایونیؒ نے لکھا ہے۔(61) اور ان قصائد کی طباعت کے بعد ہی بعض حضرات کے اصرار پر مولانا عبدالقادر بدایونیؒ نے مولانا فیض احمد بدایونی کے حالات میں تحفۂ فیض مرتب فرمایا جو کہ 1308ھ کے بعد فخر المطابع میرٹھ سے طبع ہوا ہے۔

اولاد

مولانا فیض احمد بدایونی کے ایک صاحبزادے مولانا حکیم سراج الحق تھے جو کہ 20- رمضان المبارک 1241ء کو پیدا ہوئے۔علوم عقلیہ ونقلیہ اپنے والد مولانا فیض احمد، مولانا نور احمد بدایونی سے حاصل کئے۔طب حضرت مولانا حکیم فضل رسول بدایونی سے پڑھی۔معقول، فلسفہ، ریاضی میں مہارت تامہ حاصل کی۔طب میں کمال خصوصی حاصل تھا۔بوارق محمدیہ مصنف حضرت مولانا فضل رسولؒ کے خاتمہ میں قاضی معین الدین کیفی میرٹھی لکھتے ہیں:

"تحصیل علوم عقلیہ ونقلیہ از والد ماجد خود فرمودہ اند امام عصر وعلامہ دہر ہستند در جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ ید طولیٰ دارند بالخصوص در فن طب اگر شیخ وقت گفتہ آید بجا است تالیفات جناب موصوف بسیار از انجملہ شرح رسائل معمیات بہاء الدین عاملی است حاشیہ معتقد المنتقد وسراج الحکمۃ در طبیعات ودیگر رسائل متعددہ در فن طب قصائد بلیغہ عربی وفارسی بسیار اند بسیار اند۔"

اکثر آپ رؤساء دانپور و دھرم پور کی مصاحبت و ملازمت میں رہے۔ 28- ذی قعدہ 1322ھ چھہتر برس کی عمر میں دانپور میں انتقال کیا۔صاحب تصنیف تھے شرح رسائل معمیات بہاؤالدین عاملی مطبوعہ ہے طبیعات میں شرح رسالہ مستقد المنتقد لکھی عربی نظم میں مثل اپنے والد کے مہارت کامل رکھتے تھے۔صاحب درس تھے۔آپ کے شاگردوں میں مطیع احمد نقوی بقائی بدایونی، مولانا عاشق حسین بدایونی، مولوی تفضّل حسین گڑھ مکٹیشری، مولوی محمد حسین سیوہاروی، حکیم محمد حسین سہسوانی، سید اولاد حسین، حکیم تصور علی صاحب اکبرآبادی، مولوی مقبول حسین مشہور

56- تحفہ فیض از مولانا عبدالقادر بدایونیؒ و اکمل التاریخ جلد دوم از مولوی یعقوب حسین ضیاء القادری۔

57- تحفہ فیض،ص3۔

58- العرب (عربی ماہنامہ کراچی) محرم وصفر 1374ھ۔

59- ان حضرات کے مختصر سے حالات اکمل التاریخ جلدوں اور تحفہ فیض وطوالع الانوار میں کم و بیش ایک ہی عبارت کے ساتھ درج ہیں۔

60- تحفہ فیض،ص8۔

61- تحفہ فیض،ص4۔

بہادر شاہ ظفر اور 1857ء کی جنگ آزادی

جبار علی رضوان انصاری

ہندوستان میں غالباً مغل دور کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی علامہ اقبالؔ کے ذہن میں یہ شعر آیا ہوگا:

آ، تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا تقریباً وہی حال ہو گیا تھا جیسا کہ دیماس تھینز (Demosthenese) نے چوتھی صدی قبل مسیح میں ایتھنس کی سلطنت کے زوال کے وقت کہا تھا کہ صرف دیوتا ہی ہماری سلطنت کو بچائے ہوئے ہیں ورنہ ہم تو اسے برباد کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی جو ہندوستان کو یورپ کی ایک ابھرتی ہوئی طاقت کا غلام بنانے کے باعث بنی۔ اس کو اپنی ابتدائی شکل میں سولہویں صدی کے آخری دن ملکہ الزبیتھ کی طرف سے مشرق میں تجارت کرنے کا فرمان ملا جس کے تحت ان تاجروں نے جاوا میں ایک تجارتی کمپنی قائم کر لی۔ یہ کمپنی ہندوستان میں بھی تجارتی سرگرمیاں جاری کرنا چاہتی تھی۔ 1613ء میں ان تاجروں نے اس کمپنی کو ایک Joint Stock Company کی شکل دے دی اور اسی صورت میں فیکٹری قائم کرنے کی اجازت شہنشاہِ ہندوستان سے بھی حاصل کر لی۔ کاش اس وقت شہنشاہ ہندوستان جہانگیر میں وہ دور بینی و بصیرت ہوتی کہ وہ دیکھ سکتا کہ یہی تاجروں کا گروہ آئندہ زمانے میں اس کے اخلاف کو نہ صرف اپنا پنشن خوار اور رعایا بنائے گا بلکہ ان کی آزادی اور حقوق ضبط کر کے ان پر

غداری کا مقدمہ بھی چلائے گا اور اس کے آخری وارث بہادر شاہ ظفر کے لئے اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جائیں گے۔

"This traitor rushed to cease the first possible opportunity of over-throwing and destroying the government of his benefactors".... "Such was the return made by the traitor for the millions of pounds sterling bestowed by the English on himself and his family".

کاش جہانگیر انہیں تجارتی مراعات دینے سے پہلے اپنے ایک مداح کے اس شعر کو اپنے ذہن میں رکھتا:

مخور غم گر زبالِ پشہ یی کمتر ہند خود را
کہ چون فال خرابیہا زند، پیلِ دمان بینی

بہادر شاہ ظفر (پیدائش 14-اکتوبر 1775ء۔ حکومت 1837ء تا 1857ء۔ وفات 1862ء) کو آخری مغل شہنشاہوں میں بحیثیت انسان کے سب سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ لال قلعہ سے گہرا تعلق رکھنے والے ظہیر دہلوی نے انہیں نیک اور پرہیز گار قرار دیا ہے۔ انگریزوں نے بھی انہیں سراہا ہے۔ چنانچہ Twilight of the Mughal کا مصنف اسپیرس (Spears) کا قول ہے کہ وہ آخری مغل شہنشاہوں میں سب سے بڑے ہی نہ تھے بلکہ سب سے اچھے بھی تھے۔ اسپیرس کے علاوہ لامس مٹکافنے کی بیٹی نے اپنی تصنیف The Golden Calm میں ان کے متعلق کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جیسا کہ احسن اللہ خاں نے اپنے بیان میں کہا ہے۔ وہ متعصب بھی نہ تھے اور عیسائیوں کے خلاف ان کے دل میں کوئی نفرت بھی نہ تھی۔ ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی بھی انہیں پسند کرتی تھی اور جب بھی ان کے حقوق ولی عہدی کو ان کے والد نے ختم کرنا چاہا آ گرے کا لیفٹیننٹ گورنر آڑے آیا لیکن حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے اس مرنجان ومرنج، نیک دل اور درویش صفت شخص کو بقول Spears ایک سازشی باغی بنا دیا (وہ سازشی تھے یا نہیں، یہ ایک الگ بحث ہے اور انگریزوں کا سب سے مضبوط گواہ احسن اللہ خاں تک اس سے منکر تھا) بغاوت میں حصہ لینے والے معزول حکمرانوں کے برعکس ماضیِ قریب میں

ان کا یا ان کے خاندان کا کوئی ذاتی نقصان نہیں ہوا تھا (اور مقدمے کے دوران انہیں اسی کے طعنے دیئے گئے کہ انہوں نے اپنے محسنوں کے خلاف سازش کی) لیکن ایک حساس دل رکھنے والا شاعر جس کے پیش نظر اپنے خاندان کی گزشتہ عظمت ہو اپنی بے بسی اور مجبوری کو سمجھتا تو تھا ہی۔ اسے اس کا بھی احساس تھا کہ لارڈ امین برا کے زمانہ تک عید، بقرعید، نوروز اور سالگرہ کے مواقع پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے اس کی شہنشاہی کے اعتراف کے طور پر جو نذر ملا کرتی تھی وہ بھی بند ہو چکی تھی۔ اس کو اس توہین کا بھی احساس تھا کہ باوجود تمام کوشش کے وہ جواں بخت کو ولی عہد نہ بنوا سکا اور مرزا فتح الملک نے انگریزوں سے جوڑ توڑ کر کے اس گری ہوئی شرط پر کہ بادشاہ ہو کر وہ لال قلعہ چھوڑ دیں گے اپنی ولی عہدی منظور کرا لی۔ ان حالات میں اگر وہ کمپنی سے متنفر تھا تو کیا غلط تھا۔ ان حالات میں انگریزوں کو تو اس کا شکر گزار ہونا چاہئے تھا کہ رانی جھانسی اور نانا صاحب پیشوا کی طرح اس نے ان کے خلاف خود تلوار نہ اٹھائی۔ باوجود ظاہری آسائشوں کے (جن کا دارومدار بھی بہت کچھ نذرانوں تک محدود رہ گیا تھا) اس کرب کو اس کا دل محسوس تو کرتا ہی تھا کہ وہ قفس میں اسیر ہے خواہ وہاں اسے کتنی ہی نعمتیں مل رہی ہوں۔ اس کے ثبوت میں دوسرے شواہد نہ سہی، خود اس کے اشعار تو پیش کئے ہی جا سکتے ہیں جن میں استعاراتی انداز اور کنایوں کی شکل میں ظفر نے اپنی دلی کیفیتوں کا اظہار کیا ہے اور جن میں سے چند پیش خدمت ہیں:

تسمہ تسمہ کر دیا بس کاٹ کر عاشق کی کھال
وہ فرنگی زادِ کلکتہ جو سیکھا ناپنا

(دیوان اول، صفحہ 39)

ہمیں بس بس نہ سمجھاؤ، اٹھو اے ناصحو جاؤ
پڑے ہیں ہم کسی ایسے کہ بس، اب کچھ نہیں چلتی

اے اسیر و اب نہ پر میں طاقتِ پرواز ہے
کیا کرو گے تم نکل کر دام سے بیٹھے رہو

ٹیڑھے جو ہو کے تم سے کہیں وہ اے ظفر
بولو نہ تم کہ ان کے ہیں یہ بانکپن کے دن

جب بادشاہ نے گواہ سے سوال کیا کہ کیا وہ جانتا ہے کہ قتل کا حکم خود اس نے (یعنی بادشاہ نے) دیا تھا یا بسنت علی خاں نے اپنی طرف سے ایسا اعلان کیا تو گواہ نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ایک دوسرے گواہ غلام عباس نے بھی بتایا کہ شام کو پانچ چھ بجے کچھ یوروپین پکڑے گئے لیکن بادشاہ نے ان کے قتل کی اجازت نہیں دی۔ تقریباً پندرہ دن کے بعد اسے معلوم ہوا کہ تقریباً پچاس یوروپین مارے گئے لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ احسن اللہ خاں سے اسے معلوم ہوا کہ بادشاہ نے قتل کرنے سے روکا تھا۔ احسن اللہ خاں کے بیان میں اگرچہ کہا گیا ہے کہ خود اس کے مشورے پر بادشاہ نے پہلے ایسا حکم جاری کرنے سے انکار کر دیا لیکن بعد کو سوار فوج کے سردار گلاب شاہ اور پیدل سکندر راور رجمنٹ کے افسروں کی خواہش کے مطابق خواجہ سرا سیدی ناصر خاں اور بسنت علی خاں بادشاہ پر چھا گئے اور بسنت اور سیدی ناصر نے قیدیوں کو گلاب شاہ کے حوالے کر دیا اور باغی سپاہیوں نے انہیں تلواروں سے قتل کر دیا۔ احسن اللہ خاں کے نزدیک اس قتل عام کے ذمہ دار سوار فوج کے رسالدار گلاب شاہ پیدل رجمنٹوں سکندر راور رجمنٹ کے افسر اور بادشاہ کے ملازموں میں سیدی ناصر خاں اور بسنت علی خاں اور شاہزادوں میں مرزا ابوبکر اور مرزا خیر سلطان (خضر سلطان) شامل تھے اور اس کے نزدیک بادشاہ فقط اس حد تک ذمہ دار تھے کہ انہوں نے ان قیدیوں کو شاہی حرم میں نہیں چھپایا۔ کیا انگریزوں کے سب سے بڑے معتمد جاٹ مل کے بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یوروپینوں کے قتل کے معاملے میں بادشاہ بے قصور تھا۔ وعدہ معاف گواہ احسن اللہ خاں کے بیان سے بھی زیادہ سے زیادہ اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ اس حد تک ذمہ دار تھے کہ انہوں نے قیدیوں کو اندر حرم میں نہیں رکھا اور اگر وہ انہیں وہاں رکھتے تو غالباً باغی حرم میں گھس کر انہیں نہ نکالتے۔ یہ صرف ایک مفروضہ ہے۔ بادشاہ کے خواجہ سرا سیدی ناصر اور بسنت علی خاں باغی سپاہ سے مل چکے تھے اور ان کے لئے حرم سے بھی قیدیوں کو نکال لانا دشوار نہ تھا۔ احسن اللہ خاں کے کردار کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جب ظہیر دہلوی نے ان کے سامنے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ قیدی قتل کر دیئے جائیں گے اور یہ کہ احسن اللہ کو انہیں بچانے کی کوشش کرنا چاہئے تو احسن اللہ ٹال گئے اور ظہیر کو دنیاداری کا یہ سبق پڑھایا کہ ایسے معاملے میں دخل اندازی موت کو دعوت دینا ہوتی ہے لیکن گواہی دیتے وقت وہ اپنی یہ بات بھول گئے۔ جو حالات احسن اللہ خاں کے سامنے تھے وہی بہادر شاہ کے بھی سامنے تھے۔

مقدمے میں بادشاہ پر چار الزامات لگائے گئے تھے: (1) برٹش گورنمنٹ کے پنشن یافتہ ہونے کے باوجود 10- مئی سے یکم اکتوبر تک محمد بخت صوبیدار اور دوسرے افسروں کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کی ترغیب دی۔ اس الزام کا بے بنیاد ہونا اسی بات سے ثابت ہے کہ محمد بخت خاں یکم جولائی کو دہلی پہنچے جب صحیح معنوں میں دہلی انگریزوں سے آزاد ہو چکا تھا۔ دہلی میں بغاوت کی ابتدا میرٹھ سے آنے والی فوجوں کے ساتھ 11- مئی 1857ء ہی کو ہو گئی تھی۔ (2) 10- مئی اور یکم اکتوبر کے دوران بادشاہ نے مرزا مغل کو جو برطانوی رعایا تھے اور دوسرے سپاہیوں اور لوگوں کو حکومت کے خلاف جنگ کے لئے آمادہ کیا۔ اس الزام میں پہلے الزام سے کچھ زیادہ فرق نہیں ہے صرف بخت خاں کی جگہ مرزا مغل کا نام رکھ دیا ہے۔ ان دونوں الزاموں کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ 11- مئی کے پہلے بادشاہ میں اور باغی فوج کے لیڈروں میں ساز باز تھی لیکن جیسا کہ خود انگریز جاسوسوں اور وعدہ معاف گواہ کے بیان سے ظاہر ہے، ایسی کوئی بات نہ تھی۔ احسن اللہ خاں نے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ انہوں نے کبھی نہیں سنا کہ بادشاہ دیسی فوج کے افسروں سے ساز باز کرتا تھا۔

(I never heard that the king carried on correspondence with the native troops but he used to make anxious enquiries about the native army whenever any war took place, and in as much as he was dissatified with the British Government, he took pleasure in hearing of their defeat or reverses)

مرزا مغل اور دوسرے شاہزادے باغی فوج کے دباؤ کے تحت کمانڈر انچیف اور دوسرے افسر بنائے گئے اور وہ بھی بغاوت کی ابتدا کے کئی روز کے بعد جب انگریزوں سے دہلی پوری طرح آزاد ہو چکا تھا اور فوجیوں کو قابو میں رکھنے کے لئے ذمہ دار لوگوں کی ضرورت تھی۔ (3) انگریز رعایا ہونے کے باوجود بحیثیت وفادار اپنے فرائض کو بھلا کر 11- مئی کو یا اس کے بعد ایک غدار کی حیثیت سے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور غدارانہ طور پر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اپنے بیٹے مرزا مغل، صوبیدار محمد بخت خاں اور دوسروں کی مدد سے ریاست میں بغاوت کی اور سرکار برطانیہ کو ختم کرنے کے لئے اپنے منصوبوں کے تحت دہلی میں فوج اکٹھا کی اور انہیں انگریزوں سے لڑنے کے لئے بھیجا۔ یہ الزام بھی

ہند کی طرف آ رہی تھیں تو راستے ہی میں انہیں جابجا پھانسی پر لٹکتے ہوئے لوگ نظر آئے۔ کیا ان سبھوں پر مقدمہ چلائے جانے کا آج تک کوئی ثبوت ملا۔ بہادر شاہ بیشک جنگ آزادی کے ایک سربراہ ہونے کی حیثیت سے محترم ہیں لیکن محبان وطن کی نظروں میں ان کا مرتبہ اور بلند ہو جاتا اگر وہ ہمت سے کام لے کر مقدمہ کو قبول نہ کرتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوتا کہ اپنے بیٹوں اور پوتوں کی طرح انہیں بھی قتل کر دیا جاتا۔ اس وقت زندگی سے بھرپور لطف اندوز ہونے کے بعد 82 سال کی عمر میں انہیں شہادت کی نعمت بھی میسر آ جاتی اور آج وہ ایک مظلوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک سرفروش مجاہد کے طور پر یاد کئے جاتے۔

❁❁❁❁❁

انقلاب 1857ء اور غالب کا ردعمل

(دستنبو کی روشنی میں)

ڈاکٹر ابوظہیر ربانی

غالبؔ نے نو آبادیاتی نظام کے اس دور میں آنکھیں کھولیں جس میں ہر اعتبار سے انتشار اور بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ یہی انتشار اور بدنظمی 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کا سبب بنی۔ اس جنگ میں ایک سلطنت کا خاتمہ ہی نہیں ہوا، ایک تہذیب کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ جس کی جیتی جاگتی علامت خود غالب تھے۔

یوں تو لال قلعہ میں مغل بادشاہ تخت نشیں تھے لیکن وہ انگریزوں کے پنشن خوار تھے۔ غالبؔ کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اب بچی کھچی مغل طاقت کا خاتمہ بہت قریب ہے۔ انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ انگریزوں نے مرزا فخرو کو اس شرط پر ولی عہد تسلیم کیا ہے کہ وہ بادشاہ ہونے پر قلعہ معلیٰ چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ غالب نے اپنے مستقبل کو قلعہ معلیٰ کے نئے حکمرانوں سے وابستہ کرنے کی کوشش تیز کر دی اور ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں ایک قصیدہ فارسی میں لکھ کر لارڈ ڈلن براؔ کے ذریعہ انگلینڈ روانہ کیا،(1) جس کے ساتھ ایک درخواست بھی منسلک تھی۔ اس خط میں ملکہ وکٹوریہ کی توجہ روم اور ایران کے بادشاہوں کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو اپنے شاعروں کو طرح طرح کے انعامات اور خطابات سے نوازتے تھے۔ چنانچہ غالب کی یہ خواہش تھی کہ ملکہ معظمہ کے ذریعہ انہیں بھی خطاب، خلعت اور پنشن سے نوازا جاتا تو بڑی مہربانی ہوتی۔(2)

چار ماہ بعد جنوری 1857ء میں غالب کو خط کے ذریعہ جواب موصول ہوا، لیکن اس سے غالب کو اپنے مقصد کی حصول یابی کی امید نظر نہیں آئی۔(3) اسی دوران 11- مئی 1857ء کو برطانوی اقتدار کے خلاف جنگ کا آغاز ہوگیا اور غالب کو ملنے والی پنشن بھی بند ہوگئی۔

حکومت کے ذریعہ پنشن پر پابندی کا واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ عام ہندوستانیوں کی طرح غالب کو بھی حریت پسندوں کی فتح کا یقین تھا۔ چنانچہ پنشن سے متعلق برطانیہ سے خط و کتابت کے ساتھ ساتھ قلعہ معلیٰ آنے جانے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ انگریزوں کے ایک جاسوس گوری شنکر نے حکومت کو یہ اطلاع دی کہ بہادر شاہ ظفر کے نام جو سکے جاری کئے گئے ان کی پشت پر کندہ کئے جانے والے سکے غالب نے کہے تھے۔(4) امن قائم ہونے کے بعد جب غالب نے پنشن اور دربار کی بحالی کی بات نکالی تو انہیں باغیوں کا دوست اور ہمنوا بتایا گیا اور ثبوت کے طور پر انہیں سکوں کو پیش کیا گیا:

بزر زد سکہء کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

غالب نے اسے غلط ٹھہرایا اور ذوقؔ کا کہا ہوا سکہ بتایا۔ لیکن انکار کی صورت میں کوئی ثبوت پیش کرنے سے عاجز رہے۔ غالبؔ نے اس واقعہ کو چودھری عبدالغفور سرور کے نام اپنے ایک خط میں یوں بیان کیا ہے:

> ''سکے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا کوئی گراب۔ کس سے کہوں؟ کس کو گواہ لاؤں؟ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوقؔ نے یہ دو سکے کہہ کر گزارے۔ بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر، جو ذوقؔ کے معتقدین میں تھے، انہوں نے 'دلّی اردو اخبار' میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس کے علاوہ اب تک وہ لوگ موجود ہیں کہ جنہوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکے سنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزارے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند قلمرو ہند میں ''دلّی اردو اخبار'' کا پرچہ ڈھونڈا، کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبّہ مجھ پر رہا۔

پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام ونشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ
ہوا، چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے اس کا گلہ کیا۔" (5)

غالب کے لئے پنشن کی ادائیگی اور انعام واکرام کا بند ہونا ایک سنگین مسئلہ تھا۔ چنانچہ جیسے ہی انگریزوں کی مخالفت میں قومی بغاوت کا آغاز ہوا، غالب نے انگریزوں کی مدح سرائی کو اپنا شعار بنالیا۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے بغاوت کی ابتدا سے ہی انگریزوں کو اپنا قانونی فرماں روا تسلیم کرلیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کی نظر میں بغاوت کرنے والے اور اس میں حصہ لینے والے نمک حرام اور بے ڈھنگے قسم کے لوگ تھے۔ غالب نے قومی بغاوت کے دوران مشہور زمانہ فارسی روزنامچہ لکھا جو دستنبو کے نام سے شائع ہوا۔

چودھری عبدالغفور سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"11- مئی 1857ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کردیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنی شروع کی۔ جو سنا گیا وہ بھی ضمیمۂ سرگزشت کرتا گیا۔ مگر بہ طریق لزوم مالایلزم اس کا التزام کیا ہے کہ بہ زبانِ فارسی قدیم جو دساتیر کی زبان ہے اس میں یہ نسخہ لکھا جائے اور سوائے اسما کے وہ نہیں بدلے جاتے کہ کوئی لغت عربی اس میں نہ آئے۔" (6)

نواب انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کے نام ایک خط میں رقم طراز ہیں:

"میں نے گیارہویں مئی 1857ء اکتیسویں جولائی 1857ء تک کی روداد نثر میں بہ عبارت فارسی ناآمیختہ بہ عربی لکھی ہے۔ 'دستنبو' اسی کا نام رکھا ہے اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور اپنے مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے۔" (7)

غالب کو دو طرح کی فکر لاحق تھی، ایک تو دربار سے وابستہ رہنے کی بنا پر انتقامی کارروائی کا خوف اور دوسرا پنشن نہ ملنے کی فکر، 'دستنبو' کی تصنیف کے پس منظر میں دو مقاصد کارفرما تھے۔

'دستنبو' کی اشاعت سے متعلق ہرگوپال تفتہ کے ذریعہ خدشات ظاہر کئے جانے پر غالب جواب میں لکھتے ہیں:

غلط ہے۔ باغی فوج تو کبھی خود انگریزوں کی فوج تھی۔ کسی بھی Document سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بادشاہ نے خود کوئی فوج جمع کی۔ بقول اسلم پرویز" کاش انہوں نے ایسا کیا ہوتا" اور اگر ایسا ہوتا تو حالات کچھ اور ہی ہوتے اور امریکہ کی جنگ آزادی کی طرح یہ ناکام بغاوت کامیاب انقلاب بن گئی ہوتی۔

بادشاہ اگر واقعی ابتدا سے بغاوت میں شامل ہوتا تو اس کے لئے کچھ انتظامات بھی کئے ہوتے۔ اس نے تو باغیوں کو اپنے سے دور رکھنے کے لئے یہاں تک کہا تھا کہ اس کے پاس انہیں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ جہاں تک بادشاہی کے اعلان کا تعلق ہے، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہ تو پہلے ہی سے بادشاہ تھے اور ان کی تاجپوشی کے اس اعلان اور تخت نشینی سے کئی روز پہلے ہی کمپنی کا اقتدار پورے طور پر ختم ہو گیا تھا اور مکمل anarchy کا عالم تھا۔ ان حالات میں نئی حکومت کا بننا ایک اصولی بات ہے۔ چنانچہ نئے سرے سے بادشاہت قائم کر کے بہادر شاہ کو اس کا سربراہ بنایا گیا۔ تیسرے یہ کہ کمپنی کسی بھی معاہدے کے تحت دہلی کی قانونی حکمراں نہ تھی اور اس کا دعویٰ غلط تھا کہ بہادر شاہ یا کوئی بھی دہلی والا کسی قانون کے تحت اس کی رعایا تھے جس سے وفاداری کی امید کی جاتی۔ جنگل کے قانون کے مطابق انہوں نے دہلی پر قبضہ کیا تھا اور ویسے ہی وہ وہاں سے نکال دیئے گئے تھے اور اہل دہلی نے ناجائز بادشاہ کی بادشاہت کی تصدیق کر دی تھی۔ تخت حکومت پر بیٹھنے کا بہادر شاہ کو ویسا ہی حق تھا جیسا ملکہ الزبتھ کو انگلینڈ کے تخت پر بیٹھنے کا۔ غداری انہوں نے نہیں کی بلکہ خود کمپنی نے کی تھی اور مسلسل کرتی رہی۔ (4) 11- مئی 1857ء یا اس کے بعد دہلی کے قلعہ کی حدود میں 49 یوروپیوں کے قتل میں وہ ملوث تھے اور 10- مئی تا یکم اکتوبر 1857ء انہوں نے باغی سپاہیوں کو یورپین افسروں کو ہلاک کرنے کی ترغیب دی اور باغیوں کو انعامات سے نوازا اور دوسرے دیسی حکمرانوں کو انگریزوں اور عیسائیوں کو قتل کرنے کے فرامین بھیجے۔ یوروپیوں کے قتل کے متعلق مفصل بحث کی جا چکی ہے۔ خود انگریزوں کے جاسوسوں اور دوسرے گواہوں کے بیانات شاہد ہیں کہ انہوں نے انہیں بچانے کی کوشش کی۔ دیسی حکمرانوں سے مدد طلب کرنے کی حقیقت احسن اللہ خاں کے بیان سے کھل جاتی ہے۔ "When the king expected aid from Persia, no effort was made to win over any native princes" ۔ کاش چند مہینے کی آزادی کے دوران وہ دیسی والیان ریاست میں آزادی

کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور ان سے مدد حاصل کرتے۔ جہاں تک یوروپین افسروں کو ہلاک کرنے کی ترغیب کا سوال ہے، دوسو دستاویزوں سے کہیں یہ ثابت نہیں ہے اور نہ ہندوستانی گواہوں کے بیان میں یہ کہا گیا ہے۔ اگر افسروں سے مراد فوجی افسر ہیں تو لڑائی میں کشت وخون کے علاوہ ہوتا ہی کیا ہے۔ باغیوں کو انعامات سے نوازنے کا الزام بھی غلط ہے۔ چندروز کی بغاوت کے بعد انگریزوں کا اقتدار ختم ہونے کے بعد آزاد حکومت بن گئی تھی۔ اس کے سربراہ کو اپنے فوجیوں کو سزا دینے اور نوازنے دونوں باتوں کا حق تھا۔

بہادر شاہ کا مقدمہ ایک رسمی کارروائی تھی جس کا مقصد انگریزوں کی ایمانداری اور انصاف پسندی کا پروپیگنڈہ کرنا تھا۔ فیصلے پہلے ہی ہو چکے تھے۔ پہلے یہ طے ہو چکا تھا کہ انہیں قتل نہیں کیا جائے گا لیکن ان کی کردارکشی تو ہونا ہی تھی تاکہ ان کے ہم وطنوں کے دلوں سے ان کا وقار ختم ہو جائے اور ان کے دل و دماغ سے، ان کے خاندان مغلیہ کا فرد ہونے کے رشتے سے، سلطنت کا جائز وارث ہونے کا خیال نکل جائے۔ یہ خیال عوام کے ذہنوں میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ خواہ وہ مرہٹے ہوں یا جاٹ یا روہیلے یا افغان کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ خود تخت شاہی پر بیٹھ جاتے۔ وہ اپنے کام شاہی خاندان کے ہی کسی فرد کو تخت پر بٹھا کر اور اسے اپنے قابو میں رکھ کر چلایا کرتے تھے۔ اسی اعتقاد اور تصور کو ختم کرنے کے لئے بہادر شاہ کو سزا دینا مقصد تھا۔ لیکن اس انصاف پسندی کا پول اس وقت کھل جاتا ہے جب شاہی خاندان کے تین افراد مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کو دہلی دروازے کے قریب لاکر ہڈسن نے گولی ماردی اور اس کے بعد شاہی خاندان کے فرد اور لال قلعہ کے مکین ہونے کے جرم میں دوسرے شاہزادوں کو محض شبہ کی بنیاد پر ہلاک کر دیا گیا۔ کیا انصاف کا تقاضا یہ نہ تھا کہ بہادر شاہ کی طرح ان سبھوں پر مقدمہ چلایا جاتا اور مجرم ثابت ہونے کے بعد ہی ان کو سزا دی جاتی۔ کیا ہڈسن کا قانون اپنے ہاتھ میں لینا جرم نہ تھا اور اگر تھا تو اسے سزا کیوں نہیں دی گئی۔ اس کا جرم بھی ویسا ہی تھا جیسا سوار فوج کے سردار گلاب شاہ اور دوسروں کا۔ ان شاہزادوں کے علاوہ سینکڑوں بے گناہوں کو دہلی کی سڑکوں پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ کیا ان پر مقدمے چلا کر یہ معلوم کیا گیا تھا کہ وہ واقعی مجرم تھے؟ بغیر مقدمے چلائے پھانسی دینے کا سلسلہ صرف دہلی، لکھنو، کانپور وغیرہ تک محدود نہ تھا۔ مسز ہنری ڈیو برلی نے اپنی کتاب (Suppression of Mutiny) میں لکھا ہے کہ دہلی کے سقوط کے بعد جب وہ بمبئی سے شمالی

''چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا ہے، وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے، تب جانو گے اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے کہ اس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعے ان کے جناب ملکہ معظّمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرز تحریر کیا ہوگی اور صاحبان مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہوگا۔''(8)

مندرجہ بالا عبارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ 'دستنبو' کی تصنیف بعض مصلحتوں کے پیش نظر کی تھی۔ یہ بڑا نازک دور تھا۔ پریس کی آزادی پر پابندی لگ چکی تھی اور باغیانہ مضامین لکھنے کے جرم میں مقدمے چلائے جا رہے تھے، لیکن اس بات پر تعجب نہ ہونا چاہئے کہ جابرانہ پریس ایکٹ کے باوجود 'دستنبو' کی اشاعت کی منظوری مل گئی۔ چونکہ یہ روزنامچہ مصلحتاً لکھا گیا تھا، اس لئے اس میں بعض اہم تاریخی حقائق کا ذکر تک نہیں پایا جاتا۔ اس کی زبان قدیم فارسی ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ اس سلسلے میں سید معین الرحمٰن نے بالکل درست لکھا ہے کہ:

''غالب کی چال یہ تھی کہ کتاب اپنے ناآشنا طرز تحریر کی وجہ سے ہندوستانیوں کے لئے سربستہ راز رہے تاکہ وہ ان میں ہدف ملامت بننے سے محفوظ رہیں۔''(9)

'دستنبو' کی ابتدائی عبارتوں میں غالب انگریزوں کی تعریف کس طرح کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

''ہندوستان والے منصب حاکموں (انگریزوں) کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر درندہ صفت انسانوں کے دام میں گرفتار ہو گئے...... سچ تو یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے علاوہ کسی دوسری حکومت میں انصاف کی امید رکھنا بالکل نادانی ہے۔''(10)

انگریزوں سے اپنے تعلقات ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کتاب کے پڑھنے والے یہ سمجھ لیں کہ میں نے جس کے قلم کی جنبش سے کاغذ پر (الفاظ کے) موتی بکھر جاتے ہیں، انگریزی حکومت کے نان

ونمک سے پرورش پائی ہے اور بچپن سے ان فاتحین عالم کے دستر خوان سے ریزہ چیں ہوں۔"(11)

غالب کی نظر میں 1857ء کی جنگ آزادی، ان کی مراعات کی حصول یابی میں رکاوٹ کا سبب بنی تھی۔ اس لئے انہوں نے بغاوت کو اچھے ناموں سے یاد نہیں کیا بلکہ اس کی مذمت کی۔ انہوں نے حریت پسندوں کو بلا تکلف ظالم، مفسد، نمک حرام، شہدے اور کمینے جیسے الفاظ سے خطاب کیا:

"میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر میں آئے۔ نہایت ظالم ومفسد، اور نمک حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے......"(12)

انگریزوں کے قتل پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"افسوس وہ پیکر علم وحکمت، انصاف سکھانے والے، خوش اخلاق و نیک نام حاکم! اور صد افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن خاتونیں جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن کچی چاندی کی طرح دمکتے تھے! حیف وہ بچے جنہوں نے ابھی دنیا کو (اچھی طرح) دیکھا بھی نہیں تھا، جن کے ہنس مکھ چہرے گلاب ولالہ کے پھولوں کو شرماتے تھے اور جن کی خوش رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بدنما معلوم ہوتی تھی۔ یہ سب ایک دم قتل وخون کے بھنور میں پھنس کر (بحر فنا میں) ڈوب گئے۔"(13)

آگے لکھتے ہیں:

"دل لوہے یا پتھر کا ٹکڑا نہیں ہے۔ کیسے نہ بھر آئے۔ آنکھیں رخنہء دیوار نہیں ہیں کہ آنسو نہ بہائیں۔ حکمرانوں کی موت کا غم منانا چاہئے اور ہندوستان کی ویرانی پر رونا چاہئے۔"(14)

یہ عبارت بھی ملاحظہ کریں:

"خبیث اور آوارہ لوگوں کا یہ گروہ شیر دل فاتحین سے الجھ پڑا۔ یہ لوگ

5- غالب کے خطوط، (جلد دوم) مرتبہ: خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی 1985ء، صفحہ 604

6- ایضاً (جلد دوم) صفحہ 584

7- ایضاً (جلد سوم) 1987ء، صفحہ 986

8- ایضاً (جلد اول) 1984ء، صفحہ 285-286

9- ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: غالب اور انقلاب 1957ء، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی 1988ء، صفحہ 17

10- غالب: دستنبو، صفحہ 17

11- ایضاً، صفحہ 19

12- ایضاً، صفحہ 21

13- ایضاً، صفحہ 22-23

14- ایضاً، صفحہ 25

15- ایضاً، صفحہ 37

16- غالب: کلیات نثر غالب، لکھنو 1871ء، صفحہ 407

17- الطاف حسین حالی: یادگارِ غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی 2005ء، صفحہ 68

18- غالب: دستنبو، صفحہ 85-87-88

19- ایضاً، صفحہ 50

20- ایضاً، صفحہ 72

21- ایضاً، صفحہ 73

22- ایضاً، صفحہ 57

23- شمیم طارق: غالب اور ہماری تحریک آزادی، صفحہ 111

24- غالب: دستنبو، صفحہ 65

25- غالب: دستنبو، صفحہ 41

26- ایضاً، صفحہ 83

27- ایضاً،صفحہ 54

28- ظہیر دہلوی: داستانِ غدر، مطبع کریمی، لاہور 1911ء، صفحہ 127

29- غالب: دستنبو، صفحہ 32

30- ایضاً، صفحہ 70-71

31- امتیاز علی عرشی: مکاتیب عرشی، (مقدمہ) رامپور، بارِ ششم، 1949ء، صفحہ 80

32- غالب کے خطوط، (جلد اول) صفحہ 267-268

❁❁❁❁❁

کانپور کی ایک مجاہدۂ آزادی رقاصہ: عزیزن

پی۔ پی۔ سریواستو آنند

لوگ چاہے کسی بڑی شخصیت کو فراموش کر دیں مگر تاریخ کے اوراق اسے اپنے دامن میں ہمیشہ پناہ دیتے رہتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی ایسے نام سامنے ضرور آ جاتے ہیں جنہیں اس حد تک نظر انداز کیا گیا کہ لوگ عام طور پر ان سے واقف نہیں رہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے اوراق میں اس قسم کا ایک نام کانپور (اتر پردیش) کی مجاہدۂ آزادی عزیزن کا ملتا ہے جو حسین و جمیل ہونے کے ساتھ اپنے وقت کی مقبول ترین رقاصہ تھی۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی یا قوم کی بے حسی کہ جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والی جری خواتین جھانسی کی رانی لکشمی بائی،، اودھ کی بیگم حضرت محل اور دہلی کی زینت محل کی طرح اس کے مجاہدانہ کارناموں سے خاص و عام واقف نہیں ہو سکے۔ اس مجاہدہ کی حب الوطنی، جذبہء ایثار اور جدوجہد آزادی کے کارناموں پر پردہ پڑا رہا۔ مادرِ وطن سے غلامی کا طوق اتار پھینکنے کا عزم رکھنے والوں کی صف میں وہ کس مقام پر تھیں اور انہوں نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے یہ منظرِ عام پر نہیں آ سکے۔

تحقیق سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ عزیزن کانپور (یو۔ پی) میں رقص کی محفلیں آراستہ کیا کرتی تھیں۔ وہ کانپور کے نزدیک قصبہ لور کی رہنے والی تھیں، جو اس وقت پیشواؤں کا مرکز تھا۔ کانپور میں بغاوت کے بعد کرنل ولیم نے عزیزن کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کانپور کے محلّہ لور کی محال میں رہتی تھیں اور ان پر سیٹھ کلومل کی خاص عنایت تھی۔

سچی دیش بھگت، جری اور انتہائی حوصلہ مند خاتون عزیزن کی زندگی میں جھانکنے پر پتہ چلتا ہے کہ ان کے سامنے مادرِ وطن ہندوستان کو برٹش سامراج سے آزاد کرانے کا نیک مقصد تھا، جسے

پورا کرنے کے لئے انہوں نے آخری سانس تک جدوجہد کی اور کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔

7- جون 1857ء کو کانپور کے پیشوا نانا صاحب نے ایک تاریخی اعلان جاری کیا کہ تمام ہندو اور مسلمان برٹش حکمرانوں کے مظالم کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں اور اپنی تحریک اس وقت تک جاری رکھیں جب تک ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل نہ ہو جائے۔ یہ تاریخی اعلان ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوا۔ رقاصہ عزیزن اس اعلان سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ عیش و آرام کی زندگی تج کر ایک سچی محبِّ وطن کی طرح آزادی کی جنگ میں کود پڑیں۔ جنگِ آزادی کے نقارے کی آواز سن کر وہ خود کو روک نہ سکیں اور اس عزمِ مصمم کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئیں کہ برٹش سامراج کو ملک کی پاک زمین سے نکالے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گی۔ اس نیک جذبے کو دل میں لئے عزیزن نانا صاحب کی فوج کے لئے عورتوں کو بھرتی کرنے کا اہم کام انجام دینے لگیں۔ انہوں نے پرکشش اور قیمتی لباس کی جگہ فوجی وردی پہن لی۔ زیورات کی جگہ اسلحہ اور ناز و انداز کی جگہ تلوار اٹھا لی۔ انہوں نے خواتین میں نہ صرف مجاہدانہ جذبہ پیدا کیا بلکہ انہیں گھڑسواری بھی سکھائی اور اسلحہ چلانے کی تربیت بھی دی۔ اس طرح عورتوں کو فوجی روپ میں ڈھالنے کا تمام تر سہرا بھی عزیزن کے ہی سر رہا۔ ان کی قیادت میں قائم خواتین کی بریگیڈ نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس بریگیڈ کا کام خاص طور پر زخمی فوجیوں کو فوری طبّی امداد فراہم کرنا تھا۔ ان کے لئے کپڑے، اشیائے خوردنی اور گولا بارود مہیا کرانے جیسا مشکل کام بھی اسی بریگیڈ نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ اس بریگیڈ کا ایک انتہائی اہم کام یہ بھی تھا کہ جنگ کی تمام تر معلومات ان مجاہدین تک پہنچائیں جو روپوش ہو گئے تھے مگر جنگِ آزادی میں سرگرمِ عمل تھے۔

عزیزن جون 1857ء کی جھلسا دینے وا[illegible] دھوپ اور تپتی ہوئی دوپہر میں انگریزوں کی پروا کئے بغیر محبِّ وطن فوجیوں کے لئے گھر گھر جا کر پھل، دودھ، میوے، گھی اور مٹھائیاں وغیرہ اکٹھا کیا کرتی تھیں اور پھر جان پر کھیل کر ان تک پہنچاتی تھیں۔ عزیزن کی قائم کردہ یہ بریگیڈ آزادی کی جنگ میں حصہ لینے کے لئے ذہن سازی کا کام بھی کرتی تھی۔ جو نوجوان اور بزرگ برٹش سامراج کے خوف سے تحریکِ آزادی میں حصہ لینے سے کتراتے تھے انہیں ایک خاص پیغام کے ساتھ ''چوڑیاں'' بھیجی جاتی تھیں۔۔۔ بزدل نوجوانوں اور منہ چھپا کر گھر میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر اس حربے کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ان کے دلوں میں ایک ایسا جوش و ولولہ پیدا ہوا کہ وہ بھی ہر قسم کی قربانی

دینے کا عزم دل میں لئے گھروں سے نکل پڑے اور نانا صاحب کی فوج میں بھرتی ہونے لگے۔

عزیزن کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ ننگی تلوار ہاتھ میں لئے گھوڑے پر سوار ہو کر جب لور کی سڑکوں پر نکلتی تھیں تو قصبہ کی فضا ''عزیزن کی جے'' کے نعروں سے گونجنے لگتی تھی۔ عزیزن نہ صرف نانا صاحب کے فوجی دستے سے اپنا رابطہ برابر قائم رکھتی تھیں بلکہ انہیں ہر قسم کی مدد پہنچانے کے لئے بھی بے تاب رہتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ صرف نانا صاحب ہی نہیں ان کے معتمد خاص بھی عزیزن پر بے انتہا اعتماد رکھتے تھے اور ان کے جذبہء حب الوطنی، ایثار اور قربانی کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اس عہد کے ایک نامور قلم کار نے لکھا ہے کہ ''عزیزن آزادیء وطن کے جذبے سے اس قدر سرشار تھیں کہ ہر وقت فوجی وردی پہنے رہتی تھیں۔ اپنے فوجی ساتھیوں سے بربار رابطہ قائم رکھتی تھیں۔ ان کے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا۔۔۔ ملک کی آزادی۔۔۔ مادرِ وطن کا برٹش سامراج کے مظالم سے چھٹکارا۔''

1857ء میں آزادی کی پہلی جنگ ناکام ہوئی تو برطانوی حکمرانوں پر بدلہ لینے کا جنون سوار ہوا۔ دوسرے مجاہدین کے ساتھ عزیزن کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور انہیں جنرل ہیولاک کے سامنے پیش کیا گیا۔ جنرل ہیولاک عزیزن کے حسن و جمال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اتنی حسین، اتنی خوبصورت اور اتنی نازک عورت فوجی وردی پہن کر جنگی سازوسامان اور اسلحوں کا استعمال بھی کر سکتی ہے۔ جنرل ہیولاک عزیزن کی خوبصورتی سے اس قدر متاثر ہوا کہ خود اس نے عزیزن کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر وہ اپنا جرم قبول کر لے اور زندگی کی بھیک مانگ لے، تو ان کی رہائی ممکن ہو سکتی ہے، مگر مجاہدۂ آزادی عزیزن نے حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا اور انہوں نے انتہائی بے رخی کے ساتھ جنرل ہیولاک کی تجویز ٹھکرا دی۔

ہیولاک کی تجویز پر عزیزن کا چہرہ غصہ سے تمتما گیا۔ آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں چھوٹنے لگیں، پھول کی پنکھڑیوں جیسے نازک ہونٹ کانپنے لگے۔ انہوں نے انتہائی حوصلے اور استقلال سے کہا ''ہم رحم کی بھیک مانگنے پر موت کو فوقیت دینا بہتر سمجھتے ہیں۔''

جنرل ہیولاک چوں کہ عزیزن کے حسن میں کھویا ہوا تھا اس لئے وہ عزیزن کے اس جملہ پر زیادہ برہم نہیں ہوا۔ اس نے غصے پر قابو پاتے ہوئے پیار بھرے انداز میں کہا ''آخر تم کیا چاہتی ہو؟''

''برٹش سامراج کا خاتمہ اور آزاد ہندوستان'' مجاہدۂ آزادی عزیزن نے فخر سے سر بلند کرتے ہوئے جواب دیا تو جنرل ہیولاک آگ بگولہ ہوگیا۔۔۔''اسے گولیوں سے اڑادو'' وہ چیخ پڑا۔

خوبصورت، نازک، حسین مگر بے انتہا جری، محب وطن، دلیر مجاہدہ کے چہرے پر اس حکم سے ایک شکن بھی نہیں ابھری۔ اس کے سینے پر پہلی گولی لگتے ہی اس کی زبان پر نعرہ گونج اٹھا۔۔۔''نانا صاحب زندہ باد'' اور پھر ایک کے بعد ایک گولیوں کی بوچھار نے عظیم مجاہدہ عزیزن کے پھول جیسے جسم کو چھلنی کر دیا، مگر اس کے ہونٹ آخری سانسوں تک یہی کہتے رہے ''نانا صاحب زندہ باد۔''

اس دیارِ فانی سے کوچ کرنے کے بعد عزیزن کے چہرے پر ایک خاص مسکراہٹ تھی۔ ایسی مسکراہٹ جو جنرل ہیولاک کے دل کے لئے نشتر کا کام کر رہی تھی۔ وہ گھبراہٹ میں اٹھ کر چلا گیا۔ جیسے عزیزن چیخ چیخ کر کہہ رہی ہو۔۔۔''اے برطانوی سامراجیو! تم ہمیں زیادہ دنوں تک غلام نہیں رکھ سکو گے۔ بہت جلد یہ زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔''

حقیقت یہ ہے کہ عزیزن اور ان جیسے ہزاروں مجاہدین، آزادی کی جنگ میں شہید ہو کر امر ہو چکے ہیں۔ انہیں چاہے وقتی طور پر فراموش کر دیا جائے مگر تاریخ کے اوراق جب بھی پلٹے جائیں گے ان کی قربانیوں، ایثار اور جذبہء حب الوطنی کا اعتراف کرنا ہی ہوگا۔

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں دلّی کا کردار

پروفیسر ظفر احمد نظامی

ہندوستان کی تحریک آزادی کو عالمی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے کا شرف حاصل ہے۔ دراصل مغل شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر کے عہد حکومت میں 1600ء میں برطانیہ کی ملکہ ایلزبتھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک چارٹر کے ذریعہ ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت کرنے کی اجازت دی تھی۔ اس کے نتیجے میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1608ء میں ہندوستان پہنچ کر اس کے ساتھ تجارتی روابط قائم کرتے کرتے اپنی چالاکی سے یہاں کے مقامی حکمرانوں کے معاملات میں دخل اندازی بھی شروع کر دی اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہ ملک کے بیشتر علاقوں پر قابض ہو گئی۔ (1)

اگرچہ انگریزوں کی استحصال پسند پالیسی کے خلاف مشرقی ہندوستان میں سراج الدولہ اور جنوبی ہند میں اپنے والد حیدر علی کی وفات کے بعد ٹیپو سلطان نے صف آرا ہو کر ان سے نبرد آزمائی کی لیکن ناکام ہو کر جام شہادت پی لیا۔ تاہم مختلف علاقوں میں انگریزوں کے خلاف احتجاجی اقدامات جاری رہے لیکن وہ بھی ناکام رہے۔ انگریزوں کے خلاف ہندوستان کے مختلف طبقوں میں بے چینی بڑھتی گئی جن میں ہندوستانی فوج کے جوان بھی پیش پیش تھے۔ ان کے اور انگریز فوجی جوانوں اور افسروں کے درمیان انگریز صاحبانِ اقتدار نے ہر معاملہ میں تفریق و امتیاز برت کر ان کی بے چینی میں اور اضافہ کر دیا۔

اسی طرح انگریزوں نے ہندوستانیوں کی رسوم اور رواجوں میں مداخلت کی، ان کی معاشی مشکلات میں اضافہ کیا، نسلی امتیاز کو فروغ دیا۔ مقامی حکمرانوں کے درمیان رقابتوں کو بھڑکانے

میں مدد کی، ایک حکمراں کے خلاف دوسرے حکمراں کا ساتھ دیا اور پھر دونوں حکمرانوں کو اقتدار سے محروم کر کے ان کی عملداریوں پر خود قابض ہو گئے۔ انہوں نے Doctrine of Lapse کے تحت حکمرانوں کا استحصال کیا اور ان کے علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر کے ہر ممکن کوشش کی کہ ہندوستانی طرز زندگی اور نظام تعلیم تبدیل ہو جائے۔ ان تمام پالیسیوں سے مقامی لوگوں میں بے اطمینانی کا دور دورہ ہو گیا۔ ایسے حالات میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ طور سے انگریزوں کے خلاف اقدام کرنے کے لئے وقت کا انتظار کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس سلسلے میں بہت سی افواہیں گشت کرنے لگیں جن میں ایک افواہ یہ بھی تھی کہ پرشیا سے ہندوستان پر حملہ ہونے والا ہے جو انگریزوں کو ملک سے باہر دھکیل دے گا۔ دلّی میں کئی اشتہار چسپاں کئے گئے جن میں مسلمانوں سے پرشین فوج کی مدد کرنے کی اپیل کی گئی تھی تاکہ سرزمین ہند انگریزوں کی تحویل سے نکل آئے اور مغلوں کی حکمرانی دوبارہ قائم ہو جائے۔(2) بہت سی پیش گوئیاں کی گئیں جن میں کہا گیا کہ پلاسی کی جنگ کے بعد ایک صدی کے اندر ہندوستان سے انگریزوں کی عملداری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی طرح کئی فتوے صادر کئے گئے جو انگریزوں کی مخالفت میں تھے۔ غرضیکہ ان تمام افواہوں اور حقائق نے انگریزی حکومت اور اس کی افواج میں خاصی دہشت پھیلا دی۔(3)

آخر ہندوستانیوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میرٹھ کی چھاؤنی میں 10- مئی 1857ء کو بغاوت کی چنگاری سلگ اٹھی جب تیئسویں ویں رجمنٹ کے فوجیوں نے اپنے کمانڈر کی حکم عدولی کرتے ہوئے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے صاف انکار کر دیا جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ گائے اور سور کی چربی سے بنائے گئے تھے اور جنہیں کھولنے کے لئے دانتوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان نوجوانوں نے اپنے فوجی بھائیوں کے بجائے ان انگریز افسروں کو اپنی بندوقوں کا نشانہ بنا دیا جنھوں نے ہندوستانی جوانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دیا تھا۔ بعدازاں ان جوانوں نے قید خانے سے اپنے ہندوستانی جوانوں کو رہا کرایا اور ''چلو دلّی'' اور ''بہادر شاہ کی جے'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے دلّی کی سمت چل پڑے۔ دلّی کو صدیوں سے ہندوستان کا دارالسلطنت ہونے کا شرف حاصل تھا۔ یہیں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر تاریخی لال قلعہ میں مقیم تھے۔ باغیوں کو یقین کامل تھا کہ وہ شاہی خاندان کا اعتماد حاصل کرنے اور اسے اپنے ساتھ بغاوت میں شامل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔(4)

اس عدالت کی دو خصوصیات بہت نمایاں تھیں۔ پہلی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی ہیئت جمہوری تھی جسے ہر سطح پر عوامی تعاون حاصل تھا اور دوسری یہ کہ اس میں ہندوستان کے دونوں فرقوں نے اپنا اپنا حصہ ادا کیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جولائی 1857ء کے اختتام پر بخت خاں کو فوجی سپہ سالار کی حیثیت سے اپنا منصب چھوڑنا پڑا اور اقتدارِ اعلیٰ اس انتظامی عدالت کو منتقل کر دیا گیا۔ تاہم بریلی بریگیڈ بخت خاں ہی کی کمان میں رہا۔(17)

انگریزی خیمہ کے حالات بھی کچھ بہتر نہیں تھے۔ یہ افواہ مسلسل گشت کر رہی تھی کہ انگریزی فوج میں مستقل تخفیف ہو رہی تھی۔ جنرل برنارڈ میں اس کا اعتماد بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی خرابی صحت کے سبب 5- جولائی کو اس کے اختیارات جنرل ریڈ کو منتقل کر دیئے گئے۔ تاہم جنرل ریڈ کے سبکدوش ہو جانے کے سبب آرک ڈیل ولسن نے کمان سنبھال لی۔ جنرل ولسن نے سر جان لارنس کو اپنے خط میں لکھا کہ ''دلّی پر ہمارے حملہ کی ہر کوشش ہماری بدنظمی اور شکست کی شکل میں منتج ہو گی۔ باغی ہمارے فوجی ٹھکانوں پر بیس مرتبہ حملے کر چکے ہیں اور آج وہ اپنا اکیسواں حملہ کر رہے ہیں۔ ان حملوں میں ہم نے اپنے بہت سے لوگ گنوا دیئے ہیں۔''(18)

اس صورت حال کے پیش نظر نکلسن کو ایڈوجنٹ جنرل بنا کر اور اسے بریگیڈیئر جنرل کا منصب دے کر ڈھائی ہزار جوانوں کی فوج اور چھ توپوں کے ساتھ دلّی کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ 2- اگست کو نکلسن کی افواج اور باغی فوجیوں کا مقابلہ دلّی سے 16 میل کے فاصلہ پر نجف گڑھ میں ہوا جہاں باغیوں کو دلّی کی طرف فرار ہونا پڑا۔ انگریزوں کو مزید کمک پہنچی تو انہوں نے فیصلہ کن حملے کے لئے تیاریاں شروع کر دیں اور لاہوری اور کابلی دروازوں کی طرف سے اچانک حملہ سے بچنے کے لئے خندقیں کھودنی شروع کر دیں لیکن باغی فوج ان کی راہ میں مزاحم ہوئی جس کے سبب محض تین توپ خانے کھودنے کے لئے انہیں چار راتیں صرف کرنی پڑیں۔(19)

11- ستمبر کو انگریزی فوجوں نے فیصلہ کن حملہ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں توپوں نے دو جگہوں پر فصیل میں شگاف کر دیئے۔ حملہ آوروں نے فوج کو چار ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے حملے کئے تھے، جن کی کمان نکلسن، بریگیڈیئر جونسن، کرنل کیمپ بیل اور میجر ریڈ کے ذمے تھی۔ ریڈ کی ٹکڑی کو باغیوں کی طرف سے زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور اسے سبزی منڈی کی طرف دھکیل دیا گیا۔ تاہم نکلسن کی ٹکڑی آگے بڑھتی گئی اور اس نے کابلی گیٹ اور موری گیٹ کی فصیل پر قبضہ

کرلیا۔لیکن اس کے آگے ان کی ایک نہ چلی کیونکہ باغی فوج کے سپاہیوں نے زمین کے ایک ایک انچ کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی۔انہوں نے میجر جیکب کو بری طرح زخمی کر دیا اور نکلسن کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جونسن کی کمان میں دوسری ٹکڑی آگے بڑھنے سے معذور رہی تاہم انگریزی فوج کی تیسری ٹکڑی کشمیری گیٹ تک پہنچ گئی اور اس نے اسے توپ سے اڑا دیا اور وہ جامع مسجد تک جا پہنچی لیکن مسجد کے اندر سے برستے ہوئے آگ کے گولوں نے انہیں پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔(20)

اگر چہ 14- ستمبر کی شام تک شہر کا ایک بڑا حصہ انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا تھا لیکن زبردست نقصان کے بعد۔اس معرکہ میں 1104 فوجی مارے گئے اور 66 افسر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔16- ستمبر کو انگریزوں نے اسلحہ جات کا ذخیرہ اپنے بس میں کرلیا اور باغیوں کو کشن گنج خالی کرنا پڑا۔17- ستمبر کو عام لوگوں نے سڑکوں پر آ کر جنگ کی جہاں انہوں نے اپنی دلیری کے جوہر دکھائے۔ ہر سڑک اور گلی میدان کارزار بن گئی جہاں بندوقیں شعلے اگلتی رہیں اور پتھروں کی بارش ہوتی رہی۔ باغیوں نے ہر انچ زمین کے لئے معرکہ آرائی کی جس کے نتیجہ میں سینکڑوں جانوں کا اتلاف ہوا۔شام تک انگریزی فوجیں کشمیری گیٹ سے اردو بازار تک کے علاقہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ایسی صورت میں باغیوں نے بہادر شاہ سے درخواست کی کہ وہ اپنی قیادت میں اس حملہ کا جواب دیں وہ اس کے لئے تیار بھی ہو گئے لیکن ان کے وزیر حکیم احسن اللہ نے بادشاہ کو ایسا کرنے سے باز رکھتے ہوئے کہا کہ وہ انگریزی فوج کے ذریعہ مار دیئے جائیں گے۔18 اور 19 ستمبر کو جامع مسجد کے قرب و جوار میں جھڑپیں ہوتی رہیں اور اسی رات شہر پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔20- ستمبر کو انگریزی فوجیں بغیر کسی مزاحمت کے لال قلعہ میں داخل ہوگئیں جہاں دلّی گزیٹیر کے الفاظ میں ''ہر گیٹ پر ایک ایک سنتری اپنے کاندھے پر اپنی بندوق رکھے پایا گیا جو غمزدہ اور غیر متحرک تھا اور جو اپنے انجام کی تیاری کر رہا تھا۔''(21)

دلّی کی جنگ میں انگریزوں نے 3837 فوجیوں اور افسروں کو گنوایا جب کہ مادر وطن کے لئے جام شہادت نوش کرنے والے ہندوستانی فوجیوں کی تعداد تقریباً 40000 رہی۔(22)

17- ستمبر کو علی الصبح بہادر شاہ اپنی چہیتی بیگم زینت محل یا اپنے وزیر حکیم احسن اللہ کو اطلاع دیئے بغیر ایک کشتی کے ذریعہ جمنا کے راستے سے حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر پہنچ گئے

آخرکار بہادر شاہ کو خاندان کے 15 افراد کے ساتھ رنگون بھیج دیا گیا جہاں انہیں خوراک کے لئے 11 روپے یومیہ ملتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر اتوار کو ایک روپیہ اور ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو دو روپے مزید دیئے جاتے تھے۔ تاہم انہیں کاغذ، قلم اور سیاہی استعمال کرنے کی قطعی اجازت نہیں تھی نہ ہی وہ لوگوں سے ملاقات کر سکتے تھے۔ اس کسمپرسی کے عالم میں بہادر شاہ دیواروں پر کوئلے سے اپنے اشعار لکھا کرتے تھے۔ اور آخر 7- نومبر 1862ء کو صبح پانچ بجے 87 سال کی عمر میں انہوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ (38) ایام اسیری ہی میں انہوں نے یہ شعر موزوں کیا تھا:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

دلّی میں ان کی وفات کی خبر پندرہ روز بعد 20- نومبر 1862ء کو پہنچی جسے سن کر غالب نے لکھا کہ

> "7- نومبر بروز جمعہ مطابق 14 جمادی الاول ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید حیات و قید فرنگ سے آزاد ہو گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔" (39)

حواشی

1- Kay & Mallesan, History of the Indian Mutiny 1857-1858 (Longman, 1897)26-7

2- ایضاً، صفحہ 27

3- The History of Indian Revolt (London, 1859) P 426

4- Ashok Mehta, 1857 The Great Rebellion (Bombay, 1946) P-25

5- ایضاً

6- فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش، جلد اول (لکھنو 1957ء) صفحہ 456

7- C.T.Metcalf, Two Native Narratives of the Mutiny in Delhi (London, 1898)

8- ایضاً

9- جسٹس میک آرتھی، بحوالہ اشوک مہتہ، صفحہ 34

10- دلّی گزیٹیر، (دلّی، 1976ء) صفحہ 83

11- ایضاً، صفحہ 84

12- Edward Vibart, The Sepoy Mutiny As Seen by a Subaltern (London, 1858)

13- Richard Barter, The Seige of Delhi (London, 1984)

14- سی ٹی مٹکاف، بحوالہ سابق، صفحہ 167-134

15- ایضاً

16- رئیس احمد جعفری، بہادر شاہ اور ان کا عہد، صفحہ 88-87

17- S.N.Sen, Eighteen Fifty Seven (New Delhi, 1957) P-72

18- دلّی گزیٹیر، بحوالہ سابق صفحہ 89-87

19- ایضاً

20- Major W.S.R. Hodson, Twelve Years of a Soldier's Life in India (London, 1859)

21- دلّی گزیٹیر، بحوالہ سابق، صفحہ 89-88

22- Charless John Griffith, The Siege of Delhi (London, 1910) P-173

23- ظہیر الدین دہلوی، داستان غدر، صفحہ 118-117

24- Hakim Ahsanullah Khan, Memoirs (Lahore, 1958) 32-3

25- ایضاً

-26 ایضاً

-27 ہڈسن، بحوالہ سابق، صفحہ 300

-28 William Ireland, A History of the Siege of Delhi (Edinburgh, 1861) P-274

-29 ہڈسن، بحوالہ سابق، صفحہ 312

-30 Lord Fred Roberts, Forty One Years in India (London, 1897) 258-9

-31 William Dalrymple, The Last Mughal (New Delhi, 2006) P-386

-32 Mrs. R.M.Coopland, A Lady's Escape From Gwalior in 1857 (London, 1859) 278-9

-33 منقول شمیم طارق "غالب اور ہماری تحریک آزادی" (بمبئی 2002ء) 156-157

-34 منقول Cited in "The Sack of Delhi as Witnessed by Ghalib"

-35 Bengal Past and Present No. 12 January December 1955, P-110

-36 اسداللہ خاں غالب 'دستنبو' (دہلی 2000ء) صفحہ 53

-37 ڈال رمپل، بحوالہ سابق

-38 ایضاً

-39 شمیم طارق بحوالہ سابق، صفحہ 184

❁❁❁❁❁

1857ء کی جنگ آزادی اور لکھنو

ارون کمار تری پاٹھی/تلخیص وترجمہ: محمد عمر رضا

1857ء کی پہلی جنگ آزادی میں لکھنو کا انتہائی بلند مقام ہے۔ بیگم حضرت محل کی قیادت میں خواتین افواج نے یونیورسٹی روڈ چوراہے پر انگریزی افواج کو شکست دی، بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کا سر قلم کر کے خون پینے والے ہڈسن کو اسی جنگ میں ہلاک کیا گیا تھا۔ یہیں پر مولوی احمد اللہ شاہ نے اپنی جنگی مہارت کا مظاہرہ کیا جس کے باعث دہلی کی شاہی حکومت کے خاتمے کے چھ مہینے بعد بھی لکھنو میں آزادی کا پرچم لہراتا رہا۔ مولوی احمد اللہ شاہ سر عام شاہی حکومت کے خلاف تقریریں کرتے رہے اور انہوں نے فرنگیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا تھا۔ انگریز پولیس نے طاقت کا استعمال کرتے ہوئے ان کے معتقدین کو غیر مسلح کر دیا اور مولوی کو ایک فوجی قید خانے میں قید کر دیا۔ ظہیر حسین جعفری کے مطابق ان کی پیدائش انیسویں صدی کے دوسرے دہے میں چن پٹن (مدراس) کے نواب محمد علی خان کے گھر ہوئی تھی۔ نوجوانی میں ہی نظام حیدرآباد کے مہمان بنے۔ دشمنوں کو فریب دے کر جنگ جیتنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ ان کی اس اہلیت سے بادشاہ فوراً متاثر ہو جاتے تھے۔ حیدرآباد کے بعد انہیں لندن جانے کا موقع ملا۔ وہاں جا کر انہوں نے شہنشاہ سے بھی ملاقات کی۔ واپسی میں انہوں نے مکۃ المکرّمہ اور مدینۃ المنورہ کی زیارت کی اور عراق و ایران کا سفر بھی کیا۔

انگریزوں سے لوہا لینے والے مولوی احمد اللہ شاہ کے یہ نعرے بہت مشہور تھے۔

راہِ عام پر
وطن کے نام پر

چلے چلو............

ہر قوم شان ہند

کوئی بڑی نہ چھوٹی

ہندو کے گھر کنول

اور مسلم کے گھر روٹی

چن ہٹ کے قریب اودھ کی پہلی جنگ میں آزادی کے متوالوں نے نہ صرف انگریزوں کو شکست دی بلکہ انہیں یہاں سے نکال کر باہر کر دیا اور ان کا گولہ بارود بھی ضبط کرلیا۔ ''فریڈم اسٹرگل ان یو پی، جلد:2'' میں کرنل نیل کے پیغام کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ''انگریزوں نے یہاں اپنی شکست کو قبول کیا اور 10 جولائی 1857ء کو دو پہر ایک بج کر پچاس منٹ پر پیغام نشر کیا گیا کہ لکھنو کے کمشنر ہنری لارنس کی اطلاع کے مطابق چن ہٹ میں ہماری زبردست شکست ہوئی ہے اور ہم وہاں سے بھاگ گئے ہیں۔'' اتر پردیش صوبائی آرکائیوز میں موجود گزیٹیر آف اودھ کے مطابق 30 مئی کی رات نو بجے 84 ویں نیٹو پیدل فوج کے نصف سپاہی، 71 ویں نیٹو پیدل فوج کے نصف سپاہی اور 13 ویں نیٹو پیدل فوج کے کچھ جوانوں نے ساتویں لائٹ گھوڑسوار فوج کی دو ٹکڑیوں کے ساتھ انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی شروع کی۔ چیف کمشنر ہنری لارنس نے اسے فرو کرانے کے لئے اپنی پوری طاقت جھونک دی۔ انگریزوں کو خبر ملی کہ 8 جون کی رات کو فیض آباد سے فوجی ٹکڑیاں لے کر مولوی احمد اللہ شاہ لکھنو کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں اور 30 جون کو ہنری لارنس نے اودھ کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے ککریل نالے کے قریب اودھ کی فوج کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کرلیا۔ مورخ سرنام سنگھ سوریہ ونشی کے مطابق منگل کے دن صبح چار بجے انگریزی فوجیں چن ہٹ کے لئے روانہ ہوئیں۔ لوہے کے پل (موجودہ ڈالی گنج پل) سے گزرتے ہوئے انگریزوں نے کسانوں اور سبزی فروشوں سے ملکی افواج کے متعلق معلومات حاصل کرنی چاہی، لیکن کسانوں اور سبزی فروشوں نے انہیں غلط اطلاعات فراہم کیں کہ لکھنو اور چن ہٹ کے درمیان فوج تو کیا کوئی آدمی بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس اودھ کی افواج چن ہٹ سے مغرب کی جانب خیمہ زن تھی۔'' قریب کے ایک گاؤں اسلام پور سے داہنے ہاتھ پر ایک راستہ تھا اور اسی راستے سے انگریز آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں

(اودھ) آزادی کے متوالوں نے مٹی کی دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے برطانوی فوج پر حملہ کر دیا۔اس حملے سے انگریز گھبرا گئے۔ یہاں انہیں ہندوستانی افواج کے مد مقابل ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔شدید گرمی اور ہندوستانی فوج کے جوش و ولولے کے سامنے انگریز پست ہو گئے اور وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ان کی چار توپیں اور بڑی تعداد میں گولہ بارود بھی وہیں چھوٹ گیا جسے ہندوستانی فوج نے اپنے قبضے میں کرلیا۔

16 نومبر 1857ء کوسکندر باغ کی لڑائی میں ایک نامعلوم خاتون نے درخت پر چڑھ کر سینکڑوں فائر کیے۔ان کے ہاتھوں کئی انگریز ہلاک ہوئے۔اس نامعلوم خاتون کے متعلق انگریز مصنفین نے بھی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔کرسٹوفر ہبرٹ کی کتاب ''دی گریٹ میوٹنی'' میں ایک نامعلوم خاتون کا ذکر ملتا ہے۔ جنگ کے دوران جب سکندر باغ میں کیپٹن ولیس پیپل کے درخت کے قریب پہنچے تو وہاں انگریزوں کی لاشیں دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے۔انہوں نے لاشوں کا معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ سبھی کے کندھے یا سر پر ہی گولی لگی تھی۔یعنی گولیاں بلندی سے چلائی گئی تھیں۔ جب انہوں نے پیپل کے گھنے درخت پر گولی چلائی تو اوپر سے تڑپتی ہوئی ایک انسانی شکل نیچے آ گری۔اس کے سبھی کارتوس ختم ہو چکے تھے۔ نیچے گرنے کی وجہ سے اس کی سرخ جیکٹ کا بالائی حصہ کھل گیا تو معلوم ہوا کہ وہ خاتون ہے۔کیپٹن ولیس کی آنکھیں بھر آئیں اورانہوں نے کہا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ خاتون ہے تو میں کبھی گولی نہیں چلاتا۔ پاسی سماج کی کتاب ''جدوجہد آزادی میں پاسی سماج کا حصہ'' میں مصنف نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ جاں باز خاتون اودا دیوی تھیں۔ وہ پاسی سماج کے عزت دار خاندان چودھری رائے صاحب کی بیٹی تھیں۔ جو ہیویٹ روڈ پر رہتے تھےان کی شادی اجریا گاؤں کے مکا پاسی کے ساتھ ہوئی تھی، سسرال میں وہ جگ رانی کے نام سے مشہور تھیں۔ ہنری لارنس کی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مکا پاسی بھی شہید ہو گئے تھے۔ 20 جولائی 1857ء کو ریزیڈنسی پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ ریزیڈنسی کی باہری سرنگوں میں ڈائنامائٹ بھر کراڑادیا گیااور جملہ اطراف سے دشمنوں پرحملہ کیا گیا۔اس حصار بندی کے دوران چیف کمشنر لارنس اور میجر بیکس کو ہلاک کر دیا گیا۔ 21 اگست کو ہیولاک، جنرل نیل اور آؤٹرم کے ساتھ ایک بڑی فوج لے کر لکھنو میں پھنسے انگریزوں کی مدد کے لئے کانپور سے چل پڑا۔محض 48 میل کا فاصلہ طے کرنے میں انگریزوں کو 33 دن لگ گئے۔ جگہ جگہ اودھ کے عوام سے

انگریزوں کی مقابلہ آرائی ہوئی۔ ہیولاک نے قصبات اور دیہات میں آگ لگادی جس سے کافی تعداد میں عام شہری ہلاک ہوئے۔ مورّخ مجِل کے مطابق۔۔۔ ''اودھ کی آزادی سے محبت کرنے والے عوام پر ظلم ڈھائے گئے اور انہیں قتل کیا گیا۔'' 23 ستمبر کو ہیولاک کی فوج عالم باغ پہنچ گئی، جہاں قلعے میں ہندوستانی فوج سے محاذ آرائی ہوئی۔ 25 ستمبر تک ہیولاک ہندوستانی فوج سے مقابلہ کرتا ہوا چار باغ تک پہنچ گیا۔ آج اسی جگہ پر ریلوے اسٹیشن قائم ہے۔ جنگ میں 700 لوگ ہلاک ہوئے۔ ہیولاک کو بھی وہیں قید کر دیا گیا۔ اس طرح لکھنو شہر کے ساتھ اودھ کا صوبہ بھی آزاد بنا رہا۔ مورخ انِش کے مطابق۔۔۔ ''بہادر انقلابیوں کی حیرت انگیز شجاعت اور بہادری کو دیکھ کر اودھ کے باشندوں کی جنگ کو جنگ آزادی ضرور ماننا ہوگا۔ 9 نومبر کو کیمپبیل بھی لکھنو پہنچ گیا۔ منصوبہ بنایا گیا کہ 14 نومبر کو ادھر سے کیمپبیل اور ادھر سے ہیولاک اور آؤٹرم ریزیڈنسی سے نکل کر لکھنو پر حملہ کریں گے۔ اس وقت عالم باغ میں باہر سے مزید انگریزی فوج آگئی جس میں ہیولاک، آوٹرم، لیوگارڈ، وال پول، ہڈسن، ہوپ گرانٹ وغیرہ مشہور فوجی کمانڈر کیمپبیل کے ساتھ تھے۔ 14 نومبر کو کیمپبیل کی فوج ہندوستانی افواج کا مقابلہ کرتی ہوئی بڑی مشکل سے دلکشا باغ پہنچ سکی اور وہیں رات گزارنے کے بعد 15 نومبر کو سکندر باغ پر حملہ کر دیا۔ آٹھ دن تک زبردست جنگ ہوئی جس میں دو ہزار سے زائد ہندوستانی سپاہی شہید ہوئے۔ مولیسن کے لفظوں میں۔۔۔ ''سندر باغ پر قبضہ بڑا ہی خوں ریز تھا۔ انقلابیوں نے بڑی مستعدی اور جواں مردی سے مقابلہ کیا۔ ایک ایک انچ زمین کے لئے زبردست جنگ ہوئی۔ چاروں طرف بکھری لاشوں سے پتہ چلتا تھا کہ کوئی بھی فرار نہیں ہوا، سبھی آزادی کے لئے شہید ہو گئے۔'' اگر چہ لکھنو شہر آزادی کے دیوانوں کے خون سے سرخ ہو گیا تھا لیکن آزادی کے متوالوں کے حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ زبردست مقابلے کے بعد موتی محل انگریزی فوج کے قبضے میں آسکا۔'' 23 نومبر کو کیمپبیل کی فوج ریذیڈنسی تک پہنچ گئی اور جملہ قیدیوں کو آزاد کرانے کے بعد دلکشا کو اپنا قلعہ بنایا۔

نواب واجد علی شاہ کی ڈائری کے مطابق بیگم حضرت محل کی پیدائش فیض آباد کے ایک غریب خاندان میں ہوئی تھی۔ غیر معمولی خوبصورتی کی ملکہ اس دوشیزہ کو ''خواصین'' کی صورت میں نواب کے ''حرم'' میں بیگموں کی خدمات کے لئے رکھا گیا۔ لیکن بہت جلد انہوں نے اپنی ذہانت، خوبصورتی اور دیگر کاموں میں اپنی مہارت کے باعث نواب کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی

اور وہ حرم میں شامل کر لی گئیں۔نواب نے انہیں ''مہک پری'' کا خطاب دیا۔ بعدازاں جب انہوں نے بیٹے کو جنم دیا تو نواب نے انہیں ''محل'' کا درجہ اور ''افتخار النساء'' کے خطاب سے نوازا۔ اس طرح ایک باندی سے انہوں نے بادشاہ کے حرم میں اعلیٰ مقام حاصل کیا اور بیگم حضرت محل کے نام سے مشہور ہوئیں۔ تاج پوشی کے بعد بیگم حضرت محل نے برجیس قدر کے نام ایک اعلان نامہ جاری کیا کہ ''جہاں کہیں فرنگی ملیں، انہیں موت کے گھاٹ اتار دو۔'' اس وقت بیگم کی عمر محض 26 سے 27 سال کی تھی۔ پھر بھی انہوں نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے ایسی فوج کھڑی کر دی تھی کہ ان کی قیادت میں فوج اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ملک کو آزاد کرانے کے لئے بے قرار ہو اٹھی۔ عالم باغ میں 22 دسمبر 1857ء کو ان کی فوج نے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ مگر سب تدبیریں الٹی رہیں۔ بالآخر مجبوراً وہ لکھنو چھوڑ کر شاہ جہاں پور چلی گئیں۔ بعد میں بیگم حضرت محل اپنے حامیوں کے ساتھ گھاگھرا ندی کو پار کر کے بہرائچ ضلع کے بوندی قلعے میں چلی گئیں۔ یہاں انہوں نے اس قلعے کو مضبوط کرایا اور جنگ جاری رکھی۔ لیکن قسمت نے ساتھ نہیں دیا اور وہ بوندی قلعے کو بچانے میں ناکام رہیں۔ دسمبر 1858ء میں بیگم حضرت محل کو مجبوراً اس قلعے کو بھی چھوڑنا پڑا اور بیگم حضرت محل دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے نیپال کی جانب چلی گئیں۔ نیپال میں قیام کے دوران بھی انہوں نے جدوجہد آزادی کے سپاہیوں سے مستقل رابطہ قائم رکھا۔ نیپال میں اپنے لائق اعتماد ساتھی رانا بینی مادھو سنگھ، مفتاح الدولہ اور اپنے بیٹے برجیس قدر کے ساتھ اپنی بقیہ زندگی گزارتے ہوئے اپریل 1879ء میں وہ موت کی آغوش میں چلی گئیں۔ آخر میں بیگم حضرت محل کی نظم ملاحظہ کریں:

ساتھ دنیا نے دیا اور نہ
مقدر نے دیا
رہنے جنگل نے کب دیا جو
شہر نے نہ دیا
اک تمنا تھی کہ آزاد
وطن ہو جائے
جس نے جینے نہ دیا چین سے

مرنے نہ دیا
زمیں کی آگ بجھانے سے گھٹا
امڑی تھی
ہاں، مگرالٹی ہواؤں نے
ٹھہرنے نہ دیا
بکھر چلا وہ قافلہ
مقام بوڑی سے
چال دشمن کی کچھ ایسی،
ابھرنے نہ دیا
ظلم کی آندھیاں بڑھتی رہیں
لمحہ لمحہ
پھر بھی پرچم کو آسماں سے
اترنے نہ دیا۔

(بشکریہ ''ہندوستان'' مورخہ 18 ستمبر 2006ء)

❁❁❁❁❁

پنجاب اور 1857ء

سریندر ناتھ سین

پنجاب کو مشکلات کا صوبہ کہا جاتا تھا۔ 1849ء میں برٹش حکومت نے اس پر قبضہ کیا تھا اور یہ جنگجوؤں کا مسکن تھا۔ لیکن یہاں کے لوگ بہت زیادہ آپس میں بٹے ہوئے تھے۔ اور ان کی 'حسد بھری رقابت' کی وجہ سے ہی نئے حکمراں اپنے کو محفوظ سمجھتے۔ برٹش حکومت لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف اس طرح برسرپیکار رکھنا چاہتی تھی کہ وہ روک بھی بن سکیں اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے اور ہر ذات دوسری ذات لئے رکاوٹ بن سکے۔ انتظامیہ کا کام بہت باصلاحیت لوگوں کے سپرد تھا اور زیادہ تر انتظامیہ کے لوگ مشرق کے پرانے صوبوں سے تعینات کئے گئے تھے۔ پنجاب میں پوربیہ فوجوں کی اکثریت نہیں تھی۔ انبالہ سے لے کر مردان تک مختلف چھاؤنیوں میں تقریباً ساٹھ ہزار فوجی تعینات تھے، جن میں سے ہندوستانیوں کی تعداد 36 ہزار اور تقریباً 34 ہزار یورپین اور پنجابی تھے۔ سکھوں اور پوربیوں میں آپس میں کوئی محبت نہیں تھی اور کیو براؤن کا کہنا ہے کہ لفظ پوربیہ خاص طور پر استعمال کیا جانے لگا، تاکہ وہ نفرت اور حقارت دوبارہ زندہ کی جا سکے، جس سے پنجابیوں اور ہندوستان کے درمیان تفریق کی خلیج اور بڑھ جائے، اور آپسی تعاون مشکل ہو جائے۔ پنجاب میں تعینات پوربیہ فوجی سوائے سرحدی ضلعوں گڑگاؤں، حصار اور ریواڑی کے باقی پورے صوبے کو دشمن اور اپنے کو اجنبی سمجھتے۔ گرو کے ماننے والوں کی جو روایت رہی ہے کہ وہ دلّی کو ہمیشہ لوٹیں، وہ پھر سے تازہ کی گئی اور سکھوں کو یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ اس سلسلہ میں گرو کی پیشین گوئی کہ 'دلی میں خالصہ راج ہوگا' برٹش حکومت کے تحت پوری ہو جائے گی۔

میرٹھ اور دلّی کی خبریں 12- مئی کو لاہور پہنچیں۔ وہاں کے چیف کمشنر سر جان لارنس اس وقت مری کے راستے میں راولپنڈی میں موجود تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں جوڈیشل کمشنر رابرٹ منٹگمری پر ذمہ داری آ گئی۔ اس نے فوراً ہی وہاں کے سبھی خاص سول اور ملٹری افسران کو اپنے اعتماد میں لے کر یہ فیصلہ کیا کہ بریگیڈیئر کاربٹ کی رضامندی سے میاں میر میں موجود سبھی مقامی فوجیوں کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ منصوبہ یہ تھا کہ ان سے تمام گولی بارود اور ان کی کیپس لے لی جائیں۔ لیکن پولیس کا ایک نان کمشنڈ سکھ افسران ساری سازشوں کی رپورٹ لے آیا۔ اب اس رپورٹ کے ذرائع کا پتہ لگانے کا موقع نہیں تھا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر طرح کے جوکھم سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سبھی ہندوستانی رجمنٹ کو ایک ساتھ غیر مسلح کر دیا جائے۔ منٹگمری اور اس کے دوستوں نے اس فیصلے کو بالکل خفیہ رکھا۔ میاں میر میں 12 کی شب میں رکھا گیا رقص کا پروگرام ملتوی نہیں کیا گیا۔ لیکن صبح ہی صبح پریڈ کرائی گئی، جس میں عام حکم نامہ پڑھ کر سنایا گیا اور کہا گیا تھا کہ بیرک پور کی 34 ویں این آئی کو بند کیا جا رہا ہے۔ پریڈ کے آخر میں 16 ویں اور 49 ویں این آئی اور آٹھویں مقامی کیویلری نے اپنے کو چاروں طرف سے بندوقوں سے گھرا ہوا پایا۔ انہیں بتایا گیا کہ انہیں صرف اس لئے غیر مسلح کیا جا رہا ہے کہ کہیں ان کی نیک نامی کو بٹہ نہ لگ جائے۔ گرچہ شروع میں تھوڑی جھجک تھی۔ لیکن ہندوستانی فوجیوں نے بہت فرمانبرداری کے ساتھ اپنے اسلحے جمع کرا دیئے۔ اور بغیر کسی واقعے کے یہ کام پورا ہو گیا۔ کیو براؤن کا کہنا ہے کہ ''مشکل سے 6 سو یورپین کے سامنے ڈھائی ہزار مقامی فوجی غیر مسلح کر دیئے گئے۔ اور وہ بے ضرر ہو کر اپنے لائن میں چلے گئے۔'' رائس ہومس کا کہنا ہے کہ ''آج تک اس سے زیادہ فیصلہ کن فتح نہیں نصیب ہوئی تھی۔''

یہی حکمت عملی گووند گڑھ میں بھی دوہرائی گئی جو سکھوں کے مقدس مقام امرتسر کی نگہداشت کے لئے تعینات تھی، اور یہاں بھی آسانی سے فیصلہ کن فتح ہوئی۔ ہر میجسٹی کی 81 ویں رجمنٹ کی ایک کمپنی کیپٹن چیسٹر کی قیادت میں 12- تاریخ کی شب لاہور سے یکّوں میں روانہ ہوئی اور دوسرے دن علی الصبح گوبند گڑھ پہنچ گئی اور سورج سے نکلنے سے پہلے خاموشی سے وہ قلعہ میں داخل ہو گئے۔ حکام کو اب سکھوں کے متبرک مقام کو لے کر کوئی پریشانی نہیں تھی۔

لیکن فیروز پور میں یہ معاملہ اتنی آسانی سے طے نہیں ہوا۔ یہاں دو مقامی انفینٹری

رجمنٹ 45 ویں اور 57 ویں تعینات تھی۔ اس کے علاوہ 10 ویں مقامی کیویلری بھی تھی۔ کیویلری کی وفاداری پر کوئی شک نہیں تھا اور اسی طرح 57 ویں کے بارے میں یہ یقین تھا کہ اس پر بھی کوئی اثر نہیں ہے۔ یہاں کی بریگیڈ نے پیدل آرٹلری کی دو کمپنی، لائٹ فیلڈ بیٹری اور ہر میجسٹی کی 61 ویں رجمنٹ انگریزوں پر مشتمل تھی۔ منٹگمری نے فیروز پور کے حکام کو میرٹھ اور دلی کے واقعات کی اطلاع دیتے ہوئے انہیں اس بات کی تنبیہہ کر دی تھی کہ پنجاب کے ہندوستانی بھی بغاوت کر سکتے ہیں۔ بریگیڈیر انس، جس نے اس اسٹیشن کا چارج دو دن پہلے ہی لیا تھا، وہ بھی اس خطرے کی بابت یقین رکھتا تھا۔ لیکن اسٹیشن کے دوسرے کمانڈنگ افسروں کو اس بات کا یقین نہیں تھا۔ انس نے فیصلہ کیا کہ وہ دونوں این آئی رجمنٹس کو علیحدہ کر کے انہیں الگ الگ غیر مسلح کرے گا۔ 57 ویں نے تو بہت وفاداری کے ساتھ اپنے کیمپنگ گراؤنڈ تک مارچ کیا۔ لیکن 45 ویں نے مختصر راستہ اپنایا اور گراؤنڈ کے اس حصہ پر پہنچی جو انہیں الاٹ کیا گیا تھا۔ وہاں انہیں یورپین فوجی اور آرٹلری تعینات نظر آئی جس کے بارے میں انہیں کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔ ''دھوکہ ہے (دھوکا ہوا ہے)'' آواز فوراً ہی اٹھی اور تقریباً دو سو فوجی برجیوں کی طرف دوڑ گئے۔ اور جو باقی تھے وہ بھی مارچ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ سکھ نان کمشنڈ افسروں نے منٹگمری کو یہ رپورٹ دے دی تھی کہ فیروز پور، گووند گڑھ، لاہور، جالندھر اور کانگڑہ میں ایک ساتھ بغاوت پھیلے گی۔ لیکن فیروز پور میں جب فوجیوں کو بریگیڈیر کے منصوبوں کا پتہ چلا تو ان میں سے صرف دو سو آدمیوں نے بغاوت کی۔ 57 ویں رات پھر بالکل خاموش رہی۔ دوسرے دن صبح لائٹ کمپنی نے بغیر کسی مخالفت کے اپنے اسلحے جمع کرا دیئے اور اپنی لائن میں واپس آ گئے۔ اس کے بعد یورپین فوجیوں کی ایک کمپنی کو حکم دیا گیا کہ وہ لائنس کو صاف کرا دیں اور 57 ویں کے باقی آدمیوں نے سوچا کہ لائٹ کمپنی کو غیر مسلح کر کے انہیں قیدی بنا لیا گیا ہے اور وہ سب میدان کی طرف بھاگ گئے۔ شام تک اپنے کمانڈنگ افسروں کے کہنے پر وہ سب یورپین لائنس کی طرف گئے تا کہ اپنے اسلحے جمع کرا دیں۔ جب کہ 45 ویں کے 130 آدمیوں کو چھوڑ باقی سب اسٹیشن سے بھاگ گئے۔ ان کا پیچھا کیا گیا۔ وہ تتر بتر ہو گئے۔ ان میں سے کچھ تو پٹیالہ کے سکھ راجا کے علاقے میں پہنچ گئے، اور وہاں ان کو قید کر لیا گیا اور کچھ دوسروں کو گاؤں والوں نے قید کر لیا۔ انہیں واپس لایا گیا۔ جب کہ کچھ دوسرے دلی کی طرف بھاگ نکلے۔ وہاں انہوں نے بغاوت میں اور اضافہ کر دیا۔ دسویں مقامی کیویلری

وفادار رہی۔

جالندھر میں 36 ویں اور 61 ویں این آئی پر شبہ تھا، کیونکہ ماضی میں میرٹھ اور لکھنو سے ان کا تعلق تھا۔ جب 61 ویں ایک سال پہلے لکھنو سے روانہ ہوئی تو وہ اسٹیشن ہر طرح کی شورش سے پاک تھا۔ لیکن یہ اندیشہ تھا کہ ان میں سے کچھ لوگ اپنے پرانے دوستوں خصوصاً 19 ویں اور 34 ویں برہام پور اور بیرک پور دوستوں سے تعلق بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کے خلاف فوری طور پر کوئی کارروائی مناسب نہیں سمجھی گئی۔ کیونکہ بہت سے اسٹیشن ایسے تھے جہاں یورپین فوجی موجود نہیں تھے۔ اور وہ سب مقامی لوگوں کے رحم وکرم پر تھے۔ لیکن پھلور کے جنگی اسلحہ خانے میں کچھ یورپین فوجیوں کو بھیجا گیا۔ جب کہ کپورتھلہ کے راجا نے اپنی فوجوں کو جالندھر کی حفاظت کے لئے تعینات کر دیا۔ بریگیڈیر اور کمشنر دونوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ان فوجیوں کے رجمنٹ کو غیر مسلح کریں گے۔ لیکن وہ موقع کی تلاش میں تھے۔ اس لئے اس تاریخ کو دوبار ملتوی کرنا پڑا۔ کیونکہ یہ ناممکن سمجھا گیا کہ فوجی اپنے افسروں کے ارادے سے باخبر نہ ہوں۔ 7- جون کو انہوں نے اپنے افسرون کو بغیر کوئی موقع دیئے مسلح بغاوت کر دی۔ اور پھلور گیریسن کے ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ وہ سب لدھیانہ کی طرف نکل گئے، جہاں انہیں مسلح مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے وہاں انتظار نہیں کیا اور دلّی کی طرف بڑھ گئے۔ لیکن اس شہر میں ان کی مختصر آمد سے ہی یہ ثابت ہو گیا کہ برٹش حکومت پنجاب کے دیہی علاقوں کی وفاداری پر منحصر نہیں رہ سکتی۔ ''آتش زنی، قتل، قزاقی، ڈکیتی اور جانوروں کی چوری عام بات ہو گئی اور جب ایسے کچھ لوگوں کو پکڑا گیا تو انہوں نے اس بات کا اعتراف کر لیا کہ انہیں برٹش حکومت کے خاتمہ کا یقین ہو گیا تھا۔'' مجسٹریٹ نے قانون شکنی کرنے والوں کے خلاف سخت قدم اٹھائے اور شہر کے ہر آدمی پر جرمانہ عاید کر دیا اور سبھی لوگوں سے اسلحے جمع کرا لئے، کیونکہ انہوں نے اپنے اسلحوں کا استعمال قانون کی حفاظت کے لئے نہیں کیا تھا۔

کانگڑہ میں تعینات 41 ویں این آئی نے حکم ملتے ہی اپنے اسلحے جمع کرا دیئے۔ ان کا چال چلن ہمیشہ سے نظم وضبط کا پابند تھا اور وہ ہمیشہ وفادار رہے۔ اگر سپاہیوں نے آپس میں 15- تاریخ کو بغاوت کرنے کی سازش کر رکھی تھی تو بھی ان میں قیادت کی کمی تھی اور جو اِکا دُکا باغیانہ خیال رکھتے تھے، انہوں نے بھی اپنے آپ کو خاموشی کے ساتھ غیر مسلح ہونے دیا۔ البتہ بغاوت کی تاریخ

کے دو دن پہلے بغیر کسی مزاحمت کے ملتان کو لے کر بے چینی بنی ہوئی تھی۔ کیونکہ ملتان سے سندھ اور بمبئی کو شاہراہیں جاتی تھیں۔ اور یہاں تعینات دو ہزار پوربیوں اور ایک ہزار ار ریگولر، جن کی وفاداری پر شبہ تھا، کو ساٹھ یورپین فوجیوں کی مدد سے غیر مسلح کرنا ناممکن سمجھا گیا۔ میجر کرافورڈ چیمبرلین نے اس لئے مقامی افسروں کے ساتھ کھل کر بات چیت کی اور کچھ وقت کے لئے خطرہ ٹل گیا۔ لیکن 7- جون کو جالندھر میں ہوئی بغاوت سے یہ شبہ اور پختہ ہو گیا۔ اس دوران بھرو سے مند پنجابی فوجیوں کے آنے سے وفادار فوجیوں کی طاقت میں اضافہ ہو گیا۔ 9- تاریخ کو انہیں غیر مسلح کئے جانے کا حکم دیا گیا۔ دو مشتبہ رجمنٹ کو جب ان کے پریڈ گراؤنڈ سے ہٹایا گیا تو انہوں نے اپنے کو دو طرف سے وفادار گھوڑ سوار اور یورپین آرٹلری کے درمیان گھرا ہوا پایا۔ ''وہاں سے بھاگنا صرف پاگل پن ہوتا اور ذرا سی پس و پیش موت کا سبب ہوتی۔'' اس لئے اسلحہ جمع کرانے کے حکم پر عمل کیا گیا اور ملتان کو بچا لیا گیا۔

پشاور، ہندوستان اور افغان کی سرحدوں سے ملا ہوا تھا۔ یہ ڈویژن پہلے افغان حکومت کا حصہ تھا۔ افغانستان کے حکمراں دوست محمد اسے رنجیت سنگھ کے ہاتھوں ہار چکے تھے۔ بعد میں دوسری سکھ حکومتوں کے ساتھ لارڈ ڈلہوزی نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ مارچیز کے وارڈن اس وقت کرنل ہربرٹ ایڈورڈ تھے جو بہت باصلاحیت تھے۔ لیکن ان کا کام بہت مشکل تھا۔ گر چہ دوست محمد برٹش سفارت کاروں اور انگریزوں کے گولڈ کی وجہ سے جیت لئے گئے تھے، لیکن اس بات پر یقین مشکل تھا کہ وہ اپنے نقصان کو برداشت کر سکے ہیں یا نہیں؟ اس اندیشے کے وافر اسباب تھے کہ وہ اس مشکل کے وقت میں اپنے نئے رفقا کے ساتھ مل کر اپنے پرانے دعوے کو پھر سے زندہ کر دیں۔ آس پاس کی پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں افغانوں سے ملتی جلتی جنگجو قوم رہتی تھی، جن کی زبان اور ثقافت بھی افغانوں سے ملتی تھی۔ لیکن ان کے قبیلوں کے اختلافات قومیت یا مذہبیت سے زیادہ پُر اثر تھے۔ اور ہر خیل یا قبیلہ صرف اپنے آپ جنگ کے لئے کھڑا ہوتا یا مر جاتا۔ قانون ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا، زندگی اور املاک کے تقدس کا تصور ان کے لئے لایعنی لفظ تھا۔ بنجر پہاڑیوں سے انہیں اپنی محنت کا معاوضہ بہت کم ملتا اور ہزاروں سال سے وہ اپنی کفالت کے لئے صرف تلواروں کے سہارے جی رہے تھے۔ لوٹ پاٹ میں وہ آسانی سے شامل ہو جاتے اور شاید وہ فوجیوں کی بغاوت کو خدا کا عطیہ سمجھتے۔ ان کے آباواجداد نے سکندر اعظم کی فوج کو بھی پریشان

کیا تھا۔ مغل سلطنت کے لئے وہ ہمیشہ سر درد بنے رہے۔ اس لئے برٹش اسلحوں سے وہ خوف زدہ ہونے والے نہیں تھے۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ شورش برپا ہو۔

ایڈورڈ کے پاس اس وقت 13 ہزار فوجی تھے جن میں سے تین ہزار یورپین تھے، باقی فوجیوں میں سے اکثریت پوربیوں کی تھی۔ لیکن 'خلعت غلزئی' میں جو پوربیہ رجمنٹ تھی، مکمل طور پر بھروسہ مند لوگ تھے۔ اور ان کے ساتھ ہی گارڈ کور اور پنجابی فوجی بھی بھروسہ مند تھے۔ لیکن حالات خطرات سے پُر تھے۔ اور ایڈورڈ کو بہت عقلمندی سے قدم اٹھانا تھا۔ وہ کسی قسم کی بے چینی کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کسی قسم کے غیر متوقع اشارے کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرف اسے اپنے فوجیوں پر نگاہ رکھنی تھی، تو دوسری طرف ہمہ وقت شرارت پر آمادہ قبائلوں پر بھی۔ ان کی غیر جانبداری کی یقین دہانی کافی نہیں تھی اور جہاں تک ممکن ہو، ان کی انگریزوں کے لئے فوجی تعاون کی یقین دہانی ضروری تھی۔ اس کی پہلی ضرورت تو اس گھاٹی کی حفاظت کا تیقن تھا۔ اس لئے ایڈورڈ نے اپنے ساتھیوں کی میٹنگ بلائی جس میں پشاور کے ڈپٹی کمشنر کرنل نکلسن، اس اسٹیٹ کے افسر کمانڈر بریگیڈیر سڈنی کاٹن اور پنجاب کے سب سے سینئر ملٹری افسر جنرل ریڈ شامل تھے۔ کرنل نیول چمبرلین کو کوہاٹ بلایا گیا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ پنجابی فوج کی کمان جنرل ریڈ سنبھالیں اور راولپنڈی کے چیف کمشنر سے جا ملیں۔ اور کرنل چیمبرلین کے ماتحت ایک چلتا پھرتا کالم بنایا جائے اور جن دور جمنٹ پر ذرہ بھی شبہ نہیں ہے ان کو مختلف جگہوں پر تعینات کر دیا جائے تا کہ وہ آپس میں مل کر کوئی مشترکہ کارروائی نہ کر سکیں۔ اس لئے 64 ویں این آئی کو تین ٹکڑیوں میں بانٹ کر انہیں تین مختلف قلعوں میں تعینات کر دیا گیا۔ 55 ویں کی دو کمپنیوں کو نوشیرہ میں چھوڑ کر باقی سب کو ہوتی مردان لے جایا گیا۔ تا کہ وہاں سے گائڈ کور کو چھٹی دی جا سکے۔ جنہیں حکم دیا گیا تھا کہ چلتے پھر کالم میں شامل ہو جائیں۔ 16- مئی کو چیف کمشنر کے بلانے پر ایڈورڈ راولپنڈی کے لئے روانہ ہوا۔ 21- تاریخ کو وہ واپس آیا جہاں اسے معلوم ہوا کہ پشاور کے ہندوستانی فوجی بھی قابل اعتماد نہیں رہ گئے ہیں۔ اس لئے اس نے فوری طور پر حکم دیا کہ 24 ویں، 27 ویں، 31 ویں این آئی اور پانچویں لائٹ کیویلری کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ ان کے خلاف کیا شبہ تھا، یہ تو نہیں جانا جا سکا لیکن یہ طے ہے کہ بہت سے افسروں کو اپنی رجمنٹ پر مکمل اعتماد تھا۔ اور جب 22- مئی کو فوجی پریڈ گراؤنڈ پر جمع ہوئے تو انہیں یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ ان کا کیا حشر ہونے والا

ہے۔ یہاں انہوں نے اپنے کو دو کالموں کے درمیان گھرا ہوا پایا۔ جوان کی طرف بندوق تانے ہوئے تھے۔ اور اس لئے انہوں بغیر کسی مزاحمت کے اپنے اسلحے جمع کرا دیئے۔ ان کے کچھ افسروں نے بھی احتجاج کے طور پر اپنے فوجیوں کی اس بے عزتی کے لئے اپنی تلواریں پھینک دیں۔ لیکن 51 ویں کی ایک کمپنی رات کے اندھیرے میں بھاگ نکلی۔ بغاوت پر آمادہ یہ فرار قانونی طور پر ایک جرم تھا اور اس پر سزا ملنی تھی۔ اس لئے سبھی بھگوڑوں کے سروں کی قیمت طے کی گئی اور قبائلیوں کو آمدنی کی اچھی خاصی تفریح ہاتھ آ گئی۔ انہوں نے ان کا شکار کرنا شروع کر دیا۔ بعد میں قیدیوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ ''یہ رحم دلی یا انصاف کا موقع نہیں تھا'' کیو نے کہا:

55 ویں این آئی کی کہانی اس سے تھوڑی مختلف ہے۔ اس رجمنٹ کے کچھ لوگ سندھ ندی کے داہنے کنارے خیر آباد میں حفاظتی ڈیوٹی پر تعینات تھے۔ فتح خاں خٹک، جو ایک وفادار قبائلی تھا، وہ بھی اس وقت وہاں اپنی نئی وردی میں ڈیوٹی پر تھا۔ 21- مئی کو خٹک لیڈر نے باغان، جو ندی کے مخالف سمت میں ایٹک کا انچارج تھا، کو اطلاع دی کہ 55 ویں این آئی کے ایک سپاہی نے اپنے ساتھیوں کو بھڑکایا ہے۔ لیفٹیننٹ لنڈ کو ندی کے اس پار سازشی کو سزا دینے کے لئے بھیجا گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا ہمیں نہیں معلوم۔ لیکن صوبیدار اور اس کے کچھ آدمیوں نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور نوشیرہ کی طرف نکل گئے۔ راستے میں انہیں 24 ویں این آئی کے کچھ لوگ ملے، جو کچھ سامان پشاور لے جا رہے تھے۔ شاید یہ لوگ اس وقت اپنے اسٹیشن پر نہیں تھے۔ جب کہ ان کے رجمنٹ کو غیر مسلح کیا گیا۔ اور یہ لوگ بھی 55 ویں کے آدمیوں کے ساتھ ہو گئے۔ اس پارٹی کو نوشیرہ پہنچنے پر گرفتار کر کے 10 ویں ارریگولر کے لوگوں نے غیر مسلح کر دیا۔ جب انہیں یورپین محافظوں کے سامنے لے جایا جا رہا تھا تو 55 ویں کے کچھ لوگوں نے انہیں چھڑا لیا۔ اس کے بعد انہوں نے ندی پار کر کے ہوتی مردان جانے کی کوشش کی، جہاں اس رجمنٹ کے لوگ مقیم تھے۔ لیکن ناؤ کے پل کو توڑ دیا گیا اور صرف ایک یا دو سپاہی ہی دوسری طرف پہنچ سکے اور مردان میں اپنے ساتھیوں کو سارے واقعہ کی تفصیل بتائی۔ کرنل اسپارٹس اُڈ، جوان کا کمانڈر تھا، اس نے رجمنٹ سے نوشیرہ چھوڑنے کے لئے کہا۔ پھر وہ سب کیپٹن کیمران کی قیادت میں 22- تاریخ کی رات میں وہاں سے روانہ ہوئے اور دوسرے دن صبح ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔'' اپنے افسروں کی وہ اسی طرح عزت کرتے رہے جس کی وجہ سے 58 ویں کے افسروں نے یہ کہا کہ انہیں اپنے آدمیوں

سے زیادہ 10 ویں اِرریگولر کیویلری کے سواروں سے زیادہ خطرہ ہے۔ ابھی تک ہوتی مردان میں 55 ویں این آئی کے لوگوں میں بغاوت کا کوئی آثار نہیں دکھائی دیئے۔ 24- کی رات میں 55 ویں کے مقامی افسر اپنے کرنل کے پاس گئے اور جو کچھ ہو رہا تھا اس کی جانکاری حاصل کر لی۔ اس کے بعد 55 ویں کے لوگ مردان سے نکل کر سوات کی طرف بھاگے۔ جب انہوں نے بھاگنا شروع کیا تو ان کے ساتھ بہت سے لوگ تھے۔ لیکن ان کے تعاقب میں نکلسن گیا اور اس نے سینکڑوں آدمیوں کو مار ڈالا اور 120 کو پکڑ لیا جنہیں عبرتناک سزائیں دی جانی تھیں۔ نکلسن نے فوراً ہی سکھوں اور نئے بھرتی ہوئے لوگوں کی مانگ کی۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ سکھوں نے اپنے افسروں کو وقت سے پیشتر آگاہ کر دیا تھا کہ پوربیہ لوگ بغاوت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن وہ دوسروں کے ساتھ کب شامل ہوئے اور کب 55 ویں کے لوگ ہوتی مردان سے بھاگے، یہ کہیں نہیں بتایا گیا۔ سر جان لارنس بھی سبھی قیدیوں کو پھانسی دینے کے حق میں نہیں تھا۔ ''120 آدمیوں کو مارنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمارا مقصد تو انہیں سزائیں دے کر دوسروں میں خوف پیدا کرنا ہے۔ اور شاید ہمارا یہ مقصد ان میں سے ایک تہائی آدمیوں کو ختم کر کے پورا ہو جائے۔''

اس طرح پوربیوں کے 6 رجمنٹ کو ختم کر دیا گیا، اور پنجاب حکومت نے اپنی ساری قوت کمانڈر انچیف کو مزید کمک پہنچانے کے لئے وقف کر دی۔ لیکن سر جان لارنس کو اس بات میں شبہ تھا کہ سبھی مقامی فوجیوں کے خلاف جنگ کرنے کی پالیسی، چاہے انہوں نے کوئی غلط کام کیا ہو یا نہ کیا ہو، مناسب نہیں لگی۔ ایڈورڈ کو لکھے خط میں وہ کہتا ہے: ''موجودہ حالات کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہر قدم جو ہم اپنی حفاظت کے لئے اٹھاتے ہیں، وہ ہمارے خلاف ہی جاتا ہے۔ اور پھر مزید اقدامات کئے جاتے ہیں اور یہ سلسلہ چلتا رہنا چاہئے جب تک کہ ہم اس رجمنٹ کو ختم نہ کر دیں، یا برباد نہ کر دیں، یا وہ بغاوت کر کے اپنے افسروں کو مار ڈالیں۔''

64 ویں کی تین کمپنیوں کو اس کے بعد ختم کیا جانا تھا۔ انہیں ابوزئی شہاب قادر اور مچھنی کے قلعوں میں تعینات کیا گیا تھا۔ چیوٹ اور نکلسن ان سب جگہ گئے اور کمپنی کو بغیر کسی مزاحمت کے غیر مسلح کر دیا گیا۔ اب ایڈورڈ اس بات کے لئے آزاد تھا کہ وہ پرانے فوجیوں سے لڑنے کے لئے نئے لوگوں کی بھرتی کرے۔ اس نے بڑی ہمت کے ساتھ ان قبائلیوں کو بلایا کہ وہ برٹش جھنڈے کے تلے جمع ہو جائیں۔ یہ ایک جوکھم بھرا تجربہ تھا جو آخر میں کامیاب ہوا۔ ان قبائلیوں کے دل

میں انگریزوں کی کوئی عزت نہیں تھی جو اس کی پہاڑیوں کو روندر ہے تھے۔لیکن لوٹ پاٹ کرنے کی ان کی فطرت غیر ملکیوں سے نفرت پر غالب آ گئی تھی۔ان قبائلیوں نے ہندوستان کی دولت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور دلی اور لکھنو سے بڑے پیمانے پر لوٹ کا سامان پانے کی امید قوی ہوگئی تھی۔صرف یہی سفید فام عیسائی تھے جو اسے اس خزانے تک پہنچا سکتے تھے۔ایک بار جب وہ اپنے پہاڑوں سے اتر آئے تو ان آفریدی، خٹک اور مومنڈ سے یہ محسوس کیا کہ اب ان کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ اپنے نئے آقاؤں کے وفادار بنے رہیں۔پرانے قبائلی جھگڑوں اور رقابت کی وجہ سے وہ اپنے پہاڑوں پر ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہے اور یہ امید نہیں تھی کہ وہ ہندوستان کے میدانی علاقوں میں آ کر اپنے ان جھگڑوں کو بھول جائیں گے۔یہ اس پالیسی کی بہت بڑی کامیابی تھی کہ ان شورش زدہ لوگوں کو ان کے اپنے ضلعوں سے ہٹا کر جہاں وہ اپنے آقاؤں کے لئے مستقل پریشانی کا باعث بنتے، پانچ ندیوں کے پار بھیجا جائے، جہاں ان کی جنگجو فطرت اور لوٹ مار کی عادت کو کھل کھیلنے کا موقع ملے۔فوجی، لاہور، پشاور اور بنو تک برٹش اقتدار کا آلہء کار بنتے گئے۔جہاں پنجابی مسلم اور سکھ، کوہٹ اور یوسف زئی کے قبائلی ہندوستانی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے خلاف متحد ہو گئے۔سکھوں کے آس پاس کوئی لیڈر نہیں تھا، جس کے گرد وہ جمع ہو سکیں۔رنجیت سنگھ کا جانشین اپنے مورثوں کی سرزمین میں موجود نہیں تھا اور بہت سے سکھ سردار اپنے فاتحوں کے اس بات کے لئے مشکور تھے کہ حکمراں گھرانے کو برباد کر دیا گیا۔برٹش پالیسی نے ان منفرد سرداروں کے مفاد کی حفاظت کی پالیسی اپنائی تھی۔جو لوگ حکمراں گھرانے سے بیزار ہو چکے تھے انہیں ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا کہ وہ انگریزوں کا اس وقت ساتھ دیں۔لیکن یہ سوچنا مناسب نہیں ہوگا کہ پنجاب میں برٹش حکام کو جن مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا وہ غیر مطمئن سپاہیوں کی وجہ سے تھا۔رانگڑ اور دوسرے قبائلی جو دلی کے آس پاس رہتے تھے، انہوں نے لوٹ پاٹ کی غرض سے اپنے اسلحے اٹھا لیے۔لیکن حصار ریواری اور گڑگاؤں کی پنجابی آبادی نے بھی باغیوں کی طاقت میں اضافہ کیا اور ان کے ساتھ کچھ سکھ سردار بھی شامل ہوئے۔

پہلی جون کو سر جان لارنس نے بنگال فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کے نام ایک اعلانیہ جاری کیا۔''وہ سبھی رجمنٹ جو وفادار بنی رہیں گی انہیں ان کی مستقل مزاجی کی وجہ سے انعام دیا جائے گا۔جو الگ ہو گئے یا بھاگ گئے، ان کی ملازمت ہمیشہ کے لئے ختم کر دی جائے گی۔معینہ وقت

کے گزرنے کے بعد پچھتاوا کسی کام کا نہیں رہے گا۔ اب بھی وقت ہے کہ آپ اپنی وفاداری کا اظہار کریں۔ برٹش حکومت کو کبھی مقامی فوجیوں کی کمی نہیں ہوگی۔ اپنے پنجاب سے ہی پچاس ہزار فوجیوں کی بھرتی کی جاسکتی ہے۔ اگر پوربیا فوجی موجودہ موقعے کو گنوا دیتے ہیں، تو پھر انہیں یہ موقع کبھی نہیں ملنے والا۔ پنجاب میں سبھی باغیوں کو کچلنے کے لئے وافر فوج موجود ہے۔ وہاں کے سردار اور عوام بھی بہت وفادار ہیں۔ اور وہ فوج میں آپ کی جگہ لینے کے متمنی ہیں۔ سبھی مل کر آپ کو برباد کر دیں گے۔ اس کے علاوہ فوجیوں کو ابھی انگلینڈ کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ ہر طرف سے انگریز فوجی ہندوستان آرہے ہیں......'' لیکن بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ انتخاب کا یہ معاملہ سپاہیوں کے ہاتھ میں نہیں رہ گیا تھا۔ وہ کس طرف جائیں، اس کا فیصلہ بھی وہ خود نہیں کر سکتے تھے، بلکہ یہ راولپنڈی، لاہور اور پشاور کے حکمراں تھے، جنہیں اس بات کا اختیار تھا کہ انہیں فوج میں لیں یا نہیں؟ اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ اسلحے کے ساتھ ہندوستانی سپاہیوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس لئے انہیں اپنی پالیسی کو اس کے انجام تک پہنچانا تھا۔

پشاور ڈویژن میں جس مزید رجمنٹ کو ختم کیا جانا تھا وہ پشاور اور نوشیرا کی 10 ویں اِرریگولر تھی۔ انہوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے انہیں مجرم سمجھا جائے۔ لیکن انہوں نے 55 ویں کے باغیوں کو چھڑایا تھا اور ہوتی مردان سے بھگوڑوں کا تعاقب بھی پورے جوش کے ساتھ نہیں کیا تھا، اس لئے ان کی قسمت کا ہو چکا تھا۔ لیکن انہیں اس کی خبر نہیں تھی۔ یہ کام بہت کامیابی کے ساتھ 29- جون کو دونوں جگہوں پر انجام پا گیا۔ اور 10 ویں اررریگولر کو بغیر کسی مزاحمت کے غیر مسلح کر دیا گیا۔ لیکن صرف تنخواہ اور پنشن کے نقصان کے علاوہ ان کی کردارکشی ہی سزا نہیں تھی۔ ان کے ساری املاک بھی چھین لی گئی۔ لائن کی تلاشی لی گئی اور ان کے سارے سامان کو سوائے ان کپڑوں کے، جو وہ پہنے تھے، سب کچھ چھین لیا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ عورتوں اور بچوں کے زیورات اور کھلونوں کو بھی ضبط کر لیا گیا اور انہیں ناؤ میں بٹھا کر سندھ کے پار بھیج دیا گیا۔ انہیں .ادراہ کے طور پر 400 روپے دیئے گئے تا کہ کسی طرح وہ اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ ساتھ ہی انہیں اس بات کی تنبیہہ بھی کی گئی کہ ان کے حرکت وعمل کی نگرانی کی جائے گی۔ اور اگر انہوں نے ذرا بھی مزاحمت کی تو ان کی جانیں لے لی جائیں گے۔

اس دوران چلتا پھرتا کالم آگے بڑھتا گیا۔ 21- جون کو وہ جالندھر پہنچا۔ اس کے پہلے

کمانڈر بریگیڈیر چیمبرلین کو ایڈ جوٹنٹ جنرل بنا دیا گیا تھا اور ان کی جگہ پر بریگیڈیر کے رینک کے ساتھ نکلسن کی تعیناتی کی گئی، جس نے 35 ویں لائٹ انفینٹری اور 33 ویں این آئی کی کمان سے انکار کر دیا۔ یہ دونوں رجمنٹ اب تک بالکل خاموش تھیں۔ لیکن 35 ویں پر کڑی نگرانی رکھی جا رہی تھی، اور 33 ویں کو ابھی تک کالم میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔ یہ دونوں مل کر خطرہ پیدا کر سکتے تھے۔ اس لئے نکلسن نے فوراً فیصلہ کر لیا۔ یہ کالم پھلور میں پہنچی اور جب وہ قلعہ کی توپوں کے سامنے آ گئے تو 35 ویں لائٹ انفینٹری کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ اور جب 33 ویں وہاں پہنچی، تو انہوں نے بھی خاموشی سے اپنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس چالاکی سے تقریباً 15 سو مشتبہ باغی سپاہیوں کو 8 سو یورپین اور ایک درجن توپوں کے سامنے آسانی سے غیر مسلح کر دیا گیا۔ ایک قطرہ خون بھی نہیں بہا۔

لیکن ابھی اطمینان کی ساعت نہیں آئی تھی کیونکہ پنجاب ابھی پوربیوں سے خالی نہیں ہوا تھا۔ اب بھی وہاں پوربیوں کی 6 مسلح رجمنٹ تھیں۔ راولپنڈی میں 58 ویں این آئی تھی۔ جہلم میں 14 ویں این آئی، سیالکوٹ میں 46 ویں این آئی جس کے ساتھ نویں لائٹ کویلری کی ایک ونگ تھی۔ جب کہ دوسری ونگ چلتے پھرتے کالم میں تھی۔ امرتسر میں 59 ویں این آئی تھی۔ کانگڑہ اور نور پور میں چوتھی این آئی اور گرداس پور میں دوسری اِرریگولر کیویلری تھی اور سبھی مسلح تھے۔ جہلم، سیالکوٹ، کانگڑہ اور گرداسپور میں کوئی یورپین فوج نہیں تھی اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ پوربیہ رجمنٹ سے اسلحے لے کر بے ضرر کر دیا جائے۔ راولپنڈی اور جہلم کے فوجیوں کو ایک ساتھ غیر مسلح کیا جانا تھا۔ اس کام کو سہولت سے کرنے کے لئے 14 ویں این آئی کی دو کمپنیوں کا جہلم سے راولپنڈی تبادلہ کر دیا گیا تھا۔ اس دوران نکلسن سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے قدم پیچھے ہٹا کر اوپر کی طرف جائے۔ جالندھر سے وہ پھلور اور پھلور سے امرتسر گیا۔ 7- جولائی کو ایسے موقعوں پر ہونے والی پریڈ راولپنڈی میں کرنے کا حکم دیا گیا۔ لیکن یورپین فوجیوں کی آمد اور آرٹلری کی موجودگی سے فوجی خوف زدہ ہو گئے اور انہوں نے اپنے آپ کو لائن میں بند کر دیا۔ وہاں پر 58 ویں کے لوگوں نے خاموشی سے اپنے اسلحے جمع کرا دیئے لیکن 14 ویں این آئی کے لوگ شہر کی طرف بھاگ نکلے۔ جن کا تعاقب گھوڑ سوار پولیس نے کیا، اور جو ان سے بچ کر بھاگ نکلے ان کے سر گاؤں والوں نے کاٹ لیے، کیونکہ ہر باغی کے سر کی قیمت مقرر کر دی گئی تھی۔

لیکن جہلم میں معاملہ اتنا آسان نہیں رہا۔کبھی کبھار ہر طرح سے سوچا سمجھا منصوبہ بھی غلط ہو جاتا ہے۔کرنل ایلس وہاں اپنی یورپین فوج کے ساتھ سورج نکلنے کے بعد پہنچا نہ کہ اس سے پہلے۔ اس کے آنے کے مقصد کو اس کے رفقاء سے بھی پوشیدہ رکھا گیا تھا۔اوران سب کو لفافہ بند آرڈر دیا گیا کہ وہ اسے اس وقت کھولیں جب وہ جہلم کے قریب پہنچ جائیں۔لیکن اس طرح کا ڈرامہ اس سے پہلے بہت سی جگہوں پر کھیلا جا چکا تھا،اس لئے جب یورپین اور ملتانی فوجیں پریڈ گراؤنڈ پر دور سے نظر آئیں تو فوجی ان کے آنے کا مقصد سمجھ گئے۔سبھی فوجیوں نے اپنے اسلحے اٹھا لئے اور لڑائی شروع ہوگئی۔بندوقوں اور رائفلوں کے سامنے مسکٹ کا کوئی رول نہیں تھا۔لیکن سارے دن سپاہی ناکام لڑائی لڑتے رہے۔ان کے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ناؤ کے پل کو ختم کر دیا گیا تھا اور جہلم کو پار نہیں کیا جا سکتا تھا۔کچھ لوگوں نے ادھر ادھر کی ناؤوں کو پکڑا لیکن دوسری طرف وہ بھی دشمنوں کے ہاتھ میں پڑ گئے۔ان پانچ سو فوجیوں میں سے جنہوں نے 7- تاریخ کی صبح کرنل ایلس سے لڑائی کی،مشکل سے پچاس بھی نہیں بچ سکے۔150 آدمی مقابلے میں مارے گئے اور 180 آدمیوں کو بعد میں پکڑ لیا گیا۔120 آدمی کشمیر کی طرف بھاگے لیکن وہ سب پکڑ لئے گئے۔اور برٹش حکام کے سپرد کر دیئے گئے۔اس طرح 14ویں این آئی کا خاتمہ ہوگیا۔

سیالکوٹ میں موجود نویں لائٹ کیویلری کے فوجیوں کو اس بات کی اطلاع مل چکی تھی۔ انہوں نے جہلم کی لڑائی کے بارے میں سنا تھا۔لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ ختم کیسے ہوئے۔ انہیں اس بات کی بھی اطلاع تھی کہ نکلسن پھلور گیا ہوا ہے۔جہلم کی خبر سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر کو 8- تاریخ کو مل گئی۔اس نے فوراً ہی یہ اطلاع بریگیڈیر برنڈ،جو اس اسٹیشن کے کمانڈنگ افسر تھے، کو دی۔یہ کیویلری کے ہی لوگ تھے جنہوں نے بغاوت شروع کی۔ڈاکٹر بٹلہ کا کہنا ہے کہ تقریباً 4 بجے رات میں اس سے کہا گیا کہ میں سواروں کو دیکھوں جو کھلی بغاوت پر آمادہ تھے۔اور کینٹ کے علاقے میں جو بھی یوربین نظر آیا اسے مار رہے تھے۔وہ لوگ بھی اس میں مارے گئے جنہیں انگریزوں کا دوست سمجھا جاتا تھا۔لیکن 46ویں این آئی کے لوگ اپنے افسروں کے تئیں وفادار رہے۔انہوں نے اپنے افسروں کو رجمنٹل کوارٹر گارڈ میں پناہ دی اور رات کے وقت انہیں اور ان کے خاندان والوں کو نہ صرف بحفاظت قلعے کے اندر پہنچایا بلکہ سیالکوٹ روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے انہیں پیسے بھی دیئے۔شام کے تقریباً چار بجے باغی ہشیار پور کے لئے روانہ ہو گئے اور

اپنے ساتھ ایک پرانی سنگل بندوق بھی لے گئے جو نکلسن سے مڈبھیڑ کے وقت ان کے لئے بہت مددگار ثابت ہوئی۔

سیالکوٹ میں بغاوت پھیلنے سے ایک دن قبل نکلسن نے امرتسر میں 59 ویں این آئی کی پریڈ کرائی اور ان کے نیک چال چلن کے لئے ان کی بہت تعریف بھی کی۔ اور انہیں یقین دلایا کہ انہیں غیر مسلح کئے جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ لیکن جہلم کی خبر نے ان کا بھی فیصلہ کر دیا۔ دوسرے دن صبح 9- جولائی کو ان کی پھر پریڈ کرائی گئی اور یہ کہا گیا کہ کچھ لوگوں کو پھانسی دیئے جانے کا منظر انہیں دکھایا جائے گا۔ جب ان لوگوں کو پھانسی لگ گئی تو 59 ویں کے لوگوں کو اچانک حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اسلحے جمع کرا دیں۔ ''ان کے سامنے اور چاروں طرف سے یورپین فوجی اور بندوقیں لگی ہوئی تھیں چنانچہ انہوں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے ہتھیار جمع کرا دیئے۔ اگر وفاداری کے کسی ثبوت کی ضرورت ہوئی تو وہ ہر طرح سے وفادار رہے کیونکہ لائنس واپس آنے کے بعد انہوں نے سات سو مزید مسکٹیں اپنے افسروں کو واپس کر دیں۔ دوسرے دن صبح نویں کیویلری کی باری تھی جو ابھی تک چلتے پھرتے کالم کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ بغیر وردی اور اسلحے کے جمع ہو جائیں اور انہیں بتایا گیا کہ سیالکوٹ کے لوگوں نے کیا کیا ہے۔ پھر ان کے بھی اسلحے جمع کرا لئے گئے۔

اس کے بعد نکلسن سیالکوٹ کے لوگوں کے تعاقب میں نکلا۔ اپنے لوگوں کو زبردستی مارچ کراتے ہوئے وہ 11- تاریخ کو گرداسپور پہنچا۔ دوسرے دن صبح اسے معلوم ہوا کہ یہاں سے دس میل کے فاصلے پر باغی سب تریموگھاٹ پر جمع ہو گئے ہیں۔ تھوڑی سی جھڑپ کے بعد سارے باغی ندی کی طرف پیچھے ہٹ گئے لیکن نکلسن کے آدمی اتنے تھکے ہوئے تھے کہ ان کے تعاقب میں نہیں جا سکے۔ لیکن قدرت بھی جنرل کا ساتھ دے رہی تھی۔ اچانک ندی میں طغیانی آ گئی اور سارے بھگوڑے ایک چھوٹی سی خشکی میں گھر گئے۔ جس نے رات بھر میں جزیرے کی شکل اختیار کر لی۔ یہاں ان سب کو ختم کر دیا گیا۔ جب آرٹلری کے لوگ ساحل پر مشغول تھے، نکلسن نے اس جزیرے کو خاموشی سے پار کر لیا۔ اس طرح سیالکوٹ بریگیڈ پر ختم ہو گئی۔

دسویں لائٹ کیویلری ابھی تک وفادار رہی۔ انہوں نے نابھا کے راجا کی سرحد میں ہوئی بغاوت کو کچلنے میں بہت مؤثر رول ادا کیا تھا۔ لیکن جہلم اور سیالکوٹ کے واقعے کے بعد کسی مسلح

ہندوستانی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا چاہے وہ کتنا ہی وفادار رہا ہو۔ اور پوربیوں کے لئے اب اپنی وفاداری ثابت کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ 10 ویں کو غیر مسلح کیا گیا لیکن کچھ وقتوں کے لئے ختم نہیں کیا گیا۔

کانگڑہ اور نور پور میں موجود چوتھی این آئی کا اپنا فلسفیانہ نظریہ تھا۔ جب کانگڑہ میں ان سے اسلحہ جمع کرانے کو کہا گیا تو انہوں نے فوراً اپنے اسلحے دے دیئے۔ سپاہیوں کو یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ ان کے چال چلن پہ کوئی شبہ نہیں ہے لیکن ہتھیاروں کو جمع کرانے کے بعد دوسرے باغی فوجیوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو پائے گا۔ انہوں نے جواب دیا ''ان کے اسلحے جو سرکار کی املاک ہیں، وہ اپنے افسروں کے کہنے پر اسے جمع کرانے کے لئے راضی ہیں۔ لیکن انہیں صرف اس بات کا افسوس ہے کہ اس کے لئے طاقت کا مظاہرہ کرنا پڑا۔'' نور پور کی فوج ان سے بھی زیادہ متاثر تھی وہ اپنے ہتھیار اپنے کمانڈر میجر ولکی کے بنگلہ میں لے گئے جو قلعے سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اس طرح یہ دور پورا ہو گیا۔ سوائے ''خلعت غلزئی'' کے پورے پنجاب میں موجود پوربیہ رجمنٹ کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ چاہے ماضی میں ان کا ریکارڈ کتنا ہی شاندار کیوں نہ رہا ہو۔ لیکن انسان صرف اعداد و شمار نہیں ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک طرح کے ماحول میں دو شخص کس طرح سے عمل کریں گے۔ چوتھی این آئی نے اس میں اپنی کوئی بے عزتی نہیں سمجھی کہ ان سے اسلحہ جمع کرایا جا رہا ہے جبکہ 14 ویں اور 46 ویں نے صرف اسی خیال سے بغاوت کر دی۔

ہندوستانی فوجی اسلحوں کے ساتھ خطرہ تھے جب کہ غیر مسلح ہونے کے بعد وہ ایک مسئلہ بن گئے۔ انہیں نہ تو چھوڑا جا سکتا تھا اور نہ اس بات کی اجازت دی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے گھروں کو جائیں۔ لیکن پنجرے میں قید ایک چڑیا بھی اپنی آزادی چاہتی ہے۔ 30- جولائی کو غیر مسلح کئے گئے 26 ویں این آئی نے اپنے کیمپ میاں میر میں اپنے کو بند کر لیا۔ ان کے پاس سوائے چاقوؤں کے اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ لیکن ان کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ میجر اسپنسر پر جھپٹ پڑے اور جو مداخلت کرنا چاہتا تھا۔ اسے جان سے مار ڈالا۔ جو سرجن میجر اس کی مدد کو آیا اسے بھی مار دیا گیا۔ اگر اب بھی کچھ لوگوں میں ہچکچاہٹ تھی تو سکھوں کے بغیر کسی تفریق کے گولی چلانے سے قتل کا یہ سلسلہ اور زیادہ بڑھ گیا۔ بعد میں اچانک آئی آندھی سے انہیں ایک پناہ مل گئی اور یہ جاننا مشکل ہو گیا کہ وہ کدھر بھاگیں۔ دوسرے دن ایک گاؤں میں ان کی موجودگی کی اطلاع انبالہ کے تحصیلدار کو ملی،

جس نے پولیس فورس کے ساتھ ان پر فوری طور پر حملہ کر دیا۔ غیر مسلح اور بھوک سے تنگ یہ بے چارے بھگوڑے اپنا دفاع نہیں کر پائے اور تقریباً ڈیڑھ سو آدمیوں کو مار دیا گیا۔ اس سے پہلے کہ فریڈرک کوپر امرتسر کا ڈپٹی کمشنر موقع پر کچھ گھوڑ سواروں کے ساتھ پہنچے۔ اس نے انہیں ''جنگلی پرندوں کی طرح بھاگتے ہوئے ایک جزیرے میں اپنی موت کا انتظار کرتے ہوئے پایا۔'' فوراً ناؤ کا انتظام کیا گیا اور گاؤں والے ان کے ہاتھ پیچھے باندھ کر انہیں کنارے لے آئے۔ کچھ لوگ پھانسی کے پھندے سے تو بچ گئے لیکن ندی میں کود کر اپنی جانیں دے دیں۔ جو باقی 280 بچے تھے انہیں انبالہ لے جایا گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے ان مجرموں کو پھانسی پر لٹکانے کے لئے رسّے منگائے۔ کوپر کی نگاہ میں یہ سارے قیدی قاتل تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ان سب کو ماردینا چاہئے۔ لیکن جب رسّے آئے تو وہ ان سب کو پھانسی میں لٹکانے کے لئے کافی نہیں تھے۔ اس لئے باقیوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا۔ باقی کی کہانی انبالہ ہیرو کی زبانی ''جب 150 آدمیوں کو پھانسی دے دی گئی تو پھانسی دینے والا ایک شخص بے ہوش ہو گیا۔ اس لئے کچھ وقفہ دیا گیا۔ اب بھی 230 آدمی بچ گئے تھے۔ اور ضلع کے افسر کو اطلاع دی گئی کہ باقی لوگ اپنے کوٹھریوں سے جہاں وہ چند گھنٹوں کے لئے انہیں قید کیا گیا تھا، نکلنے سے انکار کر رہے ہیں۔ یہ امید کی جارہی تھی کہ یہ سب مزاحمت کریں گے اور بھاگ نکلیں گے۔ چنانچہ ان کے بھاگنے کے سارے راستے مسدود کر دیئے گئے اور پھر جب دروازہ کھولا گیا تو نظر آیا کہ تقریباً سبھی مر چکے تھے۔ لاشعوری طور پر ہوویل کے بلیک ہول کی کہانی دوبارہ دوہرادی گئی تھی۔ رات میں کسی کی کوئی چیخ پکار نہیں سنائی دی تھی۔ 45 ایسی لاشوں کو جو گرمی، تکان، خوف اور دم گھٹنے سے مر چکے تھے، انہیں باہر گھسیٹا گیا اور دوسری لاشوں کے ساتھ گاؤں کے جاروب کشوں کے ذریعے ایک گڈھے میں دفنا دیا گیا۔''

کوپر کا کہنا ہے کہ اس کا انصاف پر مبنی یہ کام گاؤں والوں کی نظر میں ادھورا رہتا، اس لئے اس نے اتنے آدمیوں کو مارنے کی وجہ انہیں سمجھائی۔ اور آخر میں گاؤں والے برٹش حکومت کی انصاف پسندی کی داد دینے لگے۔

صرف پنجاب کے عوام کی تائید سے مطمئن نہ ہو کر کوپر نے اپنے ملک کے ان انسان پرستوں کو بھی جو اس کی اس بربریت کی مذمت کرتے تھے، انہیں بھی مختلف دلائل سے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کے اس عمل کی فوری طور پر سرکاری منظوری بھی مل گئی۔ ''میں تمہیں 26 ویں این

آئی کے خلاف کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ تم نے اور تمہاری پولیس نے جو پُر جوش کام کیا ہے، اس کی حکومت تعریف کرتی ہے۔'' سر جان لارنس نے لکھا۔ ان سے بھی زیادہ بڑھ کر کوپر کی کامیابی کی تعریف کرنے والے رابرٹ منٹگمری نے کہا ''ہر طرح کی ستائش تمہیں اور تمہارے اس کام کے لئے ہے اور تاعمر تمہاری یہ کامیابی سنہرے حرفوں سے لکھی جائے گی۔'' اس نے آگے لکھا۔ ''یہاں موجود تین اور رجمنٹ تذبذب میں ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بغاوت نہیں کریں گے۔ جبکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ کریں۔ کیونکہ وہ ہمارے لئے سر درد بن گئے ہیں۔ اگر وہ بغاوت کرتے ہیں تو ان میں سے ایک آدمی بھی زندہ نہیں بچے گا۔''

لیکن وہ ساری رجمنٹیں جو یہ سمجھتی تھیں کہ ان کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے وہ 26 ویں این آئی کے اس سانحے سے خوفزدہ نہیں ہوئی۔ 10 ویں کیویلری کو کمانڈر انچیف نے ان کی وفاداری اور نیک چال چلن کے لئے مبارکباد دی تھی۔ تاہم انہیں بھی غیر مسلح کر دیا گیا تھا کیونکہ کچھ لوگ وفادار نہیں سمجھے گئے تھے۔ جب انہیں غیر مسلح کیا جا رہا تھا تو بریگیڈیر نے انہیں یہ یقین دلایا تھا کہ وقت آنے پر ان کے رجمنٹ کو سب سے پہلے اسلحے واپس کر دیئے جائیں گے۔ ان کے گھوڑے جو فوجیوں کی ذاتی ملکیت تھے سرکار نے نہیں دیئے تھے۔ سرکار کو نئے بھرتی کئے جانے والے فوجیوں کے لئے گھوڑوں کی ضرورت تھی اس لئے اس نے ان گھوڑوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے تو صرف 100، بعد میں 50 اور گھوڑے جو 10 ویں کیویلری کے فوجیوں کی ملکیت تھے، سرکار نے اپنی تحویل میں لے لیے۔ اور پھر اگست میں حکم آیا کہ باقی سارے گھوڑوں کو بھی لے لیا جائے۔ بریگیڈیر اِنس نے لاہور کے حکام کو اس فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کو کہا کیونکہ ان سے گھوڑوں کا چھینا جانا ان کی دوہری بے عزتی تھی۔ 18- تاریخ کو سرکار کا آخری حکم فیروز پور میں پہنچا اور 19- تاریخ کو غیر مسلح 10 ویں کیویلری نے بغاوت کر دی۔ اسلحوں کو چھیننے کی ان کی کوشش تو ناکام ہوئی لیکن سوائے 150 فوجیوں کے باقی سارے اپنے گھوڑوں پر لاپتہ ہو گئے۔ اور بحفاظت وہاں سے نکل گئے۔

فیروز پور کے واقعہ کے بعد سے یہ کہانی 51 ویں کے غیر مسلح فوجیوں نے پشاور میں دوہرائی۔ یہاں حکام نے چھپے ہوئے اسلحوں کے لئے لائنس کی تلاشی لی۔ 27 ویں این آئی نے کوئی مزاحمت نہیں کی لیکن 51 ویں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ فوراً ہی خطرے کی گھنٹی بجائی گئی۔

اور افغانی، فوجیوں پر ٹوٹ پڑے۔ سپاہیوں نے کچھ تلواروں اور مسکٹس کی بدولت شدت سے جنگ کی۔ لیکن قاتلوں کی بندوقوں اور رائفلوں کے سامنے وہ نہیں ٹک سکے۔ یہ رجمنٹ پوری طرح برباد ہوگئی۔''ان 870 آدمیوں میں سے جو 28- تاریخ کو 51ویں این آئی میں شامل ہوئے تھے، 48 گھنٹوں میں صرف 70 بچ سکے اور کچھ دنوں بعد حکام نے یہ اطلاع دی کہ ان 70 میں سے بھی 19 بھوکے بھگوڑے آس پاس کی پہاڑیوں میں دکھائی دیئے۔''

پنجاب میں اب مقامی سپاہی خطرے کا سبب نہیں رہ گئے تھے۔ ایڈورڈ نے پشاور کو شانت کر دیا تھا۔ لیکن حکام اپنی بے چینی کو دور نہیں کر سکے۔ وہ اپنے نئے دوستوں پر زیادہ بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہ جانتے تھے کہ ان کی وفاداری اور غیر وفاداری میں تھوڑا سا ہی فرق ہے۔ انہیں خطرہ تھا کہ پنجابی مسلمان، سکھ، ملتانی اور قبائلی کبھی بھی ذراسی غلطی پر بھی اپنے عیسائی حکام کے بالمقابل متحد ہو کر کھڑے ہو جائیں گے۔ حد تو یہ ہے کہ تجارت پیشہ لوگ جو برٹش حکومت کی سختی کی بنا پر کافی منافع کما چکے تھے، وہ سرکار کو قرض دینے سے ہچکچا رہے تھے۔ پشاور کے بینکرس نے صرف 15 ہزار روپے بطور قرض سرکار کو دیئے جب کہ ایڈورڈ انہیں مجبور کر رہا تھا کہ وہ 5 لاکھ جمع کرائیں۔ لیکن حکام کے سخت اقدام، جو انہوں نے پہلے دن سے کیا تھا، کے باوجود اب بھی پنجاب میں شورش نہیں ختم ہوئی تھی۔ پہلی ستمبر کو کچھ قبائلیوں نے مری پر حملہ کیا لیکن ان سے پہلے پولیس کو ان کے ارادے سے باخبر کر دیا گیا تھا۔ اس لئے انہیں واپس جانا پڑا۔ اس نئی بغاوت کا سردار احمد خاں تھا، جو خزل قبیلہ کا سردار تھا۔ ان کے ساتھ کچھ اور جنگجو قبائل مل گئے اور کچھ دنوں کے لئے انہوں نے ملتان اور لاہور کے بیچ مواصلاتی ذرائع کو ٹھپ کر دیا تھا۔ ملتان میں فوجیں کم تھیں اور وہ اچانک پیدا ہوئے اس خطرے سے مقابلے کے لئے نہیں بھیجی جا سکتی تھی۔ باغیوں نے گوگیرہ کے جنگلوں پر قبضہ کر لیا تھا، انگریزوں کے خلاف انہیں کچھ کامیابی بھی ملی۔ میجر چیمبرلین نے اپنے کو ایک چھوٹی سی سرائے میں محصور کر لیا۔ ملتان سے فوری مدد کی امید نہیں تھی۔ سر جان لارنس نے فوراً ہی پنجاب کیویلوی کو بھیجا۔ 28- ستمبر کو ملتان سے آئی ایک اور چھوٹی سی ٹکڑی بھی ان سے مل گئی۔ اور چیمبرلین کو چچاوتنی سرائے سے آزاد کرا لیا گیا۔ اب انگریزوں کے حملے کی باری تھی۔ لیکن جنگجو قبائلی جنگلوں میں محفوظ جگہوں سے ان پر حملہ کرتے رہے۔ احمد خاں کی موت سے بھی یہ لڑائی ختم نہیں ہوئی۔ باغیوں کو ایک نیا رہنما میر بہاول فتوانا کی شکل میں مل گیا۔ لیکن چاروں طرف سے گھر

جانے کی وجہ سے یہ باغی اپنے مقامی جنگل کے وسط میں پناہ گزیں ہو گئے۔لیکن برٹش فوجیوں نے ان کا ٹھکانہ ڈھونڈ لیا اور ان سب کو ختم کر دیا۔

لارنس اور اس کے ساتھیوں نے پنجاب میں امن کے قیام کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی اور انہوں نے پنجاب کو یورپین فوجیوں سے بھر دیا۔تا کہ دلی کی رج تک یورپین فوجی موجود رہیں۔وہ جانتے تھے کہ ہندوستانی فوجی برٹش مفاد کے لئے زیادہ کارآمد نہیں ہوں گے۔تاہم انہوں نے فوج میں صرف ان کی تعداد بڑھائی جب ان کے پاس فوجی ختم ہو رہے تھے۔اور پھر انہوں نے قبائلی سرداروں میں پھوٹ ڈال دی۔تا کہ وہ ایک ساتھ کبھی فرنگیوں کے خلاف نہ کھڑے ہوسکیں۔لیکن ہندوستان کو بچانا تھا اس لئے اس نے خزانے کو پنجاب اور پشاور سے بھرنے کے لئے ہر ممکن تدبیر کی۔ جب ان کی شہنشاہیت تقریباً ختم ہو رہی تھی تو لارنس اسے بچانے کے لئے ہر قیمت دینے کو تیار تھا۔اس نے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ پشاور کو چھوڑ دیا جائے اور سرحدی صوبوں میں جو فوجی ہیں انہیں ہندوستان میں تعینات کر دیا جائے اور دوست محمد سے کہا جائے کہ جو علاقہ اس کا پہلے تھا،اس کو آ کر دوبارہ قبضہ کر لے۔لیکن ایڈورڈ نے اس کی سخت مخالفت کی اور لارنس یہ عظیم قربانی دینے سے بچ گیا۔جو آدمی اس نے بھیجے اور جو رسد اس نے بہم پہنچائی اس کی وجہ سے پلڑا اس کی طرف جھک گیا۔

❁❁❁❁❁

اجنالہ کی داستان

ترجمہ: اظہار حسین کاظمی

جولائی کے آخیر تک پنجاب میں پھر غدر یا بغاوت نے سر نہیں اٹھایا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ نکلسن قرب و جوار میں ہو تو بغاوت کرنا کھلی دیوانگی ہے لیکن مہینہ بھر بعد تیسری بار پھر یہ مہلک زہر پھیلنے والا تھا۔ دیسی فوجوں کے ایک دستہ کی قسمت پر مہر لگ چکی تھی وہ دستہ جو کسی زمانے میں انتہائی منظم اور محتاط تھا۔

26 این آئی رجمنٹ میاں میر میں زیر نگرانی تھی اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے 13- مئی کو اُن سے ہتھیار لے لئے گئے تھے۔

یہ تو معلوم نہیں کہ بے ہتھیار رجمنٹوں نے کبھی کوئی ایسا سوچا سمجھا ہوا منصوبہ بنایا تھا جس پر عمل کر کے سب کے سب اپنی اس ناخوشگوار حالت سے نکل بھاگے ہوں ہاں یہ سب جانتے ہیں کہ بہت سوں کو ایسی ترغیب ضرور ہوئی اور اگر چھبیسویں رجمنٹ کسی حد تک بھی کامیاب ہو گئی ہوتی تو سولہویں گرینڈ یرز بھی اُس کے نقشِ قدم پر چل پڑتی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دوپہر کو بندوق داغنے کی آواز عام بغاوت کا اشارہ تھی۔ بہر حال 30- جولائی کو کمانڈنگ افسر میجر سپنسر کے بے رحمانہ قتل اور چھبیسویں رجمنٹ کی بغاوت سے سب لوگوں کو بہت صدمہ ہوا۔ لیفٹیننٹ ہر مانٹیگو وائٹ بال بال بچا۔ کچھ سپاہی کل پر اپنے افسوس کا بناوٹی اظہار کر کے اُسے اپنی بارکوں میں پھسلا کر لے گئے۔ وہ گھوڑے سے اترنے ہی والا تھا کہ ایک آواز نے کان میں ہی اُس سے خبر دار رہنے کو کہا۔ وہ سرپٹ بھاگا مگر کوئی بدمعاش اس دوران میں مار کر اُس کے گھوڑے کو زخمی کر چکا تھا۔ سارجنٹ میجر بھی مارا گیا اور رجمنٹ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اُسی وقت آندھی چل پڑی

(جالندھر میں بھی بغاوت کے وقت ایسا ہی ہوا تھا) جس سے انہیں بھاگ نکلنے میں آسانی ہوئی کیونکہ اُن کے بھاگنے کی سمت کا صحیح پتہ نہ چل سکتا تھا۔

وہ صاف بچ کر تو نہیں بھاگ سکے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ ہی ہنگامہ ہونے پر جب سکھ رنگروٹوں نے گولی چلا دی تو ان انگریزوں کے قتل کرنے میں جلدی کی گئی اور نتیجہ کے طور پر سب کے سب اچھے یا برے یا بے تعلق سب ہی سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعد کے بیانات میں جواب لکھ لئے گئے ہیں، بہت سے لوگوں نے تسلیم کیا ہے کہ پرکاش سنگھ عرف پرکاش پنڈی نام کا ایک کٹر متعصب شخص اپنے جھونپڑے سے باہر نکل کر اپنی تلوار ہوا میں لہرا لہرا کے اپنے ساتھیوں سے بغاوت کرنے اور غیر ملکیوں کو مار ڈالنے کے لئے چلا چلا کر کہنے لگا۔ اُس نے خود رحم دل میجر کو اپنا شکار بنانے کی ٹھانی۔ میجر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب اُسے اپنے رجمنٹ کے ہتھیار ضبط کر لینے کی اطلاع ملی تھی (اُسی رجمنٹ کی جس میں خود اُس کا قاتل بھی تھا) تو اُسے بہت افسوس ہوا تھا، انارکلی میں دہشت پھیل گئی میاں میر میں فرار ہونے والے سپاہیوں کی خالی بارکوں میں توپ کے داغ جانے سے خطرہ کا احساس انتہائی شدید ہو گیا۔

سب کو یقین تھا کہ فرار ہونے والے جنوب کی سمت بھاگے ہوں گے اور اسی لئے کپتان بلّر یو لاہور سے ایک بڑی فوج لے کر ہریکے گھاٹ کے طرف چلا اور امرتسر سے بھی اسی سمت میں فوج کا ایک دستہ (150 پنجاب پیدل اور کچھ ٹوانہ سوار) لیفٹیننٹ بوسویل کی قیادت میں بھیجا گیا۔ بوسویل وہ کرخت اور مستعد سپاہی جو ہر قسم کی تکلیف کو آسانی سے برداشت کر سکتا ہے۔ موسلا دھار بارش میں انہیں چلنا پڑا، سارے علاقے میں سیلاب کی سی کیفیت تھی۔ اس خراب موسم میں بھی اُن کے دل پُر امید تھے مگر افسوس اُن کی اُمیدیں، بیکار گئیں ڈپٹی کمشنر کو اطلاع ملی کہ باغی تو شمال کی جانب گئے ہیں۔ شاید اس اُمید میں کہ کشمیر جا پہنچیں یا شاید اُنہیں یہ اُمید ہو کر باقاعدہ منصوبہ بنا کر اُن ضلعوں میں جہاں کچھ ہتھیار بند رجمنٹ اور کچھ بغیر ہتھیاروں کے باقی تھیں جم کر مقابلہ کیا جائے۔

اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ 31- جولائی کی دوپہر کو یہ اطلاع ملی کہ وہ راوی کے بائیں جانب کنارے کنارے گذرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر خلاف توقع تحصیلدار نے پولیس کے کچھ سپاہی اور تنومند دیہاتیوں کے ایک گروہ کے ساتھ شہر سے چھبیس میل دُور ایک گھاٹ پر جم کر اُن کا مقابلہ

کیا۔فوراً ہی اُن کا پیچھا کرنے کے لئے انتظامات کئے گئے۔

چار بجے جب ضلع کا افسرِ اعلیٰ اَسّی نوّے سواروں کے ساتھ وہاں پہنچا تو اُسے ایسا نظر آیا کہ وہاں بہت زور کی جنگ ہوئی ہے جگہ جگہ خون نظر آتا تھا ہزاروں پیروں کے نشانات ارش کے سبب اُبلتے ہوئے دریا کا ٹوٹا پھوٹا کنارہ سب کچھ اس جنگ کی تصدیق کر رہا تھا۔کوئی ڈیڑھ سو آدمیوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا یا دھکا دیکر دریا میں غرق کر دیا گیا کیونکہ چالیس میل سفر طے کرنے کے بعد اُن میں اتنی طاقت تو تھی نہیں کہ سیلاب کا مقابلہ کرسکیں مگر اُن کی خاصی بڑی تعداد دریا کے کنارے آگے آگے بھاگ گئی تھی اور لکڑی کے تختوں کے سہارے تیر کر کنارے سے ایک میل دُور ایک جزیرے میں پناہ گزیں ہوگئی تھی یہ لوگ ایسے لگتے تھے جیسے جنگلی پرندوں کا ایک جھنڈ جان بخشی کے لئے لجاجت کر رہا ہو۔بس اب ان لوگوں کو گرفتار کرنا تھا اور اس کے بعد فوراً ہی واجبی سزا دینی تھی۔

پر ایک فطری مصنوعی یا اتفاقی بات نے اس کوشش کو کامیاب بنایا اور باغیوں کی قسمت کو ہمارے ہاتھوں میں دے دیا۔دن اتنا گرم نہیں تھا کہ گھوڑے غش کھا کر گر پڑیں۔حالانکہ اُن پر خاصا سامان لدا تھا اور امرتسر سے چھبیس میل کا خاصا طویل فاصلہ اُنہوں نے طے کیا تھا۔سورج غروب ہو رہا تھا۔بے ہمت باغی شاید آنے والے دستے کی تعداد کو زیادہ سمجھ لیں یا شاید یہ سمجھیں کہ یہ تحصیلدار اور اُس کے تمام دیہاتی ہیں، جنہوں نے پہلے اس شدت سے اُن پر حملہ کیا تھا اور اب وہی اپنی فتح پر اور اپنی ساتھیوں کی تعداد میں اضافے پر دریا کے کنارے کھڑے خوش ہو رہے ہیں حالانکہ اُن میں سے اکثر کوئی دس میل دور جھگوڑوں کا پیچھا کرنے گئے ہوئے تھے۔ضلع کے افسرِ اعلیٰ کے یہ اندازے تھے جو کچھ غلط ثابت نہیں ہوئے۔

صرف دو کشتیاں موجود تھیں دونوں خستہ حال اور ملاح اچھی طرح چلانا بھی نہیں جانتے تھے سواروں میں بہت سے ہندوستانی بھی تھے جو ممکن ہے ہچکچائیں یا ''اتفاقی'' طور پر کسی کو مفرور ہونے میں مدد دیں۔پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ اگر وہ خود کو گرفتار کئے جانے میں رکاوٹ نہ ڈالیں (لومڑیوں یا بطخوں کی طرح) تو اُنہیں کس طرح جزیرے سے کنارے تک لایا جائے۔دو تین پھیروں میں تو یہ ممکن تھا نہیں کیونکہ اس صورت سے تو اُس وقت دو تہائی باغی جزیرے پر تھوڑے سے سپاہیوں کی نگرانی میں ہی رکھنے پڑتے جبکہ پہلی کھیپ کو کنارے پر لایا جاتا اس طرح اُن کے

بھاگ نکلنے کا خطرہ تھا۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ پہلی کھیپ جب کنارے پر آئے تو اُسے اُن ہندوستانی سپاہیوں سے سابقہ پڑے جنہیں پہلے پھیرے میں ''گھوڑوں کی دیکھ بھال'' کے لئے کنارے پر چھوڑ جانا تھا۔ ایک شدید تصادم ہو چکا تھا اس لئے خیال تھا کہ ابھی اسے منصوبے پر عمل درآمد پر کافی سخت مقابلہ ہوگا۔

جُب یہ پوری داستان ساتھ آنے والے معمر سکھ سردار اور جماعت کے دوسرے ارکان کو سنائی گئی تو سب لوگوں کو بڑی ہنسی آئی اور منصوبہ کے مطابق عمل کرنے پر سب کے سب تیار ہو گئے۔

کشتیاں تیس پُر امید سواروں کو (ظاہر ہے گھوڑوں کے بغیر) لے کر روانہ ہو گئیں۔ اکثر ہندوستانی سواروں کو کنارے پر ہی چھوڑ دیا گیا۔ تھوڑی دیر تو یہ کشتیاں اِدھر اُدھر ڈولتی رہیں لیکن کوئی بیس منٹ میں جزیرے پر پہنچ گئیں۔ یہ ایک طویل قطعہ زمین تھا جس پر خوب اونچی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ رات کو قیام کرنے کے لئے تو یہ انتہائی موزوں تھا کیونکہ سیلاب ہر لحظہ بڑھتا جاتا تھا خاص طور پر ایسے لوگوں کے لئے جو بارش سے شرابور ہوں، بھوکے اور مایوس ہوں اور جن کے پاس نہ کھانا ہو نہ آگ کا سامان اور نہ خشک کپڑے سورج سنہری شفق میں ڈوب رہا تھا۔ اُن کشتیوں کے نزدیک آنے پر جن میں تقریباً ساٹھ دستی بندوقیں اور کچھ ریوالور اور پستول بھی اُبھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ سزا پانے والے ہاتھ جوڑ کو جزیرے کے کنارے پر جمع ہو گئے۔ اُن کے طویل سائے چمکتے ہوئے پانی پر پڑ رہے تھے۔ انتہائی مایوس ہو کر چالیس پچاس تو دریا میں کُود پڑے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے تھوڑی دُور جا کر پھر اُبھرے لیکن بڑھتی ہوئی تاریکی اُنہیں بہا لے گئی۔

تیس چالیس سوار توڑے دار بندوقیں لیے جن کے متعلق بعد میں پتہ چلا کہ برائے نام ہی کام کرتی تھیں پایاب پانی میں کود پڑے اور جزیرے کے نچلے حصے کو محاصرہ میں لے لیا۔ جب دیکھا گیا کہ یہ سوار انعام پانے کے لئے تیرنے والوں پر نشانہ لگانے والے ہیں تو انہیں ''گولی نہ چلانے'' کا حکم دیا گیا۔ اس اتفاقی حکم سے باغیوں پر فوراً ہی اثر ہوا اور صاف نظر آتا تھا کہ یکا یک احمقانہ طور پر یقین ہو گیا ہے کہ باقاعدہ شاندار دعوت کھلانے کے بعد اُن کا کورٹ مارشل کر دیا جائے گا۔ نتیجہ کے طور پر چھیاسٹھ تنومند سپاہی اُس ایک آدمی نے باندھ لیے جو کشتی سے اس مقصد کے لئے بھیجا گیا تھا۔ ان سب کو غلاموں کی طرح ایک کشتی کے اُس نچلے حصہ میں انبار کی طرح بھر

دیا گیا جو اسی لئے خالی کر دیا گیا تھا۔ جزیرے پر کوئی چالیس ہتھیار بند سواروں کو چھوڑ کر اور اس یقین کے ساتھ کہ پہلے جتھے کی پُر امن گرفتاری کے بعد باقی بھی اسی صورت سے ہاتھ آ جائیں گے واپس ہونے کے احکامات دے دیئے گئے۔

کنارے پر پہنچ کر کشتی سے اترنے کے بعد ایک ایک کو کس کر باندھ دیا گیا اُن کے تمغے یا امتیازی نشان بہت بے عزتی کر کے چھین لئے گئے اور اُن دیہاتیوں کے ایک دستے کی نگرانی میں جو وہاں جمع ہو گئے تھے اور کچھ سکھ سواروں کے ساتھ اُنہیں چھ میل دور اجنالہ کی پولیس چوکی کی طرف آہستہ آہستہ چلنے کے احکامات صادر کر دیئے گئے۔ اس دوران میں ہندوستانیوں کو (یعنی بلطوں کو) توانہ سواروں کی مرعوب کرنے والی تعداد کے ساتھ واپس جزیرے کی طرف بھیجا گیا اور یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ دوسرا جتھہ بھی بحفاظت چلا آ رہا ہے حالانکہ ایک دفعہ تو نگرانی کرنے والی کشتی دوسری کشتی سے خاصے فاصلے پر چلی گئی اور یہ احساس ہونے لگا کہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یہ فرار عمل میں لایا جا رہا ہے مگر خیر کچھ چیخ و پکار کر کے، دستی بندوقوں کی ایک باڑھ چلا کر انہیں ڈرایا دھمکایا گیا اور اس طرح دوسری پلٹی بھی بخیر و خوبی مل گئی اُنہیں بھی اُسی صورت سے لوٹ کھسوٹ کر برہنہ کیا گیا اور مشکیں کس دی گئیں کسی وقت بھی اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرتے تو بڑا خون خرابہ ہوتا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور پیچھا کرنے والوں کی جماعت کے اندازے کے مطابق سب کچھ ٹھیک طرح سے ہوا۔ بعض قیدیوں نے درخواست کی کہ اُن کی عورتوں اور بچوں کی جان بخشی کی جائے اُنہیں مطلع کیا گیا کہ برٹش گورنمنٹ عورتوں اور بچوں سے جنگ کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔

آخری جتھے کے آنے کے بعد اس تتر بتر گروہ کو بہت ہی آہستہ آہستہ مگر بحفاظت پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا ساری سڑک گھٹنے گھٹنے پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ بھی محض اتفاق تھا کہ راستہ اس قدر دشوار تھا اور یہ بھی اتفاقی بات تھی کہ چاند مہربان ہو کر بادلوں سے نکل آیا اور بے شمار نالوں اور جوہڑوں میں اُس کا عکس دکھائی دیا گویا کہ قیدیوں کے مقدر کی جانب راستہ روشن کر رہا ہو۔ ان سب باتوں کی بدولت کوئی بھی بچ کر نہ بھاگ سکا۔

آدھی رات کے قریب سب کے سب بحفاظت تھانہ میں بند کر دیئے گئے۔ مسلسل ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی، اس لئے اُنہیں اُسی وقت گولی نہیں ماری جا سکی۔ صبح تک کے لئے آرام

کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ پو پھٹنے سے پہلے چھیاسٹھ آدمیوں کی ایک اور جماعت لائی گئی اور چونکہ پولیس سٹیشن قریب قریب بھر چکا تھا۔ اس لئے انہیں ایک بڑے سے گولی مینار یا بُرج میں بھر دیا گیا۔

تعاقب کرنے والی جماعت کے ساتھ امرتسر سے روانگی سے قبل ڈپٹی کمشنر نے بہت سی رسّی منگوانے کے لئے حکم دے دیا تھا اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ گرفتار ہونے والوں کی تعداد اس قدر کم ہو کہ اُنہیں پھانسی دینی پڑے (درخت ویسے ہی کم تھے) پچاس سکھ رنگروٹوں کے لئے بھی حکم دیا گیا تھا تا کہ اگر تعداد زیادہ ہو تو اُنہیں گولی ماری جا سکے، یا اگر جزیرہ پر لڑائی ہو جائے تو یہ ریزرو فوج کے طور پر کام آ سکیں۔ یہ سکھ اس قدر مشتاق تھے کہ یہ سیدھے چلتے رہے اور ڈپٹی کمشنر سے اُس وقت جا ملے جب وہ قیدیوں کو لئے ہوئے دریا سے تھانے کی طرف آ رہا تھا۔ جب گولی مارے جانے کا کام شروع ہوا تو قیدیوں کی کل تعداد دو سو بیاسی تھی ان میں سب عہدوں کے سپاہی شامل تھے۔ ان کے علاوہ کیمپ کے بھی کچھ لوگ تھے جنہیں دیہاتیوں کے سپرد کر دیا گیا۔

تھانہ سے سو گز کے فاصلے پر ایک گہرا خشک کنواں دریافت کیا گیا۔ اس کنوئیں کی موجودگی سے ایک اُس دشواری کا بھی آسان حل مل گیا وہی دشواری جو صحت وصفائی کے متعلق تھی یعنی ان ذلیل سپاہیوں کے لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا معاملہ بھی طے پا گیا۔

خوش قسمتی سے بیک وقت واقع ہونے والے اتفاقات کی انتہا تو جب ہوئی جب یہ پتہ چلا کہ پہلی اگست کو تو مسلمانوں کا قربانی کا تہوار بقر عید ہے۔ ہندوستانی مسلمان سواروں کو امرتسر واپس بھیجنے کا بہت عمدہ بہانہ تھا تا کہ وہ بقر عید وہیں منائیں۔ ایک عیسائی ضرور تھا جو وفادار سکھوں کے ساتھ مل کر اُسی صبح کو ایک مختلف قسم کی قربانی کی رسم ادا کرنے والا تھا (اس رسم کی نوعیت بھی اُنہیں محض بتائی گئی تھی) جب وہ صبح ہوئی تو قصبے کے گرداگرد سنتری لگا دیئے گئے تا کہ تماش بینوں کو آگے نہ آنے دیا جائے۔ افسروں کو بلایا گیا اور انہیں اُس نظارہ کی تفصیل بتائی گئی جو وہ تھوڑی دیر میں دیکھنے والے تھے۔

سپاہی دس دس کر کے بلائے گئے یکے بعد دیگرے اُن کے نام لکھنے کے بعد اُن کی مشکیں کسی گئیں ایک دوسرے سے کس کر باندھ دیا گیا اور گولی مارے جانے کے مقام تک پہنچایا گیا۔

گولی چلانے والی جماعت تیار تھی۔ یہ لوگ جن کی قسمت کا فیصلہ کیا جا چکا تھا اور جنہیں فاصلے پر دستی بندوقوں کی باڑھ چلنے کی اُداس سی آواز نے ان کی ناگزیر موت کا یقین دلا دیا تھا یہ لوگ طرح طرح کی جذباتی کیفیتوں کا اظہار کر رہے تھے۔ حیرانی غصہ، شدید مایوسی اور بے انتہائی بے نیازانہ اطمینان سب ہی کیفیات نظر آتی تھیں۔ ایک دستہ جب سامنے سے گذرا تو وہ اُس تنہا انگریز مجسٹریٹ پر بحت چیخا چلایا جو تھانہ کے اندر سایہ میں بیٹھا اپنا اہم فرض ادا کر رہا تھا اُس کے ارد گرد وہی افسر تھے۔ دستہ کے لوگ چلاتے ہوئے گذرے کہ وہ مجسٹریٹ جو عیسائی ہے اُس کا بھی وہی انجام ہوگا پھر وہ اُس سکھ ریزرو فوج کے پاس سے گذرے جو ایک خاص وقت کے بعد گولی مارنے والی جماعت کی جگہ لینے والے تھے۔ قیدی حالانکہ کس کے باندھے گئے تھے مگر وہ سکھوں کو دیکھ کر ناچنے لگے سکھ مذہب کی انہوں نے توہین کی اور گنگا مائی سے مدد کے لئے دعا مانگی۔ صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی نے اُن کا جواب دینا چاہا مگر اُسے روک دیا گیا۔ بعض قیدیوں نے درخواست کی کہ اُنہیں صاحب کو آخری مرتبہ ''سلام'' کرنے کی اجازت دی جائے۔

ایک سو پچاس آدمیوں کو گولی کا نشانہ بنایا جا چکا تو گولی مارنے والوں میں سے ایک شخص بیہوش ہو گیا (وہ اُن لوگوں میں سب سے زیادہ عمر کا تھا) تھوڑی دیر کے لئے آرام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اُس کے بعد پھر وہی سلسلہ شروع ہوا اور تعداد دو سو سینتیس تک پہنچی تو ضلع کے افسر اعلیٰ کو مطلع کیا گیا کہ باقی ماندہ لوگ اُس بُرج سے باہر آنے کے لئے تیار نہیں جس میں انہیں عارضی طور پر چند گھنٹے بیشتر مقید کیا گیا تھا۔ خیال ہوا کہ یہ لوگ ہلّہ بول دیں گے اور جم کر مقابلہ کریں گے اس لئے انتظامات کئے گئے کہ کہیں یہ لوگ نکل نہ بھاگیں، لیکن باقی ماندہ باغیوں پر واقعی جو کچھ گذری اُس کی تو کسی کو بھی اُمید نہ تھی۔ اُنہیں چند گھنٹے پہلے ہی یقین ہو گیا تھا کہ موت قریب ہے۔ دروازے کھولے گئے تو کیا نظر آیا! وہ سب کے سب مر چکے تھے۔ ہاں ویل کے بلیک ہونے کا المیہ غیر ارادی طور پر کھیلا گیا۔ رات کو گھوڑ سواروں پولیس کے سپاہیوں، تحصیل کے محافظوں اور مشتعل دیہاتیوں کی چیخ پکار اور شور وغوغا میں ان لوگوں کی چیخوں کے آوازیں بھی نہیں سنائی دیں، خوف، تھکن، گرمی اور دم گھٹنے کی وجہ سے پینتالیس آدمی لقمہء اجل ہوئے، ان لاشوں کو روشنی میں لایا گیا اور گاؤں کے بھنگیوں نے انہیں بھی دوسری لاشوں کے ساتھ گڑھے میں پھینک دیا۔

ایک سپاہی جو سزا کے مقام تک گھسیٹے جانے کی اذیت سے بچنا چاہتا تھا اُلجھ پڑا اور بہت

زیادہ زخمی ہو گیا۔ اُسے سرکاری گواہ بنانے کے لئے وقتی طور پر معاف کر دیا گیا اور امرتسر میں بعد کو جو اکتالیس سپاہی اور پکڑے گئے اُن کے ساتھ اُسے بھی لاہور بھیج دیا گیا اور وہاں میاں میر میں دوسری باغیانہ ذہنیت رکھنے والی رجمنٹوں کے نظروں کے سامنے اُنہیں توپ کے منہ پر رکھ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اجنالہ میں گولی مارنے کا کام صبح سویرے شروع کیا گیا اور چند گھنٹوں میں یہ کٹھن کام ختم ہو گیا۔ اس طرح جرم ہونے کے اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر تقریباً پانچ سو آدمی قانون کی زد میں آئے۔ دیسی لوگوں کا ایک ہجوم جمع تھا، جنہیں جرم کی نوعیت کے متعلق سب کچھ بتا دیا گیا تھا اور یہ لوگ سزا کو ''منصفانہ'' مگر نامکمل سمجھتے تھے۔ کیونکہ مجسٹریٹ تاؤ میں آ کر اُن مردوں عورتوں اور بچوں پر نہیں برسا تھا جو باغیوں کے ساتھ بڑی خستہ حالی میں بھاگتے تھے۔ یہ لوگ انگریزوں کی رعایت اور انصاف پر حیران تھے۔

قبر کے اوپر ایک اونچی سی چھت ڈال دی گئی ہے (قرب و جوار کے لوگ ابھی سے اس جگہ کو ''مفسد گھر'' کہنے لگے ہیں) اور یہ جگہ خاصے فاصلے سے نظر آتی ہے۔ چونکہ یہ قبر شاہراہ پر واقع ہے اس لئے آئندہ فارسی، گورمکھی اور انگریزی کے جلی حروف میں یہاں لکھ دیا جائے گا۔
''باغیوں کی قبر''

متذکرہ بالا بیان اُس شخص نے لکھا ہے جو خود اس واقعہ کا مرکزی کردار تھا۔ ممکن ہے اُس کے وطن میں یہ بیان واقعہ کچھ عجیب معلوم ہو۔ تنہا ایک انگریز تھوڑے سے ایشیائیوں کی مدد سے اتنی زبردست ذمہ داری اپنے اوپر لیتا ہے اور قطعی غیر جذباتی ہو کر ایسی یادگار سزا کی نگرانی کرتا ہے اُسے جنگ کرنے کا جذبہ نہیں اُکساتا۔ اُسے ذاتی پرخاش کا احساس بھی نہیں کہ وہ گولی مارنے کے عمل میں اپنے انتقام کا معمولی سا شائبہ بھی شامل کرے۔ پنجاب کے گورنر خالص انگریز ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ انگلستان ہر شخص سے اُمید رکھتا ہے کہ وہ اپنا فرض بجا لائے۔ فرض ادا ہو جائے تو انگلستان شکریہ ادا کرتا ہے۔ بغاوت جرم تھی اور چاہے چند انگریزوں کو قتل بھی نہ کیا گیا ہوتا جس کا گورنروں کو صدمہ تھا پھر بھی اس معاملے میں قانون صاف تھا۔ سزا موت تھی۔

اس واقعہ کے کچھ سیاسی وجوہ بھی تھے اور ان کے تحت فوری طور پر گولی مار دینے کا فیصلہ ضروری تھا۔ نکلسن دہلی روانہ ہو چکا تھا اور لدھیانہ کے قریب پہنچ گیا تھا اس بات کا ہر باغی دستہ کو کچھ اس طرح علم تھا گویا کہ بازاروں میں اس کا ڈھنڈورا پیٹا جا چکا ہو۔ پہلی بغاوت کو کوئی تین مہینے ہو چکے

تھے اور ابھی تک دہلی پر قبضہ نہیں ہوا تھا۔ اس وقت صورتِ حالات انتہائی افسوسناک تھی۔ دوآبہ میں کم از کم ساڑھے سات غیر مسلح رجمنٹ اور دو غیر مسلح منظم ہندوستانی دستے تھے جن کی وفاداری مشکوک تھی۔ ایسی فوری اور زبردست مثال قائم کرنے کا موقعہ پہلے کبھی حاصل نہ ہوا تھا اور شاید آئندہ بھی کبھی نہ ملے تین سو بیس منظم اور جان پر کھیل جانے والے سپاہیوں کو کھلا پلا کر کسی اور مقام پر بھیجنا قریب قریب اُسی قدر مشکل تھا جتنا ان کو کچھ ہی عرصے کے لئے بحفاظت مقید رکھنا۔ جو لوگ انہیں لے جانے کے لئے متعین ہوئے۔ وہ بھی کچھ خوش نہ ہوتے اور شاید امرتسر میں مقیم غیر مسلح یورپی رجمنٹیں بھی کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیتیں اور کچھ بعید نہ تھا کہ وہ انہیں بچانے کی فکر کرتیں۔ سارے دوآبہ کے دیسی لوگوں پر اس واقعہ کے اثر کے متعلق ہمارے جو خیالات تھے وہ غلط ثابت نہیں ہوئے۔ کیونکہ اس رجمنٹ کے کالعدم ہونے کے بعد سے اُس جگہ مقیم دیسی فوجوں میں کسی قسم کے کوئی ''آثار'' نظر نہیں آئے ہیں۔ اگر 26 این آئی بچ نکلتی یا اُسے اتنی فوری ایسی ہولناک سزا نہ دی جاتی تو ساری غیر مسلح رجمنٹیں یقینی طور پر اُن کے نقش قدم پر چلتیں اور نہ معلوم کیسے کیسے نتائج ہوتے جن کے متعلق اب سوچنا بیکار ہے مگر تصور کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اُن کے نیست و نابود ہونے سے غالباً ہزاروں کی جان بچ گئی۔ چیف کمشنر نے اس موضوع کے متعلق اپنے فرمان میں لکھا ''امید کی جاتی ہے کہ ان فوجیوں کو جس طرح فوری طور خاص سزا دی گئی وہ دوسروں کو ایسے بلا وجہ ظالمانہ قتل کرنے سے باز رکھے گی جن کی وجہ سے بنگال کے سپاہی بدنام ہوئے ہیں۔''

وہ دیکھے سوزِ محبت سے دل کے داغ کی لو
نہ دیکھی جس نے ہو بھڑکے ہوئے چراغ کی لو

جلا جلا کے کیا شمع ساں تمام مجھے
بس اور تو مرے سوزِ جگر سے کچھ نہ ہوا

❁❁❁❁❁

1857ء کی تحریکِ آزادی اور میوات

نصیر الدین ازھر

1857ء کی پہلی جنگ آزادی سے لے کر 1947ء میں حصول آزادی تک میوؤں نے جدوجہد آزادی اور قومی اتحاد کی تحریک میں جو نمایاں رول ادا کیا وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

1857ء کی بغاوت ملک میں سامراج کو ختم کرنے کی سب سے بڑی اور منظم کوشش تھی جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ آزادی کی یہ پہلی جدوجہد کچھ لوگوں کی عجلت پسندی اور کوتاہ بینی کی وجہ سے ناکام ہوئی اور انگریزوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برائے نام مغل سلطنت کو بھی ختم کر دیا۔ مغل حکومت کا خاتمہ صرف سیاسی یا عسکری وجوہات کی بنا پر نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے پس پشت اقتصادی وجوہات بھی تھیں۔

مغل حکومت کے زوال کے بعد ہندوستان پر پوری طرح انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا اور پھر اس کے بعد انگریزوں کے ظلم وستم کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

راجدھانی دہلی سے قریب ہونے کی وجہ سے میوات میں انگریزوں کو سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے صوبوں کی طرح میواتی کسان بھی انگریزی لگان اور ان کے افسروں اور دوسرے کارندوں کی لوٹ کھسوٹ اور ظلم و بربریت کا شکار تھا۔ ادھر الور اور بھرت پور کے راجہ میو کسانوں کا بری طرح استحصال کر رہے تھے۔ 1835ء میں لوہارو کے نواب شمس الدین کو جب انگریزوں نے پھانسی پر لٹکایا تو میوات کے لوگ انگریزوں کے خون کے پیاسے ہو گئے اور ہر لمحہ انتقام کی آگ ان کے دلوں میں دہکنے لگی۔ 1854ء میں چند انگریز افسر میوات آئے۔ ان کا مقصد میوؤں کی سرکشی کو دبانا تھا۔ اسی مقصد کے تحت میوات کے کئی میو چودھریوں کو پکڑ کر

دہلی لے گئے۔ نتیجے کے طور پر پورے میوات میں انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔ اتفاق سے 10- مئی 1857ء کو جیسے ہی میرٹھ میں فساد شروع ہوا میوؤں نے انگریزوں پر دھاوا بول دیا۔ سرکاری دفتروں، ڈاک خانوں اور سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دی۔ 11- مئی کو تقریباً 300 سپاہی دہلی سے گڑگاؤں پہنچے۔ قرب و جوار کے ہزاروں کسان، مزدور اور دوسرے لوگوں نے ان سپاہیوں کا ساتھ دیا۔ گڑگاؤں کے کلکٹر ڈبلیو فورڈ نے بجواسن گاؤں کے نزدیک ان مجاہدوں کو روکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ان باغیوں نے گڑگاؤں پر حملہ کر دیا جس میں باغیوں کو سات لاکھ چوراسی ہزار روپے خزانے سے ہاتھ لگے۔ انہوں نے انگریزوں کے گھروں میں آگ لگا دی اور ان مجاہدین کو جو ان کی جیلوں میں قید تھے آزاد کرا لیا۔ ادھر میو بہت بڑی تعداد میں متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف ہو گئے اور پنگواں کے کسان لیڈر صدرالدین کی رہنمائی میں آزادی کا اعلان کر دیا۔ بقول Metcalfe:

''ایک ایک گاؤں کو سنبھالنے کے لئے ہمیں پانچ پلٹنیں اور توپ خانے کے دستوں کے ساتھ جانا پڑتا تھا۔''

اس دور کے دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہریانہ کے گاؤں میں بسنے والے کسانوں نے نہ تو انگریزوں کو زمین کا لگان دیا اور نہ ہی دوسری طرح کے کوئی ٹیکس ہی ادا کئے۔ سرکاری افسروں نے خوف اور دہشت کے مارے ان گاؤں میں جانا بند کر دیا تھا۔

1857ء کی جدوجہد آزادی میں میوات علاقہ کا کوئی ایسا محاذ نہ تھا جس پر میوؤں نے جنگ نہ کی ہو۔ بلکہ وہ ایک ساتھ کئی کئی محاذوں پر لڑتے تھے۔ ایک طرف ان کا سب سے بڑا دشمن انگریز تھا تو دوسری طرف انگریز پرست غدار وطن۔ تاوڑو اور جوراسی میں ان کی لڑائی تین طرفہ تھی۔ ایک طرف کیپٹن ایڈن کی رہنمائی میں مہاراجا جے پور کی فوج تھی تو دوسری طرف راؤ تلارام اور جاٹوں سے محاذ آرائی ہوئی اور تیسری طرف خود انگریز فوج تھی۔ اس لڑائی میں میوؤں کو بڑا بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ کافی تعداد میں میو شہید ہوئے اور ان کے گاؤں کے گاؤں نذر آتش کر دیئے گئے۔ انگریز میوؤں کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ بریگیڈیئر شاورس لکھتا ہے کہ:

''جب میں گڑگاؤں ضلع میں داخل ہوا تھا تو میں دشمنوں کے دیس میں تھا۔ میں نے جہاں بھی قیام کیا میرے ہر سفر کے دوران مجھ پر حملہ ہونے

کا اندیشہ تھا۔ جس گاؤں سے گزرا وہاں دشمن کی طرف سے ہمیشہ چوکنا رہنا پڑا۔" (1)

اس طرح انگریزوں کے خلاف ہر قدم پر میوؤں نے مقابلہ کا۔ میوات کے مجاہدین ہر چند کہ تعلیم یافتہ نہیں تھے مگر ان میں جنگی مہارت غضب کی تھی۔ وہ گوریلا جنگ کا طریقہ اپناتے تھے اور انگریزوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ اب مجاہدین کی سرکوبی کے لئے انگریزوں نے نئے سرے سے منصوبہ بنایا اور بریگیڈیئر جنرل شاورس، کیپٹن ہڈسن، کیپٹن ڈرمنڈ، ڈبلیو فورڈ اور کلے فورڈ وغیرہ انگریز افسروں نے قتل و غارت گری کا ایسا بازار گرم کیا کہ عوام میں خوف و ہراس اور بے چینی پھیل گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں بے گناہوں کا قتل ہوا اور کئی گاؤں کو خاکستر کر دیا گیا۔ مگر حریت پسند میوؤں کے حوصلے اور استقلال میں کوئی کمی نہیں آئی۔

1857ء کی سب سے مشہور جنگ بھونڈسی کے قریب رائے سینہ گاؤں میں ہوئی۔ چونکہ انگریز عمل داری کے بعد رائے سینہ اور اس کے گرد و نواح کے کچھ گاؤں جیسے رائے سینا، ہر چند پور، سانپ کی نگلی، نونیرہ، ہرپاہیڑہ، محمد پور، بائیکی، ہرمتھلا اور فیروز پور جھرکا کا دوہا وغیرہ ضبط کر لئے گئے اور وہاں کے کاشت کاروں کے مالکانہ حقوق ہمیشہ کے لئے سلب کر لئے گئے تھے۔

یہاں انگریز پرست اور سازشی راجپوتوں اور کائستھوں نے شکایت کی کہ رائے سینا میں باغی میو بھاری تعداد میں جمع ہو رہے ہیں جو کسی وقت بھی حملہ کر سکتے ہیں۔ شکایت سنتے ہی مسٹر کلے فورڈ نے رائے سینا پر حملہ کر دیا۔ اس نے ہر اس آدمی کو موت کے منہ میں پہنچا دیا جو اس کے سامنے آیا۔ یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں بخشا۔ لیکن فورڈ کی یہ بے دریغ قتل و غارت گری زیادہ دنوں تک نہ چل سکی اور آخر کار میو مجاہدین نے اسے قتل کر دیا۔ اس کے علاوہ 60 دیگر انگریزوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کچھ انگریزوں کو میوؤں نے پکڑ لیا اور بیلوں کی طرح گھانٹے میں جوڑ کر کانٹے دار باڑھ گھوائی۔ اس گاؤں میں بہت سے انگریزوں کو قتل کر کے ان کے سروں کو چوپال کے صحن میں دفن کر دیا۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ جب یہاں انگریز آئے تھے تو سر ننگا کر کے سلام کرتے تھے۔ بعد میں انگریزوں نے انتقامی جذبے کے تحت رائے سینا کی زمین نیلام کر دی۔ 26- جنوری 1862ء کو یہ گاؤں بحق سرکار ضبط کر کے تیرہ سو روپے میں گوکل سنگھ کو دے دیا گیا۔

ادھر سوہنہ اور نوح میں بھی مجاہدین نے انگریزوں کے خلاف ایک محاذ قائم کر رکھا تھا۔ یہاں کی سرگرمیوں کا ذکر غالب نے اپنی کتاب 'دستنبو' میں یوں بیان کیا ہے:

''ادھر سوہنہ اور نوح کے علاقے میں میواتیوں نے بے طرح شورش برپا کر رکھی تھی۔ جیسے دیوانے زنجیروں سے آزاد ہو گئے ہوں۔ تلارام شورش پسند کچھ دنوں تک ریواڑی میں ہنگامہ آرا رہا۔ پھر شیطان کی رہنمائی سے بلوائیوں سے مل گیا۔ یہ گروہ میدانوں اور پہاڑوں میں انگریزوں سے برسرِ پیکار رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر ہر طرف تیز آندھیوں اور بھڑکتی آگ کے ہنگامے بپا ہیں۔ ان غم انگیز حالات میں جن کا آغاز یاد نہیں اور جن کا انجام معلوم نہیں ہے رونے کے علاوہ کچھ دیکھا ہو تو آنکھوں کے روزن خاک سے بھر جائیں۔''(2)

مجاہدین آزادی نے نوح کو اپنی مہم کا مرکز بنا رکھا تھا۔ یہاں کافی دنوں تک مجاہدین اور انگریزوں کے درمیان جنگ جاری رہی۔ اڈبر اور شاہ پورنگلی سے مجاہدین نوح میں جمع ہوتے اور انگریزوں سے ہمہ وقت محاذ آرائی کے لئے تیار رہتے تھے۔ مجاہدین نے تاوڑو، سوہنہ، فیروز پور، یونہانا، پٹنگوان اور نوح میں ایک طویل جنگ کی جس کی پاداش میں 52 آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ ان شہیدوں میں چار اڈبر، بارہ شاہ پورنگلی اور باقی نوح کے باشندے تھے۔

ان مجاہدین پر سزا کے علاوہ تین ہزار روپے جرمانہ بھی ہوا اور نوح کے میو بسویداران کی زمین ضبط کر لی گئی اور مقامی خان زادوں کو بطور انعام دے دی گئی۔(3)

1857ء کی سرکاری رپورٹ اور دستاویز جن میں خطوط بھی شامل ہیں، دیکھے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہتھین اور روپڑاکا علاقہ بھی میو مجاہدین کا ایک اہم مرکز تھا۔ ہتھین میں اس وقت انگریز پرست راجپوت تھے جنہیں میو مجاہدین ختم کر دینا چاہتے تھے۔ مجاہدین پلول میں سرکاری خزانہ لوٹنا چاہتے تھے۔ لیکن انگریزوں نے ان پر بھاری بمباری کر دی جس سے مجاہدین بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہاں انگریز فوجیوں نے کئی گاؤں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ پچانکا، گوہ پور، چلی، مالپوری، روپڑاکا، کوٹ، اٹاوڑ، مٹھاکا اور جھانڈا گاؤں بری طرح نذرِ آتش کر دیئے۔

میوؤں نے اپنے قومی وقار کو بحال رکھنے، وطن عزیز کو غلامی سے نجات دلانے اور خود کو ایک

1857ء اور الٰہ آباد کا مورچہ

لئیق رضوی

الٰہ آباد میں انقلاب کا بگل 6- جون 1857ء کو پھونکا گیا۔ اس وقت یہاں انگریز سپاہی نہین تھے۔ چند گورے افسروں کی قیادت میں چھٹویں دیسی پیدل پلٹن اور فیروز پور رجمنٹ کی پانچ کمپنیاں یہاں تھیں۔ قلعہ اور اسلحہ خانہ کی حفاظت میں بھی فیروز پور رجمنٹ کے 400 سکھ سپاہی اور دیسی پلٹن کے 80 جوان تعینات تھے۔ آس پاس سے آ رہی فوجی بغاوت کی خبروں کے بعد انگریز افسروں نے چنار سے آئے 60 پینشن یافتہ گورے توپچیوں، چند سارجنٹ اور 200 سکھ سپاہیوں کو قلعہ میں بلا لیا۔ (1) اودھ سے دیسی سواروں کی ایک پلٹن بھی بلائی گئی۔ (2) انگریز افسر اندیشے میں تو تھے، لیکن یہاں لوگوں میں پنپ رہے غصہ کی انہیں بھنک بھی نہیں لگی۔ پھر ہندوستانی فوجیوں نے بھی اپنی وفاداری کا یقین دلا، دلا کر، انگریز افسروں کو آخری وقت تک اندھیرے میں رکھا۔ 6- جون کی شام ڈھلتے ہی بنارس میں فوجی بغاوت کی خبر جیسے ہی یہاں پہنچی، ان فوجیوں نے بھی بغاوت کا علم بلند کر دیا۔

رات قریب نو بجے دارا گنج میں ناؤ پل کی حفاظت پر متعین چھٹویں پلٹن کے جوانوں نے آتش بازی کا ایک تیر (ہوائی) آسمان میں چھوڑا۔ ویسا ہی ایک تیر چھاؤنی سے بھی چلا اور بغاوت شروع ہو گئی۔ دارا گنج میں تعینات ٹکڑی کے پاس دو توپیں بھی تھیں۔ یہ لوگ نعرہ لگاتے ہوئے چھاؤنی میں گھس آئے اور وہاں موجود سارا اسلحہ اور گولہ بارود اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کمپنی کے ساتھ گئے دونوں انگریز افسروں نے کسی طرح بھاگ کر جان بچائی۔ لیفٹیننٹ ہکس تو اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر قلعہ میں بھاگ گیا۔ کیپٹن ہاورڈ مدد کے لئے الوپی باغ میں لیفٹیننٹ الیگزینڈر کے

پاس پہنچا۔ انقلاب کی خبر سنتے ہی وہاں موجود دیسی سپاہی بھی بھڑک گئے اور انہوں نے الیگزینڈر کو گولی ماردی۔ ہاورڈ کسی طرح بچتے بچاتے قلعہ میں پہنچا۔ اسی رات چھٹھم لائنس چھاؤنی میں جب انگریز افسر کھانا کھا رہے تھے، باغی سپاہیوں نے بگل بجایا۔ بگل سن کر وہ لوگ باہر نکل آئے۔ سپاہیوں نے ان پر بندوقیں تان دیں۔ کئی انگریز افسر مارے گئے۔ تین افسروں نے بھاگ کر قلعہ میں پناہ لی۔ انگریزوں نے سوار پلٹن کو مدد کے لئے آواز دی، لیکن یہ لوگ بھی انقلابیوں سے جا ملے۔ زیادہ تر گورے افسر مارے گئے۔ ان کے بنگلوں میں آگ لگا دی گئی۔ بغاوت کی جانکاری ملتے ہی انگریز افسروں میں بے چینی پھیل گئی۔ خوف کا یہ عالم تھا کہ قلعہ میں موجود دیسی پلٹن کے سپاہیوں کو نہتا کر کے باہر نکال دیا۔(3) بعد میں یہ سپاہی بھی انقلابیوں سے مل گئے۔ لیکن سکھ پلٹن قلعہ کے اندر ہی رہی۔

7- جون کی صبح مولوی لیاقت علی اپنی آبائی بستی مہنگاؤں سے الہ آباد پہنچ گئے۔ انہوں نے خسرو باغ کو صدر مقام بنایا۔ انقلابی اور انگریز فوج سے نکالے گئے فوجی ان کے ساتھ جمع ہو گئے۔ مولوی لیاقت علی نے اسی روز خسرو باغ میں دربار بلایا۔ جب وہ دربار میں آئے تو انقلابیوں نے بہادر شاہ ظفر کے نام 101 توپوں کی سلامی دی۔ 21 توپوں کی سلامی سے مولوی لیاقت علی کی قیادت کا اعلان کیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، میواتی پٹھان آگے آگے تھے۔ میواتی پٹھانوں کی پنچایت نے 5- جون کو ہی انقلاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔(4) اپنے سردار شیر خاں کی قیادت میں سینکڑوں جیالے میواتی، مولوی لیاقت علی کی فوج میں شامل ہو گئے۔ مسجدوں میں آزادی کا خطبہ پڑھا گیا۔ انقلابیوں نے کمپنی کی سرکار ختم کر دی۔ جیل کا پھاٹک توڑ کر قریب تین ہزار قیدیوں کو آزاد کرا لیا گیا۔ اس مہم میں بہت سے انگریز مارے گئے۔ دارا گنج میں ناؤ کے پل سمیت شہر میں فوجی اہمیت کے حامل سبھی ٹھکانوں پر انقلابیوں کا قبضہ ہو گیا۔ 30 لاکھ روپے کا سرکاری خزانہ لوٹ لیا گیا۔ پولیس بھی انقلابیوں سے مل گئی۔ کلکٹریٹ اور کوتوالی سمیت شہر کی سبھی اہم عمارتوں اور دفتروں پر انقلاب کا پرچم لہرانے لگا۔

7- جون کو شہر میں جشن کا سماں تھا، ہر طرف آزادی کے نعرے بلند تھے۔ لوگ پھولے نہیں سما رہے تھے۔ انقلابیوں نے ہرا جھنڈا لے کر جلوس نکالا، جس میں عام لوگ بھی شامل ہوئے۔ بچے بھی گلیوں میں جھنڈے اٹھائے نعرے لگاتے پھر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انقلاب کی یہ

آ گ پھیل گئی اور جمنا پار کے کچھ علاقوں کو چھوڑ کر، پورا الہ آباد انقلابیوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ انگریزوں کے مقرر زمیندار ہٹا دیئے گئے۔اس دوران انگریزوں کی مدد کے لئے باہر سے کمک بھی آئی مگر انقلابیوں کی کامیاب مورچہ بندی کی وجہ سے ان کی ایک نہ چل سکی۔انگریز قلعہ میں قید ہو کر رہ گئے۔شہر کے انگریز بھی جان بچا کر قلعہ میں جا چھپے۔ قلعے پر قبضے کے لئے مولوی لیاقت علی نے مجاہدوں کے ساتھ قلعے کے مغربی حصے کی پشت سے حملہ کیا۔ زبردست گھمسان ہوا۔ دونوں طرف سے بہت سے سپاہی مارے گئے، لیکن جیت انگریزوں کی ہوئی اور مجاہدوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ مولوی لیاقت علی کو یقین تھا کہ جب انقلاب کا نعرہ بلند ہو گا تو قلعہ کے اندر موجود سکھ سپاہی بھی بغاوت کر دیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ انقلابیوں کا ساتھ دینے کے بجائے، سکھ سپاہیوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ سندر لال لکھتے ہیں:

> ''اگر قلعہ کے سکھ اس وقت مجاہدوں کا ساتھ دے جاتے تو آدھے گھنٹے کے اندر الہ آباد کا قلعہ اور اس کے اندر کا سارا سامان مجاہدوں کے ہاتھوں میں آ جاتا۔ مگر ٹھیک مصیبت کے اس وقت سکھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ انگریزی جھنڈا الہ آباد کے قلعے پر لہراتا رہا۔''(5)

مولوی لیاقت علی جانتے تھے کہ انگریزیوں ہی ہار نہیں مان لیں گے۔ چنانچہ وہ اپنی فوجی طاقت بڑھانے میں لگے رہے۔ جلد ہی ان کی فوج میں بڑی تعداد میں والنٹیئر بھرتی ہو گئے۔ خسرو باغ کے سامنے کی سرائے خلد آباد کو انہوں نے چھاؤنی میں تبدیل کر دیا۔ انقلابیوں کو دو رجمنٹ میں تقسیم کیا گیا، ایک کی قیادت خود مولوی لیاقت علی نے کی اور دوسری کی قیادت چھٹویں پلٹن کے باغی سردار رام چندر کو سونپ دی۔ ملک کی محبت کے ساتھ ساتھ یہ فوج بھائی چارے کے رنگ میں بھی رنگی ہوئی تھی۔ سپاہی ایک ساتھ اللہ اکبر اور ہر ہر مہادیو کے نعرے لگاتے۔

انقلابیوں کے پاس اسلحہ کے نام پر انگریزوں سے چھینی گئی چند توپوں، بندوقوں اور گولہ بارود کے علاوہ تلواریں، بھالے اور لاٹھیاں ہی تھیں۔ لیکن مختصر ساز و سامان کے باوجود انہوں نے فرنگیوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ قلعہ میں رسد کی قلت سے انگریزوں کی حالت خستہ تھی اور قریب تھا کہ وہ انقلابیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے لیکن کچھ لوگوں کی غداری نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ ایک دیسی غدار کے ذریعہ انگریز افسروں نے نوگاؤں چھاؤنی کو پیغام بھیج کر کمک مانگی۔ فوجی

نقطہءنظر سے الہ آباد ایک بڑا محاذ تھا۔ یہ سڑک اور آبی راستہ کا ایک اہم مرکز تو تھا ہی یہاں قلعہ میں تقریباً سو برس سے انگریزوں کی چھاؤنی بھی قائم تھی، یہاں گولہ بارود کا بڑا ذخیرہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہاں کا قلعہ ہاتھ سے نکل جاتا تو پورے شمالی ہند کے ہتھیاروں کی سپلائی منقطع ہو جاتی۔ اسی لئے الہ آباد کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے انگریزوں نے پوری طاقت صرف کر دی۔ 9- جون کو کمپنی سرکار نے الہ آباد میں مارشل لاء کا اعلان کر دیا۔ 11- جون کو کرنل نیل گورے سپاہیوں کا لشکر لے کر بنارس سے الہ آباد پہنچا۔ دارا گنج کے پل پر قبضے کے بعد وہ اسی راستے سیدھے قلعے میں آ گیا۔ کرنل نیل نے قلعہ میں موجود کمپنی کے وفادار سکھ سپاہیوں پر بھی بھروسہ نہیں کیا اور پاس کی بستی میں لوٹ مار کے بہانے انہیں قلعہ سے باہر بھیج کر قلعہ کی حفاظت کا انتظام اپنے ساتھ کے گورے سپاہیوں کے سپرد کر دیا۔(6)

12- جون کی صبح انقلابیوں کے لئے سختی کا پیغام لے کر آئی۔ کرنل نیل نے انقلابیوں کے خلاف سلسلہ وار مہم شروع کی۔ سیدھے مقابلے سے پہلے، انقلابیوں کا حوصلہ پست کرنے کے لئے اس نے بستیوں کو نشانہ بنایا۔ پہلے دارا گنج پر توپوں سے گولے برسائے گئے اور پھر مدراس فیوزیوئیرس اور فیروز پور رجمنٹ کے فوجیوں نے سخت حملہ کر کے پوری بستی پر قبضہ جما لیا۔ اس حملے میں بہت سے شہری شہید اور زخمی ہوئے۔ 13- جون کو کرنل نیل کے سو گورے سپاہی شہر میں گھسے۔ ان کی قیادت میجر اسٹیفنس کر رہا تھا۔ اسی روز جوائنٹ مجسٹریٹ کلنک نے جھانسی میں بے رحمی سے کارروائی کرتے ہوئے وہاں کمپنی کی حکومت پھر سے بحال کر دی۔ 14- جون کو میجر ہیرس نے مدراس فیوزیوئیرس کی ایک بٹالین ندی کے راستے یہاں بھیجی۔ اس میں سو گورے سپاہی اور چار افسر شامل تھے۔ اسی دوران انگریز سپاہیوں نے جمنا کنارے کی شاہی جامع مسجد کو گولے برسا کر شہید کر دیا۔ اس مسجد کے آثار اور سنگی در و دیوار کے کچھ ٹکڑے اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

15- جون کو انگریزوں کا حملہ اور تیز ہو گیا۔ اس روز قلعہ کی فصیل پر بھاری توپ خانہ لگا کر کیڈ گنج اور مٹھی گنج پر گولہ باری کی گئی۔ اس کے بعد لیفٹیننٹ ہیلی نے بڑے لشکر کے ساتھ حملہ کیا۔ اب جہاں کراس ویتھ گرلز کالج ہے وہاں انقلابیوں اور گورے سپاہیوں کے درمیان سیدھا اور سخت مقابلہ ہوا۔ مجاہدوں نے پوری طاقت سے مقابلہ کیا، لیکن جدید اسلحہ سے لیس، تربیت یافتہ

گورے سپاہی بہرحال انقلابیوں پر بھاری پڑے۔

اس مقابلے میں بہت سے مجاہد شہید ہوئے، کافی گورے بھی مارے گئے۔ انگریزوں نے چوک تک کا علاقہ انقلابیوں سے پھر چھین لیا۔ حوصلے توڑنے کے لئے فرنگیوں نے عام شہریوں پر بھی خوب مظالم کئے، لیکن لوگوں نے ان کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ انہیں عام طور پر ہر طرف سے نفرت کا سامنا تھا۔ کسی بھی قیمت پر کوئی فرنگیوں کی مدد کو تیار نہ ہوتا۔ خورشید مصطفیٰ رضوی نے لکھا ہے:

''انگریز مدت تک چین سے نہ بیٹھ سکے۔ نہ تو رسد ملتی تھی، نہ سواری کے لئے جانور، حتیٰ کہ بیماروں کے لئے کہار تک نہ تھے اور گرمی شدید تھی۔ عوام نے دشمن کا اتنا زبردست بائیکاٹ کر رکھا تھا کہ گورے کے ہاتھ روٹی بیچنے کے جرم میں ایک نان بائی کے ہاتھ اور ناک کاٹ لی گئی۔ نیل نے انقلابیوں کی گرفتاری کے لئے انعام مقرر کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔''(7)

15- جون کو ہی گورے سپاہیوں نے جمنا کنارے کے دریاباد اور سعد یہ آباد پر حملہ کر کے زبردست مار کاٹ کی۔ 17- جون کو کرنل نیل نے بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ خسرو باغ کی طرف کوچ کیا۔ کرنل نیل کے تربیت یافتہ سپاہی جدید اسلحوں سے لیس تھے۔ اس کے ساتھ ایک بھاری توپ خانہ بھی تھا، جسے وہ بیلوں سے کھنچوارہا تھا۔ یہ بیل اس نے پھاپھامئو کیٹل فارم سے 16- جون کو ہی منگوا لئے تھے۔ راستے میں جگہ جگہ انقلابیوں اور عام لوگوں نے اس لشکر کو روکنے کی کوشش کی۔ لیکن انگریز فوج کے سر پر تو خون سوار تھا۔ مخالفت کرنے والے قریب 400 لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد، کرنل نیل کی فوج نے خسرو باغ اور سرائے خلد آباد کو گھیر لیا۔ دن بھر جنگ ہوئی۔ مولوی لیاقت علی نے جب دیکھا کہ انگریزوں کی اس بڑی فوج سے جیتنا ممکن نہیں ہے تو وہ رات میں کچھ ساتھیوں کے ہمراہ انگریزوں سے لوٹا گیا خزانہ لے کر کانپور روانہ ہو گئے۔ 17- جون کی صبح انگریز فوج نے خلد آباد پر گولے برسائے، اس سے شہر کا دروازہ، دیواریں اور کئی عمارتیں منہدم ہو گئیں۔ انگریزوں نے خسرو باغ اور سرائے خلد آباد پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ساتھ الٰہ آباد پر دوبارہ کمپنی کا اقتدار بحال ہو گیا۔ کرنل نیل نے کمپنی کے ذمہ داروں کو پیغام بھیج کر الٰہ آباد میں اقتدار کی اطلاع دی اور مستقبل کے لئے 500 یوروپین فوجی اور توپ خانہ کا مطالبہ کیا۔

اس کے بعد انگریز فوجیوں نے مارشل لاء کی آڑ میں الہ آباد میں زبردست ظلم ڈھایا۔ بستیاں جلادی گئیں۔ ہزاروں لوگوں کو سرعام قتل کیا گیا۔صرف چوک میں جی ٹی روڈ کے کنارے نیم کے سات پیڑوں پر تقریباً سات سو لوگوں کو پھانسی دی گئی۔انگریزوں کے ظلم کا گواہ ایک پیڑ اب بھی زندہ ہے۔تاریخ کی کتابوں میں اس جوروظلم کا ذکر محفوظ ہے۔سر جان، جان کیمبل اور ولیم رسل جیسے کئی انگریزوں نے بھی اس کی تائید کی ہے۔سندرلال نے انگریز مورخوں کے حوالوں سے لکھا ہے:

> ''جنرل نیل کے سپاہی ایک ایک گاؤں میں گھستے تھے۔ جتنے بھی آدمی راستے میں ملتے انہیں وہ بنا کسی سبب تلوار کے گھاٹ اتار دیتے تھے یا گولی سے اڑا دیتے یا پھانسی پر لٹکا دیتے۔جگہ جگہ پھانسی کے تختے کھڑے کئے گئے، جن پر چوبیس گھنٹے برابر کام جاری رہتا تھا۔جب ان سے بھی کام نہ چلا تو انگریز افسروں نے درختوں کی شاخوں سے پھانسی کا کام لینا شروع کیا۔جس آدمی کو پھانسی دینی ہوتی تھی، اسے عام طور پر ہاتھی پر بٹھایا جاتا تھا۔ہاتھی کو کسی اونچی ڈال کے پاس لے جایا جاتا تھا۔اس آدمی کی گردن رسی سے ڈال کے ساتھ باندھ دی جاتی تھی۔ پھر ہاتھی کو ہٹا لیا جاتا اور لٹکتی ہوئی لاش کو اسی جگہ چھوڑ دیا جاتا تھا۔''(8)

شہر میں آج بھی ایسے تمام نشانات ہیں جو انگریزوں کے ظلم وستم کی کہانی اپنی زبان میں بیان کرتے ہیں۔اب جہاں کمپنی باغ ہے پہلے وہاں میواتیوں کی جیتی جاگتی بستی تھی۔گورے فوجیوں نے یہاں کے لوگوں کو گرفتار کر لیا، مکان جلا دیئے گئے۔یہاں ایک مسجد اب بھی موجود ہے جس پر اس ظلم کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔1870ء فتح کی یادگار میں یہاں چمن کاری ہوئی اس کا نام الفریڈ رپارک رکھا گیا، لیکن شہرت کمپنی باغ کے نام سے ہوئی۔مہنگاؤں میں مولوی لیاقت علی کا مکان کھود ڈالا گیا۔شہر میں مارکاٹ تیز ہوئی تو جان بچانے کے لئے کچھ لوگوں نے کشتیوں کے سہارے دریا پار بھاگنے کی کوشش کی لیکن گھاٹ اور قلعے کی فصیلوں پر تعینات انگریز سپاہیوں نے ان پر گولے برسا کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔(9) بھولا ناتھ چندر نے اپنی کتاب ''ٹریولیس آف اے ہندو'' میں الہ آباد میں ہوئے اس قتل وغارت

اس کو بنا دیا۔ اور ناموں کے سوا کہیں کوئی خامی باقی نہ رہنے دی۔ ناظرین خود غور کر سکیں گے کہ عبارت کے تسلسل میں اور مطلب سمجھنے میں کہیں بھی کسر نہیں ہے۔

ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے۔ خصوصاً ابتدائی مشق میں غلطیوں کا ہونا لازمی ہوتا ہے مگر قابل تعریف ہیں حسن عزیز صاحب کہ انہوں نے اتنی جلدی بہت اچھا ترجمہ کر دیا اور ترجمہ کی مشکلات پر غالب آ گئے۔

انگریزوں کے ناموں میں اکثر لوگوں کو اردو میں لکھتے وقت مشکل ہوا کرتی ہے موجودہ وائسرائے کا نام مدتوں اخبارات میں اختلافات کا اکھاڑہ رہا۔ کوئی ان کو لارڈ شیمسفورڈ لکھتا تھا۔ کوئی لارڈ چمسفورڈ۔

یہی حال اس کتاب اور اس کے حصوں کا ہے کہ اس میں انگریزوں کے ناموں کا تلفظ غالباً صحیح ادا نہیں ہوا ہوگا۔ باقی مطالب سب درست ہیں۔

پس میں حسن عزیز صاحب بھوپی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے سب سے پہلی کوشش میں ترجمہ کو بڑی تیزی اور سرعت سے پورا کر دیا۔

ترجمہ کے دوران میں اطلاع ملی کہ دہلی کے کسی اور صاحب نے بھی بہادر شاہ کے مقدمہ کا تھوڑا سا حصہ دہلی کی تاریخ میں شریک کیا تھا۔ میں نے ہر چند اس کتاب کو تلاش کیا مگر وہ دستیاب نہ ہوئی۔ تاہم مجھے ان صاحب کی تحریر پر اعتماد و بھروسہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ فرضی عبارتیں و فرضی حکایتیں اور فرضی حوالہ جات تاریخ کی کتابوں میں درج کر دینے میں مشہور ہیں۔ اور ان کی دلیری اور جھوٹ بولنے اور جھوٹ لکھنے کی بیباکی پر شمس العلماء علامہ شبلی مرحوم تک حیرت زدہ رہتے تھے۔ لہٰذا میں نے ان کی کتاب کو زیادہ تلاش نہ کیا اور خود ہی ترجمہ کرایا۔

انگریزی زبان میں بہادر شاہ کا مقدمہ ٹرائل آف بہادر شاہ کے نام سے چھپا ہے۔ اور دہلی کی سرکاری لائبریری میں بھی اس کی اصل انگریزی کاپی موجود ہے۔ جس کو ضرورت ہو دیکھ سکتا ہے۔ تاکہ ترجمہ کے نا قابلِ فہم حصے سمجھ سکے اگر اُس کو کہیں شبہ پیدا ہو۔

حسن نظامی

☆☆☆

تیسری اشاعت

یہ مجموعہ 1919ء میں پہلی بار اور 1923ء میں دوسری بار شائع ہوا تھا۔ گویا پہلا ایڈیشن چار برس میں ختم ہوا تھا اور دوسرا ایڈیشن 16 برس میں ختم ہوا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سولہ برس کا یہ دور کساد بازاری اور معاش کی کمی اور بے روزگاری کا زمانہ تھا۔ اس واسطے کتابوں کی خریداری اس زمانہ میں بہت کم رہی۔ میری کتابیں خدا کے فضل سے پرامیسری نوٹ کی طرح چلتی ہیں۔ پھر بھی ایسی دلچسپ اور مقبول کتاب کے سلسلہ کی یہ کڑی سولہ برس میں ختم ہوئی اس سے ہندوستان کی اقتصادی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔

تیسرا ایڈیشن بغیر کسی ترمیم و تبدیلی کے شائع ہو رہا ہے کیونکہ یہ چیز ایسی ہے کہ اس میں کسی تبدیلی اور ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔

حسن نظامی
جولائی 1939ء۔ دہلی

☆☆☆

اقتباس از صادق الاخبار دہلی

صفحہ 285

ایران۔ ایرانی اخبارات سے یہ تحقیق ہوا ہے کہ شاہِ ایران نے اپنی تمام فوجوں کو مختلف اضلاع سے بلا کے طہران میں تا حکم ثانی ٹھہرنے کا حکم دیا ہے جس کے لئے کہتے ہیں کہ وہ (فوجیں) جو حکم پائیں گی دل و جان سے بجا لائیں گی۔ صحیح خبر دی گئی ہے کہ یہ حکم جو امیر دوست محمد خاں کے خلاف توقع ہے دراصل شاہ ایران کی ایک چال ہے اپنے اصلی مقاصد کو پوشیدہ رکھنے کے لئے۔ ان کا مقصد امیر سے لڑنے کا نہیں ہے بلکہ انگریزوں سے لڑنے اور ان پر فتح پانے کا ہے۔ امیر برطانوی طاقت پر بھروسہ کر کے انگریزوں سے مل گئے ہیں اور انگریزوں اور ایرانیوں کے درمیان تمام بے لطفیوں کا موجب ہیں۔ شاہِ ایران نے سر دست دوستانہ تعلقات انگریزوں سے ظاہراً منقطع نہیں کئے ہیں نہ انہوں نے امیر دوست محمد خاں سے ذاتی دشمنی اختیار کی ہے۔ تاہم یہ

صحیح ہے کہ تینوں طاقتوں میں کچھ نہ کچھ خیالات کی تبدیلی ضرور ہوگئی ہے۔

اقتباس از صادق الاخبار دہلی

نمبر 4 جلد 3۔ مورخہ 26 جنوری 1857ء

فرانس۔ یہ بیان کرنے میں تمام اخبارات متفق ہیں کہ شاہ فرانس وشہنشاہ ٹرکی نے تاحال انگریزوں یا ایرانیوں سے متحد ہونے کا اعلان نہیں کیا ہے۔ لیکن ہر دو مخالف طاقتوں کے سفیر ہر دو مذکورہ بالا سلطنتوں میں تحفہ تحائف لے کر پوشیدہ پوشیدہ جاتے ہیں۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ شاہِ فرانس اور شہنشاہ ٹرکی انگریزوں اور ایرانیوں کے درمیانی قصہ میں نہ پڑیں گے۔ لیکن زیادہ تر لوگ کہتے ہیں کہ وہ دونوں ایرانیوں کے جانبدار ہوں گے۔ بعد میں جو کچھ تحقیق ہوگا بے کم و کاست شائع کر دیا جائے گا۔ روسیوں کے متعلق یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تیاریوں کو جن سے وہ مدد کریں گے مخفی نہیں رکھا ہے وہ فوج کی اور مال کی امداد ایرانیوں کو پہنچاتے رہیں گے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دراصل روسی ہی اس جنگ کے محرک ہیں اور ایرانیوں کی آڑ پکڑ کر اپنی فتح ہندوستان کی تمنا پوری کرنی چاہتے ہیں۔ یہ یقینی ہے کہ روسی فوج جرار لے کر میدان میں آ جائیں گے۔ اگر آئندہ کچھ تحقیق ہوا تو شائع کیا جائے گا۔ ناظرین صادق الاخبار کو منتظر رہنا چاہئے کہ پردۂ مستقبل کیا آشکارا کرتا ہے۔

اقتباس از صادق الاخبار دہلی

نمبر 2 جلد 3 مورخہ 16 مارچ 1857ء۔ صفحہ 83-82

دربار ایران۔ بمبئی کے سابق پرچوں سے جو پریس ہذا میں موصول ہوئے ہیں معلوم ہوا کہ شاہِ ایران نے رؤساء ہرات کو مع اپنے عمائد کے ایک روز دربار میں طلب کیا۔ اور ایک کانفرنس جنگ کی بابت منعقد کی۔ بعد گفت وشنید ان سب نے انگریزوں سے جنگ کرنے کی رائے دی اور یہ یقین کر کے کہ خدا کامیاب کرے گا انہوں نے کہا۔ ہرات کو لے لینے سے تم گویا ہندوستان کے دروازہ پر پہنچ جاؤ گے۔ پھر کہا کہ روسیوں کی بھی خواہش ہے کہ ایرانی انگریزوں سے جنگ کریں اور ہندوستان کو فتح کریں۔'' اس پر بادشاہ نے بیان کیا کہ ''وہ ان مدبرین سے بہت

خوش ہوا جنہوں نے اس نمک حرام وزیر اعظم کے مخالف رائے دی اور اقرار صالح کیا کہ جب وہ ہندوستان پہنچ جائے گا تو ان لوگوں کو مختلف صوبہ جاتِ ہند کا گورنر بنائے گا جن میں کا ایک بمبئی دوسرا کلکتہ تیسرا پونا وغیرہ اور وہ تاج بادشاہ دہلی کو بخش دے گا۔"

اسی اثناء میں خبر ملی کہ وزیر اعظم نے تاج شہنشاہی کو جس میں بیش قیمت جواہرات تھے ایک سوداگر حاجی علی کی معرفت چوری سے ایک لاکھ پچیس ہزار فرانک میں فروخت کر ڈالا۔ اور اسے (سوداگر کو) رقم کا چوتھائی حصہ دیا۔ اس پر بادشاہ نے وزیر اعظم کو طلب کر کے اس معاملہ کو دریافت کیا لیکن اس نے لاعلمی ظاہر کی پھر بادشاہ نے اس سوداگر کو گرفتار کر کے اس پر جرمانہ کیا۔ اور وزیر اعظم پر بسبب غیر اقوام سے ربط ضبط رکھنے کے بیحد ناراضگی و خفگی ظاہر کی۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ وزیر اعظم کے فرائض منصبی کسی اور مدبّر کے سپرد کیے گئے ہیں۔ مذکورۂ بالا وزیر اعظم نے بادشاہ کو صلح کل پالیسی قائم رکھنے کی صلاح دی تھی بادشاہ کو خبر دی گئی کہ شہنشاہ روس نے چالیس ہزار فوج مع کثیر سامان و اسلحہ جنگ اس کی امداد کے لئے روانہ کی ہے جس کی کئی ٹکڑیاں ایرانیوں سے آ کر مل بھی گئی ہیں اور یہ خبر بھی آئی ہے کہ شہنشاہ روس نے کہا کہ اگر مراسلہ فوج جنگ کے لئے ناکافی ہوگی تو اور فوج جنگ و جدال کے لئے روانہ کی جائے گی۔ ان سپاہیوں کے جواب میں بادشاہ نے شہنشاہ الگزنڈر والئی روس کی بہت مدح سرائی کی اور ہدایات جاری کیں کہ روسی افواج کے مصارف کے لئے اس کے خزانہ سے روپیہ لے لیا جائے اور روسی فوج کے کسی ہرکارہ تک کو بھی کسی قسم کی تنگی یا تکلیف نہ پہنچے۔ اس کے بعد فرانسیسی سفیر نے خوشخبری سنائی کہ اس کا بادشاہ جو چند روز سے علیل تھا خدا کے فضل سے پوری طرح صحت یاب ہو گیا ہے۔ بادشاہ نے یہ سن کر کہا کہ "میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔" پھر سفیر خارجیہ نے اپنے آقا کی طرف سے بادشاہ سے عرض کیا کہ برخلاف قوانین انگلستان اور ٹرکی کے آپ کے ملک میں ہنوز بردہ فروشی جاری ہے۔

ایران میں شاہ ایران کے انگریزوں سے جنگ کرنے کا خاص سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایرانی سلطنت میں پانچ پشتوں سے تسخیر ہند کا سودا سمایا ہوا ہے اور اسی وقت سے ہر قسم کے اسلحہ جات و سامان جنگ اور خزانہ جمع ہو رہا ہے لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی اپنے ارادوں پر عمل درآمد نہیں کیا۔ چنانچہ ناصر الدّین موجودہ بادشاہ کو بھی یہی ہوس ہے اور یہ اس کی قدیمی خواہش ہے جو اس کو وراثتہً ملی ہے۔ اب ایک طرف تو ہرات آسانی سے قبضہ میں آ گیا۔ دوسری طرف روسی

گئے تو ان کا شمار شہداء میں ہوگا۔ وگرنہ وہ غازی کہلائیں گے بہمہ وجوہ جہاد سے بڑھ کر کوئی کام نہیں ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ امیر اس کے برعکس رویہ اختیار کریں گے تو وہ پہلے اپنے مذہب سے دور ہو جائیں گے دوسرے یہ کہ تمام دنیا کی نظروں میں ذلیل ہوں گے۔ تیسرے یہ کہ بزدل کہلائیں گے۔ چوتھے ان پر غضب الٰہی نازل ہوگا۔

شاہ ایران نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''آہ امیر! کیا تم دین سے منکر ہو کر انگریزوں سے مل گئے ہو؟ میں بحیثیت مسلمان تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ میرے ساتھ ہو جاؤ اور ان کی تباہی کی تدابیر کرو۔ یہ بھی سمجھ رکھو کہ تمام مسلمان شاکی ہیں کہ امیر نے انگریزوں سے مل کر اپنے مذہب کی تحقیر کی ہے۔ اگر صرف طمع ہی تمہارے اس رویہ کی موجب ہو تو مجھ سے دوگنا زر لے لو۔ اور کیا تم نے سنا نہیں کہ انگریزی قوم نے سلاطین و رؤساء ہند سے کیا کیا بدسلوکیاں کی ہیں؟ امیر نے اس خط کا بہت احترام کیا اور رئیس سوات کے ہمراہ حاضر ہونے کا وعدہ کیا ہے۔ اور شاہ ایران ہرات میں داخل ہو گئے ہیں۔ قندھاری فوجوں نے ان تمام انگریزوں کو قتل کر ڈالا جو آگے بڑھ گئے تھے۔

ایڈیٹر پنجابی رقم طراز ہے کہ چونکہ اعلان بہت طول طویل ہے لہٰذا اس نے اقتباس کر لیا ہے اور اس کے خیال میں جو بات مفید مطلب ہے وہ یہ ہے کہ محمرہ پر قبضہ کر لیا گیا اور یہ کاغذ ہاتھ آ گیا ورنہ یہاں تک کبھی نہ پہنچ سکتا۔

شکر ہے کہ برطانیہ عظمٰی کا آفتابِ اقبال نصف النہار تک چمک رہا ہے۔ یہ یقین کر لینا چاہئے کہ شاہِ ایران کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوں گی۔ اخبار پنجابی کا اقتباس یہاں ختم ہو گیا اور اب ہم اخبار انگلشمین کی رائے پر نظر ڈالتے ہیں۔ افواہ ہے کہ ایک زبردست فوج بہت جلد درہ بولن پر پہنچنا چاہتی ہے مگر ہم اس خبر کو چنداں وقعت نہیں دیتے کیونکہ موسم گرما شروع ہو گیا ہے۔ ہمیں اطلاع موصول ہوئی ہے کہ سلطان جان دوست محمد خاں کا بھتیجا شاہ ایران سے مل گیا ہے اور اب فوج ہمراہ لے کر خراہ سے قندھار کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کچھ متعصب مغل اپنے ہم مذہبوں سے ملنے کی غرض سے ایران روانہ ہو گئے ہیں۔ اس واقعہ نے امیر دوست محمد خاں کو بہت تشویش میں ڈال رکھا ہے کیونکہ یہ مغل اپنے مذہبی اصولوں اور جنگی کرتبوں میں مشہور ہیں۔

23-اپریل 1857ء کو میجر لمسڈن کچھ انگریز افسروں اور فوجدار خاں گورنمنٹ ایجنٹ کے ہمراہ ''ناراب'' پہنچے ہیں۔

ایڈیٹر کراچی اخبار مسمی ''سندھین'' بمبئی ٹائمس کا حوالہ دیتے ہوئے نمبر 33 کی اشاعت میں رقم طراز ہے: خبر ہے کہ ''پچاس ہزا ایرانیوں نے تین یا چار روسی افسروں کے زیر کمان بوشہر پر قبضہ کرلیا تھا لیکن انگریزوں نے پھر چھین لیا اور تین ہزار روسی جو دوران کارزار میں ایرانیوں سے جدا ہو گئے تھے پسپا ہو گئے اور سخت نقصان برداشت کرنا پڑا۔ شمال میں لشکر کثیر جمع ہو رہا ہے اور سنا گیا ہے کہ بحیرہ کاسپین اور بخارا کی طرف سے روسی طاقتیں بہت زبردست ہیں۔ ایڈیٹر پنجابی لکھتا ہے کہ ایرانیوں نے مکمل انتظام کرلیا ہے اور متعدد مقامات مثلاً آوار گنج، کوکن کرش وغیرہ میں چھاؤنیاں قائم کی ہیں جہاں ضروریات کی چیزیں کثیر مقدار میں فراہم کر لی ہیں۔ اکرام خاں، رئیس محمد عظیم خاں، حیدر خاں، افضل خاں اور جلال الدین خاں پسر اکبر خاں بادشاہ کے ساتھ ہیں اور غلام حیدر خاں کو شاہِ ایران کی طرف سے چھتیس ہزار روپیہ انعام ملا ہے اور وہ (غلام حیدر خاں) دل و جان سے بادشاہ پر قربان ہے، اور صرف راستہ کھلنے کی راہ دیکھ رہا ہے۔ تعجب نہیں کہ جو ایرانی قندہار میں داخل ہو جائیں اور آگے بڑھیں۔ پشاور سے آنے والے مسافروں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر دوست محمد خاں کے اقرار و معاہدوں پر اعتبار نہ کرنا چاہئے۔ لیکن خدائی طاقت کیسی زبردست ہے کہ انہیں جس نے اب تک روک رکھا ہے اور اب یہ کہا جاتا ہے کہ برطانوی فوجیں پشاور میں جمع ہو رہی ہیں خدانخواستہ اگر اس طرف کوئی جنگ ہوئی تو اس کا نتیجہ سوا خونریزی کے اور کیا ہونا ہے۔ حال میں ایرانی خبریں آنی بند ہو گئی ہیں۔ ہمارے ناظرین یہ نہ سمجھ لیں جیسا کہ ناواقف لوگ بیان کرتے ہیں کہ گورنمنٹ نے خبریں شائع کرنی ممنوع کردی ہیں بلکہ برخلاف اس کے گورنمنٹ کی تو خواہش ہے کہ دنیا کے دور دراز مقامات کی صحیح خبریں پبلک کے سامنے کھول کر رکھ دی جائیں اور تمام ملک اخبار سے مستفید ہوا کرے۔ اور یہی سبب ہے جو حکام خود اخبارات پڑھتے ہیں اور ان پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جیب خاص سے خرچ کر کے پبلشروں اور پرنٹروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں لیکن خبریں خود ہی نہ آ جائیں تو اس کا کیا علاج؟ بہر کیف جو دور و دراز کی خبریں پڑھتے ہیں انہیں منتظر رہنا چاہئے کیونکہ اب جو ڈاک آئے گی اس میں ضرور تازہ خبریں موصول ہوں گی خواہ وہ صلح کی ہوں یا جنگ کی۔ خدا چاہے تو میں بدون طرفداری کئے یا چھپائے من و عن شائع کردوں گا۔ کیونکہ ہماری گورنمنٹ کا بھی یہی رویہ ہے کہ کسی حق بات کو پوشیدہ نہ رکھا جائے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی

سلطنت روز بروز قوی ہو رہی ہے اور علوم و فنون پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ ہو رہے ہیں۔ قادر مطلق اس عادل گورنمنٹ کو تادمِ حشر سلامت رکھے۔

☆☆☆

اقتباس از صادق الاخبار دہلی

نمبر 5 جلد 4 مورخہ 3- اگست 1857ء

ایرانی فوج کی آمد۔ میرے ایک دوست جو نہایت صائب الرائے ہے اور فارسی زبان بولتے ہیں حال ہی میں وارد ہوئے ہیں بیان کرتے ہیں کہ ایرانی فوجیں جو سلطان جان خاں پسر خون دل خاں کے زیر کمان عرصہ دراز سے قراہ متصل ہرات پڑی ہوئی تھیں۔ اب باجازت شاہ ایران قندھار کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ یہ سن کر امیر دوست محمد خاں کا لڑکا دو یا تین ہزار قواعد داں سپاہیوں کے ہمراہ مقابلہ آ رہا ہوا۔ لڑائی پورے چھ روز تک جاری رہی اور طرفین کے سینکڑوں آدمی کام آئے۔ آخر کار امیر کا لڑکا میدانِ جنگ سے شکست کھا کر بھاگ نکلا اور ایک قلعہ میں محصور ہو گیا۔ ایرانی فوج نے کامل طور پر قندھار کا محاصرہ کر لیا اور رسد کی آمد چاروں طرف سے بالکل منقطع کر دی۔ اس لئے امیر کے لڑکے نے کابل سے امداد طلب کی ہے۔ سنا ہے کہ امیر دوست محمد خاں بہت جلد روانہ کریں گے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ امیر نے شاہ ایران کے پاس ایک عاجزانہ خط بھیجا ہے کہ وہ بھی بادشاہ کی رعایا یا ملازم ہیں اور انہیں انگریزوں کو مدد دینے کا ذرا بھی خیال نہیں ہے اور بادشاہ کو ہندوستان کی طرف فوجیں روانہ کرنے پر زور دیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ وہ حتی المقدور رسد یا فوج دینے سے دریغ نہ کریں گے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ امیر شاہ ایران کو تحائف بھیجنے والے ہیں۔ شہزادہ محمد یوسف رئیس ہرات ہندوستان و انگریزوں کی شاہ ایران کو ہر وقت خبریں پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور شاہ ایران کو ان شہزادہ پر بہت اعتماد ہے اور اکثر ان کی رائے پر عمل درآمد کرتے ہیں۔

اقتباس از صادق الاخبار دہلی

ایڈیٹوریل آرٹیکل نمبر 6 جلد 4 مورخہ 10- اگست 1857ء

شاہ ایران کی چال۔ شاہِ ایران نے انگریزوں سے کئی لڑائیاں لڑنے کے بعد فرخ خاں

کی معرفت صلح کی درخواست کی ہے۔ میں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ یہ جنگ بغیر حکمت کے نہیں ہے بقول شخصے ''سلامِ روستائی بے غرض نیست'' اور مجھ کو یقین کلی تھا کہ اس درخواست میں ضرور کوئی چال مضمر ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ اس دماغ کی رسائی پر مجھے اپنے تئیں شاباشی دینی چاہئے۔ کیونکہ مجھے معتبر قاتلان کفار سے معلوم ہوا ہے کہ ایرانیوں کا اصلی مقصد ہرات پر قبضہ کرنا اور انگریزوں کو بوشہر سے نکالنا تھا چنانچہ وہی ہوا جس کی امید کی جاتی تھی۔ شرائط صلح بین الاقوام کی رو سے انگریزوں نے بوشہر خالی کر دیا۔ لیکن ایسا ہونے کے بعد بھی شاہ ایران ہرات سے دستبردار نہیں ہوا۔ علاوہ ازیں انگریز اپنی بے دخلی پر بہت شرمندہ و پریشان ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ایرانیوں سے اس کی باز پرس کریں گے مگر یہ ایک فضول دھمکی ہے ہمیں غور کرنا چاہئے کہ جب انہیں تھوڑی یا بہت طاقت تھی تو وہ کیا کرنے کے قابل تھے جواب کچھ کریں گے۔ ایک صاحب یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ایرانیوں نے یہ سمجھ کر کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئے 5000 کی جماعت کو قندھار کی طرف روانہ کیا ہے۔ امیر دوست محمد خاں کافروں کے دوست ہیں لیکن پوشیدہ طور پر وہ تمام ذرائع ایرانیوں کو ترغیب دینے اور ان سے سازش کرنے میں صرف کر رہے ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایرانی فوج جس میں کچھ کابلی افسر ہیں ثابت قدمی سے ہندوستان کی طرف بڑھ رہی ہے۔

مذکورہ بالا جیسی خبروں کو سن کر عیسائی بہت پریشان ہو رہے ہیں۔ اور انہیں یقین ہے کہ کمپنی کے زوال کا وقت بیشک قریب آ پہنچا ہے۔

☆☆☆

اقتباس از صادق الاخبار دہلی

نمبر 34 جلد 19 مورخہ 23- اگست 1857ء

ایران کی فوجی خبریں۔ پنجاب و پشاور کی طرف سے آنے والے کچھ لوگ بیان کرتے ہیں کہ ایرانی فوج اٹک پہنچ گئی ہے۔ گو مجھے فی نفسہ اس پر یقین نہیں ہے مگر میں نے عوام کی زبانی یہ افواہ سنی ہے اس وجہ سے اس کو شائع کیا۔ اور ممکن بھی ہے کہ ایسا ہو کیونکہ کسی طرح بعید الفہم نہیں ہے جو لغو یا جھوٹ تصور کر لیا جائے۔ لیکن یہ ضرور خیال آتا ہے کہ جس طرح یہ افواہ مشہور کی جاتی ہے اس پر یقین و بھروسہ نہیں ہو سکتا۔

اقتباس از صادق الاخبار دہلی

نمبر 8 جلد 4 مورخہ 24۔اگست 1857ء

ایرانی فوج کا نزدیک پہنچ جانا۔ایڈیٹر ''ٹرنیمفنٹ نیوز'' رقم طراز ہے کہ اس نے پنجاب وپشاور کی طرف سے آنے والے مسافروں سے سنا ہے کہ ایرانی فوج نے اٹک تک راستہ صاف کر لیا ہے۔ مجھے چند وجوہات کی بنا پر یہ خبر قابل یقین نظر آتی ہے۔اول کوئی شخص کچھ نہیں کہتا کہ تاوقتیکہ اس کی کوئی دلیل نہ رکھتا ہو۔دوم ولی صفت شاہ نعمت اللہ صاحب کی پیشین گوئی ہے کہ ہندوستان پر عیسائیوں اور آتش پرستوں کی سو سال تک حکومت رہے گی۔ پھر جب ان کے قلمرو میں بے انصافی وظلم ہونے لگے گا تو ایک عرب کا شہزادہ اٹھے گا اور بصد عزّ وشان آ کر انہیں قتل کرے گا۔سوم جب ملتان کی فوجوں نے بغاوت کی تو کہا تھا کہ ہمارے افسروں اور شاہ ایران میں خط وکتابت ہوتی ہے۔ چہارم شاہ ایران نے یہ سن کر کہ برطانوی سلطنت میں میرا ایک پُر جوش و سرگرم دوست ہے اور ایک جاسوس روانہ کیا تھا اور وہ جاسوس یہاں آیا تھا۔میرے ایک دوست سے کہا تھا کہ شاہِ ایران نے ہندوستان آنے کا مصمم قصد کرلیا ہے۔پس چاہے وہ جلدی آئے یا دیر سے مگر اس کے آنے میں کلام نہیں۔واللہ اعلم بالصواب۔

اقتباس از صادق الاخبار دہلی

نمبر 37 جلد 19 مورخہ 13۔ستمبر 1857ء

ایران۔بعض لوگ پھر کہہ رہے ہیں کہ ایرانی فوج ''درہ بولن'' اور ''بی بی نزی'' پر آ گئی ہے اور امیر دوست محمد خاں نے بخوشی خاطر اپنے حدود میں سے اسے گذرنے دیا ہے لیکن بموجب مشہور ہندی کہاوت کے کہ برہمن کھانے کی دعوت پر اُس وقت یقین کرتا ہے جب کھانا سامنے آجاتا ہے۔ اہل ہند اس پر اُسی وقت یقین کریں گے جبکہ کوئی عینی شہادت مل جائے گی۔لیکن کئی وجوہات کی بنا پر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ خواہ موجودہ خبریں صحیح ہوں یا غلط لیکن ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ ایک نہ ایک روز ایرانی فوجیں ضرور آئیں گی خواہ درّہ بولن سے ہو کر آئیں یا بمبئی و یا سندھ سے۔باقی خدا ہی علام الغیوب ہے۔یعنی غیب کی خبریں سوائے اُس کے کسی کو معلوم نہیں۔

❁❁❁❁❁

1857ءاور فارسی اخبارات

اخلاق احمد آہن

فارسی زبان وادب نے ہندوستانی تہذیب وثقافت اور زبان وادب پر جتنے گہرے اور وسیع اثرات مرتب کیئے ہیں، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ گذشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں اس ملک کے ہر گوشے اور ہر خطے کی تہذیبی وراثت میں فارسی زبان وادب اور فارسی تہذیب کے نقوش دکھائی دیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس زبان کو نظر انداز کر کے ہم اپنے زبان وادب یا تاریخ کے مطالعہ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔ اس کے ساتھ یہ بھی درست ہے کہ فارسی زبان و ادب کو پروان چڑھانے اور اس میں رنگ و بو بھرنے میں ہندوستانیوں کا رول اہل ایران سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ اسی ضمن میں ہندوستانی صحافت میں فارسی صحافت کا ذکر بھی بے حد اہم ہے اور ہمارے لئے یہ قابل فخر بھی ہے کہ دنیا کا پہلا فارسی اخبار ''مرأۃ الاخبار'' 1822ء میں ہندوستان ہی سے شائع ہوا۔

ہندوستانی صحافت کے باضابطہ آغاز کا سہرا راجہ رام موہن رائے کے سر ہے۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے 1822ء میں فارسی، ہندی اور بنگلہ میں اخبارات جاری کیئے۔ اس کے بعد بڑی تعداد میں مذکورہ زبانوں کے ساتھ ساتھ دیگر دیسی زبانوں میں اخبارات شائع ہونے شروع ہوئے۔ اس نئی ابتدا کے ساتھ ہی ہندوستان کی عمومی صحافت میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ انگریزی اخبارات جو اب تک کمپنی کے حمایتی اور مخالف گروپوں میں منقسم تھے، آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے اور بالآخر دیسی زبانوں میں چھپنے والے اخبارات اور انگریزی اخبارات ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ چنانچہ بعد میں عام طور سے دیکھا گیا کہ

انگریزی اخبارات حکومت کے ہر غلط صحیح قدم کا جواز پیش کرنے لگے۔ نتیجتاً ہندوستانی اخبارات کے احتجاجی رویہ میں سختی آتی گئی اور یہ شدت 1856ء میں اودھ ریاست کے انگریزی حکومت میں انضمام اور 1857ء میں جنگ پلاسی کے صد سالہ موقع پر نقطۂ عروج پر پہنچ گئی جس کی تصدیق مشہور مستشرق گارسیں دتاسی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے:

> ''ان منحوس کارتوسوں کی تقسیم کے موقع پر ہندوستانی اخباروں نے جو بددلی پھیلانے میں پہلے سے مستعدی دکھا رہے تھے، اپنی غیر محدود آزادی سے فائدہ اٹھایا اور اہل ہند کو کارتوسوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کرنے پر آمادہ کیا اور یہ باور کرادیا کہ اس حیلے سے انگریز ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔''(1)

بغاوت کے زمانے میں دیسی اخبارات پر پابندی لگاتے ہوئے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے ان اخباروں کے 'منفی' رول کی شکایت کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ''دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیئے۔ یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا۔''(2)

اگرچہ 1857ء کے ایکٹ XV کی رو سے دیسی اور غیر ملکی انتظام کے تحت جاری ہونے والے اخبارات کے درمیان کوئی بھید بھاؤ نہیں رکھا گیا تھا، لیکن ایک انگریزی اخبار ''فرینڈز آف انڈیا'' نے اولاً ان ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ''پلاسی صد سالہ'' کے عنوان سے اداریہ لکھا، جس پر تنبیہہ کی گئی اور اس تنبیہہ کا اس نے جواب بھی دیا۔ اس کے مالک مارش مین (جو اس وقت لندن میں تھے) نے وہاں سے کسی قانونی خلاف ورزی نہ کرنے کی ہدایت بھیجی۔ انہیں حکومت کو صفائی بھی دینی پڑی۔(3) لیکن، اس کے بعد ملک کی سیاسی فضا اس قدر مکدر اور مسموم ہو گئی کہ جلد ہی اخبارات حکومت کے مخالف اور حامی دو خیموں میں بٹ گئے۔(4)

یہی نہیں، بلکہ اس سے قبل ہندوستانی سیاست کی مسموم فضا کو اس کے پیش رو لارڈ ڈلہوزی نے بھی بھانپ لیا تھا اور 1856ء میں استعفیٰ دے کر انگلستان واپس چلا گیا تھا۔ جب لارڈ کیننگ کو یہ ذمہ داری دی گئی تو اسے ہندوستان کے نازک حالات کا پورا احساس تھا۔ چنانچہ ہندوستان

آنے سے پہلے اس نے اپنے الوداعیہ تقریر میں کہا تھا:

"میں ایک پرامن حکومت چاہتا ہوں، لیکن میں یہ بھی فراموش نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کا آسمان جو بظاہر پرسکون ہے، وہاں بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نمودار ہو کر ساری فضا پر چھا سکتا ہے اور ہم کو تباہیوں سے شرابور کر سکتا ہے۔" (5)

فارسی اخبارات نے بغاوت کے زمانے میں ہی نہیں، بلکہ ابتدا ہی سے ایسی خبریں اور تبصرے چھاپے اور ایسا انداز اور لہجہ اختیار کیا، جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان اخبارات نے ہندوستانی عوام کے ذہنوں میں کس طرح سے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا کیا۔ البتہ بغاوت کے وقت ان کے لہجہ میں مزید شدت آ گئی، جو فطری امر تھا۔ چنانچہ جے۔ لونگ (Rev. J. Long) نے 1859ء کی اپنی رپورٹ میں ہندوستانی اخبارات کے لب ولہجہ اور تیور پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ دیسی پریس کو مجموعی طور پر سیفٹی والیا (Safety Valve) کہا جا سکتا ہے، جو خطرے کی وارننگ دیتا ہے۔ اس طرح اگر یوروپی اہل کاروں نے جنوری 1857ء میں دہلی کے دیسی اخباروں سے رجوع کیا ہوتا تو انہیں بخوبی اندازہ ہو جاتا کہ ہندوستانی کس حد تک بغاوت کے لئے کمربستہ تھے اور انہیں ایران اور روس سے مدد کی امید بھی تھی۔ (6)

مذکورہ حقائق کی روشنی میں History of Indian Journalism کے مصنف جے۔ نٹراجن (J. Natrajan) کی بات غلط اور بے معنی معلوم ہوتی ہے کہ:

"ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس بغاوت میں ہندوستانی اخبارات نے ادنیٰ قسم کا رول بھی ادا کیا ہو۔" (7)

رجب علی حسینی لکھنوی کی ادارت میں شائع ہونے والا اخبار "سلطان الاخبار" انگریزوں کی ظلم و زیادتی، فریب کارانہ اور متعصبانہ سازشوں کی نقاب کشائی کو اپنا فرض سمجھتا تھا اور جس بے باکی سے ان پر تبصرے کرتا تھا، اس کی نظیر اس وقت کی صحافت میں ملنی مشکل ہے، مثلاً موصوف نے 2- ستمبر 1835ء کے شمارے میں "خبر رسم و عادات انگریزان در ممالک ہندوستان" کے عنوان سے تین صفحہ پر مشتمل ایک طویل مضمون شائع کیا، جس میں نہ صرف یہ کہ انگریزوں کے مستبدانہ رویہ کا ذکر کیا بلکہ ہندوستانیوں کو اس بات پر غیرت بھی دلائی کہ مٹھی بھر انگریز یہاں آ کر

لوگوں پر ظلم کر رہے ہیں اور لوگ بے چوں و چرا اسے برداشت کر رہے ہیں۔ اس مضمون کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

''مردم می گویند کہ انگریزان قلیل و کمتر اند و ہندوستانیان کثیر و بیشتر و در سرکار انگریز بہادر تدارک و عدل همچنین است کہ ہر کرا کشندہ می دانند میکشند، لیکن عجب است کہ درین معنی غور و تامل بکار نہ برند کہ آخر ہر جا کار کنان انگریزی دگری و دمس و قید و قتل و قصاص و اخراج ملک و ضبط تمغا و ملک می سازند و کسی دم نمی زند......'' (8)

اسی طرح اخبار نے اپنے پہلے ہی شمارہ (یکم اگست 1833ء) میں صوبہ بنگال میں رونما ایک لڑکی کی انگریز تاجر کے ہاتھوں آبروریزی کے واقعہ اور عدالت کے متعصبانہ رویہ کی رپورٹنگ ''خبر عدالت کلکتہ'' کے عنوان سے ان الفاظ میں کیا:

''شنیدہ ام کہ دختری ہندوی بحضور حاکم مرافعہ برد کہ فلان انگیریز تاجر نیل خواہرم را از کنار آب درربود و آغوش خویشتن از تن آن نازک بدن گرم نمود۔ مادرم و برادرم ازاین واقعہ در آتش کدہ غم افتادہ اند و از این پردہ دری و بی ناموسی چو شمع لگن بہ سوختند۔'' (9)

ملزم انگریز کو جب مرافعہ کی خبر ملی تو اس نے پولیس سے ساز باز کر کے لڑکی کے سارے خاندان پر چوری کا الزام لگا کر جیل میں بند کرا دیا۔ اس کی بوڑھی ماں نے ''بہ زندان وداع حیات واپسین نمود'' یعنی قید میں ہی مر گئی۔ اس کے بعد رجب علی لکھنوی نے غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ ''این است ظلم انگریز بر رعیت'' اور آخر میں لکھا کہ اس کارروائی کی وجہ سے عوام ''ظن بردہ اند کہ شاید رعایت ابنائے جنس از انصاف بہتر است۔'' (10)

ایک دوسری خبر سرکاری دفاتر کی بے راہ روی، خاص طور سے عدالتوں اور کچہریوں میں کام کرنے والے منشی اور دیگر ملازمین کی ظالمانہ حرکات، بدتمیزیوں اور رشوت ستانیوں کے بارے میں تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق:

''از حال منشیان عدالت چہ نویسم کہ برہمہ چیرہ دست اند و سرہنگان شحنہ در عقوبت و آزار بہ ہلاکوی وقت برابر نمایند و عیش و شحنہ رئیس جفاکاران

است و چپراسیان پرمٹ از نقد بازرگانان و مسافران کیسہ ندارند۔
ونوکران خانہ ءڈاک خصوصاً کرانیان آن جادر خیانت بی باک اند۔ اگر
مظلومی بہ حضور حکام مرافعہ بردیا شکایت نماید حکام اغماض فرمایند۔ بی
چارہ راازبارگاہ می رانند۔''(11)

اس دور کے حالات کو دیکھتے ہوئے رجب علی حسینی کے انتہائی بے باکانہ اور بے لاگ انداز تحریر کو دیکھ کر لوگ آج بھی حیران وششدر رہ جاتے ہیں، چنانچہ ایک بار انہوں نے اودھ کی سلطنت میں رہنے والوں اور کمپنی کے زیرانتظام علاقے میں رہنے والوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

''اگر انصاف وتعصب راراہ نہ دہم زمینداران مملکت انگریزی پریشان
حال ورعیت مملکت آودھ فارغ البال، قتل نفوس بنی آدم دریک شہر کلکتہ
بیشتر درقلم رو آودہ کمتر...... بازار رشوت در ہر عدالت انگریزی گرم
است۔''(12)

چنانچہ محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

''رجب علی لکھنوی یقیناً بڑے باہمت آدمی تھے۔ ان کے اخبار کی خبریں
اوران خبروں پر ان کا جلا کٹا تبصرہ پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ کمپنی
انگریز بہادر کے دارالسلطنت کلکتے میں بیٹھ کر وہ اخبار نہیں نکالتے تھے بلکہ
ایسٹ انڈیا کمپنی کی چھاتی پر کودوں دلتے تھے۔''(13)

اسی طرح سلطان الاخبار نے لوہارو کے نواب شمس الدین اوران کے رفیق کریم خاں گل کو ''ایک انگریز عہدہ دار ولیم فریزر کو قتل کرنے کے جرم میں تختہ ءدار پر چڑھائے جانے کے واقعہ کی رپورٹنگ کی ہے۔ اس سے اس اخبار کے شدید قوم پرستانہ اور انگریزی سامراج کے خلاف بھڑکتے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس اخبار کے 2- ستمبر 1835ء کے شمارہ کی شہ سرخی بھی یہی ہے:

''بہ بست وہشتم اگست کریم خاں رابمقامی کہ اشتباہ خون ریختن ولیم فریزر
داشتند بردند وحسب دستورانگریزی بکشتند۔''

اس خبر کی تفصیلات اس طرح ہیں:

''مسلمانان شہر دہلی بر طبق وصیت او بہ بست وہشتم روز جمعہ در جملہ مساجد فراہم آمدند و دعائے خیر بہر او نمودند و مغفرتش از خدا خواستند ۔ لیک در مسجد جامع مسلمانان را بہر دعا کردنش رفتن ندادند ۔ شاید کہ این ممانعت خیر از طرف سلطان بہ ایمائے انگریزان است ۔ اہل اسلام از ازین معنی خیلی منغض و مکدر اند و ہمین ورد زبان دارند کہ ممانعت انگریزان از دعای خیر نقصانہای بہر ما مسلمانان را و کریم خان ندارد ۔ چہ او ر ابدرگاہ خدا مستحق جنت و ثواب است نہ مورد عتاب و عذاب کہ کافری را کشتہ است ۔ نامش گل شہید نہادہ اند و ہر شب عوام بر مزارش ہجوم می آورند ، چراغاں روشن سازند و خنیا گران ولولیان ہم ہزاران ہزار بر گورش مجتمع شوندہ بہ نغمہ و رقص دل عالم بہ ربایند ۔''(14)

دہلی کے مسلمانوں نے کریم خاں کے اس جرأت مندانہ اقدام کی دل کھول کر داد تحسین دی، جس سے انگریزوں کی ناانصافی اور ظلم وستم کے خلاف ان کے دلوں میں بھڑکتے غم وغصہ کے جذبات کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے، لیکن کلکتہ کے اندر انگریزی اخبارات نے صحافتی بددیانتی اور نافہمی کا ثبوت دیتے ہوئے گھٹیا اور مبتذل لہجہ کا استعمال کیا اور کریم خاں کے متعلق کچھ ایسی بات لکھی کہ اگر کریم خاں کی لاش کو تدفین کے بجائے جلا دیتے تو اس قدر لوگوں کو اس کی قبر پر بھیڑ لگانے کا موقع نہ مل پاتا۔

سلطان الاخبار نے دہلی کے عوام کی ترجمانی کرتے ہوئے کلکتہ کے ان انگریزی اخبارات کی گھٹیا رپورٹنگ اور انتہائی گری ہوئی زبان کی سخت لہجہ میں تنقید کی اور ان خبروں کا ترجمہ کرنے کے بعد اس کا منہ توڑ جواب دیا، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''این مر زیادہ باعث توحش و تکدر خلائق شدے بلکہ یقین بود کہ مردم بر سر بلوہ آمدند و عاقبت کار نیندیشیدہ قیامتی بر پا می کردند ۔ آن وقت چارہ کار مشکل بود ۔''

اور آخر میں انگریزی اخبارات کو متنبہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

''اہل اخبار را لازم است کہ سخن فہمیدہ گویند و از ہرزہ سرائی در

گزرند۔"(15)

کریم خاں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد نواب شمس الدین کو تختہ دار پر چڑھانے کی تیاریاں شروع ہوگئیں اور اس مقصد کی تکمیل کی خاطر منصفوں کا ایک مخصوص پینل ترتیب دیا گیا۔ سرکاری گواہوں فتح اللہ خاں اور کرنل اسکیو وغیرہ کی یہ پوزیشن تھی کہ وہ گواہی دینا نہیں چاہتے تھے، لیکن مجبور تھے اور اس پر زیادتی یہ کہ بیانات انگریزی میں قلمبند کیے گئے، جو عدالت میں چاہتی وہ لکھوالیتی۔ گواہ یہ بھی معلوم نہیں کرسکتا تھا کہ اس کا بیان کس طرح لکھا جارہا ہے اور اگر تردید وانکار کرتا تو بیڑیاں پاؤں میں ڈال کر جیل بھیج دیا جاتا تھا۔(16)

چنانچہ اس واقعہ کو سلطان الاخبار نے 19-اگست 1835ء کے شمارے میں بڑے طنزیہ انداز میں لکھا ہے کہ:

"اظہار گواہان بعبارت انگریزی حوالہ قلم نزاکت رقم می شود۔ شاھد بیچارہ دریافت نمی شود کہ انکار را اقرار شمردہ باقرار را انکار، اگر عذری بہ میان آوردند فوراً زنجیر در پاشدہ بزندان می روند۔ اگر چہ بہ چنین ثبوت چشم سزاو عذاب در حق ثواب از گورنمنٹ انگریزی دارند عین روا است۔"(17)

آخر کاران نام نہاد منصفوں نے حسب منشائے ارباب دولت نواب شمس الدین کو تختہ دار پر چڑھانے کا حکم صادر کردیا۔ چنانچہ سب سے پہلے سلطان الاخبار نے 11-اکتوبر 1835ء میں اس خبر کو شہ سرخی کے طور پر چھاپا اور اس تعصب اور یک طرفہ فیصلہ پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

"افسوس در مقدمہ اش انصاف نہ رفت۔"

بعدازاں 25-اکتوبر کو اس واقعہ کی پوری تفصیلات کو شائع کیا اور معاندانہ فیصلہ کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے اسے قتل سے تعبیر کیا اور اس خبر کا عنوان بھی "خبر قتل نواب شمس الدین" رکھا جس کا اقتباس یوں ہے:

"اہل اخبار حکایت کنند کہ بروز شنبہ ماضیہ، بوقت شام از طرف دہلی در کلکتہ خبر رسید کہ نواب شمس الدین بہ ہشتم اکتوبر 1835ء روز پنجشنبہ سپیدہ دم بعذاب پھانسی کشتہ گردید۔ شرح این اجمال در اخبار بنگال ہیرلڈ بدین

میں آج بھی کسی نہ کسی صورت میں زندہ ہے اور یہاں کی ہزار سالہ تہذیبی اور ثقافتی روایات کی حفظ و پاسداری میں کوشاں ہے۔

حوالہ جات

1- دتاسی، گارسیں، خطبات، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، 1935ء، ص 218

2- Donough, History of Law & Sedition, Page 183-84

3- Home Dept., June 29, 1857, Parliamentary Paper, House of Commons 1857-58, Vol. 43, Paper 253, Page 41.

4- Chanda, Mrinal Kanit, History of English Press in Bengal (1780-1857), K. P. Bagchi & Co., New Delhi, 1987, Page-358.

5- Hutchinson, Empire of the Nababs, Page-135.

6- Sen, S.P.Dr., The Indian Press (Ed.), Institute of Historical, Studies, Calcutta-12, 1967, Page-39.

7- Natrajan, J., History of India Journalism, Part I, Delhi, 1956, Page-66.

8- سلطان الاخبار، 2- ستمبر 1835ء، شمارہ 8

9- سلطان الاخبار، یکم اگست 1833ء، شمارہ یکم

10- سلطان الاخبار، یکم اگست 1833ء، شمارہ 1

11- سلطان الاخبار، 9- اگست 1833ء، شمارہ 2

12- ایضاً

13- صدیقی، محمد عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو 1957ء، ص 247

14- سلطان الاخبار، 2- ستمبر 1835ء

15- ایضاً

16- امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، حصہ اول، دہلی 1953ء، ص 87

17- سلطان الاخبار، 9- اگست 1835ء

18- سلطان الاخبار، 25- اکتوبر 1833ء

19- سلطان الاخبار، 30- اگست 1835ء

20- سلطان الاخبار، 6- ستمبر 1835ء

21- ماہ عالم افروز، یکم مارچ 1836ء

22- Natrajan, J., Ibid., Page-68.

23- صدیقی، محمد عتیق، متذکرہ، ص 405

24- ایضاً

25- Parliamentary Papers, Vol. 44, Pt.I, Page-363 بحوالہ محمد عتیق صدیقی، متذکرہ، ص 404

26- Sen, Dr. S.P., Ibid., Page-3.

27- Punjab Government Records, Vol, Pt.2, Page-20. بحوالہ محمد عتیق صدیقی، متذکرہ، ص 398-399

28- سراج الاخبار، 11- مئی 1857ء

❁❁❁❁❁

بہادر شاہ ظفر کے فرامین

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات 1707ء میں ہوئی اور 1757ء میں پلاسی کی تاریخی جنگ، جس میں انگریزوں کو شمالی ہندوستان میں پہلی فتح نصیب ہوئی دراصل اسی دن قسمت نے سلطنت کا فیصلہ کر دیا اور اگلے تقریباً دو سو سال تک ہزاروں میل دور بیٹھے ایک قوم کے چند افراد لاکھوں انسانوں کی قسمت کا فیصلہ کرتے رہے۔ 1707ء سے 1757ء تک صرف پچاس سال کی مختصر مدت میں اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کی مستحکم سلطنت جس طرح پارہ پارہ ہوئی۔ اس کی داستان دلخراش بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا تھا۔ حکومت اور امارت نے خون سفید کر دیئے تھے مذہب، ایمان، اخلاق سب کی بندشیں ٹوٹ گئی تھیں۔ طوائف الملوکی تھی۔ افراتفری تھی۔ ذہنی اور سماجی انتشار تھا غرض آفات اور حوادث کی ایسی آندھیاں چل رہی تھیں کہ امید کی شمعیں جلائی جاتیں اور بجھ جاتیں۔ سلطان شہید ٹیپو اور سراج الدولہ سے بہادر شاہ ظفر تک انہیں آندھیوں میں امید کے چراغ روشن کرنے والے بھی موجود تھے۔ ان کے ذرائع اور وسائل محدود تھے۔ انہیں بیگانوں ہی سے شکایت نہ تھی، اپنوں کا بھی شکوہ تھا۔ اور آج جب ہم پچھلے دو سو سال کی تاریخ کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں۔ تو ان کی امیدیں اور تمنائیں ان کے ولولے اور ان کا جوش عمل اور ان کی ناکامیاں اور محرومیاں ایک موقع بن کر سامنے آ جاتی ہیں۔

بہادر شاہ ظفر پر سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن کیا ظفر چاہتے تو وہ اس انقلاب کو روک سکتے تھے؟ کیا ان میں اس قدر طاقت اور قوت تھی جو وہ اس تناور درخت کو جس کی بنیادیں پوری

ایک صدی سے گھلتی چلی آ رہی تھیں، گرنے سے روک لیتے؟ اور کیا وہ تنہا اس جنگ آزادی میں، جسے برطانوی عہد کے مؤرخین ''غدر'' کے مکروہ نام سے یاد کرتے ہیں، ایک سامراجی قوت کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتے تھے؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے سوال ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا جواب بہادر شاہ ظفر کا مؤرخ ہی دے سکتا ہے۔ ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ اس جنگ آزادی کی کہانی ان کے فرامین میں کہاں کہاں اور کس طرح ظاہر ہوتی ہے۔

بہادر شاہ کے مطبوعہ فرامین میں ان کے وہ احکام شامل ہیں جو جنگ آزادی کے ایام میں انہوں نے بعض درخواستوں اور مراسلوں پر تحریر کئے تھے۔ اور جن کو بہادر شاہ پر مقدمہ چلاتے وقت بطور شہادت ان کے خلاف پیش کیا گیا تھا۔ یہ کاغذات Trial of Bahadur Shah میں شامل تھے۔ بعد میں خواجہ حسن نظامی صاحب نے ''غدر کے فرمان'' کے نام سے ان کا ترجمہ کر دیا۔ یہ خطوط بیشتر اردو میں تھے۔ Trial of Bahadur Shah میں ان کا انگریزی ترجمہ کیا گیا ہے اور پھر انگریزی سے اردو میں منتقل ہوئے۔ اس طرح ان فرامین کی عبارت اصل بہادر شاہ کی عبارت نہیں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں تصرف کیا گیا ہو۔ بہر حال ان فرامین کے مطالعہ سے کئی باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ بہادر شاہ جنگ آزادی کی تحریک کا مرکز اور محور تھے۔ لیکن یہ ایک عوامی تحریک تھی اور اختلاف مذہب یا اختلاف زبان ان لوگوں کے اتحاد میں مانع نہ تھا جو اس جنگ میں شریک تھے۔ دوسری طرف ان فرامین سے اس جنگ کی ناکامی کے اسباب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ خزانہ خالی تھا بہادر شاہ کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی جو سپاہیوں کو باقاعدہ اور بروقت تنخواہ مل جاتی۔ یہی حال سامان حرب اور آلات جنگ کا تھا۔ رسد کا یہ حال تھا کہ جو فوج دہلی میں موجود تھی اس کے ایک حصے کو دو دن کا فاقہ گذر چکا تھا جب سو من بھنے ہوئے چنے طلب کئے گئے۔ پھر اس کے ساتھ آپس کی چشمک، حسد، رقابت اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش بھی جاری تھی۔ یعنی خود اپنی صفوں میں اتحاد نہ تھا۔ ایک طبقہ ایسا تھا جو ذاتی مفاد کے لئے انگریزوں کا ساتھ دے رہا تھا۔ اور انہیں میں وہ جلوس شامل تھے جو ہر کارروائی کی اطلاع دشمن کو پہنچاتے رہتے تھے۔ ایسے ایک بزرگ محمد درویش تھے جنہوں نے لیفٹیننٹ گورنر کو ایک خط میں لکھا تھا کہ بادشاہ دہلی حسن عسکری کی معرفت شاہ ایران سے سازباز کر رہے ہیں۔ اور بادشاہ کے کمرۂ خاص میں شب و روز ایرانیوں کی فوجی آمد کا ذکر رہتا ہے۔

بغرض خیر خواہی مندرجہ بالا حالات سے مطلع کیا گیا ہے، اب گورنمنٹ کو اختیار ہے کہ مناسب بندوبست کرے۔ اس خیر خواہ کی یہ خیر خواہی 24-مارچ 1857ء کو لیفٹیننٹ گورنر کو ملتی ہے۔ جنگ آزادی مئی میں شروع ہوئی۔ گویا مہینوں پہلے جو تیاریاں ہو رہی تھیں ان کی تفصیل سے انگریز پوری طرح آگاہ تھے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بہادر شاہ کمرۂ خاص میں جن مشاہیر و اکابر سے گفتگو کرتے تھے اور جو خفیہ احکام صادر فرماتے تھے۔ ان کی اطلاع بھی لیفٹیننٹ گورنر کو ہو جاتی تھی۔ 18-اگست 1857ء کو لکھا ہوا ایک خط ملتا ہے جو مکند لال نے لکھا ہے۔ مکند لال کے خط میں 27 خطوط و ہدایات کی تفصیل ہے اور لکھنے والا مکند لال بہادر شاہ کا سکریٹری ہے۔ مکند لال ہندو تھا اگر اس جنگ کی نوعیت صرف یہ ہوتی کہ مسلمان اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے انگریزوں کے خلاف جہاد کی تبلیغ کر رہے تھے تو ظاہر ہے غیر مسلموں پر بھروسہ نہ کیا جاتا اور کم از کم انہیں بادشاہ کے سکریٹری کا اہم عہدہ ہرگز نہ دیا جاتا۔ بادشاہ کا دل صاف تھا لیکن جن لوگوں پر اعتماد کیا گیا وہ اس اعتماد کے اہل ثابت نہیں ہوئے۔ بہادر شاہ کی بیکسی اور بے بسی کا اندازہ ان کے اس فرمان سے کیجئے:

''بنام فرزند ما بدولت شہرۂ آفاق دلاور مرزا ظہور الدین عرف مرزا مغل بہادر۔۔۔ جانو کہ جب پیدل و سوار میرے پاس آئے تھے تو میں نے خود اپنی زبان سے ان سے کہہ دیا تھا کہ میرے پاس خزانہ یا مال نہیں ہے جس سے میں ان کی مدد کروں۔ انہوں نے میرا یہ بیان سن کر سر تسلیم خم کیا اور میرے لئے اپنی جانوں کو قربان کر دینے پر آمادگی ظاہر کی اور ماتحتی اور فرماں برداری کو منظور کیا۔ اس پر انہیں اول ہدایت کی گئی تھی کہ میگزین اور خزانے کی اشیاء مہیا کریں تاکہ اس سے انہیں اور مجھے فائدہ پہنچے دوسرے یہ کہ اگرچہ اس معاملے میں ان سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا تاہم روپیہ قرض لیا گیا۔ تاکہ ہر پیدل و سوار کو روزانہ الاؤنس دیا جائے۔ مکرر فرمان جاری کئے گئے کہ شہر میں لوٹ مار اور دارو گیر نہ کی جائے۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ فوجی اور سپاہی ایسی زیادتیاں کرتے ہیں کہ ان تمام شہروں میں جو بغیر فوجی دخل کے تصرف میں لائے گئے ہوں ایسی غارت گری نہ ہوئی ہو گی۔ چنگیز خاں اور نادر شاہ بادشاہوں نے بھی ایسے شہروں کو پناہ دی ہے جو بے لڑے بھڑے قبضے میں آگئے ہوں۔''

اس کے بعد بہادر شاہ سپاہیوں کی بدتمیزی کی شکایت کرتے ہیں کہ گورنمنٹ برطانیہ —

اعلیٰ افسر بھی قلعہ دیکھنے آتے تو دیوان عام کے دروازے پر گھوڑوں سے اتر پڑتے۔ اور وہاں سے پیدل آتے۔ لیکن یہ لوگ دیوان خاص کے کمرے تک گھوڑوں پر بیٹھے چلے آتے ہیں۔ ابتری اور افراتفری کی طویل اور دلخراش داستان بہادر شاہ ان الفاظ میں ختم کرتے ہیں:

''اس حکومت کی بربادی صاف عیاں ہے۔ مجبوراً تھک کر ہم نے آخر کار اپنی بقیہ عمر یاد الٰہی میں بسر کرنے کی ٹھان لی ہے اور خطاب شہنشاہی کو جو تفکرات اور مشکلات سے لبریز ہے موجودہ خطرات و بیقراریوں سے تنگ آ کر تہیہ کر لیا ہے کہ ترک کر دیں۔ اور کفن پہن کر پہلے خواجہ صاحب کی درگاہ میں جا کر مقیم ہوں اور پھر ضروری انتظام کر کے وہاں سے مکہ مکرمہ روانہ ہو جائیں۔''

اس ہنگامے میں یہ ضروری تھا کہ شہری زندگی میں کوئی بڑا خلل واقع نہ ہو اور فوج شہری نظم و نسق سنبھالنے کی جگہ مورچوں کا رخ کرے۔ اس ضرورت کے احساس سے 23- جولائی کو بہادر شاہ نے یہ فرمان جاری کیا:

''اعلان کیا جاتا ہے کہ کوئی کسی پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ ظلم نہ کرے اور یہ کہ اصل زمینداروں کی رعایا بن کر رہے کہ وہ سلطنت کے خیر خواہ سمجھے جاتے ہیں۔ نظم و نسق کے لئے بہت جلد فوجی قوت روانہ کی جائے گی۔ اعلیٰ حضرت بادشاہ سلامت کو اپنی رعایا کی فلاح و بہبودی کی فکر ہمیشہ دامنگیر رہتی ہے۔ چنانچہ وہ تمام لوگ جو بدامنی پھیلانے یا حکام بااختیار سے سرکشی کرنے کے مجرم ہوں گے مستوجب سزائے شدید ہوں گے۔ یہ اعلان عوام کی آگاہی کے لئے کیا جاتا ہے۔''

کسی جنگ میں سب سے اہم کام فوجی نقل و حرکت اور محاذ جنگ کی ترتیب ہے۔ یہ کام سوائے فوجی ماہروں کے کسی اور کے بس کا نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یا تو فوج میں قحط الرجال تھا کہ اس کام کے قابل کوئی آدمی نہ تھا یا آپس کے حسد و رقابت کی وجہ سے بادشاہ کو خود ان امور کا فیصلہ کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً کمانڈر انچیف مرزا مغل تھے جو بادشاہ کے فرزند تھے۔ وہ بادشاہ کی خدمت میں ایک عرضی پیش کرتے ہیں:

''چونکہ اعلیٰ حضرت نے فوج کو میرٹھ جانے کا حکم صادر فرمایا ہے لہٰذا رسد وغیرہ کے انتظامات کے لئے بیس سوار، پچاس پیدل پہلے سے جانے ضروری ہیں۔ امید ہے کہ خادم کو ان

کے روانہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے گی۔''

اس پر بہادر شاہ نے پنسل سے یہ فرمان لکھا ہے:

''میر حیدر حسین خان 20 سواروں کو اور شاہرخ بیگ پچاس پیدلوں کو روانہ کردیں۔''

بادشاہ اس موقع پر صرف نقل و حرکت ہی کی نگرانی نہیں کرتے تھے بلکہ رسد اور سامان حرب کے حمل و نقل کی ذمہ داری بھی ان پر تھی۔ چنانچہ 20 جون کو کمانڈر مرزا مغل کے نام ایک فرمان میں لکھا گیا۔

''معلوم ہو کہ شورہ لانے کے لئے چھ گاڑیاں تیار کی گئی ہیں۔ جو باہر جمع ہیں اور بارود کے لئے جس کی ضرورت ہے۔ پس 'باقاعدہ پیدل' کے پچیس آدمیوں کو اس کی حفاظت کے لئے مقرر کردو کہ بہ حفاظت میگزین پہنچ جائے۔ نیز فوجی پہرہ متعینہ لاہوری دروازے کے نام احکاری جاری کرو کہ اس آمدورفت میں رخنہ اندازی نہ کریں۔''

اگر بہادر شاہ کا کام صرف فوجوں اور فوجی سامان کے نقل و حمل تک محدود ہوتا تو ایک بات تھی، فوجوں کی بھرتی اور ملازمت کی ذمہ داری بھی بالآخر براہ راست ان پر ڈال دی گئی تھی۔ اور ہر ملازم ہونے والے کی درخواست ان کے سامنے پیش ہوتی تھی۔ مرزا مغل کے نام ایک فرمان میں لکھتے ہیں:

''معلوم ہو کہ بے شمار آدمیوں کی درخواستیں تمہاری درخواست کے ساتھ موصول ہوئیں جن میں نوکری کی خواہش کی گئی ہے فرزند تم کو معلوم ہے کہ خزانہ شاہی میں روپے کی قلت ہے۔ ''قسمتوں'' سے متوقع آمدنی وصول نہ ہونے اور فوج کے باہر جا کر بندوبست نہ کرنے اور حکومت میں ڈاکہ زنی و لوٹ مار کرنے کے سبب سے اور پھر حصہء ملک سے کثیر افواج کے ایک جگہ جمع ہو جانے کے سبب اخراجات روزمرہ بھی پورے نہیں ہوتے۔ پھر ان لوگوں کو کیونکر ملازم رکھا جائے؟ اور ان کی تنخواہیں اور اخراجات کہاں سے پورے کئے جائیں؟ ایسی حالت میں ان لوگوں کو جن کے وطن دور دراز فاصلے پر ہیں موہوم امیدیں دلانی بالکل بے جا بات ہے۔''

برہمن، حجام، دھوبی، درزی تک کے تقرر کا مسئلہ بہادر شاہ کے سامنے پیش کیا جاتا۔

بہادر شاہ کی ذمہ داریوں کا تو یہ حال تھا اور ان کی کس مپرسی کا یہ عالم کہ نہ ان کے پاس روپیہ

تھا، نہ فوج اور نہ سپاہ ان کے احکام کی تعمیل کرتی تھی۔ وہ تنہا اس جنگ کو کیسے جیت سکتے تھے؟ سب سے بڑی پریشانی روپے کی کمی سے پیدا ہوئی۔ ایک فرمان سے اس کا اندازہ کیجئے:

''فرزند شہرۂ آفاق دلاور، مرزا ظہور الدین عرف مرزا مغل کمانڈر انچیف بہادر، معلوم ہو کہ فوج کی روزانہ یا ماہانہ تنخواہ دینے اور میگزین کے ضروری مصارف اور اخراجات توپ خانہ و بارود کے لئے خزانے میں روپیہ بالکل نہیں ہے اور بارود نہ ہوئی تو دشمن سے لڑنا دشوار ہو جائے گا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ فی الفور کہیں نہ کہیں سے بغیر سود کے قرضہ لیا جائے۔ اور پنجابی سوداگروں اور انگریزوں کے مالدار نوکروں سے بھی روپیہ لیکر خزانہ میں داخل کیا جائے۔ نیز یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ہنڈیاں بنا کر ہمارے پاس بھیجو کہ ہماری مہر خاص اس پر ثبت کی جائے اور روپیہ وصول کرنے کے لئے انہیں تقسیم کیا جائے۔ جس میں معاہدہ ہوگا کہ مال گذاری کی آمدنی وصول ہونے پر سب کا روپیہ ادا کر دیا جائے گا۔ قرض مذکور میں سے کچھ بھی باقی نہ رکھا جائے گا۔ اور اس پر تمام لوگوں کو یقین دلا دو۔ ماسوا اس کے اگر وہ لوگ چندے کا بندوبست کریں گے تو علاوہ ان کا قرضہ ادا کرنے کے اپنے اپنے مرتبے اور لیاقت کے موافق ملازمت اور انعام بھی دیا جائے گا۔

ان حالات میں بہادر شاہ کے نیک ارادے، ان کی ذاتی مستعدی اور سرگرمی کیا کام آسکتی تھی۔ ان فرامین کے مطالعہ سے یقین ہو جاتا ہے کہ بہادر شاہ کے بس میں جو کچھ تھا انہوں نے اس سے گریز نہ کیا لیکن یہ جنگ شروع ایسے وقت ہوئی جب ملک اس کے لئے پوری طرح تیار نہ تھا۔ اور اس فیصلے کی ذمہ داری بھی بہادر شاہ ظفر پر نہیں۔ وہ اس جنگ میں شریک ہوئے اور شرکت کی پوری ذمہ داریاں قبول کیں۔

آخر میں بہادر شاہ ظفر کی ایک نظم کے چند اشعار سنئے جو مجموعہ ''فغان دہلی'' میں شامل ہیں 1857ء کا ہنگامہ ایسا نہ تھا جس کا اثر صرف بہادر شاہ ظفر کی ذات یا اس کے متوسلین تک محدود رہا۔ دلّی جو اس سے پہلے بھی کئی بار لٹ چکی تھی اس مرتبہ ایسی اجڑی کہ پھر اس کی خرابی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکی۔ دلّی کے مٹنے سے مراد صرف وہ عمارات نہیں جو آج کھنڈر بن چکی ہیں۔ دلّی ایک تہذیب، ایک معاشرت، ایک روایت کی علمبردار تھی۔ یہ تہذیب یہ معاشرت اور یہ روایت اب محض ایک افسانہ رہ گئی ہے۔ لیکن اس چمن کے بعض عنادل اس وقت بھی نالہ سرا ہوئے تھے اور آج بھی نوحہ

خواں ہیں۔مجموعہ ''فغان دہلی'' میں انہیں نالوں کو جمع کیا گیا ہے۔اور سب سے پہلا نالہ بہادر شاہ ظفر کا ہے:

کیا پوچھتے ہو کجروی چرخ چنبری
ہے اس ستم شعار کا شیوہ ستمگری
کرتا ہے خوار تو نہیں جن کو ہے برتری
اس کے مزاج میں ہے یہ کیا سفلہ پروری
کھائے ہے گوشت زاغ فقط استخواں ھما
کیا منصفی ہے زاغ کہاں اور کہاں ھما
بالعکس ہیں زمانے میں جتنے ہیں کاروبار
شیوہ کیا ہے الٹا زمانے نے اختیار
ہے موسم بہار خزاں اور خزاں بہار
آئی نظر عجب روش باغ روزگار
جو نخل پر ثمر ہیں اٹھا سکتے سر نہیں
سرکش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں
باد صبا اڑتی چمن میں ہے سر پہ خاک
ملتے ہیں دم بدم کف افسوس برگ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک
کرتی ہیں بلبلیں یہی فریاد دردناک
شاداب حیف خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خار نخل مغیلاں نہال ہوں
جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں
ہوویگا سر پہ چرخ بھی جاوینگے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زندان یہ آسماں
چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں

جو آ گیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں
قید حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں

اوراس جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں بہادر شاہ ظفر رنگون میں جلاوطنی کی زندگی گزار کر قید حیات اور قید فرنگ دونوں سے چھوٹ گئے۔

❁❁❁❁❁

بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی

بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے کے نام سے جو کتابیں اس وقت دستیاب ہیں ان میں 1844ء سے 1849ء تک کے درباری واقعات کا ذکر ہے۔ان کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی انگریزی حکومت اور بادشاہ کے درمیان آئے دن کچھ نہ کچھ غلط فہمیاں اور رنجشیں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ یہ باہمی رنجشیں اور کدورتیں آہستہ آہستہ بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ جب 12- مئی 1857ء کو جنگ آزادی کی پہلی چنگاری پھوٹی تو دلوں کی یہی کدورت شعلہء جوالا بن کر بھڑک اٹھی۔اندریں حالات بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ، 1857ء کے ہنگامے کا تاریخی اور سیاسی پس منظر ہے، جس کی روشنی میں ہمیں وہ اسباب نظر آتے ہیں جنہوں نے دودمان مغلیہ کے اس آخری تاجدار کو برطانوی حکومت سے ناراض اور بدگمان کر دیا تھا۔

بہادر شاہ کے اس روزنامچے پر تنقیدی نگاہ ڈالنے اور اس کا صحیح مفہوم اخذ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس عہدنامے کا جائزہ لیا جائے جو انگریزوں نے ستمبر 1803ء میں دہلی فتح کرنے کے بعد شہنشاہ ہند، شاہ عالم ثانی کے ساتھ کیا تھا۔شاہ عالم اگرچہ بینائی کھو چکے تھے اور اختیار و اقتدار سے بھی محروم تھے لیکن ہندوستان کے شہنشاہ کی حیثیت سے وہ اب بھی اس برعظیم کی سیاست کے مرکز ثقل تھے۔اس لئے انگریز ان کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس معاہدے میں یہ شرائط درج کی گئی تھیں کہ:

1- وہ خاص علاقہ جو دہلی کے نواح میں دریائے جمنا کے داہنی طرف واقع ہے شاہی خاندان کی کفالت کے لئے دے دیا جائے گا اور یہ علاقہ دہلی کے ریذیڈنٹ کے ماتحت رہے گا۔

مالیات کا وصول کرنا اور انصاف کا قائم کرنا گورنمنٹ کے قانون کے مطابق شاہ عالم کے نام سے ہوگا بادشاہ کو اختیار ہے کہ ایک دیوانی کا افسر اور دوسرے چھوٹے افسر کلکٹر کے دفتر میں رکھیں جن کا کام یہ ہوگا کہ جانچ پڑتال کریں اور بذریعہ رپورٹ بادشاہ کو اس امر کا اطمینان دلاتے رہیں کہ وصولئی مالگزاری میں جو خرچ ہو رہا ہے اس کا کوئی حصہ خورد برد نہیں کیا جا رہا ہے۔

-2 دہلی شہر اور اس اراضی کے باشندوں کے لئے جو بادشاہ کے نام منتقل کر دی گئی ہے دیوانی اور فوجداری کی دو عدالتیں قائم ہوں گی جو اسلامی قانون کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کریں گی۔ فوجداری عدالتوں کے سزائے موت کے حکم کی تعمیل اس وقت تک نہیں کی جائے گی جب تک بادشاہ سے منظوری نہ لے لی جائے۔

-3 بادشاہ اور ان کے خاندان کی کفالت کے لئے ایک لاکھ روپے ماہوار وظیفہ دیا جائے گا۔ اس رقم کے علاوہ دس ہزار روپے سالانہ ہندو اور مسلمانوں کے خاص تہواروں کے موقع پر قدیم رواج کے مطابق دیئے جائیں گے۔

یوں سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں اگرچہ انگریزوں کی حکومت قائم تھی لیکن دہلی میں شاہ عالم کی سیاست کو از راہ مصلحت باقی رکھا گیا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اور انگریزوں کے پاؤں مضبوطی سے جمتے گئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ مغل بادشاہ کی بالا دستی کو ختم کر دینا چاہئے۔ جنوب میں مرہٹوں اور ٹیپو سلطان کی طاقت فنا کی جا چکی تھی۔ ادھر شمال میں سکھوں کا زور توڑا جا چکا تھا۔ لے دے کے یہ مغل شاہنشاہیت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ باقی تھا جس کی موجودگی برطانوی اقتدار کی آنکھ میں کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی۔ چنانچہ انگریزوں نے بتدریج ایسی حرکتیں شروع کیں جن سے اس عہد نامے کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ قابل اعتراض اور خلاف قاعدہ حرکات کیا تھیں۔

اول تو شہر دہلی سے دیوانی اور فوجداری کی دونوں عدالتیں جو شرع اسلامی کی رو سے انفصال مقدمات کے لئے قائم کی گئی تھی منسوخ کر دی گئیں اور ان کی جگہ برطانوی قانون کے مطابق انگریزی حکومت نے اپنی عدالتیں قائم کیں اور ان عدالتوں پر بادشاہ کا قطعاً کوئی اختیار نہ تھا۔

چنانچہ بہادر شاہ ظفر کا روز نامچہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بادشاہ اور خاندان شاہی کے دیگر افراد پر آئے دن ان عدالتوں میں لوگ دعوے دائر کرتے رہتے تھے اور یہ سب کچھ انگریز ریذیڈنٹ کے علم سے ہوتا تھا۔ بادشاہ کو ہر لحہ اپنی بے بسی کا احساس تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے خلاف جو معناً نہ سہی لیکن لفظاً اب بھی شہنشاہ ہند تھا، معمولی بنیئے اور ساہوکار ان عدالتوں سے ڈگریاں لے لے کر شاہی جائیداد قرق کراتے تھے۔ بہادر شاہ بار بار دہلی کے انگریز ریذیڈنٹ کو لکھتا ہے کہ شاہی جائیداد قرق نہیں ہوسکتی۔ لیکن ریذیڈنٹ نہایت ہوشیاری سے بادشاہ کی ان پیہم عرضداشتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

ابتداء میں جب شاہ عالم کے ساتھ انگریزوں کا معاہدہ ہوا تو یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ دہلی شہر پر بادشاہ کی عملداری قائم رہے گی لیکن بہادر شاہ کے زمانے میں وہ عمل داری سراسر ایک مذاق بن کر رہ گئی تھی۔ شروع سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا کہ جب بادشاہ کی سواری قلعہء معلیٰ سے نکلتی اور راستے میں اتفاق سے کوئی انگریز، بگھی یا گھوڑے پر سوار ملتا تو وہ فوراً نیچے اتر کر آداب بجالاتا تھا۔ بہادر شاہ کے ساتھ انگریزوں نے ادب و نیاز کا یہ سلوک بھی ترک کر دیا تھا۔ چنانچہ بہادر شاہ کے روزنامچے میں اس قسم کا ایک واقعہ درج ہے کہ ایک روز جمنا کے کنارے بادشاہ کی سواری جا رہی تھی تو راستے میں ایک انگریز گھوڑے پر سوار ملا۔ جب وہ نہایت بیباکی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا بادشاہ کے برابر سے نکلنے لگا تو شاہی خدام نے اُسے زبردستی گھوڑے سے اتار دیا۔ بعد میں دہلی کے انگریز ریذیڈنٹ نے بادشاہ سے اس واقعہ کی سخت شکایت کی کہ انگریزوں کو اس طرح سر راہ سواری سے اترنے اور آداب بجالانے پر مجبور نہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ اس قسم کے واقعات کو اپنی توہین سمجھ کر سخت رنجیدہ ہوتے ہوں گے۔ دہلی کے بازاروں میں بھی پہلے یہ قاعدہ تھا کہ انگریز اگر ہاتھی پر سوار ہو کر نکلتے اور راستے میں شاہی خاندان کے افراد کی سواری ملتی تو انگریز اپنے ہاتھی کو ایک طرف کر لیتے تھے تاکہ خاندان شاہی کی سواری گذر جائے، لیکن بہادر شاہ کے خاندان کے لوگوں سے انگریز حکام نے یہ ترجیحی سلوک بھی ترک کر دیا تھا۔

بہادر شاہ کے والد، اکبر شاہ ثانی کے عہد تک گورنر جنرل نے اپنی سرکاری مہر پر ''وفادار اکبر شاہ'' اور ''حلقہ بگوش اکبر شاہ'' کے الفاظ کندہ کرا رکھے تھے۔ اور گورنر جنرل جب بادشاہ کو کوئی خط

لکھتا تھا تو وہ خط حقیقتاً ایک عرضداشت یا درخواست کی شکل میں ہوتا تھا۔ لیکن بہادر شاہ کے زمانے میں گورنر جنرل نے اس مہر کا استعمال ترک کر دیا تھا اور بادشاہ کے ساتھ ہر قسم کی مراسلت بھی بند کر دی تھی بلکہ یہ حکم دے دیا تھا کہ بادشاہ براہ راست گورنر جنرل کو کسی قسم کا خط نہیں لکھ سکتا اور اگر اسے گورنر جنرل تک کوئی بات پہنچانی بھی ہو تو وہ دہلی کے انگریز ریذیڈنٹ کے توسل سے پہنچائی جائے۔ بہادر شاہ اس نوع کے توہین آمیز سلوک سے سخت دل گرفتہ تھے اور ان کے روزنامچے میں اکثر مقامات پر اس کوفت اور دل گرفتگی کے آثار ملتے ہیں۔

ایک اور چیز جو بہادر شاہ کے روزنامچے سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ شاہ عالم ثانی کے وقت سے قاعدہ چلا آ رہا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام جن میں برطانوی فوج کے کمانڈر انچیف بھی شامل تھے جشن شاہی کے موقع پر بادشاہ کی خدمت میں نذر پیش کیا کرتے تھے۔ انگریزوں نے آہستہ آہستہ اس رسم کو بھی مٹا دیا تھا۔ مدعا اور مقصود یہ تھا کہ شاہ دہلی کے تفوق کا احساس لوگوں کے دلوں سے محو کر دیا جائے تاکہ عوام بادشاہ کو کہیں ہندوستان کا مالک تصور نہ کرنے لگیں۔ اس حربے کو زیادہ کارگر بنانے کے لئے دہلی کے انگریز ریذیڈنٹ کو یہ تاکید کی گئی تھی کہ وہ ان لوگوں پر بھی کڑی نگاہ رکھے جو وقتاً فوقتاً بادشاہ سے تخلیئے میں ملاقات کرتے ہیں۔ چنانچہ گنے چنے درباری امرا کے علاوہ اگر کوئی اجنبی بادشاہ سے علیحدگی میں ملتا تو ریذیڈنٹ بادشاہ سے اس ملاقات کی تفصیلات دریافت کرتا تھا۔ بہادر شاہ کے روزنامچے میں اکثر ایسے واقعات ملتے ہیں جہاں عرب، ایران یا جنوبی ہند کے کسی درویش صفت اور فقیر منش مسافر نے بادشاہ سے ملاقات کی تو دوسرے ہی روز ریذیڈنٹ کی بارگاہ سے جواب طلبی کا پروانہ وارد ہو گیا۔ انگریزی حکومت نہایت ہوشیاری سے، لیکن دراصل اپنی مطلب براری کے لئے، لال قلعہ کو سازشوں کا مرکز بنا رہی تھی اور بادشاہ کو ان تمام ہتھکنڈوں کا علم تھا۔ انگریزوں کا مقصد یہ تھا کہ شاہی خاندان میں ہر ممکن طریقے سے تفرقہ پیدا کیا جائے اور پھوٹ ڈالی جائے۔ چنانچہ وہ ایک شہزادے کو دوسرے کے خلاف، اور بادشاہ کی ایک بیوی کو دوسری بیوی کے خلاف، آمادۂ پیکار کرتے رہتے تھے اور بادشاہ بعض اوقات ان خانگی جھگڑوں سے اس قدر پریشان ہو جاتے تھے کہ وہ مجبوراً انگریز ریذیڈنٹ کو خط لکھتے تھے کہ خدارا ان شہزادوں کو سمجھاؤ کہ وہ اپنی حرکتوں سے خاندان شاہی کو بدنام نہ کریں۔ بادشاہ کو معلوم تھا کہ اس فتنہ و فساد کو بالواسطہ ہوا دینے والا وہی انگریز

ریذیڈنٹ تھا جس سے وہ استمداد کر رہے تھے۔ لیکن حالات نے انہیں اس قدر عاجز اور بے بس کر دیا تھا کہ وہ تنگ آ کر اسی شخص سے اپنے مرض کا علاج کرانا چاہتے تھے جس نے مرض پیدا کیا تھا۔ بہادر شاہ کے روزنامچے میں اکثر اس قسم کے واقعات کا تذکرہ ہے۔ روزنامچے کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انگریز گورنر جنرل جب صوبجات مغربی کا دورہ کر رہا تھا تو اس نے دہلی آ کر بادشاہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ لیکن شرط یہ عائد کی تھی کہ ملاقات بالکل مساویانہ طریق سے ہوگی۔ یعنی گورنر جنرل اور بہادر شاہ کے درمیان حیثیت اور مرتبے کا کوئی فرق نہیں ہوگا۔ بادشاہ کو یہ شرط منظور نہیں تھی اور وہ گورنر جنرل کو اپنے برابر جگہ دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس بنا پر ملاقات نہ ہوسکی۔

اس واقعہ کے بعد انگریزی حکومت نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ بادشاہ دہلی کی مرکزی حیثیت کو بالکل ختم کر دیا جائے تا کہ لوگ اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ اب ہندوستان کی فضا میں سوائے برطانوی جھنڈے کے اور کوئی جھنڈا نہیں لہرا سکتا۔ سب سے پہلے یہ فیصلہ کیا گیا کہ شاہی خاندان کو لال قلعہ سے نکال کر قطب صاحب میں آباد کیا جائے۔ دہلی کا لال قلعہ شاہ جہاں کے وقت سے مغل شہنشاہیت کا مرکز اور ہندوستان کا قلب تصور کیا جاتا ہے۔ انگریز جانتے تھے کہ خاندان مغلیہ کی جاہ وسطوت کے مٹ جانے کے باوجود ہندوستان کے دور دراز گوشوں کے لوگ ابھی تک لال قلعہ ہی کو حکومت ہند کا اصلی محور سمجھتے تھے۔ عوام کی یہ نفسیاتی کیفیت برطانوی راج کے استقلال کے لئے بیحد نقصان دہ تھی۔ چنانچہ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر لال قلعہ پر مغلوں کا جھنڈا بدستور لہراتا رہا تو بہت ممکن ہے کہ آئندہ چل کر یہ پرچم برطانوی شہنشاہیت کے پرچم کا حریف ثابت ہو۔

دوسری چیز جو انگریزوں کے دل میں کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی یہ تھی کہ لال قلعہ میں رہنے والے حکمراں کو بادشاہ کے لقب سے محروم کر دیا جائے۔ بہادر شاہ اگرچہ بالکل بے دست و پا انسان تھا۔ لیکن وہ ابھی تک عوام ہی کے لئے نہیں، بلکہ اس برعظیم کے تمام والیانِ ریاست کے نزدیک بھی اس وسیع وعریض ملک کا جائز وارث اور ہندوستان کا شہنشاہ تھا۔

انگریزوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بہادر شاہ کی وفات کے بعد اس کے جانشین کو 'بادشاہ' کی بجائے صرف 'شہزادے' کے لقب سے پکارا جائے گا اور شاہی خاندان کو لال قلعہ سے نکال کر

قطب صاحب بھیج دیا جائے گا۔ بہادر شاہ کو ان تمام باتوں کا بخوبی علم تھا۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ اسی دوران میں 1857ء کا ہنگامہ برپا ہوا تو شاہی خاندان نے ڈوبتے ہوئے انسان کی طرح اپنی زندگی بچانے کی آخری کوشش کی اور ظاہر ہے کہ اسی کوشش میں فنا ہو گئے۔

❁❁❁❁❁

61ویں انگریز رجمنٹ نے پیچھے دھکیل دیا۔ لیکن اس نے شہر کی لوٹ مار کی، اسے آگ لگا دی، دوسرے دن سوار فوج نے قلعہ سے نکل کر بھگا دیا۔

لاہور میں، میرٹھ اور دہلی کے واقعات کی خبریں سن کر جنرل کوربیٹ کے حکم پر سپاہیوں کو عام پریڈ کے لئے جمع کیا گیا اور نہتا کر دیا گیا (انگریز فوج نے گھیر لیا جس کے پاس توپیں تھیں)۔

20 مئی، (لاہور کی طرح) پشاور میں 64ویں، 55ویں، 39ویں دیسی پیدل رجمنٹوں کو نہتا کر دیا گیا۔ پھر باقی دستیاب انگریزوں اور وفادار سکھوں نے نوشہرہ اور مردان کے گھرے ہوئے قلعوں کو آزاد کرلیا، اور مئی کے آخر میں انبالہ کے بڑے قلعہ کو جہاں قریب کے قلعوں سے آئی ہوئی کئی یورپی رجمنٹیں بطور محافظ فوجوں کے جمع ہوگئی تھیں۔ یہاں جنرل اینسن کے تحت ایک فوج کا مرکز قائم کیا گیا...... پہاڑی گڑھ شملہ انگریز خاندانوں سے بھرا ہوا تھا جہاں وہ موسم گرما میں مقیم تھے، اس پر حملہ نہیں کیا گیا۔

25 مئی، اینسن نے اپنی چھوٹی سی فوج کے ساتھ دہلی تک مارچ کیا۔ 27 مئی کو وہ مر گیا اور اس کی جگہ سر ہنری برنارڈ نے لے لی۔ 7 جون کو آخرالذکر میں جنرل ولسن کے تحت انگریزی دستے شامل ہو گئے (جو میرٹھ سے آئے تھے، انہوں نے مقامی سپاہیوں سے راستے پر بعض لڑائیاں لڑیں)۔

تمام ہندوستان میں بغاوت پھیل گئی۔ 20 مختلف مقامات میں بہ یک وقت سپاہیوں کی بغاوتیں اور انگریزوں کا قتل۔

خاص مناظر: آگرہ، بریلی، مرادآباد۔ سندھیا "انگریز کتوں" کا وفادار لیکن اس کی فوج نہیں۔ پٹیالہ کے راجہ نے ـــ شرم کی بات ہے! ـــ انگریزوں کی مدد کے لئے سپاہیوں کی بڑی تعداد بھیجی۔

میں پوری میں (شمال مغربی صوبے) ایک نوجوان وحشی لیفٹیننٹ دے کانترف نے خزانے اور قلعے کو بچا لیا۔ کانپور میں 6 جون 1857ء نانا صاحب (مقامی سپاہیوں 3 رجمنٹوں اور مقامی سوار فوج کی 3 رجمنٹوں کی کمان سنبھال لی جنہوں نے کانپور میں بغاوت کی، اور کانپور فوج کے کمانڈر سر هیو وھیلر کے پاس (انگریز) پیدل فوج کی صرف ایک بٹلین تھی اور اسے باہر سے تھوڑی

سی کمک حاصل ہوئی تھی۔ وہ قلعہ اور بارکوں پر قابض رہا جہاں تمام انگریز لوگ، عورتیں اور بچے بھاگ کر آئے تھے) نے سر ھیو وھیلر کا محاصرہ کرلیا۔

26 جون 1857ء، نانا صاحب نے پیش کش کی کہ اگر کانپور حوالے کر دیا گیا تو تمام یورپی بخیر و عافیت پسپا ہو سکتے ہیں۔ 27 جون (وھیلر نے پیش کش قبول کر لی) بقیہ 400 کو کشتیوں پر سوار ہونے اور گنگا پر سفر کرنے کی اجازت دیدی گئی۔ نانا صاحب نے ان پر دونوں طرف سے گولی چلائی۔ ایک کشتی بھاگ نکلی۔ نشیب میں اس پر حملہ کیا گیا، ڈبو دی گئی، ساری محافظ فوج کے صرف 4 آدمی بچ کر بھاگ سکے۔ ایک کشتی ریتیلے کنارے پر بری طرح پھنس گئی تھی، عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی، انہیں پکڑ لیا گیا، کانپور لائے گئے، قیدیوں کی طرح بند رکھا گیا۔ 14 دن کے بعد (جولائی میں) باغی سپاہی فتح گڑھ (فوجی قلعہ فرخ آباد سے 3 میل) مزید انگریز قیدی وہاں لائے گئے۔

کیننگ کے حکم پر فوجیں مدراس، بمبئی اور رلنکا سے بھیجی گئیں۔ 23 مئی کو نیل کے تحت مدراس سے کمک آئی اور بمبئی کی فوج دریائے سندھ کے کنارے کنارے لاہور روانہ ہوگئی۔

17 جون، سر پیٹرک گرانٹ (بنگال میں اینسن کی جگہ کمانڈر ان چیف) اور جنرل ہیولاک، اجیٹن، کلکتہ پہنچے اور پھر فوراً آگے روانہ ہو گئے۔

6 جون، الہ آباد میں سپاہیوں نے بغاوت کر دی، (انگریز) افسروں کا بیویوں اور بچوں کے ساتھ قتل عام کیا، قلعہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جس کی مدافعت کرنل سمپسن کر رہے تھے جنہیں بندوقچی فوج۔ آخر الذکر نے سارے سکھوں کو بھگایا، قلعہ پر قبضہ کرلیا، جگہ کی صرف انگریزوں نے حفاظت کی (راستے میں اس نے بنارس تسخیر کرلیا اور 37 ویں دیسی پیدل رجمنٹ کو شکست دی جو بغاوت کی پہلی منزل میں تھی۔ دیسی سپاہی بھاگ گئے)۔ چاروں طرف سے (انگریز) فوجیں الہ آباد آنے لگیں۔

30 جون، جنرل ہیولاک الہ آباد آئے، کمان ہاتھ میں لی اور تقریباً ایک ہزار انگریزوں کو ساتھ لے کر کانپور کو کوچ کیا۔ 12 جولائی کو فتحپور میں دیسی سپاہیوں کو پیچھے دھکیل دیا، وغیرہ۔ کچھ اور فوجی اقدام۔

16 جولائی، ہیولاک کی فوج کانپور کے مضافات میں، ہندوستانیوں کو شکست دیدی لیکن

قلعہ بندی میں داخل ہونے میں بہت دیر ہوگئی۔ رات کے وقت نانا نے تمام انگریز قیدیوں کو قتل کر دیا۔۔۔افسر، خواتین، بچے۔ پھر اسلحہ خانہ کو بھک سے اڑا دیا اور شہر چھوڑ دیا۔ 17 جولائی، انگریز فوج اس مقام میں داخل ہوئی۔ ہیولاک نے نانا کی پناہ گاہ بٹھور کوچ کیا، کسی مزاحمت کے بغیر اس پر قبضہ کرلیا، محل تباہ کر دیا، قلعہ کو بھک سے اڑا دیا اور پھر کانپور واپس مارچ کیا۔ وہاں انہوں نے مرکز کی حفاظت کرنے اور تھامے رکھنے کے لئے نیئل کو چھوڑ دیا اور خود ہیولاک مدد کے لئے لکھنو روانہ ہوگئے۔ وہاں سر ہنری لارنس کی کوششوں کے باوجود ریزیڈنسی کے علاوہ سارا شہر باغیوں کے ہاتھ میں آ گیا۔

30 جون، ساری محافظ فوج نے پڑوس میں باغیوں کی ایک جماعت کے خلاف کوچ کیا، پسپا کر دی گئی، ریزیڈنسی میں پناہ لی، یہ جگہ محاصرے میں تھی۔

4 جولائی، سر ہنری لارنس کا انتقال (2 جولائی کو بم پھٹنے سے زخمی ہوئے)۔ کرنل انگلیز نے کمان سنبھال لی۔ وہ تین ماہ تک سنبھالے رہے کبھی کبھی محاصرہ توڑ کر محاصرین پر حملہ کر کے۔ ہیولاک کی کارروائیاں (صفحہ 271)۔ آخرالذکر کی کانپور میں واپسی کے بعد سر جیمس اوٹرم فوج کی بڑی تعداد کے ساتھ ان کے شریک ہوگئے اور انہوں نے مختلف باغی ضلعوں کی کئی علیحدہ رجمنٹوں کی کمکیں روانہ کیں۔

19 ستمبر ہیولاک، اوٹرم اور نیئل کی کمان میں ساری فوج نے گنگا کو پار کیا، انہوں نے عالم باغ پر حملہ کیا، لکھنو سے 8 میل دور اودھ کے بادشاہوں کے گرما محل پر قبضہ کیا۔

25 ستمبر، لکھنو پر آخری بار جھپٹ ماری گئی، ریزیڈنسی پہنچے جہاں متحدہ فوج کو تنگ محاصرے میں دو ماہ اور ٹھہرنا پڑا (جنرل نیئل شہر میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ اوٹرم کا بازو شدید طور پر زخمی ہوگیا۔)

20 ستمبر، دہلی پر قبضہ کرلیا گیا، جنرل ولسن کی رہنمائی میں چھ دن کی لڑائی کے بعد (تفصیل کے لئے حوالہ صفحات 272 اور 273 پر)۔ ہڈسن آگے آگے گھوڑے پر محل میں داخل ہوا، بوڑھے بادشاہ اور ملکہ (زینت محل) کو گرفتار کیا۔ انہیں جیل میں بند کر دیا گیا، اور ہڈسن نے خود اپنے ہاتھوں سے (گولی مار کر) شہزادوں کی جان لی۔ دہلی میں محافظ فوج جما دی گئی اور وہ خاموش ہوگیا۔ اس کے فوراً بعد کرنل گریٹ ہیڈ دہلی سے آگرہ گئے جس کے قریب انہوں نے ھولکر کی راجدھانی اندور کے باغیوں کی ایک بڑی جماعت کو شکست دی۔

10 اکتوبر، انہوں نے آگرہ تسخیر کرلیا، پھر کانپور روانہ ہوئے جہاں وہ 26 اکتوبر کو پہنچے۔ اسی دوران میں اعظم گڑھ، چھترا (ہزاری باغ کے قریب)، کھجوا اور دہلی کے اردگرد دیہات میں کپتان بوئیلیو، میجر انگلش، پیل (آخرالذکر بحری بریگیڈ کے ساتھ، منظرِ عمل پر پہنچنے والے پروبن اور فین کے سوار وطن سے کمک، رضا کاروں کی رجمنٹیں بھی) اور شاورز کے تحت انگریز فوج نے باغیوں کو شکست دی۔ اگست میں سر کالن کیمبل نے کلکتہ کی کمان سنبھال لی اور بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاری کرنے لگے۔

19 نومبر 1857ء، سر کالن کیمبل نے لکھنو کی ریزیڈنسی میں محصور محافظ فوج کو آزاد کیا (سر ہنری ہیولاک 24 نومبر کو مر گئے)۔ لکھنو سے۔

25 نومبر 1857ء، کالن کیمبل کانپور روانہ ہو گئے، یہ شہر پھر باغیوں کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

6 دسمبر 1857ء کانپور کے سامنے کالن کیمبل کی فاتحانہ لڑائی۔ باغی بھاگ گئے، شہر کو ویران چھوڑ گئے، ان کا تعاقب کیا گیا اور سر ہوپ گرانٹ نے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ پٹیالہ میں کرنل سیٹن اور مین پوری میں میجر ہڈسن نے باغیوں کو شکست دی۔ اور کئی دوسرے مقامات پر۔

27 جنوری 1858ء، دہلی کے بادشاہ کو ڈاز کے تحت کورٹ مارشل میں لایا گیا، وغیرہ۔ ''مجرم'' (مغل شاہی خاندان کا نمائندہ جو 1526ء میں قائم ہوا تھا!) کی حیثیت سے سزائے موت۔ اس سزا کو رنگون میں عمر قید بہ عبور دریائے شور میں تبدیل کر دیا گیا۔ سال کے آخر میں انہیں رنگون منتقل کر دیا گیا۔

سر کالن کیمبل کی 1858ء کی مہم۔ 2 جنوری کو انہوں نے فرخ آباد اور فتح گڑھ کو تسخیر کر لیا، اپنے آپ کو کانپور میں جما لیا جہاں انہوں نے ہر جگہ سے تمام دستیاب فوجیں، رسد اور توپیں بھیجنے کا حکم جاری کیا۔ باغی لکھنو کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ جہاں سر جیمس اوٹرم روکے ہوئے تھے۔ کئی دوسرے حادثوں کے بعد (حوالہ ملاحظہ ہو صفحات 276، 277 پر) 15 مارچ کو لکھنو پر دوبارہ قبضہ کر لیا گیا (کالن کیمبل اور سر جیمس اوٹرم وغیرہ کی رہنمائی میں)، شہر کی لوٹ مار جہاں مشرقی فن کے خزانے جمع ہیں۔ 21 مارچ کو لڑائی ختم۔ آخری توپ 23 تاریخ کو داغی گئی۔ بریلی کی طرف باغیوں کا فرار جن کے رہنما شہزادہ فیروز بخت، دہلی کے بادشاہ کے بیٹے، بٹھور کے نانا صاحب،

فیض آباد کے مولوی اور اودھ کی بیگم حضرت محل تھے۔

25 اپریل 1858ء، کیمبل نے شاہجہاں پور پر قبضہ کرلیا۔ بریلی کے پاس موگز نے باغیوں کا حملہ پسپا کردیا۔ 6 مئی کو محاصرے کی توپیں بریلی پر آگ برسانے لگیں اور جنرل جونس مرادآباد پر قبضہ کرنے کے بعد مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گئے۔ نانا اور ان کے حامی بھاگ گئے، بریلی پر بلامزاحمت قبضہ کرلیا گیا۔ اسی دوران میں شاہجہاں پور کو جو باغیوں سے گھرا ہوا تھا جنرل جونس نے آزاد کرالیا۔ لوگارڈ کے ڈویژن پر لکھنو سے کوچ کے وقت حملہ کیا گیا، کنور سنگھ کی رہنمائی میں باغیوں کے ہاتھوں سخت شکست کھائی۔ تھوڑے عرصے بعد فیض آباد کے مولوی مارے گئے اور اس سے پہلے سرھوپ گرانٹ نے بیگم کو شکست دیدی جو نئی فوجیں جمع کرنے گھاگرا دریا بھاگ گئی تھیں۔

1858ء کے وسط جون میں، باغیوں کو تمام مرکزوں میں شکست ہوئی۔ مشترکہ اقدام کے نااہل۔ لٹیروں کے گروپوں میں بٹے ہوئے، انگریزوں کی منقسم فوجوں پر سخت دباؤ ڈالتے ہوئے۔ اقدام کے مرکز: بیگم، دہلی کے شہزادے اور نانا صاحب کے پرچم۔

وسطی ہندوستان میں سرھیوروز کی دو ماہ (مئی اور جون) کی مہم نے بغاوت پر آخری ضرب لگائی۔

جنوری 1858ء، روز نے راحت گڑھ، فروری میں ساگر اور گڑھ کوٹ پر قبضہ کرلیا، پھر جھانسی کو مارچ کیا جہاں رانی لکشمی بائی ڈٹی ہوئی تھی۔

یکم اپریل 1858ء، تانتیا ٹوپی کے خلاف سخت اقدام، نانا صاحب کے چچا زاد بھائی جنہوں نے جھانسی کو بچانے کے لئے کالپی سے کوچ کیا تھا۔ تانتیا کو شکست ہوئی۔

4 اپریل کو جھانسی تسخیر کرلیا گیا، رانی اور تانتیا ٹوپی فرار ہو گئے، انگریزوں کا کالپی میں انتظار کیا۔ اس کی طرف کوچ کرتے ہوئے۔

7 مئی 1858ء، شہر کونچ میں دشمن کی طاقتور جماعت نے روز پر حملہ کیا۔ روز نے اسے نمایاں طور پر شکست دیدی۔

16 مئی 1858ء، روز نے کالپی سے چند میل دور، باغیوں کا محاصرہ کیا۔

22 مئی 1858ء، کالپی کا محاصرہ توڑنے کے لئے باغیوں نے بے دھڑک اقدام کیا۔

انہیں بری طرح شکست ہوئی، بھاگ گئے۔

23 مئی 1858ء، روز نے کالپی پر قبضہ کرلیا۔ اپنے سپاہیوں کو آرام کرنے کے لئے جو موسم گرما (کی مہم) سے تھک گئے تھے وہاں چند دن ٹھہرے۔

2 جون، نوجوان سندھیا (انگریزوں کے وفادار کتے) کو اسی کی فوج نے شدید لڑائی کے بعد گوالیار سے نکال دیا اور اس نے آگرہ بھاگ کر جان بچائی۔ روز نے گوالیار پر کوچ کیا۔ باغیوں کے سربراہ جھانسی کی رانی اور تانتیا ٹوپی نے

19 جون، اس کے خلاف لشکر پہاڑی (گوالیار کے سامنے) پر لڑائی کی، رانی ماری گئی، کافی قتل عام کے بعد اس کی فوج منتشر ہوگئی، گوالیار انگریزوں کے ہاتھوں میں۔

جولائی، اگست، ستمبر 1858ء کے دوران، سر کالن کیمبل، سر ہوپ گرانٹ اور جنرل والپول زیادہ ممتاز باغیوں کے تعاقب اور ان تمام قلعوں پر قبضہ کرنے میں مصروف رہے ہیں جن پر اختیار بحث طلب تھا۔ بیگم آخری بار لڑائیاں لڑیں، پھر نانا صاحب کے ساتھ راپتی دریا کے پار انگریزوں کے وفادار کتے، نیپال کے جنگ بہادر کے علاقے میں بھاگ گئیں۔ اس نے انگریزوں کو اجازت دے دی کہ وہ اس کے ملک میں باغیوں کا تعاقب کریں۔ چنانچہ ''پرجوش لٹیروں کے آخری گروپ منتشر ہوگئے۔''

نانا اور بیگم پہاڑیوں میں چلے گئے اور ان کے حامیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

1859ء کا آغاز، تانتیا ٹوپی کی چھپنے کی جگہ کا کھوج لگالیا گیا، اس پر مقدمہ چلا اور پھانسی دی گئی۔ نانا صاحب کے متعلق ''کہا جاتا ہے'' کہ نیپال میں انتقال کرگئے۔ بریلی کے خان کو پکڑلیا گیا اور گولی ماردی گئی۔ لکھنو کے ماموخاں کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ دوسروں کو جلاوطن کردیا گیا یا مختلف میعادوں کے لئے قید کیے گئے۔ باغیوں کی اکثریت نے۔۔۔ ان کی رجمنٹیں توڑ ڈالی گئی تھیں۔۔۔ ہتھیار ڈال دیئے اور رعیت بن گئے۔ اودھ کی بیگم نیپال میں کٹھمنڈو میں مقیم رہیں۔ اودھ کی سرزمین کی ضبطی، جسے کیننگ نے اینگلو انڈین حکومت کی جائیداد ہونے کا اعلان کیا! سرجیمس اوٹرم کی جگہ اودھ کا چیف کمشنر سر رابرٹ منٹگمری کو بنادیا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ۔ اسے جنگ ختم ہونے سے پہلے ہی توڑ ڈالا گیا۔

دسمبر 1857ء، پامرسٹن انڈین بل۔ فروری 1858ء میں بورڈ آف ڈائرکٹرس کے شدید

احتجاج کے باوجود پہلی خواندگی منظور ہوگئی، لیکن لبرل کابینہ کی جگہ ٹوری نے لے لی۔

19 فروری 1858ء، ڈزرائیلی کا انڈین بل (حوالہ صفحہ 281 پر) نامنظور کردیا گیا۔

2 اگست 1858ء، لارڈ اسٹینلی کا انڈین بل منظور ہوگیا اور اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ۔ اب ہندوستان وکٹوریا ''عظمی'' کی سلطنت کا ایک صوبہ ہے!

کارل مارکس نے انیسویں صدی کی آٹھویں دھائی میں تحریر کیا۔

❁❁❁❁❁

ہندوستان سے موصول ہونے والے مراسلات

کارل مارکس

لندن، 31- جولائی 1857ء

آخری ہندوستانی ڈاک جس نے دہلی سے 17 جون تک کی اور بمبئی سے یکم جولائی تک کی خبریں پہنچائی ہیں انتہائی افسردہ پیش بینوں کو پورا کرتی ہے۔ بورڈ آف کنٹرول کے صدر مسٹر ورنن اسمتھ نے دارالعوام کو پہلی بار ہندوستانی بغاوت سے مطلع کیا تھا تو انہوں نے اعتماد سے بیان کیا تھا کہ اگلی ڈاک یہ خبر لائے گی کہ دہلی کو مسمار کر دیا گیا۔ ڈاک آ گئی لیکن دہلی کو ہنوز ''تاریخ کے صفحات سے مٹایا'' نہیں گیا۔ پھر یہ کہا گیا کہ توپ خانہ 9 جون سے پہلے نہیں لایا جا سکتا لہٰذا مورد عتاب شہر پر حملے کو اس تاریخ تک ملتوی کر دینا چاہئے۔ 9 جون کسی اہم واقعہ کے نمایاں ہوئے بغیر گزر گیا۔ 12 اور 15 جون کو بعض واقعات ہوئے لیکن ایک حد تک متضاد سمت میں، دہلی پر انگریزوں نے ہلا نہیں بولا بلکہ انگریزوں پر باغیوں نے حملہ کیا لیکن ان کے پے در پے دھاووں کو پسپا کر دیا گیا ہے۔ دہلی کی شکست اس طرح پھر ملتوی ہو گئی، نام نہاد سبب اب محاصرے کے توپ خانے کا نہ ہونا ہی نہیں رہا بلکہ جنرل برنارڈ کا یہ فیصلہ ہے کہ کمک کے لئے انتظار کریں کیونکہ ان کی فوج تقریباً 3000 جوان ۔۔۔ قدیم دارالسلطنت پر قبضہ کرنے کے لئے ناکافی ہے جس کی مدافعت 30000 سپاہی کر رہے ہیں جن کے پاس تمام فوجی ساز و سامان ہے۔ باغیوں نے اجمیری دروازے کے باہر ایک کیمپ بھی قائم کر لیا ہے۔ ابھی تک فوجی مصنفین 30000 یا 40000 مقامی سپاہیوں کی فوج کو شکست دینے کے لئے 3000 جوانوں کی انگریز فوج کو بالکل کافی سمجھنے میں متفق تھے۔ اگر معاملہ ایسا نہیں ہے تو انگلستان ۔۔۔ لندن ''ٹائمز'' کا فقرہ استعمال کر

کے ہندوستان کی ''دوبارہ فتح'' کرنے کے لائق کیسے ہوسکتا ہے؟

ہندوستان میں برطانوی فوج آج کل 30000 جوانوں پر مشتمل ہے۔ اگلے نصف سال میں انگلستان سے جو جوان روانہ ہو سکتے ہیں ان کی تعداد 20000 یا 25000 سے زیادہ نہیں ہو سکتی، جن میں سے 6000 جوان ہندوستان میں یورپی صفوں کی خالی جگہیں پر کریں گے اور جن میں سے 18000 یا 19000 جوان بحری سفر، موسم کے نقصان یا دوسرے حادثوں سے گھٹ کر تقریباً 14000 رہ جائیں گے جو جنگ کے میدان میں آ سکیں گے۔ برطانوی فوج کو غدر کرنے والوں سے بے حد غیر متناسب تعداد میں مقابلہ کرنے کا مسئلہ حل کرنا چاہئے یا ان کا مقابلہ کرنے ہی سے دستبردار ہو جانا چاہئے۔ دہلی کے ارد گرد ان کی فوج کو مرکوز کرنے میں سستی کو سمجھنے سے ہم اب بھی قاصر ہیں۔ سال کے اس موسم میں اگر گرمی غیر مغلوب رکاوٹ ثابت ہوئی جو سر چارلس نیپئر کے دنوں میں نہیں تھی، تو چند ماہ بعد یورپی فوج کی آمد پر بارش رکاوٹ کا ایک اور تصفیہ کن غدر فراہم کرے گی۔ یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ موجودہ غدر درحقیقت جنوری کے مہینے میں شروع ہو گیا تھا اور اس طرح برطانوی حکومت کو اپنے ہتھیار اور فوج کو تیار رکھنے کی بروقت تنبیہ مل گئی تھی۔

محصور کرنے والی انگریز فوج کے مقابلے میں دہلی پر دیسی سپاہیوں کے طویل قبضے نے ظاہر ہے کہ فطری نتیجہ پیدا کیا ہے۔ غدر کلکتہ کی دہلیز تک پہنچتا جا رہا تھا، پچاس بنگالی رجمنٹوں کا وجود ختم ہو گیا، بذات خود بنگالی فوج ماضی کا خیالی فسانہ بن گئی اور یورپی جو بڑی وسعت میں منتشر تھے اور جدا جدا جگہوں میں بند تھے یا تو باغیوں کے ہاتھوں قتل کر دیئے گئے یا انہوں نے جان ہار مدافعت کا رویہ اختیار کر لیا۔ خود کلکتہ میں سرکاری عمارتوں پر بے خبری میں قبضہ کرنے کی سازش کے بعد جو اچھی طرح منظم کی گئی تھی اور جو دیسی فوج وہاں مقیم تھی اسے توڑ دینے کے بعد عیسائی باشندوں نے رضا کار محافظوں کی تشکیل کی۔ بنارس میں ایک دیسی رجمنٹ کو نہتا کرنے کی کوشش کا مقابلہ سکھوں کی ایک جماعت اور تیرہویں بے قاعدہ سوار رسالے نے کیا۔ یہ واقعہ بہت اہم ہے کیونکہ یہ دکھاتا ہے کہ مسلمانوں کی طرح سکھ بھی برہمنوں کے ساتھ ملتے جا رہے ہیں اور اس طرح برطانوی حکمرانی کے خلاف تمام مختلف قبیلوں کا عام اتحاد تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ انگریزوں کے اعتقادات کا یہ خاص جز رہا ہے کہ دیسی فوج ہی ہندوستان میں ان کی

ساری قوت ہے۔ اب یکایک وہ پورے طور پر محسوس کرتے ہیں کہ یہی فوج ان کے لئے واحد خطرہ ہے۔ ہندوستان کے متعلق گذشتہ بحثوں میں بورڈ آف کنٹرول کے صدر مسٹر ورنن اسمتھ نے اب بھی اعلان کیا کہ ''اس امر پر بہت زیادہ اصرار نہیں کیا جا سکتا کہ مقامی راجوں اور بغاوت کے درمیان کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔'' دو دن بعد انہیں ورنن اسمتھ کو ایک مراسلہ شائع کرنا پڑا جس میں یہ منحوس پیرا شامل تھا:

''14 جون کو سابق شاہ اودھ (واجد علی شاہ) کو جو پکڑے گئے کاغذات کے مطابق سازش میں ملوث تھے فورٹ ولیم میں رکھا گیا اور ان کے حامیوں کو نہتا کر دیا گیا۔''

عنقریب دوسرے حقائق فاش ہوں گے جو جان بل (انگریز قوم) کو بھی قائل کر دیں گے کہ جسے وہ فوجی غدر سمجھتا ہے وہ درحقیقت قومی بغاوت ہے۔

انگریز پریس اس یقین سے بڑی تسلی حاصل کرنے کا بہانہ بناتا ہے کہ بغاوت بنگال پریزیڈنسی کی حدود سے باہر نہیں پھیلی ہے اور بمبئی اور مدراس کی فوجوں کی وفاداری پر ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہے۔ لیکن معاملے کا یہ خوشگوار تصور اس حقیقت سے انوکھے طور پر ٹکراتا ہے جو آخری ڈاک سے ظاہر ہوتی ہے کہ اورنگ آباد میں نظام کی سوار فوج میں بغاوت ہو گئی۔ اورنگ آباد اسی نام کے ضلع کا صدر مقام ہے جو بمبئی پریزیڈنسی سے تعلق رکھتا ہے تو سچ یہ ہے کہ پچھلی ڈاک بمبئی فوج میں بغاوت کے آغاز کی اطلاع دیتی ہے۔ اورنگ آباد کے غدر کے متعلق کہا گیا ہے کہ جنرل وڈبرن نے اسے فوراً کچل دیا۔ لیکن کیا میرٹھ کے غدر کے متعلق یہ نہیں کہا گیا تھا کہ اسے فوراً کچل دیا گیا؟ کیا لکھنو کے غدر نے جسے سر لارنس نے کچل دیا تھا دو ہفتے بعد اور زیادہ غیر مغلوب سر نہیں اٹھایا؟ کیا یہ یاد نہیں کرنا چاہئے کہ ہندوستانی فوج کے غدر کے پہلے اعلان ہی کے ساتھ بحال شدہ نظم و نسق کا اعلان کیا گیا تھا؟ اگرچہ بمبئی اور مدراس کی فوجوں کا زیادہ حصہ نیچی ذات کے لوگوں پر مشتمل ہے لیکن ہر رجمنٹ میں کوئی سو راجپوت شامل ہیں، اور یہ تعداد بنگال فوج کے اونچی ذات کے باغیوں کے ساتھ رابطے قائم کرنے کے لئے بالکل کافی ہے۔ پنجاب کے پرسکون ہونے کا اعلان کیا گیا ہے لیکن ہمیں مطلع کیا جاتا ہے کہ ''فیروز پور میں 13 جون کو فوجی پھانسیاں دی گئیں۔'' اور وائن کے دستوں۔۔۔ 5 ویں پنجاب پیدل فوج۔۔۔ کی تعریف کی جاتی ہے کہ ''55 ویں دیسی پیدل فوج کا تعاقب

کرنے میں اس نے قابل تعریف کارروائی کی۔ اسے تسلیم کرنا چاہئے کہ یہ بہت ہی عجیب و غریب سکون ہے۔

کارل مارکس نے 31 جولائی 1857ء کو تحریر کیا۔
''نیویارک ڈیلی ٹریبیون'' کے شمارے 5091 میں 14 اگست 1857ء کو شائع ہوا۔

ہندوستان میں اذیت رسانی کی تفتیش

کارل مارکس

ہمارے لندن کے نامہ نگار نے جس کا خط کل ہم نے ہندوستان میں بغاوت کے بارے میں شائع کیا ہے قطعی بجا طور پر کچھ ایسے پچھلے واقعات کا حوالہ دیا ہے جنہوں نے اس طوفانی دھماکے کے لئے زمین ہموار کی۔ آج ہم کچھ وقت کے لئے خیالات کے اس سلسلے کو جاری رکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے برطانوی حکمراں کسی طرح بھی ہندوستانی عوام کے ایسے نرم اور بے داغ محسن نہیں ہیں جیسا کہ وہ ساری دنیا کو یقین دلانا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ہم ایسٹ انڈیا میں اذیتوں کے سوال سے متعلق سرکاری نیلی کتابوں کی طرف رجوع کریں گے جو 1856ء اور 1857ء کے برطانوی دارالعوام کے اجلاسوں میں پیش کی گئی ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے یہ ثبوت کچھ ایسا ہے جس کی تردید ممکن نہیں۔

''سالانہ تقریباً اتنی ہی تعداد میں مجرمانہ الزامات کی بنا پر لوگوں پر تشدد کیا جاتا ہے جتنی محصول کی غیر ادائیگی کے لئے۔''

کمیشن اعلان کرتا ہے کہ

''ایک بات نے کمیشن کو اس یقین سے بھی زیادہ درد انگیز طور پر متاثر کیا ہے کہ اذیت پہنچائی جاتی ہے۔ یہ ہے اذیت زدہ فریقین کے لئے دادرسی میں مشکل۔''

کمیشن کے ممبروں نے اس مشکل کی وجوہ یہ بتائی ہیں: (1) ان لوگوں کے لئے جو ذاتی طور پر کلکٹر سے فریاد کرنا چاہتے ہیں طویل فاصلوں کے سفر کی وجہ سے اخراجات اور کلکٹر کے دفتر میں تضیع اوقات۔ (2) یہ خوف کہ تحریری درخواست ''اس عام ہدایت کے ساتھ واپس کردی جائے گی

کہ تحصیلدار'' (ضلع پولیس اور محاصلات کا افسر) اس کی جانچ کرے یعنی وہی شخص جس نے ذاتی طور پر یا اپنے پولیس کے چھوٹے ماتحتوں کے ذریعہ درخواست دہندہ کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔
(3) سرکاری افسروں کے خلاف قانونی کارروائی اور سزا کے اس وقت بھی ناکافی ذرائع، جب ان کو ایسی حرکتوں کی وجہ سے باقاعدہ ملزم یا مجرم ٹھہرایا جاتا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اگر کسی مجسٹریٹ کے سامنے اس طرح کا الزام ثابت بھی ہو گیا تو اس کی سزا صرف پچاس روپیہ یا ایک مہینے کی جیل ہو گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ملزم کو ''سزا کے لئے فوجداری کے جج کے سپرد کر دیا جائے یا سرکٹ کورٹ کے سامنے مقدمے کی سماعت کے لئے پیش کیا جائے۔''

رپورٹ میں یہ اضافہ کیا گیا ہے:

''یہ طویل کارروائی ہے جو ایک قسم کی قانون شکنی کے لئے کی جاتی ہے یعنی اختیارات کو غلط استعمال کرنے کے لئے جس میں پولیس کو ملزم ٹھہرایا جاتا ہے اور یہ کارروائی دعویٰ کے لئے قطعی بے نتیجہ ہوتی ہے۔''

پولیس یا محاصلات کے افسر پر، جو ایک ہی شخص ہوتا ہے کیونکہ محصول پولیس جمع کرتی ہے، جب روپیہ زبردستی وصول کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے تو پہلے اس کا مقدمہ اسسٹنٹ کلکٹر کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ پھر وہ کلکٹر سے اپیل کر سکتا ہے اور اس کے بعد ریونیو بورڈ کو۔ یہ بورڈ ملزم کا معاملہ حکومت یا عدالت دیوانی کو بھیج سکتا ہے۔

''قانون کی ایسی صورت حال میں غربت زدہ رعیت کسی دولت مند افسر محاصلات کے خلاف مقدمہ نہیں چلا سکتی اور ہمیں کسی واحد واقعہ کا بھی علم نہیں ہے جس میں ان دو قوانین (1822ء اور 1828ء) کے تحت لوگوں نے شکایت کی ہو۔''

مزید برآں، روپیہ کی زبردستی وصولی کا الزام اس صورت میں عائد ہوتا ہے جب متعلقہ افسر سرکاری رقم ہڑپ کر لیتا ہے یا رعیت کو زائد محصول دینے پر مجبور کرتا ہے جسے وہ اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سرکاری محصول جمع کرنے کے لئے تشدد کے استعمال کے واسطے قانون میں کوئی سزا نہیں رکھی گئی ہے۔

یہ رپورٹ جس سے یہ حوالے لئے گئے ہیں صرف مدراس پریزیڈنسی سے تعلق رکھتی ہے لیکن خود لارڈ ڈلہوزی نے ستمبر 1855ء میں ڈائرکٹروں کو لکھا تھا کہ

''مجھے بہت دنوں سے اس بارے میں شک نہیں ہے کہ ہر برطانوی صوبے میں کسی نہ کسی شکل میں چھوٹے افسروں کے ہاتھوں اذیت رسانی ہوتی ہے۔''

اس طرح اذیت رسانی کے ہمہ گیر استعمال کو برطانوی ہند کے مالیاتی ڈھانچے کے اٹوٹ جز کی حیثیت سے سرکاری طور پر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس کا اعتراف برطانوی حکومت کی دفاع کے لئے کیا جاتا ہے۔ درحقیقت، مدراس کمیشن نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اذیت رسانی کا رواج قطعی طور پر چھوٹے ہندوستانی افسروں کا قصور ہے جبکہ حکومت کے یورپی افسر گویا اس کو ہمیشہ روکنے کی امکانی کوشش کرتے ہیں خواہ وہ ناکام ہی کیوں نہ ہو۔ اس دعوے کے جواب میں مدراس کے دیسی لوگوں کی انجمن نے جنوری 1856ء میں پارلیمنٹ کو ایک درخواست بھیجی جس میں اذیت رسانیوں کی تفتیش کے بارے میں مندرجہ ذیل شکایتیں کی گئی تھیں: (1) یہ کہ تحقیقات تقریباً نہیں ہوئی کیونکہ کمیشن کا اجلاس صرف شہر مدراس میں ہوا اور وہ بھی تین مہینے کے دوران جبکہ چند کیسوں کے علاوہ شکایت کرنے والے دیسی لوگوں کے لئے اپنا گھر چھوڑنا ممکن نہیں تھا۔ (2) کہ کمیشن کے ممبروں نے برائیوں کی جڑ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی، اگر انہوں نے ایسا کیا ہوتا تو وہ اس کو محاصلات وصول کرنے کے نظام ہی میں پاتے۔ (3) ملزم دیسی افسروں سے یہ تحقیقات نہیں کی گئی کہ کس حد تک اذیت رسانی کے رواج سے ان کے اعلیٰ افسروں کا تعلق تھا۔

''اس اذیت رسانی کا آغاز'' درخواست دہندگان نے لکھا ہے ''اس کے جسمانی طور پر پہنچانے والوں سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا حکم انہیں اپنے فوری اعلیٰ افسروں سے ملتا ہے جو محاصلات کی مقررہ رقم کی وصولیابی کے لئے اپنے ان یورپی افسروں کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں جو اپنی باری میں اسی مد کے لئے حکومت کے اور زیادہ اونچے افسروں کے سامنے ذمے دار ہوتے ہیں۔''

درحقیقت، اس شہادت کے چند حوالے جس پر، کمیشن کے اعلان کے مطابق مدراس رپورٹ مبنی ہے، رپورٹ کے اس دعوے کی تردید کرتے ہیں کہ ''انگریز قابل الزام نہیں ہیں۔'' چنانچہ ایک تاجر مسٹر ڈبلیو۔ ڈی۔ کولہوف کہتے ہیں:

''رائج شدہ اذیت رسانی کے طریقے مختلف ہیں اور تحصیلدار اور اس کے ماتحتوں کی پرواز خیال پر منحصر ہوتے ہیں لیکن آیا اعلیٰ صاحبان اختیار کی طرف سے اس کی کوئی تلافی کی جاتی ہے یا نہیں یہ میرے لئے کہنا دشوار ہے کیونکہ ساری شکایتیں عام طور پر تحصیلدار کو تحقیقات اور اطلاعات

کے لئے بھیج دی جاتی ہیں۔''

دیسی لوگوں کی شکایتوں میں ہمیں مندرجہ ذیل ملتا ہے:

''پچھلے سال ہمارے یہاں خریف (دھان یا چاول کی خاص فصل) بارش کی کمی کی وجہ سے خراب گئی اور ہم حسب معمول لگان نہ ادا کر سکے۔ جب جمع بندی تیار کی گئی تو ہم نے اس نقصان کی چھوٹ اس سمجھوتے کی بنا پر چاہی جو ہم نے 1837ء میں کیا تھا جب مسٹر ایڈن ہمارے کلکٹر تھے۔ چونکہ اس چھوٹ کی اجازت نہیں ملی اس لئے ہم نے پٹے لینے سے انکار کر دیا۔ تب تحصیلدار نے ہم کو سختی کے ساتھ ادائیگی کے لئے مجبور کیا۔ یہ سلسلہ جون کے مہینے سے اگست تک جاری رہا۔ میں اور دوسرے لوگ ایسے اشخاص کی نگرانی میں دیئے گئے جو ہمیں دھوپ میں لے جا کر جھکا دیتے تھے اور ہماری پیٹھ پر پتھر لاد دیئے جاتے تھے اور جلتی ہوئی ریت میں کھڑا رکھا جاتا تھا۔ صرف آٹھ بجے کے بعد ہمیں اپنے دھان کے کھیتوں میں جانے کی اجازت دی جاتی تھی۔ اس طرح کی بدسلوکی تین مہینے تک جاری رہی جس کے دوران میں ہم کبھی کبھی کلکٹر کو درخواستیں دینے گئے لیکن انہوں نے درخواستیں لینے سے انکار کر دیا۔ ہم یہ درخواستیں جمع کر کے سشن کی عدالت میں اپیل کرنے گئے جس نے ان کو کلکٹر کے یہاں بھیج دیا۔ پھر بھی ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ ستمبر کے مہینے میں ہم کو ایک نوٹس دیا گیا اور 25 دن بعد ہماری جائیداد قرق کر لی گئی اور بعد کو فروخت کر دی گئی۔ ان واقعات کے علاوہ جو میں نے لکھے ہیں ہماری عورتوں کے ساتھ بھی برا سلوک کیا گیا، ان کے سینوں میں شکنجے رکھے گئے۔''

کمیشن کے ممبروں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ایک دیسی عیسائی نے کہا:

''جب کوئی یورپی یا دیسی رجمنٹ ادھر سے گزرتی ہے تو ساری رعایا کو کھانے پینے کا سامان مفت دینے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اگر کوئی چیزوں کی قیمت مانگتا ہے تو اس کو سخت اذیت پہنچائی جاتی ہے۔''

پھر ایک برہمن کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ اس کو، اس کے گاؤں والوں اور پڑوسی گاؤں کے لوگوں کو تحصیلدار کا یہ حکم ملا کہ یہ لوگ مفت لکڑی کے تختے، کوئلہ اور ایندھن وغیرہ فراہم کریں تاکہ تحصیلدار کولرون کے پل کی تعمیر کا کام جاری رکھے۔ برہمن کے انکار پر اس کو بارہ آدمیوں نے پکڑ کر طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ برہمن نے یہ بھی بتایا:

''میں نے اسسٹنٹ کلکٹر مسٹر ڈبلیو۔ کیڈیل کو شکایت کی درخواست دی لیکن انہوں نے کوئی

تحقیقات نہیں کی اور میری درخواست پھاڑ دی، چونکہ وہ چاہتے ہیں کہ کولرون کا پل غریبوں کے متھے سستے داموں تیار ہو جائے اور سرکار میں ان کا نام ہو جائے۔ اس لئے تحصیلدار چاہے قتل بھی کیوں نہ کر دے اسسٹنٹ کلکٹر اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔''

انتہائی شدید جبری وصولی اور تشدد کی غیر قانونی کارروائیوں کو اعلیٰ افسران کس روشنی میں دیکھتے ہیں اس کا اظہار 1855ء میں پنجاب میں ضلع لدھیانہ کے کمشنر مسٹر بریرٹن کے واقعہ سے ہوتا ہے۔ پنجاب کے چیف کمشنر کی رپورٹ کے مطابق یہ ثابت ہوا کہ

''متعدد واقعات میں خود ڈپٹی کمشنر مسٹر بریرٹن کی مرضی یا ہدایت سے امیر شہریون کے مکانوں کی بلاوجہ تلاشی لی گئی، ایسے موقعوں پر قرق کی ہوئی جائیداد طویل مدت تک قرق رہی، بہت سے لوگ جیلوں میں بند کر دیئے گئے اور وہاں ہفتوں تک پڑے رہے اور ان کے خلاف کوئی فرد جرم نہیں لگائی گئی اور خراب چال چلن کے لئے محلکے کے قوانین کو بڑے پیمانے پر اور بلا امتیاز شدت کے ساتھ استعمال کیا گیا، بعض پولیس افسر اور مخبر ڈپٹی کمشنر کے ساتھ ضلع ضلع پھرے جن کی خدمات کو ڈپٹی کمشنر نے ہر جگہ استعمال کیا اور یہی لوگ ساری اذیت کے خاص مجرم تھے۔''

اپنی رپورٹ میں اس معاملے کے بارے میں لارڈ ڈلہوزی نے کہا ہے:

''ہمارے پاس نا قابل تردید ثبوت ہے، ایسا ثبوت جس سے دراصل مسٹر بریرٹن بھی انکار نہیں کرتے کہ افسر موصوف بے قاعدگی اور غیر قانونی باتوں کی بھاری فہرست میں ہر بات کے قصوروار ہیں جن کے لئے چیف کمشنر نے ان کو ملزم ٹھہرایا ہے اور جنہوں نے برطانوی انتظامیہ کے ایک حصے کو بدنام کیا ہے اور برطانوی رعایا کی بڑی تعداد کو سخت ناانصافی، من مانی قید اور ظالمانہ اذیتوں کا نشانہ بنایا ہے۔''

لارڈ ڈلہوزی ''دوسروں کی نصیحت کے لئے مسٹر بریرٹن کو سخت سزا دینے'' کی تجویز کرتے ہیں اور اسی لئے یہ رائے دیتے ہیں:

''مسٹر بریرٹن کو فی الحال ڈپٹی کمشنر کے اختیارات دینا مناسب نہیں ہے، اس درجے سے ان کی تنزلی اول درجے کے اسسٹنٹ تک کر دینی چاہئے۔''

پہلی کتابوں سے یہ حوالے مالابار ساحل پر واقع کنٹر کے ایک تعلقہ کے باشندوں کی اس درخواست پر ختم کئے جا سکتے ہیں جنہوں نے یہ بتانے کے بعد کہ وہ حکومت کو کئی درخواستیں بھیج چکے

ہیں جن کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اپنی سابقہ اور حالیہ حالتوں کا موازنہ یوں کیا ہے:

''جب ہم لوگ سیراب اور خشک زمینوں، پہاڑی اور نشیبی قطعات اور جنگلات کو کاشت میں لا رہے تھے تو معمولی مقررہ لگان دیتے تھے اور اس طرح رانی، بہادر اور ٹیپو کے زیر انتظام سکون اور خوشی سے گزر بسر کرتے تھے۔ پھر سرکاری افسروں نے ہمارے اوپر مزید لگان عائد کیا لیکن ہم نے اس کو کبھی نہیں ادا کیا۔ مالگزاری کی ادائیگی کے لئے ہمارے ساتھ کبھی جبر و تشدد اور برابرتاؤ نہیں ہوا تھا۔ محترم کمپنی کے تحت اس ملک کے آنے کے بعد سرکاری افسروں نے ہم سے پیسہ نچوڑنے کے لئے ہر طرح کے ممکن طریقے اختیار کئے۔ اس برے مقصد کے پیش نظر انہوں نے قانون قاعدے بنائے اور اپنے کلکٹروں اور دیوانی کے ججوں کو انہیں عمل میں لانے کی ہدایات دیں۔ لیکن اس وقت کے کلکٹروں اور ماتحت دیسی افسروں نے کچھ وقت تک ہماری شکایتوں کی طرف مناسب توجہ کی اور ہماری خواہشوں کے مطابق کام کیا۔ اس کے برعکس موجودہ کلکٹر اور ان کے ماتحت افسران، ہر قیمت پر ترقی کی خواہش رکھتے ہوئے، عام طور پر لوگوں کی بہبودی اور مفادات کو نظر انداز کرتے ہیں، ہماری شکایتوں کی طرف سے کان بند کر لیتے ہیں اور ہم پر ہر طرح کا ظلم کرتے ہیں۔''

ہم نے یہاں ہندوستان میں برطانیہ کی حکمرانی کی سچی تاریخ سے ایک مختصر اور معتدل سا حصہ پیش کیا ہے۔ ان واقعات کے پیش نظر غیر جانبدار اور صاحب فکر لوگ پوچھ سکتے ہیں کہ کیا کسی قوم کی یہ کوشش بجا نہیں ہیں کہ وہ ان غیر ملکی فاتحوں کو نکال باہر کرے جو اپنی رعایا کے ساتھ ایسا برا سلوک کرتے ہیں۔ اور اگر انگریز لوگ ایسی باتیں سنگدلی کے ساتھ کر سکے تو کیا اس پر حیرت ہوگی کہ باغی ہندوستانی اپنی بغاوت اور تصادم کے طوفان میں انہیں جرائم اور مظالم کے مرتکب ہوں جو ان پر کئے جاتے ہیں؟

کارل مارکس نے 28 اگست 1857ء کو تحریر کیا۔

''نیویارک ڈیلی ٹریبیون'' کے شمارے 5120 میں 17 ستمبر 1857ء کو اداریے کی حیثیت سے شائع ہوا۔

❁❁❁❁❁

1857ء کی کہانی بڑے بوڑھوں کی زبانی

آغا حیدر حسن مرزا

میرے پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں لال کنوئیں پر دوا سوبھا اور پیر بخش غلام کے ہمراہ رتھ میں بیٹھ کر جراّح کو دکھانے آئی تھی۔ اس کی دوکان سے اُتری ہی ہوں گی کہ کچھ سوار علی علی دین عین کہتے ہوئے ننگی تلواریں ہاتھوں میں لئے کھاری باؤلی کی طرف گھوڑے دوڑاتے چلے گئے، پیر بخش اور دوا سوبھا گھبرا کر مجھے ایک کوٹھے پر لے چڑھے۔ اور رتھ بان ایک گلی میں رتھ گھسا لے گیا۔ غرض وہاں سے تھوڑی دیر بعد اتر بھاگا بھاگ کرتے چاوڑی میں سے ہوتے ہوئے ٹوکری والون اپنی حویلی پہنچے۔ وہاں میں نے دیکھا کہ حویلی کا پھاٹک بند ہے پیر بخش نے کیواڑ دوا سوبھا نے زہرا پھاڑ کر چیخیں ماریں۔ باوا جان جو مارے گھبراہٹ کے بیڑے میں ٹہل رہے تھے اور دو آدمی ہماری خبر لینے کو روانہ کر چکے تھے۔ دوا کی آواز پہچان خود دوڑے ہوئے آئے، کھڑکی کھول ہمیں اندر لیا اور کہا کہ غضب ہوگیا۔ کمپنی کی دیسی فوج بگڑ گئی، اور جہاں کہیں بدیسیوں کو پاتی ہے تلوار کے گھاٹ اتارتی ہے۔ خدا خیر کرے۔ دیکھئے کیا نتیجہ ہو۔ عمر میری چھوٹی ہی تھی۔ کوئی دس گیارہ برس کی ہوں گی۔ لیکن میری یاد چھٹپنے میں غضب کی تھی اب اس بڑھاپے میں اس پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ نہیں تو ذرا ذرا سی معمولی بات مجھے خوب یاد رہتی تھی۔ اور کجا کہ یہ قیامت صغرا، کہ جو گابھ میں بھی ہوں گے۔ اُن کو بھی یہ واقعہ تو یاد ہوگا۔ ایسا گہرا اثر اس مصیبت کا دلوں پر پڑا تھا۔ دور کئے دور نہ ہوتا اور بھلائے نہ بھولتا تھا۔ ساری مصیبت اب تک تازہ ہے اور کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ ایک مدت تک گھر میں رہے پھاٹک حویلی کا ہر وقت بند رہتا۔ مامائیں، اصیلیں اور نوکر سب اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ صرف ہمارے ہاں آدمیوں میں پیر بخش رہ گیا تھا۔ گھر

میں مغل، حرمت، ظہوراً، سوبھا اور پچھی رہ گئی تھیں۔ ان میں سے پچھی، سوبھا اور مغل تو زرخرید تھیں اور میری نانی حضرت نواب امانی بیگم صاحب جو درگاہ کی مہتمم تھیں اور بادشاہ سلامت کو تسبیح دیا کرتی تھیں۔ ان کا معمول تھا کہ صبح نور ظہور فجر کے تڑکے خواب گاہ میں جاتیں اور کہتیں جہاں پناہ سلامت ظلِ سبحانی بیدار ہو جایئے۔ اور کلمہ درود شریف پڑھتے ہوئے تسبیح بادشاہ کو پیش کرتیں اور حضور کا معمول تھا کہ صبح اٹھتے ہی ان کی صورت دیکھتے تھے اور ان کا سرکار سے بارہ سو روپے سال وظیفہ مقرر تھا۔ پچھی جو میری مانی تھی اس کو نانی حضرت نے سو روپے میں خریدا تھا۔ بچاری کہا کرتی تھی۔ متھرا کے قریب کوئی گاؤں تھا اس میں رہتی تھی۔ کنوئیں پر پانی بھرنے آئی۔ نگوڑے بنجارے نے پکڑ لیا اور مشکیں کس بورے میں ڈال، ڈنڈے ڈیرے سنبھال دلّی کی طرف لے آئے۔ یہ بدنصیب چیختی پیٹتی ہی رہی اور قلعے میں لا سو روپے میں بیچ ڈالا۔ نانی حضرت کی صحبت میں مسلمان ہوگئی۔ نماز اپنے شوق سے سیکھی، ننانوے نام اللہ کے یاد کیے جن کا ورد مرتے دم تک کرتی رہی۔ میری اماں جان کے جہیز میں یہ اور مغل دی گئیں۔ دوا سوبھا چوں کہ اماں جان کی مانی تھی وہ اپنی خوشی سے خود چلی آئی اور آخر دم تک ہمارے ہی ہاں رہی۔ بڑی باوفا تھی، اللہ جنت نصیب کرے۔ میری نانی حضرت رنگون حضرت بادشاہ سلامت کے ساتھ گئیں اور وہیں انتقال فرمایا۔

میرے نانا مرزا الٰہی بخش صفوی، خدا بندہ مرزا صفوی کے پوتے تھے، خدا بندہ مرزا طہماسپ صفوی ثانی کے بیٹے تھے اور ہندوستان حضرت محمد شاہ کے زمانے میں چلے آئے تھے۔ میری نانا حضرت نے بڑی عمر پائی اور غدر سے اٹھارہ بیس برس پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ میری نانی حضرت بیوہ رہیں ان کی دو لڑکیاں تھیں ایک کا نام مبارک انسا بیگم تھا۔ جو میری اماں جان تھیں اُن کی شادی، مرزا حسین علی صفوی سے ہوئی یہ میری والدہ کے ہم جد تھے اور دوسری صاحبزادی میری خالہ اماں تھیں۔ ان کا نام صاحب انسا بیگم تھا۔ ان کی شادی مرزا شاہرخ سے ہوئی، اور نواب صاحب محل خطاب ملا۔ مرزا شاہرخ کو شکار میں بگھیلے نے پھاڑ ڈالا۔ اور خالہ اماں بیوہ ہو کر بادشاہ سلامت کے پاس قلعے میں رہتی تھیں۔ نواب ممتاز محل کے ساتھ۔ نواب ممتاز محل کا نام نیازی بیگم تھا اور یہ مرزا فخرو کی بیگم تھیں بادشاہ سلامت کو میری خالہ اماں کی دل جوئی، دل داری کا بڑا خیال تھا۔ مرزا شاہرخ کی وفات کے بعد برسات میں ایک موقعہ پر یہ

ساون انہی کے لئے کہا تھا:

اب مورے سیاں گئے ہیں بدیس موہے چوندری کون رنگاوے

بیر ساون آیا رے

جو سیاں ہوتے تو کہتی لال لال کنبھ کڑا دے

بیر ساون آیا رے

ایک دن کوئی آدھی رات گئے باہر پھاٹک پر کسی نے آواز دی۔ پیر بخش کے سوال جواب کی آواز آئی۔ لیکن کچھ صاف طور پر سنائی نہ دیا۔ اور کچھ بھید سمجھ میں نہ آیا۔ دل پریشان تھا۔ اس رات کا سناٹا کچھ غیر معمولی سا تھا۔ آسمان سے وحشت اور پریشانی بڑی برس رہی تھی۔ بھادوں ختم ہو چکا تھا۔ کنوار کا مہینہ تھا، کنوار جاڑے کا دوار مشہور ہے۔ باہر کے دالان اور کمانچوں میں چیٹی پردے بندھے ہوئے تھے۔ ایک کمانچے میں مجھے اور بھائی کو ددا سوبھا لئے لیٹی تھی اور کہہ رہی تھی سو رہو۔ اے ہے آنکھیں بند کرو۔ دوئی نیند کون لے گیا، اچھا جو پہلے سوئے وہی بادشاہ۔ اماں جان بے چاری بسر اتن اُن کو نیند کہاں۔ وہ صدر دالان میں بیٹھی وظیفے پڑھ رہی تھیں۔ دوسرا کمانچہ باوا جان کی خواب گاہ تھا۔ وہ وہاں آرام کر رہے تھے۔ اور صدر دالان کے بیچ میں در میں مردنگ روشن تھا کہ کسی نے اندر کی ڈیوڑھی کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ میں نے ددا کے کہنے سے آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ ایکا ایکی کنڈی کی کھڑکھڑاہٹ سے اچھل پڑی۔ ددا نے فوراً مجھے چھاتی سے لگا لیا کہ اے ماں میں تیرے صدقے۔ تیرے قربان گئی تھی۔ واری کوئی ڈیوڑھی پر ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اتنے میں اماں نے بلبلا کر کہا کہ اے صاحب کیا آرام کرتے ہو۔ شاباش ہے۔ خوب غفلت کی نیند ہے باوا جان نے ہنکارا بھرا۔ اور بھرائی آواز سے کہا کہ نہیں تو جاگ رہا ہوں۔ بیگم! تم تو بس یونہی سڑن ہوگئی ہو۔ اتنے میں ددا سوبھا للکاری کہ ان کم بختوں مغل اور حرمت کو دیکھو کیا مردوں سے شرط باندھ کے سوئیاں ہیں۔ درے میں سے پچھی بولی۔ ہوں ہوں! یہ بے چاری بھی ہول دلی تھی اور وظیفہ پڑھ رہی تھی۔ اتنے میں باہر سے پیر بخش نے آواز دی۔ ظہورن! چھوٹی سرکار تشریف لائی ہیں۔ یہ سُن اماں جان پھڑک کر باہر صحن چبوترے پر نکل آئیں۔ فرشی تہ پوشی پہنے تھیں۔ گھبرا کے جو اٹھیں پائنچے سنبھالنے بھول گئیں۔ مردنگ کے

اور ذرا فکر نہ کرو۔ تم اپنی خبر لو، میں بالکل اچھی ہوں۔ غرض جوں توں کر کے سب اٹھے۔ اماں جان نے چھوٹا خوانچہ ساتھ لیا، سارا گھر نکل چل کھڑا ہوا، خالہ اماّں کو سہارا دیتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ کالی مسجد کی طرف سے ہوتے ہوئے فصیلوں فصیلوں اجمیری دروازے پہنچے، یہاں وہ بھیڑ کہ الحفیظ الامان، میں تجھ پر تو مجھ پر، تل دھرنے کو جگہ نہیں، پھاٹک کے کیواڑ بند، جائیں تو کدھر جائیں اور نکلیں تو کہاں سے نکلیں، اللہ کے قربان جائے۔ اتنے میں کنہیالال جو انگریزوں کا مخبر تھا نظر پڑا۔ باوا جان نے اس کا ایک مقدمہ تھا، اس میں سفارش کی تھی اور اسے بچوا دیا تھا۔ اس کا وہ احسان مانتا تھا، اسے بُلایا اور پریشانی کا اظہار کیا۔ اس نے اطمینان دلایا۔ اور باوا جان نے کہا کہ عورتوں سے کہہ دیجئے کہ گھبرائیں نہیں، اور اگر یہ تمام آدمی بھاگیں تو یہ نہ بھاگیں، باوا جان نے ہم سب کو سمجھا دیا کہ دیکھو تمام آدمی اگر بھاگیں تو تم سب ایک جگہ کھڑے رہنا اور بھاگنا مت۔ اتنے میں نگوڑا کنہیالال چلایا کہ ارے دیکھو! وہ گورے آئے، بس یہ کہنا تھا کہ وہ بھگڈر پڑی کہ سڑک پر سوائے جوتیوں، ٹوپیوں، صافوں، دوپٹوں اور گری پڑی عورتوں، بوڑھوں اور اِدھر اُدھر پھرتے ہوئے بچوں کے اور کچھ نہ رہا۔ خالہ امّاں اور کم بخت شیدو یہ دونوں بھی اس بھاگڑ میں جانے کدھر کی کدھر نکل گئیں اور ہمیں خبر نہ ہوئی۔ کنہیالال نے کہا کہ جلدی کرو اور دروازے پر چلو۔ اس نے کچھ دربانوں سے کہا باوا جان نے انگشتری اُتار دربانوں کے جمعدار کو دی۔ اس نے کھڑکی کھولی اور ہم سب نکل گئے۔ اب امّاں جان نے جو خالہ امّاں کو نہ دیکھا، بہت روئیں، پیٹیں اور کہا کہ میں اب آگے جا کے کیا کروں گی۔ وہیں نیم کے نیچے گڑ گج کے قریب بیٹھ گئیں۔ غرض بڑی مشکلوں سے سمجھا بجھا کر انہیں اٹھایا۔ پو پھٹے تک پہاڑ گنج پہنچے۔ وہاں ایک کٹھیک جو ہمارے ہاں کا خس خانہ بنایا کرتا تھا، رہتا تھا۔ باوا جان نے اس کا کوٹھا کرائے پر لیا۔ اور ہم سب وہاں ٹھہرے۔ تیسرے دن کنہیالال مخبر آیا۔ باوا جان اس سے ملے اور یہ طے پایا کہ اس کی مدد سے ہماری چھوکریاں شہر میں جائیں اور زیور لائیں، اس کا چوتھائی کنہیالال کا حصہ۔ غرض رحمت، مغل اور ظہورن دوپہر کو شہر کی طرف روانہ ہوئیں۔ خاکیوں کا پہرہ پھاٹک پر تھا، تینوں تھیں جوان، انہوں نے انہیں چھیڑا، انہوں نے خوشامد درآمد کر کے اپنا پیچھا چھڑایا، کوئی دو گھڑی دن رہے تک گھر پہنچیں اُن کے پیروں کی آہٹ سُن ہمسائی نے انہیں آواز دی، یہ ڈر گئیں، اور کہا کہ بی تم کیسے یہاں، تم نہیں نکلیں، انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو اللہ پر بھروسہ

گوشوارے نوچ لئے تھے اور کان لہولہان ہو رہے تھے۔ کچھ شہیدوں اور مردودوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ اس وقت تو سرکار بھی بڑی مرد بن گئیں اور انہیں اٹھا کر جما مسجد کی سیڑھیوں پر لا کر ڈال دیا۔ پاس بیٹھے تھے کہ نگوڑے فوجیوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا، میں سمجھی کہ خدائی خوار آ گئے تو اپنی میا بھینوں کی آبروریزی کریں گے۔ سرکار سے کہا کہ بھاگئے، وہ آئے، اور ہم بھاگے، یہ جو بے تحاشہ بھاگیں تھوڑی دُور جا کر تھی نالی اس میں جا پڑیں۔ اس وقت سے کچھ بے اوسان سی ہو گئی ہیں۔ بڑی مشکلوں سے یہاں تک لائی ہوں، باوا جان نے سُن کر سر پکڑ لیا۔ اماں جان بولیں کہ اچھی دیکھنا یہ یہ شہر پر گور گئی اور تم نے گھر میں آ کر نہ کہا۔ میں گولے دیکھتی اور غل غپاڑے کی آوازیں سن کر تم سے پوچھی بھی تو یونہی واجبی سا جواب دیتے۔ بات اصل یہ تھی کہ باوا جان کبھی کوئی ایسا ذکر گھر میں نہ کیا کرتے تھے، جس سے ہم ہولیں اور خوف کھائیں۔ اس کا اُن کا بڑا خیال تھا۔ باوا جان نے کہا کہ بی ہولن کہنے پر تو تمہارے ہولوں کا یہ حال تھا کہ نیند تم پر حرام تھی۔ اور جو میں کہتا تو تم زندہ رہ چکی تھیں۔ باوا جان نے جو ممتاز محل کا واقعہ سُنا۔ پیر میں جوتی ڈال شیخ منگلو کے چھتے کی طرف سے نکل جامع مسجد انہیں لینے دوڑے چلے گئے۔ اماں جان انہیں روکنے کے لئے ہائیں ہائیں کرتی اٹھیں۔ لیکن کچھ سوچ کے وہ بھی چپ ہو گئیں۔ آدھ گھنٹے پون گھنٹے میں باوا جان لوٹے اور کہا کہ افسوس میں نے آس پاس سب طرف ڈھونڈ لیا، لیکن کہیں پتہ نہ چلا، مجبور لوٹ آیا، اچھا لو بس گھر خالی کرو۔ اب یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ اماں جان نے کہا کہ واہ تم بھی خوب ہو۔ رات کو کہاں نکلیں۔ بچوں کا ساتھ، نہ رتھ بان، آپا کا یہ حال، نہ ناشتہ نا کچھ کھانے پینے کا سامان اُٹھ دوڑی بازار، دل میں ایسی آئی، بھلا یہ بھی کوئی نکلنے کا وقت ہے نہ مجھ سے چلا جائے گا۔ بھلا مجھ میں اتنا کہاں دم، چبوترے سے گری گھٹنوں کا چورا ہو گیا وہ تو بیگا کی پریشانی میں مجھے چوٹ معلوم نہ ہوئی اب جو خیال کیا تو گھٹنوں میں وہ جھل جھلاہٹ ہے کہ آگ پڑی لگ رہی ہے۔ باوا جان بولے کہ انگریزی فوج جامع مسجد کے قریب آ گئی ہے اور اب دم کے دم میں اِدھر آنے والی ہے۔ خدا معلوم کیا غضب توڑے، محلّہ اڑا دے، کیا کرے کیا نہ کرے، تم دیر نہ کرو بس فوراً کھڑی ہو جاؤ، ورنہ گورے نہ مجھے چھوڑیں گے اور نہ تمہارے لڑکے کو اور تم سب کی ہمارے بعد کیا درگت بنائیں۔ اس کی خبر نہیں جلدی کرو، دیر نہ لگاؤ۔ اماں جان گھبرائیں اور کہا تو اچھی بیگا کا کیا کروں لہ اماں نے آنکھیں کھولیں اور کہا کہ میرا غم نہ کھاؤ

پاس سے جو تیزی سے گزریں، مردنگ گر پڑا، شمع ٹھنڈی ہوئی اور اندر اندھیرا گھپ ہو گیا۔ ددا نے مجھے سینے سے لگا لیا اور ایک ہاتھ بھائی پر رکھا، اور چلائی کہ اری رحمت جلدی سے روشنی لا۔ شمع ماموُر ہو گئی۔ میرے بچے ڈر رہے ہیں۔ رحمت چراغ دان میں سے چراغ اٹھا۔۔۔ دری میں سے ہماری طرف جو لپکی، ہوا کے جھونکے سے وہ چراغ بھی بجھ گیا۔ اتنے میں باوا جان مردنگ سیدھا کر باہر ہوئے، میں نے اور بھائی نے جو باہر نکلنا چاہا، ددا سو بھا نے روکا کہ اے ہے، ٹھنڈ ہے ہوا چل رہی ہے۔ پسینے میں لگ جائے گی تو دشمنوں کو نزلہ زکام ہو جائے گا۔ لیکن ہم کس کی سُنتے فوراً چادرے میں سے نکل پڑے۔ ددا نے ایک ہاتھ سے تو مجھ پر دولائی ڈالی، اور دوسرے ہاتھ سے بھائی کو پکڑ۔۔۔ جلدی سے نیمہ آستین پہنا، از بکی کن ٹوپ اوڑھا دیا۔ اب ہم جلدی سے باہر آئے۔ پیچھے پیچھے ددا سو بھا، اتنے میں ظہورن نے کنڈی کھولی، کیا دیکھتی ہوں، کہ خالہ اماں ننگے پیر ننگے سر، ڈوپٹہ کندھے پر پڑا پلو زمین پر جھاڑو دیتے ہوئے، شیدو باریدارنی کے کندھوں کا سہارا لئے لڑکھڑاتی گرتی پڑتی چلی آتی ہیں۔ اماں جان دیکھ بے قرار ہو گئیں۔ کہ اے ہے میری آپا! کہہ کے جو لپکیں، گھبراہٹ میں سیڑھیوں کا خیال نہ رہا۔ صحن چبوترے سے کھڑے قد اوندھے منہ گریں۔ ظہورن، رحمت اٹھانے لپکیں، خالہ اماں تو پہلے ہی اوسان باختہ ہو رہی تھیں، انہیں غش آ گیا۔ وہ تو وہ بھی گرتیں، لیکن شیدو نے سنبھالا۔ اتنے میں چھمی، مغل، رحمت، ظہورن سب اکٹھی ہو گئیں۔ بہن کی آگ میں اماں جان کو بھی گرنے کا ذرا خیال نہ ہوا، فوراً کھڑی ہو خالہ جان سے لپٹ گئیں اور انہیں کسی عنوان ہوش نہ آئے، اماں جان لگیں کھڑی اور پڑی پیٹنے کہ اری میری بہن! اری میری ماجائی، اچھی صاحب محل! کچھ منہ سے تو بولا، لللہ آنکھیں کھولو! میں تمہارے قربان، ارے تم کھڑی کیا منہ تکتی ہو۔ اچھی صاحب! تم ہی بتاؤ انہیں کیا ہو گیا۔ میں اور بھائی دھارم دھار روئیں باوا جا بہتیرا سمجھائیں کہ کوئی بات نہیں ہے۔ کمزوری سے غش آ گیا ہے بیگم تم نہ گھبراؤ، بچے دلگیر ہوتے ہیں۔ ددا چلائی کہ باہر خنکی ہے اندر دالان میں سب کیوں نہیں چلتے، غرض ہاتھوں ہاتھ خالہ اماں کو اٹھا کر اندر لائے چھپرکھٹ میں لٹایا، روشنی کے لئے غل مچایا، گھر بھر میں کوئی چراغ روشن نہیں اب جیسی دیا سلائی تو پہلے تھی نہیں، پتلی پتلی تیلیوں کے سرے پر گندھک لگی ہوئی تھی۔ اور ملا لخو پیسے کی ایک گڈی دیتے تھے۔ وہ آگ سے سُلگائی جاتی تھی۔ پھر اس سے چراغ روشن کرتے تھے، باورچی خانے میں خود اندھیرا، چولہا روشن نہیں۔

غرض ظہورا باہر پیر بخش حقے کے لئے آگ دبائے رکھتا تھا اس سے آگ لائی اور شمع روشن کی، خالہ اماں کو لخلخہ سنگھایا، گلاب اور ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے۔ خدا خدا کر کے انہوں نے ذرا آنکھیں کھولیں تو سب کی جان میں جان آئی۔ گلاب کی خوشبو سے مجھ کو چھینکیں آئیں اور تھوڑی دیر میں نزلے کی تحریک ہی شروع ہو گئی۔ اماں جان نے پھر خالہ جان سے پوچھا کہ اچھی بیگم! رات کو قلعے سے کیسے نکل آئیں، انہوں نے جواب نہ دیا، آنکھوں میں آنسو بھر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا دیا، اماّں جان جھٹ سے چمٹ گئیں، ماتھے اور گالوں کی چٹ چٹ بلیّاں لیں، اور کہا کہ بیگا آخر ہے کیا؟ تم بولتی کیوں نہیں؟ لیکن خالہ اماں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور آنسواُن کی آنکھوں سے بہہ کر کے تکیئے پر گرے۔ تب بے قرار ہو کر اماں جان بھی رونے لگیں۔ باوا جان نے بہتیرا سمجھایا کہ بیگم تم خبطن تو نہیں ہو گئیں، کیوں بہن کی جان کے پیچھے پڑی ہو۔ وہ سخت کمزور ہو رہی ہیں۔ اس وقت ان سے اس قسم کے سوال مت کرو۔ شیدو تو بتا کیا بات ہے۔ قلعے میں تو خیر ہے۔ شیدو نے کہا کہ سرکار خیر کیسی اور کیسا قلعہ وہ قلعے والا ہی نہ رہا۔ اللہ اس کا نگہبان اسے پیروں کی امان اُس کا بر سرِ میدان الٰہی جہاں ہو علی کی پناہ میں، جہاں پناہ تو لال حویلی میں جمی جم ہیں۔ عجب تریوں کی بھگڑ مچی ہوئی ہے۔ کوئی کسی کو نہیں پوچھتا کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ جدھر جس کا منہ اٹھتا ہے بھاگا چلا جاتا ہے، میں سرکار کا ہاتھ پکڑ کے بھاگی۔ ان میں بھلا چلنے کی کہاں سکت، خانم کے بازار میں میری ایک جوتی ہاتھ سے گر گئی۔ میں جو اٹھانے جھکی نگوڑی دوسری بھی نکل گئی۔ اسے چھوڑ میں سنبھلی کہ کہیں ایسا نہ ہو جو روندن میں آ جاؤں۔ خاص بازار میں جب آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ حضرت ہرے بھرے صاحب کے آستانے سے ذرا ادھر کوئی چیز پڑی ہے۔ میں اور سرکار کانپ گئیں، کوئی عورت تھی، اوندھی پڑی ہوئی، ڈھیلے پائچوں کا پاجامہ پائنچے سڑک پر چھوٹے ہوئے، ایک ہاتھ سینے کے نیچے، ایک درگاہ کی طرف پھیلا ہوا، چمپا کی مباف دار چٹیا، نیچے دبے ہوئے ہاتھ کی طرف پڑی ہوئی، دوپٹہ کوئی دس قدم پیچھے پڑا ہوا، محرم کچھ کچھ پھٹی ہوئی، میں ڈر کے پیچھے ہٹی، سرکار بھی کانپ گئیں، لیکن خود تو ہٹ گئیں اور مجھے ڈانٹا کہ ویدن کم بخت دیکھ تو سہی کون ہے، میں نے ڈرتے ڈرتے سیدھا کیا اور غور سے جو دیکھا تو لرز گئی، نیچے دبے ہوئے ہاتھ میں کٹاری تھی، میں نے سرکار کو آواز دی، پہچانا تو شہزادہ عالمیان مرزا فخرو کا محل نواب نیازی بیگم ممتاز محل تھیں۔ کسی نامراد نا شاد نا س گئے، نگوڑے نے کانوں سے

کرے یہیں رہے، ہاں کوئی مرد وا ہمارے ہاں ہے نہیں، جان جوانیں ہم نہیں، جو کسی بات کا ڈر ہو۔فوجی آتے ہیں چاول، گھی، مرغ لوٹ مار کر لاتے ہیں، اور ہمیں دے جاتے ہیں۔ ہم پکا پکا بریانیاں، انہیں بھی کھلاتے ہیں اور آپ بھی کھاتے ہیں۔ جب یہ تینوں اندر گھر میں داخل ہوئیں تو میری روپی کتیا اور بختاور بندریا انہیں دیکھ بلبلا گئیں۔ انہوں نے پیار کیا، کبوتر جدا پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اُن کا جال کھولا، مرغیوں کو ڈربے سے الگ نکالا، رات ہوئی اور خوب اندھیرا ہو گیا تو انہوں نے پردے دالان کے چھوڑے، چراغ روشن کیا۔ پرانی توشکیں، بالا پوش نکالے، باوا جان نے گہنا، جواہر اور قیمتی چیزیں توشی خانے (توشک خانے) سے نکال کر بغیر کسی کو خبر کئے مختلف جگہ کے چوبچوں میں چھپا دیا تھا۔ گہنا اور جواہر اُپلوں والی کوٹھڑی کے چوبچے میں رکھ دیا تھا۔ اُس کا پتہ اُن چھوکریوں کو بتایا۔ اور اچھی طرح سمجھا دیا۔ انہوں نے کرسیاں ہٹا کر سل کھسکائی اور زیور نکال لائیں اور اسے ترکیب کے ساتھ روئٹر میں رکھا۔ اور موٹے موٹے تاگے جن کو مٹی میں مل کر میلا کر دیا تھا۔ اس سے اس پر نگندے ڈالے، رات بھر بے چاری بیٹھی یہ کرتی رہیں اور دوسرے دن دوپہر تک لوٹ کر نہ آئیں۔ باوا جان کو یہ خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کنہیا لال نے اُن پر تشدد کیا ہو اور تمام زیور اُن سے لے لیا ہو۔ یا خود وہ مل گئی ہوں یا اپنے آپ لے کر کسی خاکی کے ساتھ چل دی ہوں۔ لیکن پھر جب اُن کی وفاداری کا خیال آتا تو پہلے خیال کی تردید کرتا۔ کیوں کہ وہ اگر لونڈیاں تھیں تو قلعے تک تھیں، شہر میں آزاد اور اپنے کار مختار، جہاں چاہتی چلی جاتیں۔ لیکن انہوں نے ہماری چوکھٹ نہ چوڑی، آخر ددا کو بھیجا کہ جا ددا تو دیکھ کے آ کہ انہیں زمین کھا گئی یا آسمان۔ آخر کدھر اُجڑ گئیں، بے چاری ددا فوراً روانہ ہوئی، بڑی منتوں سماجتوں کے بعد پہرے داروں نے اندر گھسنے دیا۔ یہ گھر گئی وہاں دیکھا کہ وہ بس چلنے ہی کو کھڑی ہیں۔ ددا نے بہت کچھ بُرا بھلا کہا، وہ سب میری کتیا اور بندریا اور ہریالی مٹھن کا پنجرا لے کر چلیں۔ راستے میں ایک اناج کی کوٹھی لُٹ رہی تھی۔ بندریا تو نگوڑی کئی دن کی بھوکی تھی بلبلا کر اناج پر گری بھنور کلی ٹوٹی اور چھٹ گئی، میری کتیا اور مٹھن ایک گورے نے سنگین دکھا کر چھین لی۔ بھائی کی مینا فاقوں ہی کے مارے مر گئی تھی، مرغیاں فوجیوں نے کھائی ہوں گی۔ تینوں چھوکریاں اور ددا سو بھاڑ رتے لرزتے چلے آتے تھے، ددا نے کہا کہ اندھیوں ڈریں تو سارا بھید کھلا، یہیں کمپنی کی فوج مار دے گی۔ اللہ پر بھروسہ کرو اور جی کڑا کر کے بڑھو، نمک حلالی اور شرافت دکھانے

کا یہی وقت ہے۔ جھٹ پٹے کے وقت تک دروازے پر آ پہنچیں۔ پہرے داروں نے ٹوکا، چھوکریاں مومی چھینٹ کے دو دو کلی کے پاجامے پہنے تھیں۔ ددا میرا سیدھی موری کا پاجامہ اور تھکا را کُرتہ پہنے تھی۔ ہنسنے کی کوئی بات نہیں۔ اس زمانے میں صرف رانڈ بیوائیں ہی کُرتے پہنا کرتی تھیں۔ اور قلعے میں تو نام بھی کرتے کا لینا منحوس سمجھتے تھے۔ کیوں کہ کرتہ رنڈ سالے میں دیا جاتا تھا، آج کل کا سا رواج تھوڑی تھا کہ نگوڑی بیاہنیاں، کنواریاں، جوان بوڑھیاں ایک ہی رنگ ایک ہی وضع میں نظر آتی ہیں۔ کوئی تمیز ہی نہیں کہ کون رانڈ ہے اور کون سہاگن، شان دار تہ پوشیاں اجاڑ نگوڑی بندوڑوں کی وضع کے تین کلی کے بالشت بالشت بھر کے پائنچے اڑا مسیح کی چماریاں بن مرغی کے چوزوں کی طرح اچھل اچھل باغیوں میں جالی کے بلّوں اور گیندوں سے کھیلتی ہیں، یو چھو نگوڑی کالی چماریو تم نے جو فرنگیوں کی رِیت اختیار کی تو کے رکعت کا ثواب، کوّا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ خیر بیٹا۔ ددا تھی بڑی دلیر اور منچلی، دل گردے کی۔ حرمت اماں جان کی مندرسی تہ پوشی پہنے تھی، اور پائنچے آگے اڑسے ہوئی تھی۔ ایک پہرے دار نے آگے بڑھ کر جھاڑا لینا چاہا۔ رکھ کے جو نگوڑی کے پائنچوں پر ہاتھ مارا تو پائنچے نیچے آ رہے، ددا لپک کر آگے بڑھی، بغل میں توشک دبائے تھی۔ ایک نے سنگین اُس کی طرف کی، اس نے پلٹ اسے سلام کیا اور تھوڑی میں ہاتھ ڈال دیا۔ لگی خوشامد کرنے کہ ماں واری جاؤں، ہمارا ننھا ننھا سا بابا ہے، جاڑے کا زمانہ ہے، سردی میں اکڑ کر مر جائے گا۔ یہ پُرانے لحاف رضائیاں ہیں، لئے جاتے ہیں اس میں دبک رہیں گے، کمپنی کے راج کو دُعا دیں گے۔ بوڑھے مصیبت زدہ کئی دن کے بھوکے ہیں، پیغمبری وقت پڑا ہے۔ یہ کنواریاں بالیاں ہیں ان کا ہاتھ لگانا مہا پاپ ہے۔ بے چاری رحمت نے ڈر کے مارے وہیں کھڑے کھڑے چھل چھل کر دی۔ ظہورن اور مغل بالا پوش اوڑھے تھیں۔ ایک کو ایک مارے ڈر کے لپٹ گئیں اور بیری کی طرح تھر تھر کانپتی تھیں، کچھ ایسا اُن کا قابل رحم حال ہوا کہ پہرے داروں کو جن میں خاکی بھی تھے، ترس آ گیا اور کہہ سُن کر بغیر جھاڑا لئے اور چھوئے چھوڑ دیا۔ پھاٹک سے نکل یہ جو پتّا توڑ بھاگی ہیں تو انہوں نے منہ موڑ کر نہ دیکھا۔ اور ہانپتی کانپتی اذانوں کے بعد پہنچیں۔ باوا جان دیکھ کر خوش ہو گئے میں بھی ددا کو دیکھ نہال نہال ہو گئی۔ باہر کنہیا لال بیٹھا تھا۔ باوا جان نے اپنے ایمان سے حسب وعدہ چوتھائی حصہ زیور کا جا کے اس کے حوالے کیا اور اس نے بھی بغیر کسی پس و پیش کے سلام کر کے خوش ہو لے

لیا۔ دوسرے روز کٹھیک نے ایک بہلی کا انتظام کر دیا۔ اماں جان اس کے اس سلوک سے اس قدر خوش ہوئیں، اسے اپنا منہ بولا بھائی بنایا۔ چلتے وقت چار اشرفیاں اسے دیں اور ایک چمپا کلی اور دوراج کی جوڑی اس کی بیوی کو دی۔ افسوس خالہ اماں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ جس سے اماں جان بہت اداس رہتی تھیں اور رویا کرتی تھیں۔ غرض ہم سب ٹھس ٹھسا کر بہلی میں بیٹھے۔ باوا جان پیدل ساتھ ہوئے۔ ظہورن جوتیاں ہاتھ میں لئے بہلی کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئی ایک خلقِ خدا تھی کہ اسی طرح ویران طہران پھر رہی تھی۔ ارادہ تھا کہ سلطان جی جائیں، ہمایوں کے مُقبرے میں بادشاہ ہیں، پھر معلوم ہوا کہ وہاں گرفتاریاں ہو رہی ہیں اور پھانسیاں لگ رہی ہیں۔ غرض مرتے گرتے، وظیفے پڑھتے، حصار باندھتے قطب صاحب پہنچے، اولیاء مسجد میں اُترے، یہاں ایک خلقت کا ہجوم، لیکن تھے تمام شریف، بڑے گھرانوں کے، کچھ باوا جان کے بھی شناسا نکل آئے، غرض مرد سب کے ایک طرف اور عورتیں ایک طرف پڑ رہیں۔ پردہ وردہ کس کا، صبح بھائی اور لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ گوروں کا توپ خانہ آیا ہے۔ جتنے مرد تھے گھبرا کر پولول اور بھس کے ڈھیروں میں گھس گئے اور بھائی بوہلا کے ایک بیوی بے چاری لیٹی تھیں اُن کے پائنچے میں گھس گئے، وہ جلدی سے اٹھ بیٹھیں، پوچھا، ارے بیٹا کیا ہے؟ تو کون ہے؟ بھائی نے کہا کہ خالہ گورے ہیں۔ انہوں نے بس اپنے پائنچے ان پر اچھی طرح ڈال دیئے اور چھپا لیا۔ قطب صاحب سے الور جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن سفر بڑا لمبا تھا۔ دن کو خوب دھوپ، راتوں کو اوس، آدمی بے چارے پُرانی شکستہ گوروں میں، قبروں کے تعویذوں، مسجدوں اور مقبروں کی سلوں پر راتیں اکڑ سکڑ کر کاٹیں۔ غرض ہم پھر شہر کی طرف پلٹے۔ شاہ مرداں آئے۔ دو روپے دے کے ایک گنوار سے تھوڑی پھوٹیں کچریاں لیں۔ اس بھوک میں انہوں نے کیا مزا دیا ہے، کھا، پانی پی، پیٹ کی آگ بجھا، اللہ کو یاد کر وہیں پڑ رہے۔ وہاں سُنا کہ پانی پت میں امن امان ہے۔ بہت آدمی وہیں جا جا رہے ہیں۔ ہم سب نے بھی اِدھر کی ٹھانی، راستے کی کھکھڑیں جھیلتے، منزلیں مارتے چلے جاتے تھے۔ راستے میں رات کے وقت دور مشعلیں اپنے آپ جلتی اور چلتی نظر آتی تھیں۔ ددا سے ہم پوچھتے ددا یہ کیا ہے۔ ددا وہ نیلے پیلے دیدے نکالتی کہ کچھ ہی ہو دوئی تمہیں کیا۔ خبردار ادھر مت دیکھو، اور ہمارے منہ پر چادرہ ڈال دیتی اور آیت الکرسی پڑھ پڑھ کر ہم پر دم کرتی، رات بھر ہمیں اپنی چھاتی سے لگائے پکھوے میں دبائے لیٹی جاگا کرتی۔ خدا خدا

کر کے پانی پت پہنچے۔ کچھ عرصہ وہاں رہے۔ زیور بیچ بیچ کر خوب کھائے۔ پھر وہاں سے اکتا کے دلّی کی ٹھانی، دل نہ مانا، چل کھڑے ہوئے۔ مرتے گرتے عرب سرائے آئے۔ وہاں سے سلطان جی میں ایک مکان اماّں جان کی جان پہچان خادمنی تھیں، اُن کا لے کر رہنے لگے۔ صدر میں کمپنی کی طرف سے آٹے دال کی کچھ دکانیں کھل گئی تھیں۔ عورتوں کو اجازت تھی وہ جا کر خرید لاتیں۔ آٹھ روپے تولہ سونا لے کر روپے کا پان سیر کے بھاؤ آٹا دیتے تھے۔ اماّں جان جب ضرورت ہوتی سروتے سے کڑا کترتیں، تولے دو تولے کا ٹکڑا لیا بکوا دیا، اور ضرورتیں پوری کیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کئی کئی وقت فاقے سے گزر جاتے۔ لیکن ایمان کی یہ ہے ددا ایک آدھ ٹکڑا ہمارے لئے تو لگائے ہی رکھتی، اور ہمیں کبھی بھوکا نہ رہنے دیا۔ جب ہم یہ دیکھتے کہ اور تو سب بھوکے ہیں اور ہم کھا رہے ہیں تو جی کڑھتا، اور ہم بھی کھانے سے انکار کرتے تو قسمیں دے دے کر اور پچکار پچکار کر بے چاری کھلاتی تھی۔ اماّں جان کا یہ تھا کہ جب تک کھانا نہ ملتا تو اُن کو پان کی پروا نہ ہوتی تھی۔ اور جہاں کھانا کھایا اور زردے کی طلب نے انہیں بے چین کیا، بھلا جنگل بیابان میں پان کہاں۔ اکثر ہڑک بجھانے کو سلسلے کا پتا کتھے کے ساتھ کھایا ہے۔ منہ تو خاصہ لال ہو جاتا تھا۔ یہ نئی بات تھی، گیہوں اور چنے کے پیڑ ہم نے شہر سے نکلنے ہی کے بعد دیکھے۔ پہلے میں یہ جانتی تھی کہ بڑے اونچے اونچے ہوتے ہوں گے اور ان کے باغ کے باغ کھڑے ہوں گے اور آدمی ان کی ٹہنیاں توڑ لاتے ہیں اور بیچ ڈالتے ہیں۔ لیکن گنے کے کھیت میں قلعے میں سے ریتی پر دیکھ چکی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے ان کے بھی درخت جانا کرتی تھی، اور جانتی تھی یہ ان درختوں کی کٹی ہوئی شاخیں ہیں۔ گیہوں کی پید نہ سمجھ سکتی کہ الٰہی یہ تھیلیوں میں بھرے ہوتے ہیں یا کسی چیز کا بیج ہیں۔ ایک اور چیز دیکھی۔ جس کو باہر والے گنوار بونگی کہتے تھے۔ یہ پوتوں کی ایک گنبد نما سی بنی ہوئی چیز تھی۔ اس میں بھس یا اناج، معلوم نہیں کیا چیز بھری رہتی ہے۔ اور بارش وغیرہ کے خوف سے اس چیز پر پھونس کی بونگی بنا دیتے ہیں۔ پھونس بڑا چمکتا ہوا، سنہری زرد رنگ کا تھا۔ اور ہمیں یہ چیزیں بڑی انوکھی معلوم ہوتی تھیں۔ مدتوں سلطان جی میں پڑے رہے۔ ایک مرتبہ بھائی کو اللہ نے بچایا۔ ایک کالا ناگ نکل آیا تھا۔ اور بھائی بال بال بچ گئے۔ ایک دفعہ ہم سب باؤلی کے اوپر گنبد میں بیٹھے تھے کہ ایکا ایکی ایک سل آن پڑی اور ہم دبتے دبتے بچ گئے۔ اماّں جان کی ہر وقت ہولوں میں جان جاتی تھی۔ پھر سُنا کہ شہر میں

عورتوں کو جانے کی اجازت ہوگئی ہے۔ رحمت تو گئی نہیں۔ ہاں میری دداا ور مغل گئیں۔ گھر میں نہ کیواڑ تھے نہ پردے حتیٰ کہ دیوڑھی کی چوکھٹ تک نگوڑے اکھیڑ کر لے گئے تھے۔ حسین بخش کا جہاں اب مدرسہ اور مسجد ہے وہاں ایک انگریز کوئی فوجی افسر ہوگا ٹھہرا ہوا تھا۔ ہمارے ہاں کے پردے وہاں پڑے ہوئے تھے اور باوا جان کا کتب خانہ اس کے حمام گرم کرنے کے کام آیا۔ ہزاروں قلمی کتابیں تھیں۔ پوری صحنچی کے طاق اور مچان کتابوں سے اٹااٹ بھرے ہوئے تھے۔ ساری ہمارے ہاں کی انگنائی کی کھدنی ہو چکی تھی۔ اندر دالان کوٹھریاں جا بجا سے کھدی ہوئی پڑی تھیں۔ نہ چمن رہا تھا نہ وہ کیاریاں، میرے لگائے پھل پھول سب یونہی برباد ہوگئے۔ حوض، نہر اور فوارے سب کھد کے کھنڈانے ہوگئے تھے۔ ہاں چھوٹے حمام کے پاس بھائی نے جو میرے لئے مہندی کا درخت لگایا تھا بس وہ کھڑا رہ گیا۔ غرض جتنا سامان باوا جان چوبچوں میں چھپا گئے تھے اس میں سے ایک تنکا نہ رہا۔ البتہ اوپر دو چھتی میں اونچے پر ایک کولکی تھی۔ اس میں ددا نے خود ہی کچھ بھاری جوڑے تانبے اور چینی کے برتن ڈال کر حصار باندھ دیا تھا۔ اس حصار کی برکت سے وہ سب بچ رہے۔ کسی کو اس کا خیال ہی نہ آیا ورنہ وہ کاہے کو رہتے، دوسرے کولکی تھی بھی کچھ اس طرح ایک طرف الگ کو کہ کس کا خیال بھی ادھر نہ جاسکتا تھا۔ گھر میں دیواروں پر ایک گونٹھی ایک کیل تک نہ رہی تھی۔ ددا آئی اور یہ رام کہانی سنائی۔ اماں جان نے کہا کہ بی احمق تم وہ چیزیں جو رہ گئی تھیں انہیں کیوں چھوڑ آئیں جو بندھ جائے سو ہی موتی۔ ددا تڑخ کر بولی۔ دوئی اسے کیا آگ لگانی ہے۔ کہاں لاتی اور کون ڈھوتا۔ جہاں وہ سب گیا۔ اس کے سر صدقہ یہ بھی جائے کے فاقے کاٹنے جوگا تھا جو لے آتی۔ غرض دوسرے دن کچھ لہرا اٹھی۔ شہر پہنچیں۔ دو قابیں سچی چینی کی بڑی خوبصورت اماں جان کے جہیز کی تھیں انہیں لے آئیں آئی جو شامت تو چلا چل، کہاں چلیں بیچنے کہ قلعے میں، بغل میں مار، چادرے سے اچھی طرح ڈھانک اندر معلوم نہیں کس طرح گھس گئیں۔ دیکھو دیدہ کتنا موٹا تھا۔ وہاں کچھ انگریزنیں پھر رہی تھیں انہیں سلام کیا۔ دور سے قابیں کھول دکھائیں وہ لپک کر آئیں۔ قابیں ددا سے لے لیں۔ ددا نے کرتہ اٹھا، سوکھا سوکھا پیٹ، سانس اوپر کر کھینچ، پسلیوں سے لگا۔ گنگلوں کا سا منہ بنا دام مانگے، وہ سب بڑے زور سے قہقہہ مار ہنسیں، ددا نگوڑی سمجھی انچھر چل گیا۔ یہ دم میں آ گئیں منہ مانگے دام ملیں گے۔ پیٹ پر ہاتھ مار کر کہا کہ ہمارا بابا لوگ بڑا بھوکا ہے۔ وہ آپس میں معلوم نہیں کیا گٹ پٹ گٹ۔

پٹ کرتی تھیں، ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ وہ قابیں لے چمپت ہوئیں۔ ددا پیچھے پیچھے دام مانگتی ہو لی، ایک کوٹھے پر وہ چڑھ گئیں، ددا نیچے زینے میں کھڑی رہی۔ وہ اپنی بولیوں میں معلوم نہیں کیا کیا کہتی تھیں، اور آئیں سیڑھیوں پر سے ددا کے منہ پر تھوک جاتیں۔ ددا آنچل سے پونچھ لیتی اور گڑگڑائے جاتی، آخر جب تنگ آ گئی تو چادر اسر سے اتار اور ہاتھ لے کر پھرانا اور چلاّنا شروع کیا کہ کمپنی صاحب کی دہائی ہے۔ کمپنی صاحب کی دہائی ہے۔ وہ بندی لٹ گئی، اتنے میں ایک لال منہ کا فرنگی خوں خوں کرتا آیا۔ ددا نگوڑی سمجھی میری پشتی لے گا۔ کہنے لگی دیکھو صاحب ہمارا مال چھین لیا۔ اس نے اُلٹا ددا ہی کو خوب ڈانٹا، کہا کہ بدمعاش عورت دریا گنج کے بنگلوں سے تم لوگ مال لوٹ لے گیا ہے۔ یہ سرکاری کاب ہے اور ہمرا لوگ کے پاس بیچنے آتا ہے۔ چاہے کہ ددا کچھ بولے کہ وہ گھگھیا کے دھم دھم کرتا کتا ساتھ لئے سیڑھیوں سے اُترنے لگا۔ اتنے میں ایک چپڑاسی بولا کہ بڑی بی تم دیوانی ہوئی ہو، تمہیں بھی کہیں موت رزق نہ تھا تو یہاں مرنے آئیں۔ بھاگ ورنہ صاحب کتا چھوڑ دیں گے۔ ددا یہ کہتی کہ مُردے چھوڑیں گے تیری اماّں بھیناؤں پر کتا۔ نامرد، بے غیرت کہیں کے، اور بُروں کی جان کو دعائیں دیتی ہوئی لیاّں پیاّں اپنا سا منہ لے کر چلی آئی۔ اور سارا قصہ اذل سے آخر تک اس مزے سے سنایا کہ میں مارے ہنسی کے لوٹی جاتی تھی۔ اماّں جان چپ تھیں اور باوا جان کا رنگ سُرخ تھا، لیکن دم بخود تھے۔ ددا میری ہنسی سے خوش ہونے کی کوشش کرتی تھی لیکن رنج کا پلّہ بھاری تھا۔ جو اُس خوش نہ ہونے دیتا تھا۔ غرض جو پونجی چھوکریوں کے صدقے میں بچ رہی تھی، بیچ بیچ کھایا کئے مدتوں باہر پڑے رہے۔ جب جائیدادیں واگزاشت ہوئیں۔ باوا جان کی بھی جائیداد چھٹی، شہر کی بندی کھلی، یہاں آئے تو مکانوں کا عجب حال پایا، گھر ڈھنڈار، کھنڈر در و دیوار، اینٹیں دات نکوسے، استر کاری ادھڑی، جابجا کی کھدنی نے زمین فرش تہ و بالا کر دیئے۔ دروازوں پر کیواڑ اور چھتوں میں قلابہ تک نہ رہا۔ رات بھر جنگلی کتے، انگنائی میں کبڈی کھیلتے، اندر باہر سب برابر تھا۔ قلعہ اُجڑ گیا، روزگار والے بے روزگار ہوئے۔ اتنا پاس نہ رہا کہ نئے کیواڑ چوکھٹ چڑھواتے پیٹ ہی کے لالے تھے۔ گزر کیوں کر ہوتی، گہنا تار تار کر کے خاں سے (خالصہ) لگا۔ اب کھنڈلوں کی باری آئی۔ لیوے کون خریدے کون۔ سب ایک ہی چکّر میں، بنیئے مہاجن کمپنی کے طرف دار رہے۔ چپکے چپکے انگریزوں کو رسد پہنچاتے رہے۔ ان کی اب اوج موج ہوئی۔ رفتہ رفتہ سب

جائیدادیں اُن کے قبضے میں چلی گئیں۔ اشرفیوں کی چیز کوڑیوں کی مولوں گئی۔ جائیدادوں کی اتنی جب قدر نہ تھی۔ تجارت نوابوں میں عیب، آمد پیسے کی رہی نہیں۔ خرچ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئے۔ ہر چیز پر آگ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اینٹیں بیچ بیچ کھایا کیے یا قرض لیا تو سود دریا کی روانی چڑھتا گیا۔ چار دن میں نالش ہو ہوا۔ جائیداد بنیئے بقال کے نیک لگی۔ گروی رکھی تو مول بیاج میں برابر ہوئی۔ غرض اس وقت سے ایسا جہاز تباہی میں آیا کہ پھر نہ نکلا اور اشراف پھر کبھی نہ پنپے سینکڑوں یونہی پاپڑ بیلتے مر گئے۔ اس مصیبت کی یاد ایسی تازہ ہے کہ کل کی بیتی معلوم ہوتی ہے۔ جو گزرنی تھی وہ تو گزر گئی البتہ رونے کو اس کی یاد رہ گئی۔

❋ ❋ ❋ ❋ ❋

بادشاہ دہلی کے حضور میں انگریزوں کی آخری نذر

ولیم ایڈورڈ

جس روز ہمارا کیمپ دہلی میں ہوا ہمیں معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت شہنشاہِ ہند بیمار ہیں اور قدیم رواج کے مطابق گورنر جنرل ہند یا اس کے نمائندوں کو مزاج پُرسی کے لئے حاضر ہونا اور کچھ مبلغات بطریق ''نذرانہ'' پیش کرنا ضروری ہے۔ کمپنی کے پرانے ریکارڈ نکال کر دیکھے گئے اور ان میں مختلف حالات پڑھنے کے بعد ہمیں اس بات کا ثبوت مل گیا کہ اگرچہ گورنر جنرل ہند اور بادشاہ دہلی کے درمیان اعلیٰ وادنیٰ کا رابطہ نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی گورنر جنرل ہند کو سال بہ سال بادشاہِ دہلی کے حضور میں ایک نذر پیش کرنی ضروری ہوتی تھی۔ نذر پیش کرنا اور اعلیٰ حضرت مغل شہنشاہ کی مزاج پُرسی کرنا دراصل اِس بات کا ثبوت اور نشان تھا کہ ہم ہندوستان کے حصص واقطاع پر بادشاہ کے کارندے اور باجگزار کی حیثیت سے حکومت کرتے ہیں اور بادشاہ کے سامنے اپنی عقیدت و محکومیت کا ثبوت پیش کرنا ہمارے لئے از حد ضروری تھا۔ نیز کچھ طلائی مُہروں کا ''نذرانہ'' بھی رواج کے مطابق ضروری تھا۔

چونکہ یہ ایک قدیم رواج اور ہماری اطاعت گزاری ایک مانی ہوئی بات تھی اس لئے گورنر جنرل سے استفسار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اور میں اور مسٹر طامسن بادشاہِ عالی جاہ مغل شہنشاہِ ہند کے حضور میں طلائی مہروں کی ریشمی تھیلیاں اور دیگر تحائف لے کر بصد آداب و خصوصیاتِ مشرقی اپنے کیمپ سے روانہ ہوئے۔

جلوس کی روانگی کی صورت یہ قرار پائی کہ اعلیٰ افسرانِ وفد اور طلائی مہروں کی تھیلیاں ہاتھیوں پر بار کی جائیں۔ ان کے آگے اور پیچھے گورہ دستہ اور نشان انگلشیہ ہو۔ ہم کو یہ بھی ہدایت

ہوئی تھی کہ بادشاہ کے حضور میں جوتے اتار کر اور جھک کر پہنچنا چاہئے۔ اور مشرقی دربار میں اس آداب کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ اگرچہ ہمارے کیمپ کے لوگ بے دست و پا بادشاہ کے سامنے اپنی اس تذلیل کو قطعی غیر ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن اس وقت تک جو رواج قائم تھا اسے دُور کرنا یا ایک دم بغاوت کر کے اُسے پسِ پشت ڈال دینا بھی ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ اس لئے بادلِ ناخواستہ میں نے اور سب کی یہ بات منظور کر لی اور نذر پیش کرنے والا یہ جلوس قلعہء دہلی کی جانب بڑھنا شروع ہوا۔

ہم نے اپنے جوتوں پر ریشمی غلاف پہن لئے لیکن ''دربار عام'' میں پہنچنے اور ''کورنش'' ادا کرنے کے لوازم سے تب بھی مفر نہ ہوا۔

جب ہم شہ نشین کے نیچے پہنچے تو دربار لگا ہوا تھا۔ ہمارے پہنچتے ہی ایک پردہ ہٹا اور اس کے پیچھے ایک اونچا تخت رکھا ہوا دیکھا۔ اگرچہ تختِ طاؤس جا چکا تھا لیکن تیموری خاندان کی سُبکی ہوتی اگر دارالحکومت دہلی میں کوئی شاہی تخت نہ ہوتا۔ اس لئے ہم نے جو تخت دیکھا وہ بھی آن بان میں کچھ کم نہ تھا۔ بادشاہ دہلی ایک نہایت بوڑھا اور نحیف وضعیف انسان تھا۔ آلتی پالتی مارے گاؤ تکیوں سے لگا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے زوال وانحطاط کے آثار نمایاں تھے جو شاید آنے والے واقعات کا عکس تھے۔ مگر اس وقت ہمیں صرف جسمانی کمزوری اور طوالتِ عمر کے طبعی نشانات محسوس ہوتے تھے۔

ہم نے تخت کے قریب پہنچ کر ایک ایک دفعہ بوسہ دیا اور اپنے اپنے ہاتھوں سے تھیلیاں جن میں کافی طلائی مہریں تھیں گزرانیں۔ اور علیٰ حضرت سے مزاج کے متعلق مشرقی طریق پر ہاتھ جوڑ کر دریافت کیا۔

چونکہ یہ آخری نذر تھی جو کسی باقاعدہ خراج دہندہ اور ماتحت نے آلِ تیمور کے سامنے پیش کی اس لئے بہت زیادہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ میں جس وقت نذر لے کر اوپر چڑھا، میرے دل میں عجیب وغریب خیالات تھے۔ میرے سامنے قدیم مغل بادشاہوں کی وسیع سلطنت، دبدبہ اور حیرت انگیز طاقتوں کا منظر تھا اور جب اس بادشاہ کو دیکھتا تھا تو انقلابِ زمانہ کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہ مبادا کوئی غلطی ہو جائے۔ آداب عرض کیا اور نذر پیش کی جسے بکمال مہربانی قبول کر لیا گیا۔ برطانوی سلطنت کی جانب سے مغل بادشاہ کے حضور

میں یہ آخری نذر تھی، اس کے بعد مغلوں کو ہم سے ایک پائی بھی لینی نصیب نہ ہوئی۔

مغل بادشاہ نے ہماری نذروں کو قبول فرما کر خلعت اور طلائی صافے پہنائے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ پورے آداب مغلیہ کے ساتھ ان احکام پر عمل کیا گیا اور دربار کے اس آخری منظر سے متاثر ہو کر ہم نے پھر آداب اور کورنش بہ اندازِ مقرر ادا کیا۔ اور رخصتی جملے جس میں اپنی اطاعت گزاری کا یقین اور ان کے اقبال و دولت کی ترقی کے الفاظ تھے پھر دہرائے اور قلعہ سے رخصت ہوئے۔

ہم اپنے اپنے ہاتھیوں پر سوار ہوئے اور جلوس پھر آراستہ کیا گیا۔ بادشاہِ دہلی کی خوشی اور حکم کے مطابق ہمارا جلوس دہلی کے بڑے بڑے بازاروں میں سے نکلا جس کے ہمراہ شاہی فوج اور انتظام کرنے والے بھی تھے اور ہر جگہ یہ چرچا تھا کہ ''بادشاہ غازی نے ان کو شرفِ باریابی بخشا ہے۔'' اس لئے ان کی نمائش و جلوس اہلِ دہلی کے علم و خوشنودی کے لئے بازاروں میں سے گزرا جا رہا ہے۔

ہمارے جسموں پر مشرقی طریق کے جوزر بار اور قیمتی لباس پڑے ہوئے تھے انہوں نے ہمیں ایک عجیب مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ اور ہمارے دل میں سنجیدگی اور متانت کے کوئی جذبات نہ تھے لیکن لوگ شاید ہمیں قدر کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں، مجھے تو اس لباس سے اس قدر شرم آئی کہ میں نے اپنے ہاتھی کو کیمپ کی جانب کر دیا اور کیمپ میں پہنچ کر ان کپڑوں کو فوراً اتار دیا۔ اس اثنا میں کرنل براڈفٹ اور دوسرے ساتھی بھی آ گئے اور ہم سب نے یہ لباس اتارا اور آدمی کی صورت بنے۔

اس کے بعد ہم سب گورنر جنرل کے خیمہ میں گئے اور وہاں جا کر آج کے تمام حالات سنائے۔ لیکن گورنر جنرل صاحب ہم سے بہت ناراض ہوئے کہ بغیر ان کی مرضی کے بادشاہ دہلی کو کیوں نذر پیش کی گئی۔

انہوں نے بیان کیا کہ اس نذر کی پیشی اور دیگر رسوم کی ادائیگی سے ہم نے یہ بات ظاہر کر دی کہ ملکہ وکٹوریہ کی سلطنت مغل بادشاہ کی باجگذار اور اطاعت گزار و ماتحت سلطنت ہے۔ اور ہم ہندوستان پر مغل بادشاہ کی مرضی اور رعایت کی وجہ سے حکومت کر رہے ہیں۔ ایسا کرنے سے حکومتِ انگلشیہ کی توہین ہوتی تھی اور نذر دینا اب ضروری نہیں تھا اس لئے ہم تینوں افسروں کا یہ

اقدام غیر مآل اندیشانہ قرار پایا۔

گورنر جنرل نے بتایا کہ اب حکومتِ انگلشیہ کی پالیسی یہ نہیں ہے کہ اطاعت گزاری کی جائے اور نذریں پیش کی جائیں۔

گورنر جنرل نے اسی وقت احکام جاری کیئے کہ ہندوستان کے کسی حصہ سے کوئی برطانوی باشندہ یا باشندے کسی حیثیت سے بھی بادشاہ دہلی کو نذر یا خراج پیش نہ کریں۔ نیز اس بات کی تحقیق کرائی گئی کہ اس سال میں کس قدر روپیہ بطور نذرانہ اعلیٰ حضرت بادشاہ دہلی نے وصول کیا تھا اس روپے کے موازی روپے بادشاہ کے وظیفہ میں برطانوی خزانہ سے دیا جانا منظور کیا گیا لیکن آئندہ نذریں دینی بند کرائی گئیں۔ اور کوئی رسمی بات نہیں ہوئی۔ ہاں زرِ نقد بادشاہ کو غدر تک دیا جاتا رہا جس کی شکل وظیفہ کی سی رہی اور جس کی کمی بیشی کا حکام انگلشیہ کو اختیار رہا۔ لیکن نذر اس واقعہ کے بعد ہمیشہ کے لئے بند کر دی گئی۔ یہ آخری دربار تھا جو تیمور کی اولاد میں سے کسی نے کیا اور جس میں فرنگیوں نے ماتحت ہونے کی حیثیت سے شرکت کی اور نذر گزرانی۔ یہ بادشاہ دہلی کی آخری نذر تھی۔

(ایک بنگالی سول افسر کے مشاہدات سے ماخوذ)

گیا منزل پہ سارا قافلہ اور راہِ غربت میں
ہم آوازِ جرس کی طرح سے تنہا بھٹکتے ہیں

(ظفرؔ)

مقید بادشاہ سے ملاقات

رسل/ ترجمہ: محمد حسن رابع

ہفتہ، پانچ جون: صبح کو چھ بجے کے قریب جب میری آنکھ کھلی تو میں نے میلوں کے نشان سے اندازہ لگایا کہ میں دہلی سے بارہ میل دُور ہوں۔ ہر طرف ایک عجیب وحشت اور خموشی پھیلی ہوئی تھی۔ راستے میں ایک چھوٹی سی ندی پڑی جسے میں نے لکڑی کے پل کے ذریعہ عبور کیا چھٹے سنگِ میل کے آس پاس سبزہ بچھا تھا اور گیہوں کے کھیت لہلہاتے تھے بے شمار جانور گھاس چر رہے تھے۔ اس سے تھوڑا سا آگے بڑھ کر مٹی کے بڑے بڑے تودے پڑے تھے جو یا تو کسی بھٹے کا ملبہ معلوم ہوتے تھے یا پھر قبروں کے ڈھیر۔ ان تمام چیزوں کے بعد نگاہ جمنا پر پڑتی ہے اور اس سے پرے ایک اونچی سی چٹان پر دہلی کے گنبد اور مینار دکھائی دیتے ہیں۔ جمنا سے پرے اونچی اونچی سرخ دیواروں کو دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ جو ملک آج ہندوستان پر حکومت کرتا ہے۔ اُس میں کتنے آدمی ایسے ہوں گے جنہیں دو سال پہلے یہ بھی معلوم ہو کہ دہلی کا بادشاہ ایک جیتا جاگتا انسان ہے یا جو یہ جانتے ہوں کہ اپنی ضعیفی کے زمانے میں بھی جب کہ قوم کو زوال آچکا تھا شہنشاہ کے جانشین کا اتنا رعب و داب تھا کہ ہندوستان کا گورنر جنرل اس کی ہمسری نہیں کر سکتا تھا اور دہلی کے تمام برطانوی افسر اس سے مذاکرات کرتے ہوئے ان تمام تعظیم و تکریم کے آداب کو ملحوظ رکھنے پر مجبور تھے جو ملازموں کو ایک بادشاہ کے سامنے بجالانے پڑتے ہیں۔ دہلی کے بادشاہ کے متعلق انگلستان کے لوگوں کو جو پہلی اطلاع ملی وہ یہ تھی کہ وہ ایک ایسی بغاوت کا نام نہاد سرغنہ ہے جو ان کی ہندوستانی سلطنت کی بنیادیں کھوکھلی کر رہی تھی۔ اس کو اپنے محسنوں کے خلاف سر اٹھانے پر ناشکرا کہا جاتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شخص بوڑھا کمزور اور ظالم تھا لیکن ایک ایسے شخص پر کفرانِ

نعمت کا الزام لگانا جس نے اپنی آنکھوں سے اپنے آباؤ اجداد کے علاقوں کو قوت یا کسی اور بل پر آہستہ آہستہ جاتے دیکھا ہو، جس کے پاس ایک خالی خولی خطاب رہ گیا ہو، جس کا خزانہ بالکل خالی ہو چکا ہو اور جس کا محل کوڑی کوڑی سے محتاج شہزادوں اور شہزادیوں سے بھرا ہوا سراسر زیادتی اور ناانصافی ہے کیا وہ اُن حالات میں رہ کر بھی خوش رہتا جو کمپنی نے اس کے لئے پیدا کر دیئے تھے؟ کیا وہ ان پر بھی انعام واکرام کی بارش کرتا کہ انہوں نے نابینا شاہ عالم کو مرہٹوں سے بچایا اور پھر خود ان کا خون چوسنا شروع کر دیا؟ یہ درست ہے کہ اب ہمیں اپنی ہندوستانی ریاستوں پر وہی حقوق حاصل ہیں جو دہلی کے مسلمان فرمانرواؤں کو ہندوستان کی بادشاہت کے لئے حاصل تھے، لیکن ہم ہندوستان میں ان کی طرح بڑی بڑی فوجوں کے ساتھ اور ملک پر غلبہ حاصل کر لینے کی نیت سے نہیں آئے تھے۔ ہم تو یہاں بے ضرر سوداگروں کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ جن کا دارومدار دہلی کے بادشاہوں کے فوجی افسروں کی دوستی اور نظرِ عنایت پر تھا اور وہ ''سخاوت'' جو ہم نے شاہ عالم کے ساتھ ان کی ان تمام مہربانیوں کا ایک معمولی سا صلہ تھا جو اس کے پیش روؤں نے ہماری قوم کے ساتھ کی تھیں۔

میں ایک چوڑی ندی کو ایک کشتیوں کے پل کے ذریعہ عبور کر رہا ہوں۔ یہ پل اتنا چوڑا ہے کہ اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک راستہ شہر کی طرف جانے والی گاڑیوں کے لئے ہے اور دوسرا اس طرف سے واپس آنے کے لئے، اس پل پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھمبے لگے ہوئے ہیں، کشتیوں کے اگلے حصے کو چٹائی سے ڈھانپ کر ان آدمیوں کے رہنے کے لئے جگہ بنا دی گئی ہے جو اس پل کی خبر گیری کرتے ہیں۔ پل کے شروع میں ایک پولیس چوکی ہے جس پر سکھ سپاہی متعین ہیں۔ یہ لوگ ہر آنے والے کی تلاشی لیتے ہیں اور انہیں اجازت نامہ دکھانے پر مجبور کرتے ہیں لیکن میری سفید رنگت دیکھ کر وہ نہایت ادب سے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مجھے سلامی دیتے ہیں۔ میری جلد میرا پاسپورٹ ہے اور میرے عہدے کی ضمانت ہے میں ہندوستان میں حکومت کرنے والی جماعت سے تعلق رکھتا ہوں ایک پیدائشی بااثر آدمی، مجھ پر ریاست کے معمولی قانون کا بھی اطلاق نہیں ہوتا۔

اس محرابی راستے سے باہر نکل کر جہاں پل تقریباً ختم ہو جاتا ہے میں نے اچانک اپنے آپ کو سنسان شہر کی تباہ و برباد سڑکوں پر پایا جہاں ہر مکان پر توپوں یا بندوق کی گولیوں کے نشان تھے یا

وہاں لوٹ مار ہوئی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں غیر شعوری طور پر لیبا سٹو پول شہر کی سب سے بڑی شاہراہ کا وہ نقشہ ابھر آیا جو مالاکوف کے مغلوب ہو جانے کے بعد وہاں نظر آتا تھا۔ جس وقت اونچی لال دیوار کے نیچے ہماری گاڑی سڑک پر دوڑ رہی تھی تو سوائے چند بھوکے گدھوں اور ڈھیٹ کوؤں کے اور کوئی سڑکوں پر نہ دکھائی دیتا تھا۔ تھوڑا سا آگے بڑھ کر ہم لوگ ایک نسبتاً چوڑی سڑک پر مڑ گئے لیکن یہاں بھی مکانوں کا وہی حال تھا جو ہم پہلے دیکھ چکے تھے۔

کچھ مکانوں کے دروازوں پر چٹائی کے پھٹے پرانے پردے ہوئے تھے اور کھڑکی کے شیشوں میں سے چند موٹے تازے انگریز بچے اور چند بڑی عمر کی زرد رو لڑکیاں اور لڑکے سڑک پر سے گزرتی ہوئی گاڑی کو دیکھ رہے تھے، نچلے درجے کے چند مقامی لوگ اس چوڑی گلی میں ادھر ادھر جا رہے تھے۔ یہاں کوئی دکان نہ دکھائی دیتی تھی، میں بمشکل یقین کر سکتا تھا کہ میں اُسی شہر میں ہوں جس کے بارے میں ایک بوڑھے سیاح نے کہا تھا ”یہ شہر لندن، پیرس اور ایمسٹرڈم تینوں کو ملا کر ان سے بڑا ہے اور دولت اور آبادی میں بھی ان سے زیادہ ہے۔“

شام کے قریب گاڑی بلائی گئی اور عورتوں کے علاوہ تمام لوگ دہلی کے بادشاہ، بریگیڈ اور الیسن سے ملنے محل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم لوگ ایک بار پھر کشمیری دروازہ سے گزرے اور ان سڑکوں کو عبور کیا جہاں چند مقامی لوگ پھر رہے تھے۔ پھر فصیل کے جو سارے محل کا احاطہ کئے ہوئے ہے صدر دروازے میں سے گذر کر ہم صحن میں پہنچ گئے۔ یہاں پر ایک کنواں ہے جس پر ایک بڑا درخت اپنا سایہ کئے ہوئے ہے یہ وہی کنواں ہے جہاں انگریز عورتوں کو قتل کیا گیا تھا۔

ہم ایک مینار کے قریب ایک شگاف کے ذریعہ جو مکانوں کے دیواروں میں بنایا گیا تھا اینٹوں پر سے ہوتے ہوئے اس دربار سے باہر نکل آئے اور ایک بہت بڑے باغ میں پہنچ گئے۔ یہ باغ نہایت خراب خستہ حال میں تھا اور ہر طرف خودرو گھاس اُگی ہوئی تھی۔ یہاں پر کچھ ٹوٹے پھوٹے مکانات اور دفتر بھی تھے اور باقی ہتھیاروں کے ذخیرہ کے پاس پھر رہے تھے۔ چند سپاہی پتھر کے ایک شکستہ زینے کے قریب کھڑے دیوار کے شگاف پر پہرہ دے رہے تھے۔ یہ زینہ تقریباً بارہ پندرہ فٹ اونچا تھا اور باغ میں سے ہو کر دربار کے ایک مکان یا محل کی چھت کو جاتا تھا جہاں سے ہم ابھی گزرے تھے۔ یہ زینہ مکان کے پچھلے حصہ اور باغ کو ملانے کے لئے بنایا گیا تھا اور اس

پر چڑھ کر ہم نے خود کو ایک نہایت کھلے ہوئے دربار میں پایا۔ یہ دربار مکان کی چھت پر بنایا گیا تھا اور شاید اس پر ایک منزل اور کھڑی کی جانے والی تھی کیونکہ بازو کی دیواریں ابھی تک موجود تھیں۔ زینے کے ختم پر اس مختصر سے دربار کے چھوٹے سے دروازے پر دو سنتری پہرہ دے رہے تھے اور بے شمار ملازم جو مقامی لوگ تھے اندر کام کر رہے تھے۔

ایک اندھیرے اور تاریک راستہ میں جو اس کھلے دربار سے ہو کر جہاں ہم کھڑے تھے ایک اور تاریک کمرے کو جاتا تھا، ایک بوڑھا اور پستہ قد آدمی بیٹھا ہوا تھا جس نے ایک معمولی میلا کچیلا ململ کا کرتا پہن رکھا تھا۔ اس کے پاؤں ننگے تھے اور سر پر ایک تنگ ٹوپی منڈھی ہوئی تھی۔ در حقیقت معزول بادشاہ بیمار تھا۔ پیتل کے ایک تاشلہ پر جھک کر قے کرنے کی کوشش میں وہ بالکل اس پر لیٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہم چھوٹے سے دربار کا جائزہ لینے لگے جو تیس مربع فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ اس دربار کے ایک کونے میں چارپائی پر ایک پتلا دبلا آدمی لیٹا ہوا تھا جو ہمارے آنے کی آواز سن کر اٹھ بیٹھا اور ہمیں نہایت ادب سے سلام کیا۔ وہ نہایت عمدہ سفید ململ کے لباس میں ملبوس تھا اور شوخ نیلے رنگ کی ریشمی واسکٹ پہن رکھی تھی اس کا سر ننگا تھا اور ماتھے سے سر کے بیچ تک بال بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ یہ رواج مشرق کے لوگوں میں عام پایا جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں تیز اور چمک دار تھیں۔ اس کی چارپائی کے قریب ہی چار ملازم سفید کرتے پہنے اور پگڑیاں باندھے اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور نوجوان کی ہر حرکت کو نہایت تشویش کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک بولا ''یہ بیمار ہیں'' کمشنر نے انہیں ہدایت کی کہ نوجوان کو لٹا دیا جائے۔ چنانچہ ایک اور سلام کے بعد جوان بخت (کیونکہ یہی وہ تاجِ دہلی کا فرزند تھا جس کے سامنے ہم کھڑے تھے) ایک آہ بھر کر دوبارہ لیٹ گیا اور اپنے چہرہ پر چادر کھینچ لی گویا ہماری موجودگی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے سرہانے ایک تیرہ چودہ سال کا بھاری بھر کم لڑکا کھڑا تھا اس کے متعلق پتہ چلا کہ خاندان کا سب سے چھوٹا لڑکا ہے۔ یہ لڑکا کسی طرح بھی خاندان میں ایک خوش آئندہ اضافہ نہیں تھا۔ اور کمشنر کے خیال میں تو معزول شدہ بادشاہ کی عمر اور اس عورت کے کردار کو جس کے ہاں یہ لڑکا پیدا ہوا تھا مدِ نظر رکھتے ہوئے اس لڑکے کا شاہی خاندان سے تعلق بھی مشتبہ معلوم ہوتا تھا لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان تمام باتوں کے باوجود لڑکے کی ناک بالکل اپنے باپ پر ہے اور اس کے ہونٹ بالکل

جوان بخت جیسے ہیں۔

''آخر بادشاہ کی متلی رفتہ رفتہ ختم ہوگئی اور ہم لوگ اس برآمدے میں داخل ہو گئے۔ وہ ابھی تک ہانپ رہا تھا اور کمشنر کی باتوں کا جواب ہاتھ کے اشاروں یا مختصر لفظوں میں دیتا تھا کیا یہی وہ پریشان نظر اور کھویا ہوا سا بوڑھا آدمی تھا جس نے ایک بڑی سلطنت کو دوبارہ مستحکم کرنے کی اسکیمیں تیار کی تھیں، جس نے دنیا کی تاریخ میں سب سے بڑی بغاوت پھیلائی تھی اور جس نے اپنے پرانے محل کی دیواروں پر سے اس قوم کی نافرمانی کی تھی اور مذاق اڑایا تھا جس کی مٹھی میں اس وقت ہندوستان کی تمام ریاستوں کے تاج تھے؟ آخر اس نے مہرِ سکوت توڑی اس نے ہمیں صرف اتنا بتایا کہ وہ بہت بیمار ہے اور اتنی شدت کی متلی ہوئی ہے کہ بارہ تاشلے بھر لئے ہیں یقیناً یہ بیان بہت صدمہ پہنچانے والا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ یہ بہت زیادہ حد تک درست بھی نہیں تھا اور تاشلوں کی تعداد کے بارے میں کچھ مبالغہ سے بھی کام لیا گیا تھا جو مشرق سے مخصوص ہے۔ پھر اس میں کچھ عمل دخل بادشاہ کی شاعرانہ طبیعت کا بھی معلوم ہوتا تھا۔ بادشاہ شاعر ہے اور اس کے اندازِ بیان میں کافی گرمجوشی ہے۔ حالانکہ اس نے شعروں کی چار موٹی موٹی کتابیں لکھی ہیں لیکن وہ ابھی تک اپنی شاعری سے مطمئن نہیں ہے۔ دو ایک دن ہی ہوئے کہ اس نے چند عمدہ شعر مرتب کر کے ایک جلی ہوئی لکڑی سے جیل کی دیوار پر لکھے تھے۔ ایسا کون شخص ہے جس کو اس پر رحم نہیں آئے گا؟ برآمدے میں جس میں وہ بیٹھا ہوا تھا مجھے سوائے ایک ایسی چارپائی کے اور کچھ نظر نہ آیا جو انتہائی غریب ہندوستانی گھروں میں استعمال کی جاتی ہے۔ یہ بوڑھا آدمی فرش پر دوزانو بیٹھا تھا اور اس کی پیٹھ ایک چٹائی کا سہارا لئے ہوئے تھی۔ جو تمام دروازوں سے بندھی ہوئی تھی اور اس طرح ایک بارہ فٹ چوڑا اور چوبیس فٹ لمبا راستہ بناتی تھی اس چٹائی کے پیچھے سے ہمیں کچھ کھسر پھسر کی آوازیں سنائی دیں اور چند متجسس آنکھیں اس میں سے جھانکتی ہوئی نظر آئیں لوگوں نے ہمیں بتایا کہ بادشاہ اکیلا نہیں ہے۔ میرے تخیل کی پرواز اس میں تیمور کا شائبہ تک ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ اگر یہ بادشاہ جواہرات، اطلس وکمخواب کے کپڑے، ریاست کے افسروں، موسیقی کی دھنوں اور توپوں کی گرج، نقیبوں اور سجے ہوئے ہاتھیوں کے ساتھ ہوتا تو شاید میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا لیکن مجھے صاف صاف بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے یہاں کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس کا ماتھا کشادہ ہے اور بھنوؤں کے اوپر باہر کو نکلا ہوا ہے لیکن پھر ایک دم سے چپٹی سی

کھوپڑی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے بوڑھاپے کا ضعف صاف عیاں تھا اور نوکیلی ناک سے کچھ شان وشوکت کا ذرا اظہار نہ ہوتا تھا۔ ہلتے ہوئے منہ میں پوپلی سی زبان تھی لیکن ٹھوڑی اور اوپر کے ہونٹ کے اوپر ایک رُعب دار، لمبی اور مڑی ہوئی مونچھیں سفید داڑھی سے مل رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ اور پیر نرم ونازک تھے اور کپڑے مختصر اور گندے۔ یہ اس شخص کا جانشین ہے، جس نے 12-اگست 1765ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کو صوبہ جات بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی سونپ دی تھی اور ان کے علاوہ دوسروں علاقے مثلاً بنگال، دکن اور کرناٹک بھی صوبیداروں سے لے کر معمولی رقم کے عوض کمپنی کے اختیار میں دے دیئے تھے۔

وہ بات چیت کے لئے آمادہ نظر نہیں آتا تھا اور جب بریگیڈ ٹرسٹڈ نے اس سے پوچھا کہ اس نے انگریز عورتوں کی جان کیوں نہیں بچائی تو اس نے بڑی بے چینی سے ہاتھ سے اشارہ کیا گویا خاموشی چاہتا ہے اور کہا مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں اور میں اس سلسلے میں کچھ کہنا بھی نہیں چاہتا۔ اس کا پوتا جس کی عمر صرف چند مہینے تھی ہمارے سامنے پیش کیا گیا اور برآمدے میں زنانہ کی ایک دو عورتیں بھی نظر آئیں۔ کمشنر بیگمات میں سے ایک سے بات چیت کر رہا تھا۔ وہ پردے کے پیچھے ہی رہی اور ہمیں اپنا چہرہ نہ دیکھنے دیا۔

''یہ بیگم تقریباً پینتیس سال کی تھی اور معزول مغل کی برائیاں کر رہی تھی جو اس وقت درد و کرب میں مبتلا تھا۔ یہ بیگم اس کو چھوڑ دینا چاہتی تھی۔'' دیکھیے، اس نے کہا یہ بوڑھا احمق بھی اُسی طرح بیٹھا ہے گویا بادشاہ ہے لیکن اب وہ بادشاہ نہیں ہے۔ میں اس کے پاس سے چلی جانا چاہتی ہوں۔ وہ تکلیف دہ، برا اور چڑ چڑے مزاج کا آدمی ہے اور میں اس سے تنگ آ چکی ہوں۔ کیا یہ تمام باتیں بدزبانی میں شمار نہیں ہوتیں؟ لیکن یہ مغل ایک منطقی ہے اس نے اپنے ملازم سے صرف ایک کافی کیک یا چاکلیٹ لانے کے لئے کہا۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا منہ میں رکھ کر اسے چُوسنے لگا۔ پھر مسکرا کر اپنے کندھوں پر انگوٹھوں سے اس سمت میں اشارہ کرتے ہوئے جہاں سے ملکہ کے غصہ میں بولنے کی آواز آ رہی تھی بولا، میرے خدا کچھ اس کی بھی سن لے! چنانچہ ہم اس کو اسی کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ کر چل دیئے۔ اس کی عمر تقریباً بیاسی سال ہے لیکن یہ عمر چاند کے حساب سے ہے اور اس طرح اس کی اصلی عمر اڑھتر سال بنتی ہے۔ یہ کہنا لاحاصل ہے کہ اگر اسے کافرار یا بھیجا گیا تو وہ وہاں زندہ نہ پہنچے گا۔''

محل سے نکل کر ہم چاندنی چوک میں پہنچے جہاں دوکانیں لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ یہاں پر مٹھائیاں اور دوسری چیزیں بک رہی تھیں۔ یہاں سے ہم رات کے کھانے کے وقت واپس ہوئے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
مرا رنگ روپ بگڑ گیا مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں
میں نہیں ہوں نغمہء جاں فزا مجھے سُن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

(ظفر)

❁❁❁❁❁

میں کی، ہندوستانیوں کے ساتھ بہتر سلوک اور اُن پر عائد کیے جانے والے محصول سے متعلق اصلاحات کا مطالبہ کیا۔(12) ''دی ویکلی ڈسپیچ'' نے جس کا مقصد اخبار پڑھنے والے مزدور طبقے کی توجہ سماجی اور معاشی نظام کے خلاف بغاوت کی طرف سے ہٹانا تھا، یہ رائے ظاہر کی کہ ''اگر ہم ہندوؤں اور مسلمانوں سے اُن کے جرائم کا انتقام لیں اور فرنگی حکام کو چھوڑ دیں جن کی بداعمالی ان جرائم کا موجب ہوئی تو یہ نامردی اور بے دینی ہوگی۔''(13) ادنیٰ طبقوں کی بے چینی کو کمپنی* کی مخالفت میں بدل دینا سہل تھا۔ ''دی ڈیلی ٹیلیگراف'' نے کمپنی کی اس بنا پر مذمت کی کہ حکومت کی باگ ڈور ایک ''واحد طبقے'' (14) کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے۔ ''دی سٹینڈرڈ'' نے کمپنی کی مذمت کے ساتھ یہ سفارش بھی شامل کر دی کہ وسط ہفتے میں روزے کے دن اور روزِ شفاعت مالک مزدوروں کو پوری اجرت ادا کریں۔ معلوم ہوتا ہے اس تجویز پر عمل نہیں کیا گیا۔(15) ''دی نان کنفارسٹ'' نے بھی کمپنی پر حملہ کیا۔(16) لارڈ پامرسٹن جو ہندوستان کے معاملات پر اظہارِ رائے میں بے ساختہ اور بے لاگ تھا، جھٹ اس نتیجے پر پہنچا کہ کمپنی کو بند کر دینا چاہیے۔''(17)

مظالم کے سوال پر لارڈ شیفٹس بری سب سے زیادہ صاف گو تھا۔ اُس نے اعلان کیا: ''میں نے خود ہندوستان میں مقیم ممتاز ترین خاتون کا لکھا ہوا ایک خط دیکھا ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ روز بروز مستورات کلکتے میں وارد ہو رہی ہیں جن کے کان اور ناک کٹے ہوئے ہیں اور جن کی آنکھیں نکال دی گئی ہیں۔ معصوم بچوں کو خاص کر مخصوص کیا گیا ہے کہ ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے انہیں ایسی ایسی اذیتیں دیں جو سوچی بھی نہیں جا سکتیں۔ ماں باپ کو ان مظالم کا تماشائی بنایا گیا۔ ان کو اپنے بچوں کے اعضا سے کٹے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کھلائے گئے اور بعد میں انہیں دھیمی آنچ پر جلا کر ہلاک کیا گیا۔''(18)

خاتون جن کے خط کا ذکر ہے وہ گورنر جنرل کی بیٹی لیڈی کیننگ تھی۔ بعد میں لارڈ شیفٹس بری نے دباؤ پڑنے پر اپنے بیان کی تصحیح کر دی۔ اس نے تسلیم کیا کہ ''میں نے خود خط کو نہیں دیکھا بلکہ اس کے بارے میں سنا ہے۔''(19) اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ ایسا کوئی خط لکھا بھی گیا تھا۔

---

* نوٹ متعلقہ کمپنی: اس نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ ''اگر ہم سپاہیوں کو کچل دیں تو خدا اتنا ہی خوش ہوگا جتنا اہلِ برطانیہ ہوں گے۔'' 23-اگست 1857ء

اس بات کا ثبوت کہ لارڈ شیفٹس بری نے انتقام کے حق میں اپنی رائے برقرار رکھی، ایک خط سے ملتا ہے جو اس نے مارٹن ٹپر کو لکھا۔ یہ بکنگھم محل میں ایک ہردل عزیز شاعر تھا۔ اُن نظموں کے علاوہ جس میں اس نے دہلی کی مکمل تباہی اور مجرموں کے لئے قطار در قطار ''پھانسی کے تختے'' نصب کرنے کا تقاضا کیا۔ اُس نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ ''وکٹوریہ کو ہندوستان کی ملکہ بننا چاہئے۔''(20) شیفٹس بری نے لکھا: ''میں تمہارے ساتھ اتفاق کرنے پر بہت مائل ہوں کہ اکثر لوگ جب انتقام کو خدا کے ساتھ منسوب کرتے ہیں تو وہ اس لفظ کے مفہوم کو بالکل نہیں جانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انجیلِ مقدس میں انتقام انصاف کا کامل ترین اور بلند ترین ارتقا ہے۔ سپاہی اپنے جرائم کے خود گواہ ہیں۔ اُن کے جرم کو ثابت کرنے کے لئے کسی شہادت کی ضرورت نہیں۔ اس معاملے میں انسانی حکومت مختار ہے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ آئینی حکومت کو تمام کارروائی کا اختیار ہو نہ کہ نجی قانونِ سزا کا اس میں دخل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سرکار سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ سزا دینے میں سختی، عزم اور مستعدی سے کام لے۔''(21)

کابڈن نے مظالم کی داستانوں کو تسلیم کیا لیکن جان رائٹ کو اس نے لکھا: ''یہ ظاہر ہے کہ جو سلوک انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ روا رکھا ہے اس کے پیشِ نظر اُن سے محبت یا احترام کی توقع نہیں ہو سکتی۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہم ہندوستان میں اپنی رعایا کو (ہندوستانیوں) حبشی کے عام لقب سے نوازتے ہیں۔ یہ سب کچھ گوارا ہو جاتا (گو کسی قدر مشکل سے) اگر انگریز جن کے ساتھ ہندوستانیوں کا رابطہ تھا، اعلیٰ اوصاف اور اعلیٰ دماغی صلاحیتوں سے کام لیتے۔ جو غلطیاں ماضی میں انگریزوں سے سرزد ہوئی ہیں اور اس سے زیادہ خونریزیاں جو اس وقت عمل میں آ رہی ہیں اور جو اُن بے گناہ فرقوں پر ہماری ابتدائی جارحیت کی وجہ سے آئندہ سرزد ہوں گی، اُن سب کا خمیازہ ہمیں یا ہماری اولاد کو بھگتنا پڑے گا۔ شورش کے شروع میں ہمارے افسروں نے جو خطوط لکھے اُن کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہر ماتحت کو بھی اختیار حاصل تھا کہ وہ جتنے ہندوستانیوں کو چاہے پھانسی دے دے یا گولی مار دے۔ وہ اس خونریزی کا ذکر اس حقارت کے ساتھ کرتے تھے گویا جنگلی جانوروں کے شکار کا ذکر کر رہے ہوں۔''(22) لیکن یہ نجی خیالات تھے۔ کابڈن اور برائٹ دونوں کو 1857ء کے عام انتخابات میں شکست ہوئی تھی۔ کابڈن اس سال کے بیشتر عرصے کے دوران بیمار رہا اور اس نے بغاوت سے متعلق علانیہ کوئی بات نہ کی۔ جان برائٹ نے

جو برمنگھم میں پارلیمنٹ کا ضمنی انتخاب لڑ رہا تھا، اعلان کیا: ''ہندوستانی بغاوت کی کامیابی سے ہندوستان میں افراتفری پیدا ہوگی اور میرا خیال ہے کہ اس بغاوت کو دبانا ہندوستان پر رحم کرنا ہے۔'' (23)

ایف۔ڈی۔ مارس نے ایک مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا: ''ایسی درگزر جو جرم سے نفرت نہ ظاہر کرتی ہو، جو اس کے انسداد کی کوشش نہ کرتی ہو، جو جرم کی سزا دینے سے کتراتی ہو وہ زبانی نہیں ابلیسیانہ معافی ہے۔'' (24) ڈسرائیلی کو شک تھا (لیکن اس نے اپنے شکوک کو لیڈی لنڈن ڈیری کے گوش گزار کرنے کے لئے محفوظ رکھا) کہ ان ''مظالم کی بہت سی تفصیلات جن سے ملک کے جذبات مجروح ہوئے تھے، من گھڑت کہانیاں ہیں۔'' (25) جو ڈکس نے ''دی ٹائمز'' کے نام ایک طویل خط لکھا جس میں اُس نے اس نظریے سے اتفاق ظاہر کیا کہ سراسر ایک ہندو بغاوت تھی اور ''بے حرمتی اور ایذا رسانی کی بیشتر کہانیاں محض فرضی قصے ہیں۔'' (26) لیکن اس رائے کا اظہار انتقامی کارروائیوں کے شروع ہونے کے بعد ہوا اور اس رائے کو ان برعکس اطلاعات کی روشنی میں دیکھنا چاہئے جو اس اخبار میں نمایاں طور پر شائع ہوئیں اور جن میں سے ایک میں تو بے حد تہمت تراشی سے کام لیا گیا: ''میرے قبضے میں بہت سے خطوط ہیں جن سے اور بھی شدید تر مظالم کی مثالوں کا پتہ چلتا ہے لیکن مظلوم یا ان کے متعلقین ان کے ناموں اور حالات کے اظہار سے ہچکچاتے ہیں۔'' (27) ''ڈی ٹائمز'' اداریہ کے اعتبار سے اُن اخبارات میں پیش پیش تھا جنہوں نے ''عبرتناک سزا کا مطالبہ کیا، ایسی عبرت جس کا چرچا برطانوی ہندوستان کے دیہات میں آنے والی پشتوں تک رہے۔'' (28) انتہا پسند ''مارننگ سٹار'' نے کج روی اختیار کی جس میں برائٹ کی انتخابی مصروفیتوں اور مانچسٹر کی تجارتی توقعات کی عکاسی تھی۔ اس نے کیننگ پر حملہ کیا۔ اس کی ''رحمدلی'' کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی بغاوت سے پہلے کی پالیسیوں کی بنا پر۔ لیکن اس نے انتقامی کارروائی کی مخالفت کی۔ اُس نے ایک خط شائع کیا جس میں اُس نے دہلی کو تین دن تک لوٹنے کی تجویز کی مخالفت کی۔ اُس نے اپنے قارئین کو یاد دلایا کہ ''ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ انہیں آدمیوں (باغیوں) کو، جب یہ ہماری ملازمت میں تھے، ہم نے دوسروں پر اسی قسم کے مظالم ڈھانے میں آلہء کار بنایا۔'' (29) ''دی نان کنفارمسٹ'' نے اس بات سے اتفاق ظاہر کیا کہ ہندوستان میں امن بحال کرنے میں اور قانون کی برتری قائم کرنے سے پہلے سختی سے

کام لینا پڑے گا۔'' لیکن یہ کہہ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیا کہ'' جو کچھ بھی کرنا ضروری ہے وہ عیسائی سپرٹ کے مطابق کرنا چاہیئے نہ کہ جوشِ جنون سے غضب ناک ہو کر۔''(30) ''دی ڈیلی ٹیلیگراف'' نے اعلان کیا کہ''سخت انتقام اور عبرت ناک سزا کی ضرورت کی ہر طرف سے حمایت ہو رہی تھی۔''(31) ''دی مارننگ پوسٹ'' نے اعلان کیا کہ'' ہر انگریز نے جو اپنے سینے میں مرد کا دل رکھتا ہے، اپنے وطن کے ساتھ یہ پیمان باندھا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو کم از کم اس مقصد کے لئے تو ضرور قائم رہے گی کہ اُن مسلمان اور برہمن شیطان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے جنھوں نے انگریز خواتین اور دوشیزاؤں پر ناقابلِ بیان مظالم ڈھائے ہیں۔''(32) انتہا پسند''نیو کاسل کرانیکل'' نے، جو، اب مالک، جوزف کوون کے شہنشاہیت پرستی کے بڑھتے ہوئے جوش کی عکاسی کرتا ہے، برطانوی تاج کے تحت اس شاندار نو آبادی کا ذکر کیا اور کیننگ کی رحمدلی پر یوں نکتہ چینی کی:''اب رحم کھانے کا وقت نہیں ہے، ہمارا انتقام ایسا تیز، خونریز اور اس قسم کا ہونا چاہیئے کہ مستقبل میں دہلی کے ذکر پر ہی ہماری ہندوستانی رعایا کانپ اُٹھے۔اُن کو اس طرح نیست و نابود کرنا چاہیئے کہ گویا جنگلی جانور ہیں۔''(33)

برطانیہ کے دولت مند طبقے سے متعلق ایک آخری نکتہ قابلِ ذکر ہے۔یعنی شہنشاہیت پرستانہ نظریہ جس نے اختلافات پر اپنا رنگ چڑھایا جیسا کہ سابقہ اقتباسات سے ظاہر ہے۔

یہ خیریت گزری کہ بغاوت جنگِ کریمیا یا ایران پر فوج کشی کے ساتھ ساتھ رونما نہیں ہوئی۔ ''دی ٹائمز'' نے لکھا:''اگر بغاوت ہونی ہی تھی تو اس کا اس سے بہتر موقع نہ ہو سکتا تھا۔'' پھر اس نے لکھا:''اب سوال فقط یہ ہے کہ ہندوستانیوں پر کون حکومت کرے گا کیوں کہ وہ اپنے آپ پر حکومت کرنے کے کبھی بھی قابل نہ ہوں گے۔'' اس نے بتایا کہ''جنگِ برما کے بعد سے کہیں بھی ہمارے اقتدار کو زک نہیں پہنچی۔اودھ کا امن کے ساتھ الحاق کر لیا گیا ہے۔پنجاب ہمارے تحت ایک صوبہ بن گیا ہے بلکہ پیگو ہ بھی ایک نفع کا سودا ثابت ہونے لگا ہے۔''(34) لارڈ شیفٹس بری نے بھی یہ رائے ظاہر کی کہ''بغاوت سازگار وقت پر ہوئی۔'' اس نے اپنا بیان ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا''اس میں خدا تعالیٰ کا ہاتھ تھا۔ان تمام واقعات سے ثابت ہو گیا ہے کہ خدا نے یہ کام ہمیں بحیثیت قوم سپرد کیا ہے کہ ہم اُن لاکھوں انسانوں کی تہذیب کو ترقی دیں اور خدا کے مولودِ مسعود (حضرت عیسیٰ) کے دین کی اشاعت کا کام کریں۔''(35) لارڈ برآم نے''سخت سزا''(36) کا

مطالبہ کیا۔ لارڈ گرے کی ریفارم کیبنٹ کا رُکن ہونے کے بعد سر جیمز گراہم نے اب قدامت پسندانہ خیالات اپنا لئے تھے۔ اس نے اعلان کیا کہ ''سلطنت کھو دینے سے ہمارا زوال شروع ہو جائے گا۔ اس کے قائم رہنے سے یہ ثابت ہوگا کہ ہم ابھی تنزل کا شکار نہیں ہوئے ہیں۔'' (37) ''دی ڈیلی ٹیلیگراف'' نے لکھا: ''بزدلانہ خیالات اور افسردہ جذبات کسی سلطنت کی مجالسِ شوریٰ میں دخل نہیں پاتے جب تک زوال کا دور نہ آ جائے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ایسا دور ابھی نہیں آیا'' (38) ''دی نان کنفارمسٹ'' جو ''برطانیہ صغرا'' کے نظریہ کی عکاسی کرتا تھا، اُس کا یہ خیال تھا کہ شاید یہ بغاوت چین کی معرکہ آرائیوں میں ہماری بے جا مداخلت اور ایک انگریز وزیر کو ایران کے ساتھ جنگ چھیڑنے کی اجازت دینے کی پاداش ہے۔'' (39) ''دی نیو کاسل کرانیکل'' نے ریلے اور ڈریک کا ذکر چھیڑا اور امید ظاہر کی کہ ''خوش حال اور عیش و عشرت کی صدیوں نے انگریزوں کو بے باکی اور مردانہ جرأت کی اس سپرٹ سے محروم نہیں کیا جس سے عہدِ الزبتھ کے انگریز مشہور ہوئے۔'' (40) ناول نگار تھیکرے نے اپنی خاندانی دولت جو اُسے ہندوستان سے حاصل ہوئی تھی، جوئے میں گنوا دی۔ جب وہ پارلیمنٹ کا رُکن منتخب ہونے کے لئے آکسفورڈ کے ووٹروں کی حمایت حاصل کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا، اس وقت اس نے بغاوت کو دبانے کے موضوع کو اپنے پروگرام کا حصہ بنایا۔ (41) ڈسرائیلی نے برطانوی تاج اور ہندوستان کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کی وکالت میں اپنی تمام فصاحت و بلاغت صرف کر دی۔ اُس نے دور اندیشی سے یہ بھانپ لیا کہ ان علاقوں پر صرف جبر کے ساتھ حکومت کرنا ممکن نہیں بلکہ منصبِ شاہی کی عظمت اور تقدیس بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ ہندوستان کے ساتھ برطانیہ کا رابطہ برقرار رہے۔ (42) ملکہ وکٹوریہ کو اس بات کا احساس ہوا کہ ''مجموعی صورتِ حال کریمیا کی نسبت زیادہ تشویش ناک ہے جہاں جنگ شرافت کے ساتھ لڑی گئی اور جہاں عورتیں اور بچے محفوظ تھے۔'' (43) اس نے اس موقعہ کو غنیمت جان کر مسلح افواج میں اضافہ کی تاکید کی۔ اس نے لکھا: ''پچھلے بیس برسوں میں سلطنت کی وسعت تقریباً دوگنی ہوگئی ہے لیکن ملکہ کی فوجوں کی تعداد اسی قدیم پیمانے پر قائم ہے۔'' (44) کیننگ کے خط سے اس کا ارادہ اور بھی پختہ ہوگیا: ''انگلستان کے اقتدار کو سخت دھکا لگا ہے اور اس کے اقتدار میں اعتماد اسی صورت میں بحال ہو سکتا ہے کہ ساری ہندوستانی سلطنت میں قوت کا طویل اور متواتر مظاہرہ ایسی انگریزی فوج کی موجودگی سے کیا

جائے کہ مخالفت کا سوال بھی نہ پیدا ہو سکے۔''(45) ملکہ کے شوہر کی بھی رائے یہی تھی: ''جس چیز کو سوچ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں وہ اُن لوگوں پر گولی چلانے کا خیال ہے جو ہماری ہی وردی پہنے ہوئے ہیں۔ بہرحال ممکن ہے نتیجہ اچھا نکلے۔اب ہم یقیناً ایک معقول فوجی نظام قائم کریں گے۔''(46) بین الاقوامی صورتِ حال پر بغاوت کا کیا اثر مرتب ہوا، اس پر فکرمندی کے ساتھ بحث کی گئی*۔ کیا نپولین سوم برطانیہ کی پشت میں چھرا بھونکنے کے موقعہ کو غنیمت جانے گا؟ پامرسٹن نے کچھ بے دلی کے ساتھ خوشی کا اظہار کیا جب بلجیم نے بغاوت کو دبانے میں مدد دینے کے لئے ایک فوجی دستہ بھیجنے کی پیش کش کی اور نیویارک سے جہاں ہیولاک کی موت پر جھنڈے نگوں کر دیئے گئے یہ اطلاعات پہنچیں کہ اس مقصد کے لئے پچاس ہزار مجاہد آسانی کے ساتھ بھرتی کئے جا سکتے ہیں۔(47)

غرضیکہ یہ ظاہر ہے کہ برطانوی مزدور طبقہ تو درکنار دولت مند طبقے پر بھی ردِعمل کی مختلف صورتیں تھیں۔

البتہ ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ ہمیں اس سلسلے میں کثیر دستاویزات، دیہاتی گھروں اور پادریوں کے مکانات سے اس قسم کے خطوط، سیاسی روزنامچے، پارلیمنٹری تقریریں اور فاضلانہ ادارتی مضامین حاصل ہو سکتے ہیں۔ غالباً ہمیں کبھی بھی یہ معلوم نہ ہوگا کہ ان جگہوں پر کیا گفتگو ہوتی تھی جہاں انگلستان کے مزدور اکٹھے ہوتے اور روزمرہ کے واقعات پر بحث کرتے تھے۔کوئی دستاویزات دستیاب نہیں ہیں۔ شاید ان کا وجود ہی نہیں ہے۔البتہ ردِعمل کے آثار پائے جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ مزید تحقیق سے نئی باتوں کا انکشاف ہو۔

1857ء میں برطانوی تجارت کی توسیع کے زیرِ اثر منشوریت کی مجاہدانہ تحریک ڈھیلی پڑ رہی تھی۔سوشلزم جس نے برطانوی مزدور طبقے میں جنم لیا تھا، عارضی طور پر کمزور ہوگئی تھی۔اینگلز نے 1885ء میں لکھا: ''1848ء کے فرانسیسی انقلاب نے انگلستان کے متوسط طبقے کو بچا لیا۔فتحیاب فرانسیسی مزدوروں کے اشتراکی اعلانات سے انگلستان کا نچلا متوسط طبقہ ڈر گیا اور برطانوی مزدور طبقے کی محدود مگر حقیقی تحریک کا شیرازہ بکھر گیا۔منشوریت کی تحریک 10-اپریل 1848ء کو خارجی طور پر ناکام ہونے سے پہلے ہی داخلی طور پر ختم ہو چکی تھی۔مزدور طبقے کی سرگرمی کو پسِ پشت ڈال

* گرینول، اندراج 2-اکتوبر 1857: فی الحال ہماری حالت ایک بے وقت قوم کی سی ہوگئی ہے۔

دیا گیا۔ سرمایہ دار طبقے کی ہر محاذ پر جیت ہوئی۔(48) اس کے بعد وہ پچیس سالہ دور شروع ہوا جس میں انگلستان دنیا بھر کا ''صنعتی مرکز'' بنا رہا اور اس کے اقتدار کو چنوتی دینے والا کوئی نہ تھا۔ چوں کہ ہندوستانی بغاوت اسی پچیس سالہ دور میں رونما ہوئی اس لئے برطانوی مزدور طبقے میں کسی اجتماعی ردِّعمل کی توقع نہ ہوسکتی تھی بلکہ اس کا تھوڑا سا جو ردِّعمل ہوا وہی حیرت کی بات ہے۔

''رینلڈز نیوز پیپر'' مزدور طبقے کے غیر سوشلسٹ نظریے کا ترجمان تھا۔ اس نے فوراً باغیوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ 5- جولائی 1857ء کو اس نے ''اس ہولناک انتقام کا ذکر کیا جو (اگر دنیا میں کہیں انصاف باقی ہے) برطانوی حکومت اور ایسٹ اِنڈیا کمپنی کے بے مثال جرائم کی پاداش میں نازل ہوگا۔'' اس نے اعلان کیا: ''گو ہم باغی رجمنٹوں کے مظالم کی مذمت کرتے ہیں لیکن ہماری ہمدردی طاقتور کے مقابلے میں کمزور کے ساتھ، ظالم کے خلاف جدو جہد کرنے والے مظلوموں کے ساتھ، اذیت، غارت، غلامی اور توہین کے شکار اُن ہندوستانیوں کے ساتھ ہے اور ہمیشہ رہی ہے جو اپنے ظالم، بے درد، غارت گر اور عیار آقا کے آہنی جوئے سے رہا ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری ہمدردی باغیوں کے ساتھ ہے، اُن سرکش شہیدوں کے ساتھ ہے جنہیں ''دی ٹائمز'' اور اُس کے ساتھی گولی مار کر، پھانسی دے کر اور سولی پر چڑھا کر عبرتناک سزا دینا چاہتے ہیں۔'' جب مظالم کو بڑھا چڑھا کر مشتہر کیا گیا تو اس اخبار نے لکھا: ''ہم یہاں گھر میں بیٹھے تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھ رہے ہیں۔ انگریزوں کی طرف سے حد درجہ اشتعال انگیزی ہوئی ہے۔''(49) اُس نے ہندوستان کے واقعات کو برطانیہ میں آزادی کے خاتمے کے ساتھ وابستہ کیا۔(50) جب روزے کے دن شعبدے کا مظاہرہ ہوا تو اس اخبار نے ''جنگجو اور مطلب پرست چرچ'' کے رویے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا: ''اکثر اشخاص اپنے خطبات میں آمادہ بہ جنگ اور انتقام جو ثابت ہوئے۔ وہ خون کے پیاسے اور روپیہ کے بھوکے تھے مگر رحم سے متعلق انہوں نے چُپ سادھ لی۔'' نان کنفارمسٹ جادو بیان ''مونٹ بنک سپرجن'' کا خاص طور پر ذکر کیا گیا۔ اس نے کرسٹل پیلس میں اُس بیس ہزار کے مجمع کے سامنے تقریر کی جس نے اس تماشے کے لئے پیسے خرچ کئے تھے۔ ''سپرجن'' نے 'خون کے بدلے خون' کی تلقین کی اور مجمع کے جذبات کو بھڑکانے کے لئے اس نے حقیقت کو مسخ اور تاریخ کو نظر انداز کیا۔ اس نے انہیں بتایا کہ ''سپاہی محبِّ وطن نہیں باغی ہیں کیوں کہ انہوں نے برضا و رغبت انگریزوں کی غلامی قبول کی تھی۔ بے شک! وہ اسی

طرح اپنی آزادی سے دست بردار ہوئے جس طرح ایک مسافر اپنے بٹوے سے دست بردار ہوتا ہے جب ڈاکو اُسے پستول دکھاتا ہے۔" (51) یہ مذمت قطعی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رینلڈ کا اخبار اب شہنشاہیت پرستی کا شکار ہونے لگا تھا۔ اُسے صرف یہ فکر تھی کہ برطانوی نظام میں اصلاح کر کے ہندوستان پر قبضہ برقرار رکھا جائے۔ "ہم اس وقت تک ہندوستان کو نہ چپ رکھ سکتے ہیں اور نہ اپنے ہاتھوں میں محفوظ رکھ سکتے ہیں جب تک ہم غارت گری، الحاق اور مظالم کی پالیسی کو نہ بدلیں، مستقبل میں ہندوستانیوں کو رحم و انصاف کی ضمانت نہ پیش کریں اور اُن کی موجودہ نا امیدی اور غم و غصہ کو نہ رفع کریں۔ ہندوستان برطانوی تجارت اور صنعت و حرفت کے لئے ایک وسیع میدان ثابت ہوسکتا ہے بشرطیکہ انگلستان اور ہندوستانی باشندے اسے ایسا بنائے رکھیں۔ اس لئے انگریزوں کو اس بات کا دھیان رکھنا چاہئے کہ ہم اپنی بدنظمی اور طبقہء امرا کی حماقت کی وجہ سے مشرق کے اس سنہری باغ کو اپنے قبضے میں رکھنے کا سنہری موقع نہ کھودیں۔" (52)

ارنسٹ جونز (53) کو مدّت سے ہندوستان میں دلچسپی تھی۔ 1853ء میں (54) اس نے اخباری مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ 1851ء میں جب وہ جیل میں تھا، اُس نے ایک طویل نظم بعنوان "ہندوستان یا نئی دنیا کی بغاوت" لکھی تھی۔ جب شورش بپا ہوئی تو یہ نظم دوبارہ شائع ہوئی۔ اس کے دیباچے میں جونز نے شہنشاہی نعرے میں مشہور ترمیم کی۔ شہنشاہی نعرہ یہ تھا: "برطانوی سلطنت پر آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا۔" اُس نے اس میں یہ تبدیلی کی: "اس کی نوآبادیوں پر آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا لیکن خون بھی کبھی خشک نہیں ہوتا۔"

اب جونز منشوریوں کی مجاہدانہ روایت کو برقرار رکھنے میں اکیلا رہ گیا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہ جدوجہد کو ترک کردے گا اور دولت مند طبقے کے ساتھ مصالحت کر لے گا۔ ہندوستانی لوگوں کے حق میں اس کا آخری جہاد اُس کی انقلابی زندگی کا شاندار نقطہء عروج تھا۔

4- جولائی کو جونز نے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ "انصاف اور مصالحت کی پالیسی سے ہندوستانیوں کی آخری شورش کافی مدّت کے لئے ملتوی ہوسکتی تھی۔" اس نے تنبیہہ کی "انگلستان کے مزدورو! تمہیں ایسی انتہائی غیر منصف اور غاصب سلطنت کے قیام کے لئے خون بہانا پڑے گا اور اس کا بار اٹھانا پڑے گا جس سے زیادہ سیاہ دھبّہ انسانی تاریخ کے ماتھے پر دوسرا نہ

ملے گا۔ ہموطنو! تم کو جاننا چاہئے کہ ہندو اس حق کے لئے لڑ رہے ہیں جو تمام بنی نوع انسان کی نگاہ میں مقدس ترین حق ہے۔ پولینڈ، ہنگری، اٹلی اور آئر لینڈ کے لوگوں کا نصب العین اس سے زیادہ مقدس اور منصفانہ نہیں تھا۔ دنیا کی ایک انتہائی عظیم الشان تحریک کو دبانے میں تم سے خون اور خزانہ صرف کرنے کا تقاضہ کیا جائے گا۔ ہموطنو! تمہیں دوسروں کی آزادی سلب کرنے میں مدد دینے کے بجائے کوئی بہتر کام انجام دینا چاہئے یعنی اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔''

11-جولائی کو اس نے پُر امید ہو کر حکمراں طبقے میں خوف کے آثار کی طرف اشارہ کیا ''دی ٹائمز'' کے ''سٹی پیج'' (City Page) میں ایک دہشتناک رائے کا اظہار تھا: ''انگلستان کے بنک میں سونے چاندی کے ذخیرے میں مسلسل اضافے اور اچھی فصل کی توقع کے باوجود جو سرد بازاری صرافہ میں چھائی ہوئی ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہندوستان سے متعلق تشویش دوسرے تمام امور پر غالب ہے اور اگر کسی سمجھوتے سے پہلے کل کوئی المناک خبر آ جائے تو اس سے غالباً خوف و ہراس پھیل جائے گا۔'' اس نے ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے بیگم اودھ کے خیر مقدم پر بھی توجہ مبذول کی۔ ''اس سے پہلے باریابی کی اجازت کیوں نہیں دی گئی؟ کیا اس لئے کہ بیگم اودھ ایسی خفیف لغزش کی مرتکب ہوئی تھی جس سے بکنگھم پیلس کے اخلاقی معیار کو صدمہ پہنچا تھا۔ اب تخت سے معزول بیگم کا استقبال ہو رہا ہے۔ معیارِ اخلاق بالائے طاق رکھ دیئے گئے۔ بادشاہی فقیری کے ساتھ بے تکلف ہونے لگی۔ معاملے کی اصلیت یہ ہے: رشوت خوروں نے ایک شاہی خان دان کو اس کی میراث سے محروم کر دیا تھا (مالِ حرام بود بجائے حرام رفت) اور رشوت خوروں کا مالِ غنیمت چھن جائے۔ اس لئے ملکہ کو دربدر پھرنے والی بیگم کی دلجوئی کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے کیوں کہ لٹیروں کو امید ہے کہ اُسے آلہء کار بنایا جا سکتا ہے۔''

یکم اگست کو جونز نے لکھا: ''جیسا کہ ہم اپنے قارئین کو شروع ہی سے یقین دلا چکے ہیں، یہ بغاوت فوجی غدر نہیں بلکہ قومی بغاوت ہے۔'' اس نے پھر پُر امید انداز میں لکھا کہ ''اس سے باقاعدہ تیاری کے آثار ظاہر ہیں۔ کیا یہ محض کسی حکمراں کے ساتھ جنگ ہے جو ہم بہت بار لڑ چکے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ ایک قوم کے ساتھ جنگ ہے اور اس میں اتنے لوگ شامل ہیں جتنے کہ ہندوستان کے اندر کبھی ہمارے خلاف جنگ میں شامل نہ ہوئے تھے۔'' اُس نے ان اشتعال انگیز خیالات میں اس تنبیہہ کی آڑ لی کہ ''باغیوں میں پھوٹ پڑنے کا امکان ہے اور ان سے غیر توقع

احمقانہ حرکت سرزد ہوسکتی ہے۔ایک بات کا ہمیں یقین ہے۔خواہ بغاوت دب نہ جائے یا نہ دبے، یہ ہمارے ہاتھ سے ہندوستان کے نکلنے کا پیش خیمہ ہے۔ ہمارا مشورہ یہ ہے: ہندوستانی قوم کی آزادی کو تسلیم کرو۔سو سال ہوئے دنیا کی پھیری لگانے والے، لیڈن ہال اسٹریٹ کے تاجر لٹیروں کی ایک جماعت حیلے بہانے بنا کر چپکے سے سلطنتوں کے اس عظیم جمگھٹ میں وارد ہوئی اور اس کا ہیرا (یعنی آزادی) چُرا لیا۔اس سو سالہ عہدِ حکومت میں جرائم کے ہزاروں سال سمٹے ہوئے ہیں۔''اس نے تسلیم کیا کہ باغیوں نے بھی مظالم ڈھائے ہوں گے لیکن اس نے انگریزوں کی اشتعال انگیزی کا خاص طور سے ذکر کیا اور جنگ جزیرہ نما (Peninan Car War) کے دوران برطانوی فوج کے قتلِ عام کی یاد دلائی۔''کیا اس وقت ''ٹائمز'' نے اس کی مذمت کی؟ نہیں، ایک لفظ بھی نہیں کہا۔''اُس نے ہندوستان کی بدنظمی کا تمام تر الزام ایسٹ انڈیا کمپنی پر رکھنے کے منصوبے سے آگاہ کیا۔''کمپنی کو ختم کرنا اور اس کی جگہ ہوم گورنمنٹ (برطانوی حکومت) قائم کرنا گویا ایک لٹیرے کو ہٹا کر دوسرا لٹیرا مسلط کرنا ہے۔''اس نے پھر اعلان کیا کہ ''ہندو حق بجانب ہے، ہندو کا مقصد نیک ہے۔خدا ہندو کے مفاد کی حفاظت کرے!''اس وہ تمام انتقامات گنوائے جو ''ٹائمز'' نے بیان کئے تھے اور یہ رائے پیش کی: ''یہ عیسائیت اور تہذیب کا نمونہ ہے! اس کے بعد ہندوستانیوں کے مظالم کا ذکر ہم کس منہ سے کرتے ہیں۔''

''پیپلز پیپر'' کے اسی پرچے میں بغاوت سے متعلق مزدوروں کے رویّے کی بھی دلچسپ عکاسی تھی۔''تقریباً دو سو بے کمیشن افسر اور سپاہی چیتھم اور راچسٹر کے شہروں میں مارچ کرتے ہوئے دکھائی دیئے اور بہت سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا کیوں کہ یہ خوش وضع جوانوں کا دستہ تھا۔یہ حال ہی میں ہندوستان سے لوٹے ہیں۔یہ دس سال کی ملازمت کے معاہدے کے تحت بھرتی ہوئے تھے۔چنانچہ اس مدّت کے ختم ہوتے ہی انہوں نے سبکدوشی حاصل کر لی۔دو پونڈ کے عطیے اور نئی وردی کی ترغیب کے باوجود انہوں نے مزید ملازمت سے انکار کر دیا۔''

29- اگست کو جونز نے فوجی صورتِ حال کا ایک اور جائزہ لیا۔اُسے اب بھی امید تھی کہ بغاوت کامیاب ہوگی۔اس نے ''اس سماج کی حد درجہ مصنوعی حالت پر جدوجہد کے اثرات بیان کئے جس کا مدار ساکھ پر ہے، جب کہ ساکھ کا مدار امن و امان پر ہے۔'' دوسری قومیں برطانیہ کی تجارتی برتری کو خطرے میں ڈال دیں گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مزدور طبقے کو خوراک کی گرانی،

قلیل اُجرت اور تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

5- ستمبر کو اس نے پھر اس بیان کو دہرایا کہ: ''بغاوت اتنی انصاف پر مبنی، اتنی برتر اور اتنی ضروری ہے کہ اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ حیرت اس بات کی نہیں کہ سترہ کروڑ لوگوں نے تھوڑے تھوڑے حصوں میں بغاوت کی بلکہ حیرت اس بات کی ہے کہ انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ ہتھیار نہ ڈالتے اگر اُن کے اپنے ہی حکمراں اُن سے غداری نہ کرتے۔ وہ یکے بعد دیگرے غیر کے ہاتھوں بِک گئے۔ چنانچہ بادشاہ، والیانِ ریاست اور امرا ہمیشہ اُسی ملک کے بدخواہ اور اس کے لئے باعثِ لعنت ثابت ہوئے جس کا انہوں نے ہر دور میں نمک کھایا۔'' اُس نے اِس بات پر زور دیا کہ انگریز مزدور طبقے و ''ہندو بھائیوں کے ساتھ ہمدردی ہونا چاہئے۔ ان کا مفاد تمہارا مفاد ہے اور ان کی کامیابی بالواسطہ طور پر تمہاری بھی کامیابی ہے۔''

12- ستمبر کو اس نے ''قلتِ وقت'' کی طرف اشارہ کیا جو ہندوستان میں رونما ہونے والے واقعات کا نتیجہ تھا اور تجارت کے مستقبل کے بارے میں مایوس کن پیشگوئیاں کیں: ''بغاوت کو دبانے کے اخراجات ٹیکسوں سے پورے کیے جائیں گے یعنی انگریز مزدور طبقے کی جیبوں سے۔'' اس نے سوال کیا: ''کیا انگریز مزدوروں کو اس رقم کی ادائیگی میں کوئی دلچسپی ہے؟ کیا ہندوستانی حکومت سے انہیں پھوٹی کوڑی کا بھی فائدہ پہنچا ہے؟ انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ پھر فائدہ اٹھانے والے کون ہیں؟ امرا اور رؤسا، زمین دار اور سرمایہ دار، یعنی طبقہء امرا کی اولاد جنہوں نے وہاں روپیہ اینٹھنے، لوٹ مار کی اور جبر وستم کی تعلیم حاصل کی۔ کیا ہم نے ہندوستان کو کنگال نہیں کر دیا۔ جب سے یہ انگلستان کی ملکیت بنا؟ کیا ہم نے اسے برباد نہیں کیا اور اسے گداگر بنا کے نہیں رکھ دیا؟ بیوپار کی کیا حالت ہوتی اور ہندوستان کی منڈی کی کیا صورت ہوتی اگر ہم نے خودمختار حکومتوں کے ساتھ دوستانہ ملک کی حیثیت سے تجارت کی ہوتی؟''

اس مضمون میں اس نے ظلم وستم کی داستانوں کے سلسلے میں بھی یہ سوال کیا: ''اذیت رساں کون ہیں؟'' اُس نے 1855ء میں مدراس میں مظالم کے مبینہ سبب کی تحقیقات کرنے والے کمیشن کی شہادت کا آئر لینڈ کے ایک اخبار میں حوالہ دیا۔

19- ستمبر کو اس نے اس بات کا جواب دیا کہ اس کا رویّہ غلط فہمی پر مبنی ہوسکتا ہے۔ اس نے کہا: ''جمہوریت میں استقامت ضروری ہے۔ خدا بلاشبہ حق اور انصاف کا طرفدار ہے اور انسان کو

بے شک حق اور انصاف کا طرفدار ہونا چاہئے۔ کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا: 'میں ہنگری کے ساتھ ہوں اور ہندوستان کا مخالف ہوں۔' اگر وہ یہ کہتا ہے تو وہ سراسر جھوٹ بولتا ہے۔ نہ صرف اپنے خلاف بلکہ اصول کے خلاف، سچائی کے خلاف اور عزت کے خلاف۔ اگر ہندوؤں کا ساتھ دینا ایک غیر انگریزی فعل ہے تو ظلم کوشی، سفا کی اور فوج کشی کی حمایت کرنا اس سے زیادہ غیر انگریزی حرکت ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ انگلستان بدلے بلکہ اپنی آواز، جو انگریز عوام کی آواز ہوگی دوسروں تک پہنچائے اور چیخ کر کہے کہ: 'حق حق ہے اور سچائی سچائی۔' حق ہندوؤں کی طرف ہے۔ خدا کرے فتح بھی ان کا ساتھ دے! انگریز قوم اتنی بلند ہمت اور طاقت ور ہے کہ وہ اپنی امنگوں اور اپنے عمل میں انصاف پسند اور یکرنگ ہوسکتی ہے۔''

3-اکتوبر کو جونز نے آنے والے روزے اور شفاعت کے قومی دن* پر طنزاً یہ لکھا: ''روزے کا دن کیا ہے؟ اس کی وقعت محض ایک عیارانہ مذہبی رسم سے زیادہ نہیں۔ اس کا مقصد غریبوں کی الماریوں کو خالی کرنا اور اُن کے پیٹ پر پتھر باندھنا ہے۔''

اُس نے ریلوے کمپنی کے اس اعلان پر تبصرہ کیا کہ ''تفریحی گاڑیاں اتوار کے دن کی طرح چلیں گی تا کہ لوگ حسبِ خواہش کرسٹل پیلیس میں سپرجن کا مجمع دیکھنے یا گرین وچ کی سیر کے لئے جا سکیں۔'' اس پرچے میں ایک خط بھی شائع ہوا جس پر دستخط کی جگہ یہ درج تھا ''وقت سب کو آزماتا ہے۔'' معلوم ہوتا ہے یہ خط جونز نے لکھا تھا۔ اس میں بغاوت کے برطانوی مظلوموں کی مدد کے لئے امدادی فنڈ کا ذکر تھا۔ ''میں تاکید کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ اگر کوئی مزدور اس فنڈ کے لئے ایک پیسہ بھی چندہ دے گا تو یہ ایک جرم ہوگا۔ تمہیں غارت گری اور دغابازی کے اس ابلیسانہ نظام سے کوئی سروکار نہیں جسے خودغرض احمقوں اور زمین ہتھیانے والوں کی ایک جماعت نافذ کئے ہو۔ چندے کی وصولی ان لوگوں تک محدود ہونی چاہئے جن کے ہاتھوں میں ہندوستانی پرچۂ زر یعنی ہندوستانی ہنڈیاں ہیں، ان لوگوں تک جنہوں نے ہندوستان پر فوج کشی اور ڈاکہ زنی

* حاشیہ متعلقہ روزِ شفاعت و روزہ: ''یہ بارش کا سنسان دن تھا۔ صرف مزدور طبقے کے لوگ روزہ رکھتے تھے وہ بھی خوشی سے نہیں بلکہ مجبوراً کیونکہ وہ اس دن اپنی روزی نہیں کما سکتے تھے۔ وہ مغموم و مجبور گلیوں میں پھرتے تھے اور ایسے کلمات نکالتے تھے جو مناجات کے عین برعکس تھا۔'' (نیوکاسل کرانیکل۔ 9-اکتوبر 1857ء)

سے ہاتھ رنگے ہیں۔'' جنگ کریمیا کے مصیبت زدگان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کا مقابلہ اُس نے اُس سلوک کے ساتھ کیا جواب اینگلوانڈین لوگوں کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ اُس نے ان بڑی رقوم کا بھی ذکر کیا جو شاہی خاندان اور اس کی شادیوں کے لئے مہیا کی گئیں۔ ''اس شاہانہ اور شاندار دولت و ثروت کا موازنہ اس فاقہ کشی کے ساتھ کرو جو اس ملک کے بدبخت اور خستہ حال تاجروں کی میراث ہے۔۔۔ غریب عوام۔ ذرا خیال کرو میاں بیوی کو ایک قلعے میں پھینک دیا جاتا ہے جسے یونین ہاؤس کہتے ہیں۔ جوں ہی وہ داخل ہوتے ہیں ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے ہیں۔ نوجوان بچوں کو میلوں دور بھیج دیا جاتا ہے۔ انہیں جئی کا پتلا دلیا اور پانی سا شوربا کھلایا جاتا ہے جو انسان کے کھانے کے لائق نہیں۔ جیسا کہ پچھلے ہفتے سینٹ پینکراز کے محتاج خانے سے اطلاعات پہنچی ہیں۔'' آخر میں اُس نے مزدوروں سے اپیل کی کہ وہ اپنا روپیہ سیاسی سرگرمی کے لئے محفوظ رکھیں۔ ''اپنے گھر کی حالت دیکھو، اپنے مفادات پر توجہ دو۔ چندہ اکٹھا کرو اور منظّم ہو جاؤ۔''

19-اکتوبر کو اس نے مظالم پر بحث کرتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کی کہ ان کے بیان میں ''خوفناک مبالغہ'' سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن ''اگر وہ ثابت بھی ہو جائیں تو بھی یاد رکھنا چاہئے کہ انہیں تصویر کا صرف ایک رُخ دکھایا گیا ہے۔'' امریکہ کی جنگِ آزادی سے متعلق برطانوی دستاویزات کو ذرا ذہن میں لائیں۔ ہم نے امریکی ہندوستانیوں کو بھرتی کیا اور فی سر ایک رقم مقرر کی۔ جتنے مرد، عورتوں اور بچوں کے سر وہ برطانوی کیمپ میں لائیں گے اس کے مطابق انہیں رقم ادا کی جائے گی۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن بدبخت مظلوموں کو کیسی ہولناک اذیت کے ساتھ موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔ یہ قرونِ وسطیٰ کا کام نہ تھا بلکہ موجودہ دور میں کیا گیا جس کی یاد ابھی تازہ ہے۔'' اس نے یہ بھی بتایا کہ ''انگریزوں نے ہندوستان میں ہلاکت کا ایسا دہشت ناک طریقہ ایجاد کیا ہے جس کے تصور سے ہی انسان کانپنے لگتا ہے۔ اُن رحمدل عیسائیوں کو ایک مہذب ترکیب سوجھی ہے۔ وہ زندہ انسانوں کو توپوں کے منہ پر باندھ کر ان کے پرخچے اُڑا دیتے ہیں۔ خون کی بارش ہوتی ہے، انسانی گوشت اور انتڑیوں کے لرزتے ہوئے ٹکڑے تماشائیوں پر برستے ہیں۔ اس کام میں تو انہوں نے نیرو کو بھی مات کر دیا ہے۔ یہ اُس انسانی جسم کی تباہی ہے جسے اہلِ گرجا کے قول کے مطابق خدا تعالیٰ نے اپنا مشابہہ بنایا۔''

31-اکتوبر کو اُس نے مظالم کے سوال پر پھر بحث کرتے ہوئے کہا: ''باغی غدر کے آغاز سے انجام تک اپنے طرزِ عمل میں عین اپنے مہذب حکمرانوں کے نقشِ قدم پر چلے۔''

14- نومبر کو اس نے ''ہندو سپاہ کی بہادری اور جانبازی کی دوبارہ داد دی۔'' 21- نومبر کو اس نے تنبیہہ کی کہ ''خونریزی کا نتیجہ خونریزی اور ظلم کا نتیجہ ظلم ہے۔'' 5- دسمبر کو اس نے اپنے قارئین کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہندوؤں کی کامرانی کی امید ترک کرنے کی کوئی وجہ نہیں لیکن اب برطانوی شہنشاہیت پر کامیاب ضرب کی توقع ماند پڑنے لگی۔ اب بغاوت کا ذکر پہلے کی نسبت کم ہونے لگا۔ 3- اپریل 1858ء کو اس نے ''ہندوستانی قوم پرستی اور برطانوی جارحیت کے درمیان آخری جدوجہد'' کا ذکر کیا لیکن 10- اپریل کو اس نے جو اشارہ ہندو بھائیوں کی کامیابی کی امید کی طرف کیا اُس کا تعلق فوری امکان سے نہ تھا بلکہ مستقبل کے امکان سے۔ اس نے لکھا: ''وہ وقت زیادہ دور نہیں جب ہندوستان کی عظمت کی ترقی برطانوی حکومت کی غلامی سے اس کی آزادی اور کامل خودمختری کے عین مطابق ہوگی۔'' یکم مئی کو اس نے اعلان کیا کہ ''بغاوت کا نتیجہ خواہ کچھ ہو ہندوستان انگلستان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔'' 8- مئی کو اس نے لکھا کہ اگر ہم دوبارہ ہندوستان کو فتح کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس قدر صلح جوئی سے کام لینا ہوگا جس قدر جنگ جوئی سے لوگ ماضی کو یاد رکھتے ہیں اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے وہ مستقبل سے ڈرتے ہیں۔ اُنہیں یاد ہے کہ ہم نے اُنہیں زمینوں سے جبراً محروم کیا۔ انہیں یاد ہے کہ زمین کے مالکانِ مطلق کی جاگیریں ضبط کرلی گئیں اور اُنہیں وہی زمینیں ہم سے پٹہ پر لینے پر مجبور کیا گیا جو زمانہ قدیم سے معمولی لگان پر ان کی ملکیت تھیں۔ اُنہیں یہ بھی یاد ہے کہ اُن کی زمینوں پر اس قدر ٹیکس لگائے گئے جو وہ ادا کرنے کے قابل نہ تھے۔ پھر وہ اپنے زرعی آلات گرو رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد سختی سے وصول کرنے والی برطانوی سرکار و واجب الادا رقم ادا کرنے کے لئے انہیں بیجوں کا غلّہ فروخت کرنا پڑا جس سے وہ بھکاری بن گئے۔ اُنہیں یاد ہے کہ جب کاشتکاری ناممکن ہوگئی تو اُنہوں نے کھیتوں سے دست بردار ہونا چاہا کیوں کہ وہ کھیتی باڑی کے قابل نہیں تھے لیکن دراصل اُنہیں اس زمین کا ٹیکس بھی ادا کرنے پر مجبور کیا گیا جس میں انہوں نے کبھی بھی کاشت نہ کی تھی۔ انہیں یاد ہے کہ جب وہ اپنے دوستوں سے قرض لینے میں ناکام رہتے تو کس طرح انہیں اذیت دی جاتی۔ کس طرح انہیں دن کی جھلسنے والی گرمی میں پاؤں کے

تلووں سے لٹکایا جاتا یا ٹانگوں کے ساتھ پتھر باندھ کر انہیں سر کے بالوں سے لٹکایا جاتا۔ کس طرح اُن کے ناخنوں کے اندر تیز لکڑی کی پچریں ٹھونکی جاتیں۔ کس طرح باپ بیٹے کو اکٹھا باندھ دیا جاتا اور ایک ساتھ انہیں کوڑے لگائے جاتے تاکہ ایک کی اذیت سے دوسرے کا درد بڑھے۔ کس طرح عورتوں کو چابک سے پیٹا جاتا اور ان کے پستانوں سے بچھو باندھ دیئے جاتے۔ کس طرح اُن کی آنکھوں میں سُرخ مرچیں ٹھونسی جاتیں، یہ سب چیزیں انہیں یاد ہیں۔ اور یہ مدراس کی عرضداشت، کمشنروں کی سرکاری رپورٹوں اور برطانوی پارلیمنٹ میں ثابت ہو چکی ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں بھولے کہ کس طرح پولیس ان کے پیچھے لگا دی گئی۔ اس کی تنخواہ اس قدر قلیل تھی کہ وہ لوٹ مار سے اپنا گزارہ کرتی۔ ان قانون کے محافظوں کو چور بننے پر مجبور کیا گیا اور پھر برطانوی سرکار اس نظام سے چشم پوشی کرتی۔'' 12- جون کو اس نے لکھا: ''ہمدردی کی سنہری کڑی ٹوٹ گئی ہے۔ ایسی خلیج کو خون اور فولاد نہیں پاٹ سکتے جسے حکومت کی بدنظمی، ظلم اور جبر نے پیدا کیا ہے اور جو اتنی وسیع ہے جتنا انگلستان اور اُس کی سلطنت کے درمیان فاصلہ ہے۔'' 19- جون کو اس نے اپنے اس دعوے کو دہرایا کہ ''ساری قوم ہمارے خلاف ہے۔''

بغاوت کے آخری مرحلے کے دوران ''دی پیپلز پیپر'' کی مالی مشکلات بڑھتی گئیں۔ جون 1858ء میں اس اخبار نے دم توڑ دیا۔ اگرچہ کچھ دنوں کے لئے اس کی بجائے شائع ہونے والے اخبار ''لندن نیوز'' میں جونز کو پاؤں ٹیکنے کی جگہ مل گئی لیکن اس اخبار کو ہمیشہ مشکلات کا سامنا رہا۔ اس کا لہجہ کم جنگجویانہ ہو گیا اور جلد بند ہو گیا۔ البتہ اس میں جونز کے کچھ مضامین ہندوستانی لوگوں کی حمایت میں شائع ہوتے رہے۔ اس کا آخری مضمون 15- اگست 1858ء کو شائع ہوا جب اس نے انڈیا بل کے تحت ہندوستان کی نئی صورتِ حال پر بحث کی۔ اس بل کی رو سے اُنتظامِ حکومت کی ذمہ داری کمپنی سے پارلیمنٹ کو منتقل ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ پہلے ہندوستان اور رائے عامہ کے مابین کمپنی حائل تھی۔ ''اب کم از کم مفروضہ طور پر اور عملاً بھی سب کچھ بدل گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر رائے عامہ کو سوجھ بوجھ اور مستعدی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو ہندوستان کے معاملات میں پہلے کی نسبت یہ زیادہ موثر ہو سکتی ہے لیکن کیا ایسا ہو گا؟ کیا یہ عظیم قوم اس ذمہ داری کی وقعت کو سمجھے گی اور اس کی قدر کرے گی جو اس نے قبول کی ہے؟ اب محتاط مطالعے اور مستقل نگرانی کی ضرورت پڑے گی۔ پہلا قدم اس سفاکانہ اور اندھا دھند سختی کو روکنا تھا جو ہندوستانیوں پر روا رکھی جاتی تھی۔

بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اُن انگریز باشندوں کو روکنا چاہئے جو وہاں آباد نہیں ہوتے بلکہ صرف اس لئے جاتے ہیں کہ غریب لوگوں سے جو کچھ ممکن ہو اینٹھ لیں۔''

جونز نے نہ صرف مضامین لکھے بلکہ جلسوں سے بھی خطاب کیا۔ 12-اگست 1857ء کو اس نے ''اتنے بھاری جلسے میں تقریر کی کہ شاید ہی کبھی سینٹ جارج ہال، لندن میں منعقد ہوا ہو۔'' (55) دسمبر میں اس نے سینٹ مارٹن ہال میں تقریر کی۔ اس نے کہا: ''ایک لمحہ کے لئے بھی آپ یہ سمجھیں کہ میں اس طریق کو تسلیم کرتا ہوں جس سے ہندوستان کی حکومت حاصل کی گئی یا اُن ہتھکنڈوں کو جن سے اسے قائم رکھا گیا۔ میں اُسے ایک مہذب ملک کی تاریخ میں شروع سے آخر تک ایک قبیح ترین جرم تصور کرتا ہوں۔'' (56) جنوری 1858ء میں اس نے لندن ٹیورن میں منعقدہ ایک جلسے میں تقریر کی جہاں لوگوں نے پُرانے چارٹسٹ جان فراسٹ کی تقریر سننے سے انکار کر دیا۔ اس (جونز) نے کہا: ''اگر وہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے اختیارات چھین کر سرکار برطانیہ کے حوالے کریں گے تو وہ یہ اختیارات بدتر افراد کے ہاتھوں کے سپرد کریں گے۔'' (57) اس نے اپریل 1858ء میں برمنگھم میں بھی تقریر کی۔ (58) کوپن ہیگن فیلڈز یعنی مقام موجودہ سمتھ فیلڈ میٹ مارکیٹ میں کھلے جلسے منعقد ہوئے جن سے متعلق ایک یادداشت میں قلمبند ہے۔ ''میں لندن کے ایک دور دراز حصے سے چل کر گلیوں میں میلوں کی مسافت طے کرتا ہوا اس کی تقریر سُننے وہاں پہنچا۔ یہ ہندوستانی غدر کے دنوں کا واقعہ تھا۔ پُرانا جوش اور پُرانی فضا اب بھی نمایاں تھی۔ لیکن اس کا چہرہ پژمردہ اور کپڑے تار تار تھے جن سے اس کا رنج والم ظاہر تھا۔ پھٹا پُرانا کوٹ گلے تک بٹنوں سے بند اس کی مفلسی کا پردہ دار تھا۔ وہ ایک کھوئے ہوئے مقصد کے ساتھ اپنی وفادارانہ وابستگی ... اس ناداری کی نوبت کو پہنچا تھا۔'' (59)

یہ بازی ہاری ہوئی نہیں تھی، ہار صرف عارضی تھی۔ برطانوی مزدور طبقے کو اپنے اُن آقاؤں کے ساتھ تعاون کے ایک دور سے گزرنا تھا اور ان کے دستر خوان پر آراستہ لذیذ اور نفیس کھانوں کے گرے ہوئے ٹکڑوں کو چننا تھا جنھوں نے آدھی دنیا کو لوٹا تھا۔ ہندوستانیوں کو آزادی حاصل کرنے سے پہلے غیر ملکی غلامی کے سو سال گزارنے تھے۔ بغاوت کی صد سالہ یادگار کے اس سال اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ اس اذیت اور شکست کی گھڑی میں برطانوی مزدور طبقے کی آواز خاموش نہیں تھی۔

حواشی

1- اندراج، یکم مئی 1857ء

2- 2-دسمبر 1857ء

3- 7-اکتوبر 1857ء

4- 8-اکتوبر 1857ء

5- جان مارلے: ''لائف آف کابڈن'' جلد دوم، صفحہ 205، ایش ورتھ کے نام خط مورخہ 16-اکتوبر 1857ء

6- چارلس کنگسلے: ''ہز لیٹرز اینڈ میمائر آف ہز لائف'' مرتبہ بیوی، جلد دوم صفحات 35-34 کنگسلے سے مارس کے نام، 3- ستمبر 1857ء

7- 21- ستمبر 1857ء

8- ایضاً

9- ایف۔ڈی۔مارس: ''دی انڈین کرائسس'': پانچ وعظ صفحہ 10

10- جے۔ایم۔لڈلو: ''تھاٹس آن دی پالیسی آف دی کراؤن ٹوورڈس انڈیا'' 1859ء صفحہ VIII

11- مارلے: بحوالہ تصنیف

12- ایس بیکوبائی: ''انگلش ریڈیکلوم'' جلد دوم صفحہ 366

13- 23-اگست 1857ء

14- 7-اکتوبر 1857ء

15- 9-اکتوبر 1857ء

16- 16- ستمبر 1857ء

17- ''گرینول ڈائری'' مرتبہ فلپ وٹ ویل ولسن، جلد دوم، صفحہ 563

18- ومبورن: 30-اکتوبر 1857ء

19- ''دی ٹائمز''، 7-جنوری 1857ء، 4-فروری 1858ء

20- ڈیرک ہڈسن: ''مارٹن ٹپّر''، ''ہز رائز اینڈ فال'' صفحہ 185

21- ایضاً: صفحہ 186 شیفٹس بری سے ٹپّر کے نام، 10-نومبر 1857ء

22- مارلے: بحوالہ تصنیف صفحہ 308

23- جی۔ایم۔ٹریویلین: ''لائف آف جان برائٹ'' صفحہ 261

24- ایف۔ڈی۔مارس: بحوالہ تصنیف صفحہ 11

25- ''ہاؤس آف کامنز'' 27-جولائی 1857ء

26- 29-جنوری 1858ء

27- 4-فروری 1858ء

28- 6-اگست 1857ء

29- 29-ستمبر، 5-اکتوبر، 7-اکتوبر 1857ء

30- 6-اکتوبر 1857ء

31- 8-اکتوبر 1857ء

32- 5-ستمبر 1857ء

33- 17-جولائی، 7-اگست، 23-اکتوبر 1857ء

34- 27-جون، 30-جون، 27-جولائی 1857ء

35- ''دی ٹائمز'' 2-نومبر 1857ء

36- پینز تھ: 29-اکتوبر 1857ء

37- ''ویکلی ڈسپیچ'' 23-اگست 1857ء

38- 29-جون 1857ء

39- یکم جولائی 1857ء

40- 20-نومبر 1857ء

41- ''ویکلی ڈسپیچ'' 26-جولائی 1857ء

42- ''ہاؤس آف کامنز''27- جولائی 1857ء

43- ملکہ وکٹوریہ سے بنام کنگ لیپلڈ،2- ستمبر 1857ء

44- ملکہ وکٹوریہ سے بنام لارڈ پان میور،29- جون 1857ء

45- لارڈ کیننگ سے بنام ملکہ وکٹوریہ،4- جولائی 1857ء

46- پرنس البرٹ سے بنام پرنس ولیم آف پرشیا،26- جولائی 1857ء

47- ''دی ٹائمز''19- اگست 1857ء

48- ''لنڈن کامن ویل'' یکم مارچ 1857ء

49- 26- جولائی 1857ء

50- 6- دسمبر 1857ء

51- 11- اکتوبر 1857ء

52- ایضاً

53- ملاحظہ فرمائیں ''ارنسٹ جونز: چارنسٹ'' انتخاب تحاریر و تقاریر جونز مع تعارف و حواشی۔ مرتبہ جان سیول۔

54- ''پیپلز پیپر''7-،14-،21-،28- مئی،11-،18- جون،2- جولائی 1857ء

55- ایضاً:15- اگست 1857

56- ایضاً:19- دسمبر 1857ء

57- ایضاً:23- جنوری 1857ء

58- ایضاً:10- اپریل 1858ء

59- ڈبلیو۔ای۔ایڈمس: ''میمائرز'' جلد دوم صفحہ 230۔ منقول تصنیف سیول۔

❁❁❁❁❁

اٹلی میں 1857ء کی صدائے بازگشت

للیانا ڈل نوگارے

1857ء کی بغاوت سے متعلق اہلِ اٹلی کی رائے اور اُن کے تبصروں کو صحیح پس منظر میں پیش کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اٹلی میں اُس وقت کی صورتِ حال کے بارے میں چند باتیں پہلے عرض کر دیں۔

1857ء میں اٹلی ایک متحد اور آزاد قوم کی حیثیت میں نئی بیداری کے انتہائی نازک مرحلے سے گزر رہا تھا۔ یہ ابھی متحد نہیں ہوا تھا اور کئی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ اعتدال پسند جماعت اٹلی کی دو نبرد آزما تنظیموں میں سے ایک تنظیم تھی۔ یہ اٹلی کی آزادی اور اتحاد کی قومی تمناؤں کی ترجمان تھی اور وہاں کے متوسط طبقہ اور دولتمند طبقہ کی نمائندہ تھی۔ البتہ وہ کاریگروں، مزدوروں اور کسانوں کی سماجی آرزوؤں سے خائف تھے۔ اس لئے وہ عوامی جدوجہد میں حصہ لینے سے حتی الامکان اجتناب کرتے تھے۔ چنانچہ اعتدال پسند قومی مقاصد کے لئے کام کر رہے تھے لیکن کسی قومی اور عوامی انقلاب کے ذریعے سے نہیں بلکہ فرانس اور آسٹریا کے درمیان بڑھتے ہوئے تصادم سے فائدہ اٹھانے کی سیاسی چال کے ذریعے سے۔ اعتدال پسند اس امداد کے احتمال پر بھروسہ رکھتے تھے جو پیڈمانٹ (شمال مغربی اٹلی) انگلستان سے حاصل کر سکتا تھا۔ انگلستان بحیرۂ روم کے وسط میں ایک ایسی ریاست چاہتا تھا جو برطانیہ کی حامی، آسٹریا اور روس کی مخالف ہو۔ شمالی اٹلی میں آسٹریا کے ساحل پر ایک وسیع تر پیڈمانٹ اس منصوبے کے عین مطابق تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ کاؤنٹ کیووؔز جو اعتدال پسند پالیسی کا بانی تھا، انگلستان پر اعتماد رکھتا تھا۔

اس کے برعکس جمہوریت پسند عام طور پر جوسف میزنؔی کے عقیدوں اور نقطۂ نظر کی تقلید

کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ قومی نصب العین کو لوگوں کے اشتراکِ عمل کے ذریعہ حاصل کرنا چاہئے۔ (یہ یاد رکھنا چاہئے کہ میزنی کے لئے لفظ "لوگ" سے مراد صرف شہری آبادی کے ادنیٰ طبقات تھے۔ جن لوگوں کی دیہات میں کوئی زمین نہ تھی وہ اس زمرے میں شامل نہ تھے)۔(1)

جمہوری پروگرام میں بالخصوص عوامی رنگ پایا جاتا تھا اس لئے جمہوریت پسند اس بات کے مخالف تھے کہ پیڈمانٹ ایک ممتاز ریاست کی حیثیت حاصل کرے جب کہ اعتدال پسند اُسے یہ درجہ دیتے تھے۔ جمہوریت پسندوں کی یہ رائے تھی کہ متحدہ جدید اٹلی کی تشکیل عوام کی قومی اور انقلابی شورش کے ذریعے عمل میں آنی چاہئے نہ کہ سیاسی گٹھ جوڑ اور چال بازیوں سے۔

1857ء میں ہی اٹلی کے جمہوریت پسندوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ یہ سپری کی مہم کا سال تھا جب سماجی جمہوریت پسند کارلو پیسا کین نے جوسف میزنی کی شرکت میں ایک انقلابی تحریک شروع کی تا کہ جنوب(2) کے لوگوں کو رجعت پسند بوربان سرکار کے خلاف اُکسایا جائے۔ اور جنوب سے اتحاد کی تحریک کا آغاز کیا جائے۔ اس کوشش کی ناکامی اور اس بحران سے جو اس نے جمہوری تحریک میں پیدا کیا، اعتدال پسندی کے رجحان کو تقویت ملی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیڈمانٹ کی شخصی حکومت نے فرانس کے نپولین سوم کی مدد سے آسٹریا کو شکست دی۔ اس طرح اتحاد کا وہ عمل شروع ہوا جو 1860ء میں جوسف گیری بالڈی کی "یک ہزاری" مہم سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

ان حالات میں اعتدال پسندوں نے علانیہ برطانیہ کی حمایت کا رویّہ اختیار کیا۔ ان کی نگاہ میں برطانوی پارلیمنٹری سسٹم ایک ایسا نمونہ تھا جس پر اٹلی کے سیاسی اداروں کو تعمیر ہونا تھا آسٹریا کے اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنے کے لئے انگریزوں کی امداد بھی ضروری سمجھی گئی۔ برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام کی تقویت کو ایک قطعی مصلحت تصور کیا گیا جو اٹلی کی سیاست کے لئے سازگار تھی۔

اس کے برعکس جمہوریت پسندوں میں اگرچہ برطانوی پارلیمنٹری نظام کو قبولیت(3) کی نگاہ سے دیکھا گیا، انگریزوں کی نوآبادیاتی پالیسی کی مخالفت اور نکتہ چینی کا عام احساس پایا جاتا تھا۔ اس پالیسی کی بنیاد ظلم اور لوٹ کھسوٹ پر تھی۔ جمہوریت پسندوں کی نگاہ میں جو قومی آزادی کے اصول کو سب سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے، نوآبادیاتی نظام ان عقائد کے منافی تھا کیوں کہ اس کی بہت سی خصوصیات اٹلی میں آسٹریا کی قومی جبر و ستم کی پالیسی سے ملتی جلتی تھیں۔

ان جمہوری حلقوں میں ہندوستان کی قومی تمناؤں کے لئے ہمدردی پائی جاتی تھی۔ ''لا اِنڈیا اینٹکا اے ماڈرنا'' (انڈیا، قدیم و جدید) (4) کا مصنف کارلو کیٹینیو اٹلی میں ہم عصر جمہوری اندازِ فکر کا نہایت مسلم الثبوت نمائندہ تھا۔ اپنے عالمانہ اور پُر جوش مقالے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی لوٹ کھسوٹ اور اس کے اخلاقِ قبیحہ کے پرچار کی مذمت کرنے کے بعد کیٹینیو نے بہادر اور سمجھ دار ہندوستانیوں کی آنے والی آزادی کی صاف صاف پیش گوئی کی۔ اس نے لکھا: ''واقعات کی اندھا دھند قوت ظالموں کی خواہشات کے خلاف خیال اور عمل کا الگ راستہ تیار کر سکتی ہے۔ ہندوستان میں آزادی کے بیج جڑ پکڑ چکے ہیں تا کہ محکوم برہمن حاکم بن جائے اور اپنے آقا کو غلام کا درجہ دے۔'' (5)

چند سال بعد فلکس آرسینی نے ان لوگوں پر نکتہ چینی کی جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ اٹلی کے قومی نصب العین کے حصول کے لئے انگلستان پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ وہ ایک مشہور جمہوریت پسند تھا جو نپولین سوم کی زندگی پر قاتلانہ حملہ کا ارادہ رکھتا تھا۔ اُس نے انقلاب پسند نکولا فابریزی کے نام ایک خط میں لکھا: ''لوگ مثال کے طور پر انگلستان کے آزادی اور خود مختاری کے خیالات کا پرچار کرتے ہیں یہ سراسر فریب ہے! جب تک یہ خیالات اس کے اپنے مفاد سے مطابقت رکھتے ہیں، وہ ان کا قائل ہے لیکن جونہی اس کی کوئی غرض باقی نہیں رہتی، ان خیالات میں اس کی دل چسپی زائل ہو جاتی ہے۔ کیا آپ دوسری قوموں کی فیاضی کا ثبوت چاہتے ہیں؟ کارسیکا، مالٹا اور یونانی جزائر میں بغاوت کر کے دیکھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ فرانسیسی اور انگریز مطلق کوئی خطرہ مول نہ لیں گے اور فوراً گولی چلا دیں گے۔ وہ وہی کچھ کریں گے جو ہیناؤ نے ہنگری میں کیا۔ وہ لوگوں کو پھانسی دیں گے۔'' (6)

اس قسم کی بہت سی شہادتوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں ایک اور جمہوریت پسند اینٹونیو مارٹیناٹی کی رائے کا ذکر کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ وہ میزنی کا پیرو تھا۔ اس نے اپنے مقالہ ''رسپوسٹا آل پروگراما دی ان پارٹیٹو نیشنیل'' (جواب پروگرام نیشنل پارٹی) میں لکھا (7): ''کیا ہم یورپ کی سیاسی حکمتِ عملی کا ذکر کر رہے ہیں؟ مجھے اس سے کافی واسطہ پڑ چکا ہے۔ صاف صاف اور ایمانداری کے ساتھ بات کرو۔ آپ انگلستان کا ذکر کرتے ہیں۔ کیا اس کی پیش کش خلوص اور صدق دل پر مبنی ہوگی؟ کیا ہمارے حقوق اور اس کے مفادات میں مطابقت ہے؟ اُسے کہو کہ یونانی جزائر سے ذرا

10- بغاوتِ ہند کے حق میں اعتدال پسندوں کے مختلف وطیروں کے لئے ملاحظہ فرمائیں: ''دی گزیٹا پیڈ مانٹیز'' ٹیورن، 1857ء جا بجا، اور ''گزیٹا دی جنیووا'' جنیووا، 1857ء، جا بجا۔

11- ''سِو لیٹا کیتھولیکا'' روم، 27- جون 1857ء۔

12- ''اٹیلیا ڈیل پو پولو'' جنیووا، ایک اور اہم حامی میزنی روزانہ اخبار ''اٹیلیا اے پو پولو'' (اٹلی اور اہلِ اٹلی) کے سلسلے کی ایک ہی کڑی تھی جس نے محکمہ خزانہ کی تعذیب کے نتیجے کے طور پر چند ماہ پیشتر اپنی اشاعت بند کر دی تھی۔

13- ''اٹیلیا ڈیل پو پولو'' 8- جولائی 1857ء۔

14- ایضاً: 22-17- اگست مضمون بعنوان ''لا انڈیا اے لو یورپا''۔

15- ایضاً: 15- ستمبر 1857ء: ''لیٹر پار یجن ڈیلا سا ئنا اے ڈیلا اِنڈی''۔

16- ''لا ریژن'' ٹیورن، 15- اگست 1857ء۔

❁❁❁❁❁

ہم عصر فرانسیسی پریس

چارلس فورنیں

1857ء کی بغاوت کے بارے میں فرانسیسی عوام کے تاثرات کو قلمبند کرنا کوئی سہل کام نہیں۔ اولاً یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اُس وقت فرانس ایک تحکمانہ شہنشاہی حکومت کے تحت تھا۔ لوگوں کو پبلک جلسے منعقد کرنے کا حق حاصل نہ تھا۔ پریس پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا جس میں بعض مختلف سیاسی خیالات کے جمہوری رسائل بھی تھے لیکن اُن میں سے کوئی بھی مزدور طبقے کے نظریات کا ترجمان نہ تھا، دوسرے ہندوستان سے بہت کم خبریں آتی تھیں اور جو خبریں آتی بھی تھیں وہ یا تو برطانوی ذرائع سے یا ہندوستان میں مقیم فرانسیسی آبادکاروں سے۔ یہ بھی واقعات کی تازہ خبریں نہ ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر مئی کی بغاوت کی خبریں فرانسیسی اخباروں میں صرف جون کے آخر میں شائع ہوئیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ ہندوستان سے متعلق فرانسیسیوں کا علم بہت محدود تھا۔ اُس وقت فرانس میں ہندوستان پر چند ایک کے سوا جو مقالات شائع ہوتے تھے، اُن میں ہندوستان کی دولت، اس کے دیوتاؤں اور اس کی ایشیائی ذہنیت وغیرہ کے متعلق پرانی روایتی داستانوں کا اعادہ ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسی علما ہندوستان کو اپنے برطانوی ساتھیوں کا مخصوص دائرۂ اختیار سمجھتے تھے۔ کم از کم نیشنل لائبریری کے ایشیا سے متعلق شعبے اور ''دی ریویو آن ہسٹارک کوائسچن'' (The Review on Historic Questions) کے مضامین کی تحقیق سے ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ ہندوستان سے متعلق کتابوں کی قابلِ ذکر تعداد صرف بیسویں صدی کے اوائل میں شائع ہونا شروع ہوئی۔

البتہ فرانسیسی پریس نے 1857ء کی بغاوت پر کافی توجہ دی۔ مثال کے طور پر ایک آزاد

خیال رسالہ ''لاسیسل'' (Le Siecle) نے 9- ستمبر 1857ء کو لکھا: ''ہندوستان کی بغاوت اس وقت کا واحد اہم واقعہ ہے۔''

اختلافات کے باوجود فرانسیسی اخبارات بعض نکات پر متفق الرائے تھے، مثلاً برطانوی جبر و تشدد کی بے رحمی کی مذمت کے بارے میں۔

''لاسیسل'' نے جس پر انگریز کا حامی ہونے کا الزام تھا۔ 17- نومبر 1857ء کو لکھا: ''بد قسمتی سے اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے کہ دہلی پر قبضہ کے بعد ہولناک کشت وخوں ہوا۔ ہمیں ان وحشیانہ اعمال کی مذمت کرنے میں کوئی تامل نہیں جو سپاہیوں کے کسی بھی جرم کی بنا پر حق بجانب نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔'' ایک عوامی اخبار ''لیس تافیت'' نے 29- اگست 1857ء کو غیظ و غضب کے ساتھ اعلان کیا: ''اگر انگریز جبر و ستم کی پالیسی پر مُصر رہیں گے تو بڑی طاقتوں بالخصوص فرانس کو مداخلت کرنے پڑے گی کہ ہندوستان کے لوگوں کو مویشیوں کے ایک حقیر گلّے کی طرح ذبح نہ کیا جائے۔''

فرانسیسی اخبارات نے اتفاقِ رائے سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بداعمالیوں اور برطانوی آبادکاروں کے اُن طور طریقوں کی بھی مذمت کی جو اُن کے خیال میں بغاوت کے ذمہ دار تھے۔ مصلحت اندیش ''ریوودادا کس ماندے'' نے لکھا ''کمپنی کو غلامی کے جوئے کو ڈھیلا کرنے کی مطلق فکر نہیں۔ بالخصوص پچھلے دس سالوں میں اس نے بہت ہی بڑے پیمانے پر الحاقات، بے دخلیوں اور ضبطیوں کا دور چلایا ہے۔ اُس نے بندوبست آراضی کا طریقہ بدل دیا ہے اور تمام رسمی معاہدوں کو ناکارہ کر دیا ہے۔'' ''لیس تافیت'' نے اور بھی زیادہ زور کے ساتھ لکھا: ''کیا ہندوستان قابلِ نفرت انگریزی غلبہ کے تحت ایک نو آبادی ہے؟ نہیں، انگریزوں نے اُسے ایک بہت بڑا قید خانہ بنا دیا ہے جہاں جا بہ جا پھانسیوں اور سولیوں کے تختے نصب کئے گئے ہیں۔'' فانویل خاص طور پر برطانوی مشنریوں کے ہندوستان کو عیسائی بنانے کے جوش کی مذمت کرتا ہے اور کہتا ہے: ''انگلستان میں اب لوگوں پر یہ حقیقت آشکار ہونے لگی ہے کہ مشنریوں کی ناعاقبت اندیشی بہت حد تک اشتعال کا سبب ہے۔''

فرانسیسی اخبارات نے عام طور پر اس خیال کو پھیلایا کہ برطانیہ کو بغاوت سے سخت دھکا لگا ہے اور اس سے اُس کو کافی اخلاقی اور مادی نقصان پہنچے گا۔ مثلاً ''لا یونین'' کی رائے: ''برطانیہ

عظمیٰ نے پچھلے پچاس برسوں میں عالمی معاملات میں جو اعلیٰ پارٹ ادا کیا ہے اس میں لازمی طور پر کمی آئے گی۔''''جانکوی ایرا آنتا ایل'' نے ''ریوودا پاری'' میں اس تصویر کے نقوش کو اور نمایاں کیا: ''قسطنطنیہ میں برطانوی اثر ورسوخ کم ہو رہا ہے۔ سویز میں اس کے سر پر خطرہ منڈلا رہا ہے۔ ایران میں ایک مسلح امن کی سی صورت ہے جس سے جنگ کا خطرہ درپیش ہے۔ چین میں یہ مطعون وملعون ہے۔ ہندوستان میں یہ ڈگمگا رہی ہے۔ اور ٹرکی بغلیں بجا رہا ہے۔ تمام مشرق میں انگلستان کا وقار خاک میں مل رہا ہے۔''

برطانیہ کے ساتھ معاشی اور نسلی یک جہتی پر زور دینے کے علاوہ فرانسیسی متوسط طبقے کی رائے کو ظاہر کرنے والے اُن تمام مختلف اخبارات کا یہ خیال تھا کہ ہندوستانی حکومت خود اختیاری کے قابل نہیں ہیں اس لئے اُن کی بہبودی اس میں ہے کہ وہ غیر ملکی سرپرستی میں رہیں۔

یک جہتی کا یہ رویہ بغاوتِ ہند کے انگریز مظلوموں کے لئے چندہ جمع کرنے کی سرکاری مہم میں ظاہر ہوا۔ یہ مہم ناظم پولیس کی سرپرستی میں مانتالامبر کی اس نظم سے شروع ہوئی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدح میں لکھی گئی تھی۔ اس کے علاوہ لا پاتی نے ستمبر 1857ء میں لکھا: ''ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے خاتمے کا مطلب ہو گا تہذیب پر وحشت کی فتح۔'' 9-اکتوبر کو ''جنرل دادی بیت'' نے اس امید کا اظہار کیا کہ (سراسر تہذیب کے مفاد میں) ''اس خوفناک بحران میں برطانیہ عظمیٰ کو فتح حاصل ہو گی۔''

اُن قدامت پسند اخبارات نے برطانیہ پر جس نکتہ چینی کا اظہار کیا وہ باغی سپاہیوں کے ساتھ ہمدردی کا نتیجہ نہ تھی۔ یہ نکتہ چینی کچھ تو فرانسیسی رائے کی عکاسی تھی جو انگلستان کے ساتھ ہمدردی پر مبنی نہیں تھی۔ 2-اکتوبر 1857ء کو ''جنرل دادی بیت'' نے اس نامعقولیت کا ذکر کیا جو اس وقت بظاہر انگلستان سے منسوب تھی۔ اس کے علاوہ انگلستان کے خلاف کچھ کینہ بھی تھا جس کا اظہار ڈپلے سے متعلق گفتگو میں ہوتا تھا اور اُس وقت اس کا عام چرچا تھا۔ اور پھر اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس وقت فرانس کے قبضے میں صرف ایک بڑی نو آبادی (الجیریا) تھی، فرانسیسی اخباروں کے لئے آبادکاری کی بالعموم مذمت کرنا آسان تر تھا۔

البتہ سرکاری اخبارات عام طور پر انگلستان کے ساتھ اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے بیتاب تھے۔ ''پری و دست پیرادول'' نے 9-نومبر 1857ء کو ''جنرل دادی بیت'' میں لکھا: ''انگلستان

ہمارا ساتھی ہے۔ اتحاد کے ٹوٹ جانے کا خطرہ مول لے کر ہمیں انگلستان کی مشکلات سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیئے۔'' حریت پسند اخبارات میں نوآبادیاتی لوگوں کے حق میں سرپرستانہ انسان دوستی کے دعوے موجود تھے۔ ان لوگوں کو ''ادنیٰ درجے کے بھائی'' تصور کیا جاتا تھا۔ موروثی بادشاہت کے حامی کیتھولک اخبارات ہندوستانیوں کے لئے کوئی ہمدردی نہ رکھتے تھے لیکن 1857ء کی بغاوت کو پروٹسٹنٹ انگلینڈ پر ایک زبردست چوٹ سمجھتے تھے۔

اعتدال پسند یا رجعت پسند اخبارات کے مقابلے میں فرانسیسی جمہوریت پرست بغاوت سے پہلے اور باغیوں کی سرکوبی کے دوران انگریزوں کے جرائم کی زیادہ جوش کے ساتھ مذمت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اعتدال پسند جرائد سنجیدگی کے ساتھ برطانیہ کے اس من گھڑت قصے پر باور کرتے تھے کہ بغاوت کی تہہ میں روسی ایجنٹوں کا ہاتھ ہے۔ اس کے برعکس ''ریو دی پاری'' یا ''لیس تافیت'' کے جمہوریت پسندوں نے یہ رائے ظاہر کی۔ ''اس امر کی تصدیق ہو چکی ہے کہ مذہب کا سوال تو محض ایک بہانہ تھا۔ اصلی سبب قوم پرستی کے عام جذبہ کی ازسرنو بیداری ہے۔'' (3-اکتوبر 1857ء)

''جنرل دادی بیت'' کے خلاف بحث کرتے ہوئے اسی جریدہ نے لکھا: ''اب سوال یہ نہیں ہے کہ آیا تمام ہندوستانی کم وبیش مہذب یا کم وبیش متحد ہیں یا نہیں، بلکہ سوال یہ ہے کہ آیا گذشتہ بغاوت کمپنی کی زیادتیوں کا ردِّعمل تھی یا واقعی ایک قومی بغاوت۔''

''لاسیسل'' پر نکتہ چینی کرتے ہوئے جس کا یہ دعویٰ تھا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہندوستانی آپس میں لڑنا شروع کر دیں گے ''لیس تافیت'' نے یہ دندان شکن جواب دیا: ''یہ ہندوستانیوں کا اپنا کام ہے۔ بہرحال یہ حیرت کا مقام ہے کہ ایک جمہوریت پسند جریدہ غیر ملکی حکومت کے گُن گائے۔''

اس کے علاوہ اس ٹھوس اصولی نظریہ کا مدار دوسرے اخبارات کی نسبت ہندوستان کے تاریخی حقائق، بالخصوص برطانوی شہنشاہیت پرستی کے زیادہ سنجیدہ علم پر تھا۔ مثال کے طور پر مذکورہ ذیل سطور ملاحظہ فرمائیں: ''انگلستان کو دولت چاہیئے۔ برطانیہ نے جس لئے اور جس طرح فتوحات حاصل کیں اس کی یہ وجہ ہے۔ اسی لئے الحاقات جن سے ہندوستان کے دل کو ٹھیس لگی، ایران کے ساتھ انگریزوں کی جنگ کا موجب ہوئے۔ اسی لئے ہندوستان کی پیداوار

جہاں بعض صوبوں میں پوست کے کھیت بکثرت موجود ہیں، انگلستان کا چین کے ساتھ رابطہ پیدا کرتی ہے۔ یہ ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ کون سے رابطے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اینگلو انڈین سلطنت پر متواتر حملے انگلستان کو روسی سلطنت کے روبرو لا کھڑا کرتے ہیں۔ (ایچ دا جانکوی ایرا آنتونیل،''ریوودا پاری''1857ء''ایفیئر دااِندی'')

اِسی انداز میں ''لیس تافیت'' اعتدال پسند جرائد کی اس خام خیالی کی مذمت کرتا ہے کہ سارے یورپ کا مفاد ہندوستان پر برطانوی حکومت کے قائم رہنے میں ہے۔''اگر ہندوستان برطانیہ کے ہاتھ سے نکل جائے تو کیا یہ دولت مند یورپ سے بچ جائے گا؟ اگر ہندوستانی آزادی حاصل کرلیں تو وہ یورپی طاقتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں دیر نہیں کریں گے۔ یہ یورپی ممالک سارے ساحل کے ساتھ ساتھ اپنی ایجنسیاں قائم کریں گے اور آسانی سے اندرونِ ملک کے ساتھ تجارتی تعلقات پیدا کرلیں گے۔ اس صورت میں اس پر کسی کا غلبہ نہ ہوگا اور ہندوستانی جس طرح مناسب سمجھیں گے خود حکومت کریں گے۔''

چنانچہ 1857ء کے جمہوریت پسند، برطانوی شہنشاہیت پرستی اور اس کی تباہ کاریوں کے خلاف ایک واضح مگر کسی قدر نادرست رائے کا پہلے ہی اظہار کر چکے تھے۔

اس ضمن میں فانوتیل اور ایل۔ لیگال کی تصنیف ''دی انڈین میوٹنی'' خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے دیباچے سے ایک طویل اقتباس یہاں نقل کئے جانے کے قابل ہے:

''ہندوستان میں تین مفاد تسلی چاہتے ہیں اور پاتے ہیں۔ کمپنی کا مفاد، عام تجارت کا مفاد، اور طبقہءامرا کا مفاد۔'' سوال یہ ہے کہ اس کے بعد تہذیب کے لئے کیا بچتا ہے۔

''کمپنی اپنی فتوحات کی وسعت سے پھولی نہ سمائی اور اُن پر قبضہ رکھنے کے مصارف سے تباہ ہوگئی۔ اس کے بچاؤ کی صرف ایک ہی صورت ہے یعنی ٹیکسوں کی وصولی۔ چوں کہ اس کی نگاہ میں تجوریوں کو بھرنے کے لئے دولت اینٹھنے کے تمام طریقے نیک اور جائز ہیں اس لئے انجام کار نفرت کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ اس نفرت سے باخبر ہے اس لئے وہ مجبوراً حماقت پر اُتر آتی ہے اور اسے اپنی حکومت کے تحفظ کی ضمانت سمجھتی ہے۔ اس سے کسی ترقی کی امید نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تہذیب ایک بُری اور لاحاصل چیز ہے۔''

''بہبودی کے نقطہءنظر سے تجارت بھی بے سود ہے۔ ہندوستان میں نقل پذیری بھی نہیں

جس سے دوسرے ملکوں کے ادنیٰ ترین کارندے بعض باہمی روابط سے مستفید ہوتے ہیں اوران روابط اور نئے تعلقات کے بڑھنے سے انہیں ایک قسم کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ آقاؤں کی تمام تر قوت ایک ایسی چیز کی پیداوار پر مرکوز ہوتی ہے جو ملک کے اندر نہ تو فروخت ہوتی ہے نہ اس کا تبادلہ ہوتا ہے اور نہ ہی صرف ہوتی ہے یعنی افیون جو چین سے برآمد کی گئی اشیاء کی قیمت کو متوازن رکھنے میں بے مثال کام انجام دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برطانیہ چین سے بہت زیادہ چائے اور ریشم خریدتا ہے جس کی ادائیگی بہ نسبت اس اتنے سوتی اوراونی مال اورلوہے کے سامان سے نہیں ہوسکتی جو وہاں کھپ سکتا ہے۔ برطانیہ بقیہ رقم نقد یا سونے چاندی کے ڈلوں کی صورت میں ادا نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے اس فرق کو پورا کرنے کے لئے ہندوستان کا پوست اس کے آڑے آتا ہے۔ دس کروڑ انسان اپنا دماغ شل کر کے اور اپنی تمام قوت صرف کر کے ایک ایسی چیز پیدا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو ایک اور دوسرے ملک کے دس کروڑ انسانوں کو مسموم کرتی ہے۔

''یہ ہے ہندوستان میں تہذیب کو سنوارنے والا برطانوی تجارت کا اخلاقی پہلو!''

''کمپنی بند ہونے والی ہے۔ اس کے شہری نظام اور فوج کے محکموں میں نادار کنبوں کو بہت سے عہدے مہیا کئے جاتے ہیں۔ بھاری مشاہروں سے اس کے شریف النفس ملازمین کو ان کے شایانِ شان مقام اور اکثر گنج بعد آورد بھی حاصل ہوتا ہے۔۔۔''

اسی طرح فقط فرانسیسی جمہوریت پسندی ہندوستان کی تحریک سے متعلق کچھ قابلِ اعتماد واقفیت بہم پہنچاتے ہیں۔

جانکوی ایرآنتونیل اس خیال کو اصرار کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ 1857ء میں ہندوستان میں جمہوری قوتیں موجود تھیں۔ وہ دراصل پنچائتیں تھیں۔ میونسپلٹی جو جاگیردارانہ نظام کے تحت قائم رہی ہے، مغلوں کے عہد کی میراث ہے اور انگریزوں نے اسے برقرار رکھا ہے۔ اس کی رائے کے مطابق یہی قوتیں باغیوں کی فتح کی امید دلاتی ہیں۔

کسی اور جگہ اسی مصنف نے ''لیس تافیت'' کے نام ایک خط میں لکھا:

''نوجوان فرانس اور نوجوان جرمنی کی طرح نوجوان ہندوستان بھی ہے۔ یہ نوجوان ہندوستان شہری اور سیاسی آزادی اور مذہبی رواداری میں اعتقاد رکھتا ہے۔ وہ اصول جن سے یہ نوجوان ہندوستان پیدا ہوا ہے، یورپ کی اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے اوائل کے اصول

ہیں۔اس زمانے کے ایک ہمعصر راجہ رام موہن رائے نے فلسفہ پرست انگلستان اور فلسفہ پرست اور انقلاب پسند فرانس کا سفر کیا۔وہ وہاں سے ایک ''ایمان'' لے کر لوٹا۔''

فانویل مذکورہ بالا کتاب کے دیباچے میں اس دینِ فطرت میں عقیدے کی خصوصیات پیش کرتا ہے:

''یہ میرا دین ہے، یہ میرے بھائیوں یعنی برہموسماج سوسائٹی کے اراکین کا دین ہے۔''

''یہ میرا دین ہے جس کی تعلیم ہمارے محترم گرواور بانیِ دین راجہ رام موہن رائے نے دی۔''

''آپ اسے عیسائیت کا نام دیں یا اسلام کا یا دینِ فطرت کا، مجھے نام کی کوئی پروانہیں۔''

پھر اسی مصنف نے (معلوم ہوتا ہے وہی ایک ہے) ستیا گرہ کے دستور کا ذکر کیا۔وہ بیان کرتا ہے کہ کس طرح احتجاج کے طور پر بغاوت سے پہلے تین لاکھ لوگ بنارس کے قریب جمع ہو گئے، انہوں نے کھانا پینا ترک کر دیا اور انگریزوں کو بددعائیں دیتے تھے۔ بالآخر وہ لکھتا ہے:

''ستیا گرہ کی اس مثال سے ظاہر ہے کہ ایسی سیرت کے لوگوں کی طرف سے سرگرم مزاحمت کس قسم کی ہوگی۔''

انجام کار فرانس کے جمہوریت پسند اخبارات نے باقی تمام اخبارات کے مقابلے میں نانا صاحب کی شخصیت کو خوب سراہا۔ ماہ ستمبر 1857ء کے دوران ''لیس تافیت'' نے کئی بار اُسے خراجِ تحسین ادا کیا: ''بغاوت کے اس راہنما میں تدبیرِ جنگ میں کمالِ مہارت کے ساتھ ساتھ جرأت اور ہمت بھی ہے۔نانا صاحب اپنی قوم کا بدلہ لینے والے کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔''

''باغیوں کا سرغنہ نانا صاحب جسے بعض لوگ ایک خونخوار درندہ قرار دیتے ہیں اور کئی اُسے کامل شریف انسان کا درجہ دیتے ہیں، ہماری رائے میں مذہب اور حبِّ وطن کے دہرے اثر کے تحت کام کر رہا تھا۔یہ انسانی سرگرمی کے دو بڑے محرک ہیں۔''

اس واضح نظریے سے جس کی تائید دوسرے فرانسیسی جرائد کی نسبت زیادہ واقفیت پر مبنی ہے۔جمہوریت پسند جرائد نے متناسب رویّہ اختیار کیا۔

انہوں نے باغیوں پر رکھے گئے مجرمانہ مظالم کے الزامات ردّ کر دیئے۔''سپاہیوں کا طرزِ عمل خواہ کتنا ہی سفاکانہ ہو، یہ فقط انگریزوں کے اس ظلم وستم کا شدید عکس ہے جو انہوں نے صدی کے بیشتر حصے کے دوران ڈھایا۔'' (ایضاً 20- ستمبر 1857ء)

انہوں نے جبر وتشدد میں انگریزوں کی مدد کے لئے فرانسیسی مداخلت کی اطلاعات پر سخت رویّہ اختیار کیا۔ بعض انتہا پسند اور رجعت پسند طبقات نے اعلان کیا تھا کہ فرانس کو مداخلت کرنی چاہیئے تاکہ صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر انگلستان سے تلافیِ مافات اور معاوضے کا مطالبہ کیا جائے۔ 25-اگست 1857ء کو ''لیس تافیت'' نے رجعت پسندوں کے اس واویلا کا یوں جواب دیا:

''اگر ہم تلافیِ مافات اور معاوضے کے امکان کو تسلیم بھی کر لیں تو پھر بھی ہم یہ نہیں سمجھتے کہ فرانس کس طرح اُن ہندوستانیوں کے خلاف انگلستان کی مدد کرے گا جو صرف اپنی قومی آزادی کے اصول کی خاطر باغی ہوئے ہیں۔''

لیکن قارئین کے خطوط میں اس سے کہیں زیادہ مطالبے تھے۔ ایک نے لکھا: ''ہندوستانیوں کے حق میں مداخلت کرو۔ جہازوں کے تمام دستوں کو سمندر میں ڈال دو۔ ہماری کوشش کو روس کی کوششوں کے ساتھ شامل کرو۔ ایشیا کے تمام لوگوں سے اپیل کرو، ان کو مسلح کرو، ان کو برطانوی ہندوستان کے خلاف جہاد کے لئے بھیجو۔ ظالموں کا تعاقب کر کے انہیں نکال دو۔ مغلِ اعظم کی سلطنت کو دوبارہ قائم کرو۔ صرف یہی پالیسی ہے جو درحقیقت فرانس کی شاندار روایات کے شایان ہے۔''

ایک اور نے ایشیا کی تحریکِ آزادی کا یوں خیر مقدم کیا:

''کون جانتا ہے کہ ہندوستان کے تمام لوگ انگریزوں کا تعاقب کر کے ان کو ملک سے نکالنے کے لئے بغاوت نہیں کریں گے؟ اگر ایسے امکانات تک نوبت آ جائے تو فرانس کو دریائے گنگا کے کناروں پر اہم پارٹ ادا کرنا ہوگا اور ہندوستانی اقوام کے وسیع اتحاد کا محافظ بننا ہوگا۔''

یہ جوش اکثر دل کش اور رنگین عبارت میں ظاہر ہوا۔ جانکوی ایرآنتونیّل نے ایک خط میں لکھا: ''تم نہیں جانتے کہ میں کس موقع پر سپاہی ہوں گا۔'' اور ''لیس تافیت'' نے 11- ستمبر کو وضاحت کے ساتھ لکھا ''ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور پھر دہراتے ہیں: ''ہماری ہمدردی ہندوستانیوں کے ساتھ ہے کیوں کہ مادرِ وطن کی محبت اور قومی آزادی ہمارے لئے مقدس چیزیں ہیں۔''

ہندوستانی بغاوت کے لئے فرانسیسی جمہوریت پسندوں کی ہمدردی بالکل واضح ہے۔ البتہ نپولین کی آمریت کے تحت اخبارات میں اس جذبے کے اظہار پر کافی پابندی تھی، اس وجہ سے ہم

مزدور طبقے کے تاثرات کے براہِ راست اظہار کے علم سے محروم ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت پسندوں کے علاوہ فرانسیسی عوام کے بڑے حصے کی رائے کم و بیش بغاوت کے حق میں تھی۔ البتہ یہ سوال اٹھتا ہے کہ آیا ان تاثرات سے باغی ہندوستانیوں کے ساتھ حقیقی ہمدردی کی بجائے اُس گہری عداوت کا اظہار تو نہیں ہوتا جو بہت سے فرانسیسی انگلستان کے خلاف رکھتے تھے۔ کیتھولک اخبارات کی ہمدردی کی بظاہر یہی وجہ تھی۔ خواہ کچھ بھی ہو، مفاد کی یکسانیت اور نسلی تعصب کی بنا پر شہری متوسط طبقے کی اکثریت مضبوطی سے انگلینڈ کے ساتھ تھی۔

❁❁❁❁❁

چین اور ہندوستان انیسویں صدی کے وسط میں

یوشینگ ووچانگ چیں کن

(1)

انیسویں صدی کے وسط کا زمانہ مختلف ایشیائی ملکوں میں قومی آزادی کی تحریکوں کے لئے عام شورش کا ایک عظیم عہد تھا۔ انقلابات یکے بعد دیگرے بپا ہوئے۔ چین میں تائی پنگ انقلاب اور دوسری جنگِ افیون، ہندوستان میں عوامی بغاوتیں، ایران میں بابلیوں کی شورش اور اینگلو ایرانی جنگ، شام اور لبنان میں کسانوں کی سرکشی، بورنیو میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف لوگوں کی جدوجہد وغیرہ۔ غرضیکہ ایک زبردست سیلاب تھا جو نوآبادیاتی نظام کی بدنما قوتوں کو بہا لے گیا۔ عوامی انقلابات کی اس امنڈتی ہوئی لہر میں غیر ملکی جارحیت اور جبر و ستم کے خلاف چینی اور ہندوستانی عوام کی جدوجہد سب سے زیادہ وسیع تھی۔ بعد میں آنے والی ایشیائی قوموں کی آزادی کی تحریکوں پر اُن کا نہایت گہرا اثر پڑا اور غیر ملکی سرمایہ دار حملہ آوروں اور جاگیردار قوتوں کو بہت سخت دھکا لگا۔ ہندوستان کی جدوجہد اور چین کی شورش ایشیا میں قومی تحریکِ آزادی کی دو بڑی لہریں تھیں۔

گذشتہ صدی کے وسط میں ایشیا کی قومی تحریکوں کا آغاز دراصل مغربی سرمایہ دار حملہ آوروں کی نوآبادیاتی پالیسی کا براہِ راست نتیجہ تھا۔ قوت اور سازش دونوں سے کام لے کر انہوں نے ایشیائی قوموں کو لوٹا اور غلام بنایا۔ انہوں نے ایشیائی ملکوں کے اُس وقت کے اقتصادی ڈھانچے کو توڑ پھوڑ ڈالا اور انہیں نوآبادیوں یا نیم نوآبادیوں کی حیثیت سے دنیا کی سرمایہ دارانہ منڈی میں دھکیل دیا۔ اپنے روایتی حقوق سے محروم اور بڑھتی ہوئی بھوک اور تنگدستی کا شکار ہونے کے بعد

ایشیائی قومیں آزادی اور خودمختاری کی جانب صحیح اور واحد راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگئیں۔۔۔ یعنی غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف مصمم ارادے کے ساتھ جدوجہد کرنے اور ان بیڑیوں کو توڑنے پر مجبور ہوگئیں جن میں انہیں جبراً جکڑا گیا تھا۔

چنانچہ ایشیا میں مغربی سرمایہ داری کی جارحانہ قوتوں کے بڑھنے اور پھیلنے پر نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد ایک روزمرّہ کا واقعہ بن گیا اور اس نے لاچار مظلوم اور غلام ایشیائی قوموں کی ایک عظیم مشترکہ مہم کی صورت اختیار کر لی۔ جدوجہد کے یکساں نتائج، مفاد اور نصب العین نے ایشیائی قوموں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا اور ایشیا کی قومی آزادی کی تحریکوں میں نہایت قریبی رابطہ پیدا کر دیا۔ ہندوستان میں 59-1857ء کی بغاوت پر بحث کرتے ہوئے مارکس نے بتایا کہ قومی آزادی کی یہ ملک گیر جنگ اُس وقت شروع ہوئی جب ایشیا کی عظیم قومیں انگریزی اقتدار کے خلاف عام نفرت کا اظہار کر رہی تھیں۔ بلاشبہ بنگال کی فوج کی بغاوت کا ایران اور چین کی جنگوں کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔'' (1)

برطانوی فوجوں کے اینگلو ایرانی جنگ میں الجھنے سے ہندوستان کی عظیم بغاوت کے لئے سازگار حالات پیدا ہو گئے۔ برطانوی اور فرانسیسی حملے کے خلاف چینی لوگوں کی دوسری جنگِ افیون اور ہندوستانی بغاوت دونوں کا دراصل یہ اثر ہوا کہ دشمن بڑھنے سے رُک گیا جس سے دونوں کو فائدہ پہنچا۔ کسی ایشیائی ملک کی قومی آزادی کے لئے جدوجہد کی کامیابی اور ناکامی کا دوسرے ملکوں کی قومی آزادی کی تحریک پر دوررس اثر پڑتا تھا۔ یہ قریبی تعلق موجود تھا اگرچہ اس وقت ایشیا کے لوگوں نے اس کی اہمیت کو نہ سمجھا۔

(2)

چین کے خلاف برطانیہ اور فرانس کی 60-1856ء کی دوسری جنگِ افیون غارت گری کی جنگ تھی جو چین پر اپنے غلبے کو بڑھانے کے لئے مغربی سرمایہ دار لٹیروں نے شروع کی۔ خارجی حملے کے خلاف چینی عوام کی مزاحمت ایک برحق قومی جنگ میں بدل گئی۔ دراصل کئی پہلوؤں سے یہ پہلی جنگِ افیون کا ہی اعادہ اور حصہ تھی جو 49-1840ء میں شروع ہوئی تھی۔ لیکن اُس وقت کی عالمی صورتِ حال کے پیشِ نظر ان دو جنگوں کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ پہلی جنگِ افیون کے

دوران چینی لوگوں کو کوئی بلاواسطہ یا بالواسطہ امداد نہ ملی لیکن دوسری جنگِ افیون کے دوران ہندوستانی عوام رفیق اور بھائی بن کر ان کی مصیبت کی گھڑی میں آڑے آئے جب کہ وہ خود 1857-59ء میں برطانوی نوآبادیاتی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے بہادری کے ساتھ جدوجہد کر رہے تھے۔ باوجود اس بات کے کہ اس وقت کے حالات کی وجہ سے دونوں ملکوں میں براہِ راست تعلقات قائم کرنے کی راہ میں آج کی نسبت بڑی رکاوٹیں درپیش تھیں۔ درحقیقت ہندوستانی اور چینی عوام مشترکہ دشمن کے خلاف اپنی جنگ میں ایک دوسرے پر اثر انداز تھے اور ایک دوسرے کے معین تھے۔

دوسری جنگِ افیون اُس وقت چھڑی جب برطانوی حملہ آوروں نے جو (چوری چُھپے مال لے جانے والوں کے جہازوں کو پناہ دے رہے تھے) کینٹن کے پُرامن باشندوں کی بڑی تعداد کو قصداً قتل کیا۔ بحری ڈاکو یعنی نام نہاد "مہذب لوگ" جن کی پشت پر توپخانہ اور توپوں سے لیس جنگی کشتیاں تھیں، دریائے پرل سے اوپر کی طرف اودھم مچاتے کینٹن تک چڑھ آئے۔ 27-اکتوبر 1856ء سے اُنہوں نے پُرامن شہر پر متواتر بم برسائے۔ اُن کے بحری فوجی دستے شہر میں گھس گئے اور بے حد مظالم ڈھائے۔ زنا بالجبر، اغوا، قتل، اور ان مکانوں اور جائیدادوں کو آگ کی نذر کرنا جن پر وہ ہاتھ ڈال سکے۔ حملہ آوروں کا خیال تھا کہ طاقت کے اس مظاہرے سے چینی عوام ڈر کر اطاعت پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی۔ لوگوں نے دشمن کے حملے کا جم کر مقابلہ کیا۔ برطانوی جنگی جہاز جو دریائے پرل میں گھس آئے تھے، طاقت کا مظاہرہ کرنے میں ناکام ہوئے اور مدافعت کرنے والوں کے زبردست جوابی حملوں سے جلد ہی کینٹن کے گردونواح سے تیزی کے ساتھ پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔

اس الجھن سے نجات پانے کے لئے اور جنگ کو وسعت دینے کے لئے شکست خوردہ حملہ آوروں نے ہندوستان سے فوجی دستے بھیجنے کی تدبیر سوچی۔ 10- جنوری 1857ء کو برطانوی وزیر چین جے باؤرنگ نے ہانگ کانگ سے ہندوستان کے برطانوی گورنر جنرل، کیننگ کے نام ایک سرکاری مراسلہ بھیجا۔ اس میں یہ التجا کی گئی کہ "اگر ممکن ہو تو ملکۂ معظمہ کے پانچ ہزار فوجی جوان کسی قدر توپخانے کے ساتھ بلا تاخیر ہندوستان سے چین لڑنے کے لئے بھیج دیئے جائیں۔" (2) مشرقِ بعید کے برطانوی بحری بڑے کے کمانڈر ایم۔ سیمور نے بھی کیننگ سے

ئے درخواست کی۔

لیکن حملہ آوروں کا اندازہ پھر غلط نکلا۔ 1857ء میں ہندوستان اس قابل نہیں تھا کہ چین کے خلاف برطانیہ کی جارحانہ جنگ کے لئے کوئی کمک بھیج سکے۔ ہندوستان میں برطانیہ کی بے رحمانہ نوآبادیاتی پالیسی نے نفرت کے شعلے بھڑکا دیئے تھے۔ اب ہندوستانی عوام مزید ظلم اور غلامی کی حالت کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انگریز دشمنی کے بڑھتے ہوئے جذبات اُن ہندوستانی فوجیوں میں بھی پائے جاتے تھے جنہیں خود انگریزوں نے فوجی تربیت دی تھی۔ 1857ء کے موسم بہار میں ہندوستانی فوجیوں نے جو بیدار ہو چکے تھے، انگریزوں کے خلاف یکے بعد دیگرے کئی ایک چھوٹی موٹی بغاوتیں بپا کیں۔ یہ آنے والے انقلابی طوفان کے آثار تھے۔ اُن حالات کے پیشِ نظر ہندوستان میں برطانوی حکام کی حالت چین میں حملہ آوروں کی نسبت کسی طور بہتر نہ تھی۔ چین کے خلاف حملے کے لئے ہندوستان سے فوجی دستے بھیجنا خام خیالی تھی۔ کیننگ کے نام باؤرنگ کی اپیل قدیم تاریخی دستاویزات کے انبار میں اس طرح کھو گئی جیسے کنکر سمندر میں کھو جاتا ہے۔

پس دوسری جنگِ افیون کے آغاز سے ہی چینی لوگوں کو ہندوستانی بھائیوں سے عملی طور پر امداد ملنی شروع ہو گئی تھی۔ مدافعت، آزادی اور خودمختاری کے لئے اپنی اپنی جدوجہد میں دونوں قوموں نے ایک دوسرے کی مدد کرنا اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا شروع کر دیا اور دونوں نے مل کر دشمن کا مقابلہ کیا۔

مارچ 1857ء میں برطانوی سرکار نے ماریشس اور برطانیہ سے کمک بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ نوآبادیاتی حکومت کے مسلم الثبوت استاد لارڈ ایلگن کو جو بعد میں ہندوستان کا گورنر جنرل بنا اور طویل عرصے تک اس عہدے پر مامور رہا، چین میں سفیرِ خصوصی مقرر کیا گیا۔ اس کے ذمہ یہ کام تھا کہ بڑے پیمانے پر مسلح قوت کا مظاہرہ کر کے دشمن کو مرعوب کرے۔ لیکن جب ہندوستانی لوگوں نے بڑی حد تک اس نئے جارحانہ منصوبے میں روڑا اٹکا دیا تو نوآبادکاروں کو بڑی ذہنی کوفت ہوئی۔ 10- مئی کو جب برطانوی مہماتی فوجوں نے مشرق کی جانب حرکت کی تو بہادر ہندوستانیوں نے برطانیہ کے خلاف عظیم بغاوت کا بگل بجا دیا۔ دہلی پر فی الفور قبضہ کر لیا گیا۔ نوآبادیاتی حکومت کو یہ خطرہ درپیش ہوا کہ کہیں اس کا تختہ نہ الٹ جائے۔ اس سے تھوڑی دیر ہی

پہلے باؤرنگ نے کیننگ سے امداد کے لئے درخواست کی تھی۔ اب کیننگ کی باری تھی کہ ایلگن سے مدد مانگے۔ جب ایلگن سنگاپور کے راستے سے چین کو جا رہا تھا تو 3- جون 1857ء کو لارڈ کیننگ کی طرف سے اُسے ایک مراسلہ ملا۔ اس میں ہندوستان کی دور دور تک پھیلی ہوئی بغاوت کا بیان اور انگریزوں کی نازک حالت کا ذکر تھا۔ کیننگ نے لکھا:

''گنگا کی وادی میں کلکتہ اور آگرہ کے درمیان 750 میل لمبے علاقے میں مشکل سے ایک ہزار فرنگی فوج موجود ہے جب کہ کئی اہم شہر اور چھاؤنیاں ایسی ہیں جہاں قلعے، فوجی گودام، خزانے اور فرنگیوں کی بڑی شہری آبادیاں ہیں۔ ان پر صرف دیسی فوجی دستے متعین ہیں۔ اگر ان میں سے کسی مقام پر بغاوت رونما ہوئی تو حکومتِ ہند کے پاس سچ مچ اس کو دبانے کے لئے کوئی فوج نہیں ہے۔ باغیوں کے لئے میدان صاف ہوگا اور ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ کس طرح موقعہ سے فائدے اٹھاتے ہیں۔ بغاوت کا یہ شعلہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گا اور بغیر دبے بھڑکتا رہے گا۔ جب تک دہلی باغیوں کے قبضے میں رہے گی کسی نہ کسی جگہ نت نئی بغاوت رونما ہوگی۔ یہ صورتِ حال خطرناک ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بعض نہایت اہم چھاؤنیوں میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے، دیسی رجمنٹیں بگڑی ہوئی ہیں۔'' (3)

اس نازک صورتِ حال کی اصلاح کے لئے کیننگ نے ایلگن کو لکھا کہ وہ بنگال میں لڑکھڑاتے ہوئے برطانوی نظام کو سہارا دینے کے لئے اپنی فوجیں کلکتے کی جانب بھیج دے۔ ایک سرکاری دستاویز میں یہ قلمبند ہے کہ گو ایلگن چین میں اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے بے تاب تھا لیکن اُسے کیننگ کی درخواست کی تعمیل کرنا پڑی۔ اس طرح بہادر ہندوستانیوں نے چین کی جانب بھیجی گئی برطانیہ کی مہماتی فوج کو راستے ہی میں روک لیا۔

آزادی اور خودمختاری کے لئے ہندوستانی لوگوں کی مصمم جدوجہد انگریزوں کے حملے کے خلاف چینی جنگِ مزاحمت کے لئے پھر سازگار ثابت ہوئی۔ 20- اپریل 1857ء کو برطانوی وزیرِ خارجہ کلیرنڈن کی جاری کی ہوئی ہدایات کے مطابق یہ تجویز تھی کہ ایلگن چین میں وارد ہوتے ہی اپنی مہماتی فوج کے ساتھ شمال کی جانب چڑھائی کرے گا اور منچو سرکار کو سنگینوں کے زور سے نئے غیر مساوی معاہدے پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کرے گا۔ لیکن ہندوستانی شورش کے سبب یہ جارحانہ مقصد ایک سال تک پورا نہ ہوسکا۔

ہندوستانی بغاوت نے چین میں حملہ آور فوجوں کو جانے والی کمک کو روک لیا۔ یہ تصویر کا یک رُخ ہے۔ دوسری طرف برطانوی حملے کے خلاف چینی عوام کی جنگ ہندوستانی لوگوں کی دوجہد کے حق میں جوابی امداد ثابت ہوئی اور اس نے دشمن کو روکنے میں مدد دی۔ ہندوستانی ناوت کے پھوٹنے کے بعد انگریزوں نے مشرق بعید میں اپنی تمام فوجوں کو اکٹھا کرنے کی وشش کی تاکہ پہلے ہندوستانیوں کی سرکوبی کی جائے اور پھر چین سے نپٹا جائے۔ لیکن چینی عوام ی مسلسل جدوجہد نے ان کی یہ تدبیر ناکام کردی۔ اگرچہ ایلگن نے چین کو جانے والی برطانوی ج کا کچھ حصہ ہندوستان کو بھیج دیا پھر بھی چینیوں نے برطانوی بحری اور برّی فوجوں کی خاصی ادکو الجھائے رکھا۔ اپنی ڈاکہ زنی کے مفاد کے تحفظ کی خاطر حملہ آور چین میں اُن فوجوں کو نے پر مجبور تھے۔

جون 1857ء میں ہندوستانی بغاوتوں کے شعلے میرٹھ اور دہلی سے گنگا کی وادی میں رے مقامات تک پھیل گئے۔ کلکتے میں بھی شورش کی آگ سُلگ رہی تھی۔ برطانوی حکمراں ے سے حواس باختہ ہو گئے۔ بار بار کیننگ نے ایلگن (جو ہانگ کانگ میں پہنچ چکا تھا) سے فوجی امداد بھیجنے کا تقاضہ کیا۔ اوّل الذکر کے بار بار مدد کے لئے اپیل کرنے کے باوجود ایلگن مشکل میں تھا، چینی علاقے سے ایک بھی سپاہی نہ ہٹا سکتا تھا۔ اُسی سال 29- جولائی کو اس نڈن کی خدمت میں مذکورہ ذیل رپورٹ بھیجی:

''لارڈ کیننگ کی درخواست کی حتی المقدور تعمیل کی غرض سے ان وسائل کا ملاحظہ کرنے کے جو میرے اختیار میں ہیں، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک طرف تو ہانگ کانگ میں مامور ل قلعہ دار فوج کے کسی حصے کو ہندوستان کی جانب بھیجنے کی کوشش بے سود ہوگی، دوسری طرف فوج میں ٹھوس کمی کرنا کافی خطرے کا موجب ہوگا کیوں کہ مختلف معاہداتی بندرگاہوں میں ہموطنوں کی حفاظت اور کینٹن کے ساتھ سلسلہء رسل ورسائل کے قیام کے لئے اسی فوج پر رامدار ہے۔'' (4)

''آخرکار ایلگن نے کیننگ کو ''اخلاقی امداد'' دینے کا انوکھا ڈھنگ اختیار کیا، وہ تنِ تنہا تے گیا۔ اس نے اپنی آمد کی یہ وضاحت کی کہ اس کی وجہ سے برطانوی فوجیوں کا حوصلہ بڑھے کیوں کہ اس کی موجودگی کو چین سے بھاری کمک کا پیش خیمہ سمجھا جائے گا۔'' (5) چینی اور

ہندوستانی عوام کی مشترکہ ضربوں سے برطانوی حملہ آوروں کی حالت ڈانواڈول اور نازک ہوگئی ہوگی۔

چینی عوام کو اپنے لڑنے والے ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ گہری ہمدردی تھی اور اُن کی کامیابیوں سے ان کے حوصلے بلند ہوئے لیکن ہندوستانی نصب العین کے حق میں ہمدردی کا یہ احساس مئوثر طور پر ظاہر نہ ہوسکا کیوں کہ اس وقت چین کے اپنے کوئی اخبار نہیں تھے اور جو تحریری دستاویزات اُس کے ہاتھ لگیں اُن کی تعداد محدود تھی۔ پھر بھی حکمران طبقے کی چھوڑی ہوئی متفرق تحریروں سے یہ پتہ چلانا مشکل نہیں کہ ہندوستانی بغاوت کے تئیں چینی لوگوں کا رویّہ کیا تھا۔ ایک مضمون بعنوان ''کینٹن میں یے منگ شین کی انگریزوں کے ہاتھوں گرفتاری کے کوائف'' میں سوئے خو۔ چینگ نے جو سفارت کا ایک رُکن تھا، یہ لکھا: ''کینٹن کے لوگ انگریزوں سے نفرت رکھتے ہیں۔ یہ افواہیں پھیلی ہوئی ہیں کہ انگریزوں کے تحت ملک ہندوستان نے بغاوت کردی ہے اور برطانوی فوجیوں کو شکست ہوئی ہے اور وہ کئی کمانڈروں سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔'' اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ صوبہ کوانگ ٹنگ کے عوام کس طرح سرگرمی کے ساتھ ہندوستانی بغاوت کی خبریں حاصل کرتے رہے۔ ہوا ٹنگ چے، مجسٹریٹ ضلع ننہائی، صوبہ کوان ٹنگ اپنی تصنیف ''غیر ملکیوں کے ساتھ راہ ورسم کی داستان'' میں اپنے ذاتی تجربے کو بیان کرتے ہوئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتاتا ہے کہ کوان ٹنگ کے عوام نے کس طرح ہندوستانی بغاوت پر خوشیاں منائیں۔ ''اس وقت ہانگ کانگ کے کچھ لوگوں نے بتایا کہ انگریزوں کو روپے کی اس قدر تنگی کا سامنا ہے کہ نہ صرف فوجیوں کو تنخواہیں دیر سے ملتی ہیں بلکہ انہیں اپنے روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے میں بھی مشکل پیش آتی ہے۔ انہیں چین کے ساتھ تجارت کرنے کی سخت ضرورت ہے۔'' کچھ اور لوگوں نے یہ بیان کیا کہ ہمیں پتہ چلا ہے کہ برطانوی صوبہ بنگال نے بغاوت کردی ہے اور انگریز فوجی دستوں کو شکست ہوئی ہے۔ ایک دو مہینے کے بعد پھر یہ افواہ پھیلی کہ انگریزی فوجی دستے گھات میں چھپے بیٹھے تھے اور ان کو کلیتہً نیست و نابود کردیا گیا ہے۔ ایک سپہ سالار اور بعض لوگوں کے قول کے مطابق شہنشاہی خاندان کا ایک داماد زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ دوسرے جرنیل اس قدر دہشت زدہ تھے کہ ان کو کچھ نہ سوجھتا تھا کہ کیا کریں۔ یہ خبریں لب بہ لب پھیلتی تھیں اور ہر کوئی ایک ہی بات کہتا تھا۔ جب گورنر جنرل نے یے۔ منگ شین سے اصلی حالت کے بارے میں پوچھا گیا

تو اس نے جواب دیا کہ مجھے بھی مختلف اطراف سے اسی قسم کی اطلاعات ملی ہیں۔ حسنِ اتفاق سے ہانگ کانگ کے تاجروں سے جو خطوط آتے اُن میں بھی یہی داستان ہوتی۔ لوگ خوشی سے پھولے نہ سماتے۔'' (6)

اگرچہ ہندوستان کے واقعات کا یہ بیان کلیتہً صحیح ثابت نہ ہو (اور اس وقت یہ بات ناگزیر تھی) پھر بھی بغاوت سے متعلق کوانگ تنگ کے لوگوں کی شدید بے تابی اور یہ خواہش، ظاہر ہے کہ ان کے ہندوستانی بھائی کامیاب ہوں۔ اس وقت برطانوی حملے کے خلاف کوانگ تنگ جنگ کا سب سے اگلا محاذ تھا۔ یہ نسبتاً ہندوستان کے قریب تھا اور ہانگ کانگ اس کے عین پڑوس میں تھا۔ اس لئے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کوانگ تنگ کے لوگ سب سے پہلے ہندوستانی واقعات کی خبریں پاتے اور ان سے متاثر ہوتے۔

نہ صرف چینی عوام ہی ہندوستانی بغاوت کے واقعات میں گہری دلچسپی رکھتے تھے بلکہ یے۔منگ۔شین بھی جو اس وقت کوانگ تنگ اور کوانکسی صوبوں کا گورنر جنرل اور صوبہ کوانگ تنگ میں برطانوی حملہ آوروں کے خلاف جنگ کا سپہ سالار تھا، ہندوستانی لوگوں کی جدوجہد پر پوری پوری توجہ دیتا تھا۔ شہنشاہ کے نام عرضداشتوں میں وہ بار بار ہندوستانی بغاوت کی کامیابی کا ذکر کرتا اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا کہ ''غیر ملکیوں کا حشر کسی طور اچھا نہ ہوگا۔'' یہی اہم وجہ تھی کہ برطانوی حملہ آور ''کمک نہ بھیج سکے۔'' (7) 1859ء میں سن کیانگ کے تاتاری جرنیل، چلافینٹا اور ماندرین فاہفولی نے سن کیانگ کے روسی قونصل کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے رسمی طور پر یہ مشورہ دیا کہ برطانیہ کے خلاف معاہدہ کرنے کے لئے ایک خاص وفد ہندوستان کو بھیجا جائے۔ یہ ایک ایسی اعلیٰ مہم تھی جو اُن کی رائے میں دشمن پر فتح کی موجب ہوگی۔ شہنشاہ کے نام یادداشت میں چلافینٹا اور فاہفولی نے روسی قونصل کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا:

''اب برطانیہ اور فرانس دونوں اپنی فوجوں کو منظم کر رہے ہیں۔ وہ جنگی جہازوں کی بھی مرمت کر رہے ہیں۔ وہ انتقام کی غرض سے اگلے سال فروری یا مارچ میں اپنی متحدہ افواج کے ساتھ ٹائنسن پر چڑھائی کرنے کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ اس وقت مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ انہیں کی لاٹھی سے اُن کا سر کچلا جائے۔ ہندوستان ایک زرخیز ملک ہے اور برطانوی مقبوضات میں نہایت اہم مقام رکھتا ہے۔ گو وہاں قلعوں میں برطانوی فوجیں متعین ہیں لیکن وہاں عوام کے دلوں

میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ پایا جاتا ہےاور عرصے سے بغاوت کی آگ سُلگ رہی ہے۔ ہمارے لئے یہ موقعہ غنیمت ہے۔ اگر کوئی قابل شخص خفیہ طور پر وہاں بھیجنا ممکن ہو اور ہندوستانیوں سے تعاون کر۔ نے کا وعدہ لیا جا سکے تو انگریز اُن کے مقابلے پر نہ ٹھہر سکیں گے۔ اس طرح انگریزوں پر اندرونی ہنگامے کا خوف طاری ہو جائے گا اور پھر شاید چین کے ساتھ جنگ کا خطرہ ٹل جائے گا۔'' (8)

ایک اور یادداشت میں چلافینگا اور فاہفوکی نے پھر اس بات پر زور دیا کہ ''جو کچھ روسی قونصل نے کہا ہے وہ بالکل درست ہے اور اس کی تجویز قطعاً قابلِ عمل ہے۔'' (9) انہوں نے شہنشاہ سے درخواست کی کہ اس تجویز کو قبول کیا جائے۔ اگر چہ اس زمانے کی مجبوریوں کے سبب اس تجویز کی تعمیل ناممکن تھی تاہم یہ بات محلِ غور ہے کہ سو سال پہلے چین میں غیر ملکی حملے کے خلاف مشترکہ مزاحمت کے لئے ہندوستان کے ساتھ معاہدہ کرنے کا خیال موجود تھا۔

(3)

اگر چہ برطانوی نو آبادکاروں نے ہندوستانی لوگوں کی بغاوت کو بے دردی کے ساتھ دبا دیا اور دوسری جنگِ افیون میں چین نے شکست کھائی پھر بھی ان دونوں ملکوں کی قومی آزادی کے لئے جدوجہد پورے زور کے ساتھ جاری رہی۔ جن دور اندیش اور دلاور ہندوستانیوں نے چینی عوام کے انقلاب میں حصہ لیا ان کے بہادری کے کارناموں کا علم بھی اسی وقت ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ چینی اور ہندوستانی لوگوں کا باہمی رابطہ برطانوی حملہ آوروں کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ یہ دو بڑی ایشیائی قومیں باہم نفرت کریں اور لڑیں مریں تا کہ نو آبادیاتی نظام کے خلاف اُن کی جدوجہد کمزور ہو جائے، صحیح راستے سے ہٹ جائے اور بالآخر ناکام ہو جائے۔ 1857ء میں ہی جب ہندوستانی بغاوت کی آگ تیزی سے بھڑک رہی تھی ''ٹائمنز'' کے ایک نامہ نگار نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ غیر معتبر ہندوستانی فوجیوں کو چینیوں کے ساتھ لڑنے کے لئے بھیج دیا جائے۔ اس نے کہا: ''بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں تادیبی اقدامات کو عمل میں لانے اور ساتھ ہی چین کے ساتھ جنگ کو جاری رکھنے میں کوئی مشکل پیش آئے گی۔ بے شک بعض ایسی سپاہی رجمنٹیں ہیں جو بظاہر باغی نہیں ہیں لیکن ان کے ہم

مذہبوں کے خلاف کارروائی کرنے میں اُن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو چین میں کیوں نہ بھیج دیا جائے؟''(10) فی الواقع دوسری جنگِ افیون کے آخری مراحل میں برطانوی حکام نے کچھ ہندوستانی فوجیوں کو چین بھیجا۔

جب ہندوستانی بغاوت پوری طرح دب گئی تو انگریزوں اور منچو حکمرانوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ انگریزوں نے ہندوستانی فوجی بھیجے تاکہ وہ توپوں کا نشانہ بن کر چینی انقلاب پسندوں کی سرکوبی میں منچو فرمانرواؤں کی مدد کریں۔

انگریزوں کو ایشیائیوں کے ساتھ ایشیائیوں کو لڑانے کا ناپاک منصوبہ سوجھا لیکن واقعات ان کی حسب خواہش رونما نہ ہوئے۔ جب وہ سینکڑوں ہندوستانی فوجیوں کو تائی پنگوں کے خلاف میدانِ جنگ میں جھونک رہے تھے تو کچھ باشعور ہندوستانی انقلاب پسندوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور ان کے دوست بن گئے۔ انہوں نے اپنی توپوں کا منہ تمام غیر ملکی دخل انداز فوجیوں کی طرف موڑ دیا جن میں برطانوی فوجی دستے بھی شامل تھے۔ چینی ہندی تعلقات کی تاریخ میں یہ ایک سنہرا ورق ہے اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف جنگ میں چینی اور ہندوستانی عوام کے مابین یہ سیدھے تعاون کا آغاز تھا۔

جہاں تک دستیاب مواد سے ہمیں معلوم ہے تائی پنگوں کی صفوں میں ہندوستانیوں کی شمولیت کا ذکر پہلی بار سینگ کوفان کے ایک خط میں کیا گیا جو تائی پنگوں کا جانی دشمن تھا۔ ایک اور جرنیل ہُولن اوّل کے خط کے جواب میں اس نے لکھا: ''میں نے سُنا ہے کہ صدر مقام ضلع یوشان کا محاصرہ کرنے میں باغی وفادار پرنس لی۔سو۔ چینگ کے سپاہیوں میں کچھ کالی چمڑی والے غیر ملکی بھی شامل تھے۔ (11)

جس چیز کا ذکر یہاں سینگ کر رہا ہے وہ 1861ء کے شروع میں نامور سالار لی۔سو۔ چینگ کے زیر کمان تائی پنگ فوجوں کا صوبہ کیانکسی میں صدر مقام ضلع یوشان کا محاصرہ ہے۔ ''کالی چمڑی والے غیر ملکی ضرور ہندوستانی ہوں گے کیوں کہ منچو حکمران عام طور پر ہندوستانی فوجیوں کو ''ٹین چو (ہندوستان) کے کالی چمڑی والے فوجی'' کہتے تھے۔''

جن حالات میں ہندوستانی لی سو چینگ کے زیر کمان خدمت بجا لانے کو آئے وہ پردۂ تاریکی میں ہیں لیکن ہم یہ بات یقیناً جانتے ہیں کہ اگست 1860ء میں جب لی نے شنگھائی پر

فوج کشی کی تو برطانوی حملہ آوروں نے کھلم کھلا مداخلت کی اور ہندوستانی فوجی دستوں کو تائی پنگوں کے خلاف لڑنے کا حکم دیا۔(12) جلد بعد آلی کے فوجی دستے کیانگسی میں گھس گئے۔اس بات کا قوی احتمال ہے کہ جو ہندوستانی ان میں شامل تھے وہ قلعہ شنگھائی کی برطانوی فوج سے آئے ہوں گے۔

یہ حقیقت قابلِ غور ہے کہ جب برطانوی حکام تائی پنگوں کی سرکوبی میں براہِ راست حصہ لینے لگے تو اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ہندوستانیوں نے تائی پنگوں کے ساتھ مل کر لڑائی کی۔ اس سے ظاہر ہے کہ بعض دوراندیش ہندوستانی چین کی قومی آزادی کے نصب العین کے حامی تھے اور برطانوی حملے کے خلاف جدوجہد میں براہِ راست شامل ہو گئے۔انہوں نے برطانوی مداخلت پسندوں کے برعکس روش اختیار کی۔انہوں نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف چینی اور ہندوستانی عوام کے مابین سیدھے تعاون کی بنیاد رکھی۔اُن کی یہ دین ہمیشہ یادگار رہے گی۔

تھوڑی مدت کے بعد ہی مزید ہندوستانی فوجیوں کو تائی پنگ تحریک کے انقلاب پسندوں کے قتلِ عام کو زیادہ شدت کے ساتھ انجام دینے پر مجبور کیا گیا۔(13) یہ واقعی افسوس کا مقام تھا۔ البتہ تائی پنگوں اور مداخلت پسندوں کے مابین جدوجہد کے تلخ ترین برسوں (63-1862ء) کے درمیان باشعور ہندوستانیوں کی روز افزوں تعداد میدانِ جنگ میں بھی انقلاب پسندوں کا ساتھ دینے لگی جہاں انتہائی گھمسان کی لڑائیاں لڑی گئیں (کیانگسی اور چیکیانگ کے صوبوں کے مختلف علاقوں میں) چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

19-فروری 1863ء کو شاؤہنگ، صوبہ چیکیانگ کی ایک لڑائی میں تائی پنگوں کے ساتھ صف آرا ہندوستانیوں نے ایک فرانسیسی افسر تاردو موادرے کا کام تمام کرنے میں مدد کی۔یہ افسر منچوؤں کا مددگار تھا۔منچو سرکار کی دستاویزات کے مطابق منچوؤں اور غیرملکیوں کی متحدہ فوجوں نے اس دن ''سی کو گیٹ کے باہر سے شاؤہنگ پر بمباری کی۔شہر کی سوفٹ سے زیادہ بلند دیوار کو گرادیا اور بے شمار قزاقوں کو ہلاک کر دیا۔تاردو اکیلا پُل پر کھڑا تھا اور اپنے فوجی دستوں کو شہر کی دیوار پر چڑھنے کی تاکید کر رہا تھا۔پتھر کلا بندوقوں اور کنکروں کے ساتھ لیس باغی شگافوں کی حفاظت پر مامور تھے۔پچاس ساٹھ کالی چمڑی والے اجنبیوں نے باغیوں کی امداد میں تاردو پر سیدھی بندوق سر کی اس کے سر میں گولی لگی اور جان بحق ہوا۔''(14)

''اسی سال 2- مئی کو کیانگ سو صوبہ کے ضلع تائی سانگ میں ایک مٹھ بھیڑ کے دوران تین سپاہیوں نے جو سابقاً پانچویں بمبئی نیٹو انفنٹری سے تعلق رکھتے تھے، تائی پنگوں کے ساتھ لڑتے لڑتے اپنی جان دی۔'' (15)

اسی سال 7- اکتوبر کو صوبہ چیکیانگ میں ینچو اور یوہانگ کے درمیان بمقام شہلی چانگ چیچ ایک لڑائی میں منچوؤں اور فرانسیسیوں کی متحدہ فوج نے ''چند لٹیروں کو ہلاک کرنے کا دعویٰ کیا۔ ان میں ایک کالی چمڑی والا اجنبی بھی تھا۔'' (16)

تائی پنگوں میں کالی چمڑی والے اجنبیوں کی موجودگی کی اور مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ (17)

مذکورہ بالا تین مثالوں میں تائی پنگ فوجیں لی سو چینگ کے زیر کمان تھیں جو غیر ملکی مداخلت پسندوں کے مقابلے پر انقلاب پسندوں کے کیمپ میں سب سے زیادہ مستقل مزاج اور باہمت سپہ سالار تھا۔ اس لئے اس بات کا پورا احتمال ہے کہ غیر ملکی فوجی دستوں کے خلاف متواتر جنگوں میں کچھ ہندوستانی سپاہی اس کی فوجوں میں چلے آئے۔

جو ہندوستانی سپاہی چین میں برطانوی فوجی حکام کی سخت نگرانی اور دباؤ کے تحت تھے، ان کے لئے تائی پنگوں کی طرف چلے آنا کس طرح ممکن تھا؟ جو تاریخی مواد دستیاب ہے اس کے مطابق اس بات کی تصدیق ہوسکتی ہے کہ جن گرفتار شدہ ہندوستانیوں نے میدانِ جنگ میں ہتھیار ڈال دیئے تھے وہ انہی میں سے تھے جو انقلاب پسندوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ چین میں برطانوی وزیر کے نام ایک خط مورخہ 17- ستمبر 1862ء میں شنگھائی کے برطانوی قونصل نے لکھا: ''ایک دو دن ہوئے سُو چو سے بلجیم کا ایک مہم جُو آیا تھا۔ اس نے کہا 'میں نے شہر میں دو فرنگیوں کو دیکھا جو اسلحہ اور گولہ بارود کے نفع بخش کاروبار کا ذکر کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جو چار سپاہی گذشتہ مئی میں میدانی توپ پر قبضہ کرنے کے وقت قیدی بنائے گئے تھے ابھی زندہ ہیں اور سُو چو میں موجود ہیں۔'' (18)

نیز اور بھی ہندوستانی فوجی ہوں گے جو اُن چار سپاہیوں کی طرح گرفتار ہو کر آہستہ آہستہ عملی زندگی کے مشاہدے اور تجربے سے روشن خیال ہو گئے اور بعد میں انہوں نے رضاکارانہ اپنی خدمات چینی انقلاب پسندوں کو پیش کیں۔

ہندوستانیوں کی کچھ کمتر تعداد مختلف طریقوں سے تائی پنگوں کے ساتھ شامل ہوئی۔

آگسٹس لنڈ ے نام کے ایک انگریز نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے کہ وہ خود اور ایک ''ہندوستانی ساتھی'' کس طرح اکتوبر 1863ء میں تائی پنگوں کے ساتھ شامل ہونے کے لئے شنگھائی سے سُوچو گئے۔(19) بظاہر یہ ''ہندوستانی ساتھی'' ایک رضا کار تھا جو تائی پنگ تحریک کا حامی تھا۔ یہ کتاب ایک ''برطانوی ایسٹ انڈین باشندے'' کا بھی ذکر کرتی ہے جس کا ارادہ یہ تھا کہ ایچ۔اے۔ برجوائن وغیرہ کے ساتھ صوبہ فوکین مین تائی پنگوں کی پارٹی میں شامل ہو جائے۔(20)

جن ہندوستانیوں نے رضا کارانہ طور پر تائی پنگوں کا ساتھ دیا وہ اُن عوام کے حامی نمائندے تھے جنہوں نے سو سال پہلے غیر ملکی حملے کے خلاف چینی اور ہندوستانی عوام کی مشترکہ مزاحمت کی مشعل روشن کی۔ان کے دلوں میں چینی انقلاب پسندوں کے لئے گہری ہمدردی تھی۔ یہ ہمدردی ان کے نجی تجربے کا نتیجہ تھی اور انہوں نے غیر ملکی جابروں کے خلاف چینی انقلاب پسندوں کے ساتھ شامل ہونے کے پہلے موقعہ ہی کو غنیمت جانا۔ جہاں تک اُن ہندوستانی فوجیوں کا تعلق ہے جو گرفتار ہونے کے بعد تائی پنگ تحریک کو سمجھنے اور اس کی حمایت کرنے لگے اُن میں لازماً خیالات کی تبدیلی پیدا ہوئی ہوگی۔اس کا ایک اہم سُراغ لنڈ لے نے چھوڑا ہے۔ اس نے لکھا: ''جو لوگ تائی پنگوں کی امداد کرنے میں مصروف تھے اُنہوں نے تمام مصائب اور خطرات کے باوجود اس راستے کو کیوں پسند کیا۔اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ انقلاب پسندوں کے ساتھ ایک ہی ملاقات سے منچوؤں پر ان کی برتری ظاہر ہو جاتی اور اس بنا پر وہ اُن کی ہمدردی اور عملی امداد حاصل کر لیتے۔''(21)

لنڈ لے یورپی ہمدردوں کا ذکر کر رہا ہے۔ اگر فرنگیوں کی صورت میں یہ درست تھا تو ہندوستانیوں کی حالت میں تو یہ اور بھی زیادہ صحیح تھا کیوں کہ وہ روایتاً حق اور حریت کے دل دادہ تھے اور غیر ملکی حملہ آور اُن کی مادرِ وطن اور ان کے بھائیوں کو پامال کر رہے تھے۔ جوں ہی انہوں نے برطانوی فوج کی قید سے نجات پائی چینی انقلاب پسندوں کی عملی جدوجہد سے اُن کی آنکھیں کھلیں اور اُن کا سیاسی شعور بڑھا۔ وہ مشترکہ دشمن کے خلاف آزادی کے مجاہدین بن گئے۔اس لئے چینیوں کی قومی آزادی کی تحریک کے حق میں اُن کی امداد نہ صرف دونوں قوموں کے مابین دوستانہ تعلقات کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے بلکہ اس سے اُن کی

اپنی زندگی میں نئے معنی پیدا ہوئے۔اس مثال سے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے کہ جب مظلوم لوگ ایک دوسرے کے دست گیر ہوتے ہیں تو تبھی وہ اپنی قوم اور خود اپنے لئے نجات کا راستہ پالیتے ہیں۔

تائی پنگوں کے ہندوستانی ساتھی چینی انقلاب پسندوں کے دوش بدوش لڑتے ہوئے اس نفرت کا اظہار کرتے جو چینی اور ہندوستانی عوام مشترکہ طور پر غیر ملکی جابروں کی نسبت رکھتے تھے۔ وہ دونوں قوموں کے مشترکہ مفادات کے ترجمان تھے جو قومی آزادی کی خاطر جدوجہد کر رہے تھیں۔وہ بجا طور پر 1857ء کی بغاوت کے سورماؤں کے جانشین، اُن کے ناتمام نصب العین اور ان کی غیر فانی روح کے وارث ہیں۔ان میں سے کئی ایک نے چینی عوام کے انقلابی مقصد کے لئے اپنی جانیں قربان کیں۔

البتہ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اُس وقت ہندوستان اور چین کی عظیم قوموں کے درمیان تعاون عام اور مکمل نہ تھا بلکہ ابھی ابتدائی حالت میں تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی حملہ آوروں نے جو اُس وقت سختی کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کرتے تھے، ہندوستانیوں کو چین میں جا کر اپنے مفاد کے لئے لڑنے پر مجبور کیا۔اس سے ہندوستانی اور چینی عوام کے بیچ زیادہ دوستانہ رابطہ اور مفاہمت کے قیام میں رکاوٹ پڑی۔جن ہندوستانی فوجیوں کو چین میں بھیجا گیا وہ بے شک برطانوی جارحانہ پالیسیوں کا شکار تھے۔ان کا حشر یہ ہوا کہ وہ برطانوی فوجی حکام کے حکم کے بندے اور غلام بن کے رہ گئے۔یہ بھی برطانوی نو آبادیاتی نظام کا قصور تھا۔

اب تاریخ نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا ہے اور صورتِ حال یکسر بدل چکی ہے۔جس طرح سو سال پہلے نو آبادکار حکم چلا سکتے تھے اور حسب مرضی بلا روک ٹوک منصوبے باندھ سکتے تھے، آج ممکن نہیں۔ ہندوستان اور چین کے لوگ آزاد اور متحد ہیں اس لئے اب وہ نو آبادیاتی نظام کے مقابلے پر طاقتور حریفوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہماری دو قوموں کے درمیان براہِ راست اور وسیع تعاون کی بنیاد رکھ دی گئی ہے اور شہنشاہیت پرستوں کی طرف سے ہمارے عوام میں نفاق ڈالنے کی کوشش ناکام ہوگئی۔ جب ہمیں اُن شہیدوں کا خیال آتا ہے جنہوں نے جبر و ستم کے خلاف جدوجہد میں اپنی جانیں قربان کیں تو ہمارے دل فخر اور شکر گزاری کے جذبات سے معمور ہو جاتے ہیں۔

حواشی

1- انڈیا ٹو ڈے: ''مارکس آن ریوولٹ آف 1857ء'' جلد دوم، نمبر 3 صفحہ 23
2- ''دی سیکنڈ چائنا وار، 60-1856'' مرتبہ ڈی۔ باز سمتھ وای۔ لمبی۔ صفحہ 162
3- ''بلیو بک'': کارس پانڈنس ریلیٹو ٹو دی ارل آف ایلگن، س سپیشل مشنز ٹو چائنا اینڈ جاپان 59-1857ء، صفحہ 8
4- ایضاً صفحہ 26
5- ایضاً صفحہ 26
6- ہُوا ٹنگ چی (چن کو چوجین): ''این اکاؤنٹ آف کنٹیکٹ ود فارنرز'' جلد دوم، از ''دی ڈیٹا فروم ماڈرن ہسٹری'' مرتبہ دی ہسٹاریکل انسٹی ٹیوٹ آف دی چائنیز اکاڈمی آف سائنسز، نمبر 2، 1956ء، صفحہ 108
7- ''اے کمپلیٹ اکاؤنٹ آف دی ٹرانزیکشن آف فارن ایفیئرز'' بعہد حکومت سین۔ فینگ، منچو خاندان، جلد 15 ویں صفحہ 6
8- ایضاً: جلد 47 ویں، صفحہ 17
9- ایضاً: جلد 47 ویں، صفحہ 18
10- جی۔ ڈبلیو۔ کگ: ''چائنا'' صفحہ 73
11- ''کارس پانڈنس آف سینگ کواوفان'' صفحہ 44 از ''دی کمپلیٹ ورکس آف سینگ کواوفان'' جلد سوم، مطبوعہ ورلڈ بک کمپنی۔
12- ایل برائن: ''دی تائی پنگ ری بلین ان چائنا'' صفحات 55-254
13- شنگھائی کے گردونواح میں پانچویں بمبئی این۔ آئی۔ اور بائیسویں پنجاب این۔ آئی کے فوجی اقدامات برطانوی حکام کے زیرِ ہدایت 1862ء کے بعد عمل میں آئے۔
14- ''میموریلز آف لی ہنگ۔ چنگ'' جلد سوم، صفحات 6-5۔ اس مٹھ بھیڑ میں برطانوی افسر،

ٹنلنگ جومنچوؤں کی طرف سے لڑا، مہلک طور سے زخمی ہو گیا۔ اس کی موت سے انگریزوں میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ ملاحظہ فرمائیں: جلد دوم، صفحات 88-587، ''تائی پنگ تین واہ'' مصنف لنلے (تاریخ بغاوت تائی پنگ)۔ کلمات ''ڈاکو'' اور ''باغی'' جو اقتباسات میں استعمال کیے گئے ہیں جو نفرت کے کلمے ہیں جو منچو عدالت نے تائی پنگوں کو رسوا کرنے کے لئے استعمال کیے۔

15- اے۔ ولسن: ''دی ایورو کٹوریس آرمی'' صفحہ 156

16- ''میموریلز آف سوسنگ ٹانگ'' جلد گیارہویں، حصہ اوّل، صفحہ 5۔

17- ''سیاؤ سانگ سنگ چی'' (تغیر پذیر مناظر کے کوائف) منف یو۔ یاؤ چی رقم طراز ہے کہ 8- نومبر 1863ء کو ''ایک غیر ملکی افسر نے شہر سے باہر تائی پنگوں کے تین ترجمانوں کے ساتھ دو اجنبیوں کو بھی گرفتار کیا، ایک گورا اور دوسرا کالی چمڑی والا اور انہیں ضلع لاؤ ہیسن کے حکام کے حوالے کر دیا۔''

ملاحظہ فرمائیں ''تائی پنگ تین کواؤ'' جلد ششم، صفحہ 526، مرتبہ ''چائنیز ہسٹاریکل سوسائٹی۔''

18- ایس۔ او۔ 228/229، مراسلہ ڈبلیو۔ ایچ۔ میڈھرسٹ۔ بنام ایف۔ بروس، مورخہ 17- ستمبر 1862ء

19- آگسٹس لنلے: بحوالہ تصنیف جلد دوم، صفحات 36-632

20- ایضاً: صفحہ 800

21- ایضاً: صفحات 77-476

❁❁❁❁❁

1857ء اور روسی پریس

پی۔شاستی کو

روس میں ہندوستانی بغاوت کی پہلی اطلاع 27- جون 1857ء کو پہنچی جب لندن میں متعین روسی سفیر، خریپتووچ نے میرٹھ میں شورش اور دہلی پر باغیوں کی خبر تار کے ذریعے سینٹ پیٹرس برگ کو بھیجی۔ اُسی دن اُس نے امورِ خارجہ کے وزیر، پرنس گورچاکوف کے نام ایک یادداشت لکھی اور اس کے ساتھ لندن کے اخبارات سے اقتباسات شامل کیے۔ لندن میں مقیم روسی ملٹری اٹیچی، کرنل اگناتی ئیف نے بھی واقعات کی مفصل روداد بھیجی۔

اگناتی ئیف نے لکھا: ''ہندوستان میں بغاوت کمپنی کے خلاف صرف کئی دیسی رجمنٹوں کا اتفاقیہ غدر نہیں ہے بلکہ غلامی کے نفرت انگیز غیر ملکی جوئے سے اس سرزمین کی آزادی کی خواہش کا اظہار ہے۔''

اگناتی ئیف کا خیال تھا کہ ''حکومت کی بدعنوانیاں اور کمپنی کی سب کچھ ہڑپ کر جانے کا لالچ بغاوت کے موجب تھے۔'' اگناتی ئیف کی رائے میں کمپنی کی پالیسی سے ہندوستان کے جاگیردار رئیسوں میں بھی یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جلد یا بدیر ہر موزوں قطعہء آراضی جو انگریز تاجروں کی دسترس میں تھا اس پر وہ قابض ہو جائیں گے۔''

جب لندن کی سنسنی خیز خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو اس نے روسی عوام کی رائے کو بیدار کیا۔ حریت پسند رسالہ 'اتے چست دینی یے' نے اعلان کیا ''آج سیاسی دنیا میں شاید ہی ہندوستان کے سوال سے زیادہ اہم، دلچسپ، یا سنجیدہ کوئی مسئلہ ہو۔ ہندوستان کی خبروں کا انتہائی بے تابی کے ساتھ انتظار کیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ سنسنی خیز عنوان یہ ہیں: 'ہندوستان'،

'ہندوستان کی ڈاک' اور 'کلکتہ کے مراسلات'۔''

''آج سب سے زیادہ جاندار مسئلہ ہندوستان کے معاملات کا ہے۔ پانچ مہینے سے سارے یورپ کی نظریں ہندوستان پر گڑی ہوئی ہیں۔'' یہ رائے رسالہ ''روسکی ویتنک'' کی تھی جو اس نے اپنے قارئین پر ظاہر کی۔

اخبارات اور رسائل میں بغاوت کی نسبت روسی رویے پر شدید بحث چھڑ گئی۔ بغاوت کے اسباب کیا تھے اور یہ کس طرح پھیل رہی تھی؟ عوام کے لئے اس کا صحیح تصور کرنا مشکل ہو گیا کیوں کہ روسی اخبارات اس موضوع پر اپنا بیشتر مواد انگریزی اخبارات سے اخذ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف مختلف رسائل اور اخبارات کے نقطہء نظر میں اختلاف اور انتشار تھا بلکہ مختلف صحافیوں کے خیالات میں بھی۔

بغاوت سے متعلق سب سے زیادہ واضح اور قطعی رائے بے شک صرف روسی انقلاب پسند جمہوریت پرستوں میں پائی جاتی تھی۔ اُن کے خیالات کا اظہار این۔ اے۔ دوبرولیوبوف کے ایک مضمون میں کیا گیا جس کا عنوان ''ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ اور اس کی معاصرانہ صورتِ حال کا جائزہ'' تھا اور جو رسالہ ''سودرے مینگ'' کے پرچہ ستمبر میں شائع ہوا۔ ادیب اور فلسفی اور روسی انقلاب پسند جمہوری تحریک کے راہنما این۔ جی۔ چرنی شیوسکی کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ''مضمون واقعی اچھا نکلا۔''

موضوع سے متعلق نظریے کی پختگی دوبرولیوبوف کے مقالے کی امتیازی خصوصیت تھی۔ اس کی نگاہ میں بغاوت بے اطمینانی کی ایک اتفاقیہ لہر نہیں تھی بلکہ ''تاریخی طور پر ایک ناگزیر واقعہ تھا۔'' دوبرولیوبوف نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی لوٹ کھسوٹ کی مشینری کے کل پرزوں کی تحقیق کے ساتھ بغاوت کے اسباب کا مطالعہ شروع کیا۔ یہ مشینری ڈاکو کی بے باکی اور حقیر تاجرانہ حرص سے مرکب تھی۔

دوبرولیوبوف نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کی تاریخ کی چھان بین کی اور اس امر کی بھی تحقیق کی کہ کس طرح منچلے بیوپاریوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی ترقی کر کے تجارتی سالاروں کی حکمراں جماعت بن گئی۔ اُس نے اُن مورخوں اور صحافیوں کے دعوے کو قطعاً رد کر دیا جو سادہ لوحی یا ریاکاری سے انگریزوں کے تہذیبی مقصد کے قائل تھے۔ دوبرولیوبوف نے لکھا:

''انگلستان کا آخری مقصد حکومت قائم کرنا اور نجی منافع کمانا ہے نہ کہ تہذیب پھیلانا۔''

بغاوت کا جائزہ لینے میں دوبرولیوبوف اُن لوگوں کا طرفدار تھا جو اسے متعصب ہندوؤں کی مذہبی شورش یا بے قابو سپاہیوں کا غدر تصور نہیں کرتے تھے بلکہ اسے آزادی کے لئے لوگوں کی بغاوت سمجھتے تھے جو بغیر کسی ذاتی غرض کے حملہ آوروں کے مقابلے پر آئے۔ وہ سمجھ گیا کہ ''لوگوں نے بغاوت کی کیوں کہ انہوں نے بالآخر برطانوی حکومت کے نظام میں خرابی پائی۔''

اُس وقت روس کا سرکاری نظریہ، اخبار ''روسکی ان ویلڈ'' میں پیش کیا گیا جو ہندوستان کے واقعات کی باقاعدہ اور مکمل اطلاعات شائع کرتا تھا۔ 13-اکتوبر 1857ء کو اس اخبار نے سرگے برگ کا ایک طویل مضمون بعنوان ''ایسٹ انڈیا افیرز'' شائع کیا۔ مصنف کی ہمدردی سراسر باغی ہندوستانیوں کے ساتھ تھی۔ ''برطانوی شیر، ریاستوں کے سیاسی اجسام کو نوچنے کا عادی ہے۔ اس بار جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اُسے اپنی خونخواری کی خصلت کو قابو میں رکھنا ہوگا۔'' سرگے برگ کی نظر میں بغاوت کا سبب ''ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا وحشیانہ سلوک (خاص طور پر ٹیکس کی وصولی میں) اور انسانی حقوق سے اُن کی مطلق چشم پوشی تھا۔''

مقبولِ عام اخبار ''پتر برگسکی ودوموستی'' زیرِ ادارت اے۔اے۔ کرائسکی، رکن انجمن سیاسی المعروف ''اہلِ غرب'' بھی اپنے قارئین کو مطلع رکھتا۔۔۔ 30-جولائی کو اخبار نے ایک سلسلہء مضامین بعنوان ''لیٹرز اباؤٹ ایسٹ انڈیز ان ڈکنیشن'' شروع کیا۔ اس میں مصنف نے اپنے قارئین کو مشورہ دیا کہ وہ لندن کے اخبارات پر تنقیدی نگاہ ڈالیں کیوں کہ اس کے قول کے مطابق ''انگریز اپنی ناکامیوں کو چھپانے یا ان سے انکار کرنے کا فن جانتے ہیں۔'' جس طریقے سے ہندوستان میں برطانوی حکومت قائم ہوئی، اس کی تاریخ سے مصنف نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''خود انڈو برٹش سلطنت کی تعمیر میں تخریب کا تخم موجود ہے۔ اس نے برطانوی صحافیوں کے اُن دعوؤں کو مہمل قرار دیا کہ بغاوت کا سبب یہ تھا کہ افسروں نے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو نظر انداز کیا۔

جہاں تک اُن لوگوں کا تعلق ہے جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ''روشن خیال مہذب یورپ'' ''پس ماندہ جاہل ایشیا'' میں تمدن پھیلانے کا مقصد رکھتا تھا۔ ''پتر برگسکی ودوموستی'' نے اس نظریے کو بے باکانہ ریاکاری کا نام دیا۔ اس نے یہ معقول دلیل پیش کی کہ ''انگلستان نے

ایک وسیع سلطنت حاصل کی لیکن اس میں تہذیب پھیلانے کے لئے نہیں بلکہ اسے ہڑپ کرنے کے لئے۔''

ایشیا میں یورپ کے تہذیب پھیلانے کے پارٹ پر روسی مصنفوں کے اس قدر توجہ دینے کا سبب یہ تھا کہ نو آبادکاروں کی کھلم کھلا اور ظاہر اً بداعمالیوں کو جائز ٹھہرانے کے لئے اس دلیل سے کام لیا جاتا تھا۔ روس میں رجعت پسند حلقوں نے بھی اس ریاکاری کے حربے کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ ''روسکی ویتنک'' نے ان حلقوں کی رائے کی عکاسی کی جب اس نے یہ بیان کیا کہ ''ہمیں انگلستان کی خارجہ پالیسی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ اس کے ساتھ ہمارے اختلافات کے کئی نکتے ہیں۔ لیکن ہم ہمیشہ فراخدلی اور ایمانداری کے ساتھ تسلیم کریں گے کہ ہمارے کئی مقاصد یکساں ہیں۔ انگلستان اور روس دونوں پر فرض ہے کہ وہ بچھڑے ہوئے ایشیا کی اخلاقی تاریکی میں یورپی طرزِ زندگی کی روشنی پھیلائیں۔ اس میدان میں ہم حلیف ہیں۔ یہاں ہم میں یکجہتی پائی جاتی ہے۔

البتہ انصاف اس حقیقت کا مطالعہ کرنے کا تقاضہ کرتا ہے کہ ''روسکی ویتنک'' کو روسی عوام کی حمایت حاصل نہ ہوئی۔ اس کو سمجھنا کچھ دشوار نہیں۔ آزادی اور خود مختاری کے لئے جدوجہد میں ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی رکھنے کے علاوہ روسی عوام خود ابھی اس ضرب سے پیچ وتاب کھا رہے تھے جو 1854ء کی جنگِ کریمیا میں برطانوی اور فرانسیسی ہتھیاروں نے ان کے قومی فخر پر لگائی تھی۔ اس لئے ان کی ہمدردی ان لوگوں کے ساتھ تھی جو ہندوستان کو غلامی کے نوآبادیاتی جوئے سے نجات دلانے کی کوشش کرتے تھے۔

ہندوستان کے طوفان کی المناک صدائے بازگشت ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں کے اوپر سے لڑھکتی ہوئی روس کے میدانوں کو عبور کر کے سینٹ پٹرسبرگ تک جا پہنچی۔ روسی عوام کے ترقی پسند طبقے نے اس طوفان میں بہار کے اس پہلے جھونکے کی قوت کو دیکھا جو آزادی کی آنے والی آندھی کا پیش خیمہ تھا۔

روسی عالم 59-1857ء کی ہندوستانی بغاوت کی تاریخ کا بڑی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ دلچسپی تاریخ کو داخلی نظریات کا مجموعہ سمجھنے پر مبنی نہیں ہے بلکہ خارجی قوانین کا منطقی نتیجہ سمجھنے پر۔ ان خارجی قوانین کے مطالعے سے اس رُخ کو سمجھنا ممکن ہو جاتا ہے جس میں سماج

حرکت کر رہا ہے۔ ماضی میں ہندوستانیوں کی بہادرانہ جدوجہد، حال میں ایک بڑی قوت کی حیثیت سے ہندوستان کے ظہور اور مستقبل میں اس کی ترقی کے امکانات سے تاریخِ ہند کا مطالعہ بڑا دل آویز اور مئوثر ہو جاتا ہے۔

روسی علما کی رائے کے مطابق ہندوستانی بغاوت کوئی الگ تھلگ واقعہ نہیں ہے۔ ہندوستان کی بغاوت، چین میں تائی پنگ شورش، ایران میں بابیوں کی تحریک اور انڈونیشیا میں تحریکِ آزادی کا ظہور۔۔۔ یہ سب کچھ ان ملکوں کو نوآبادیوں میں بدلنے کی کوشش کا عوامی ردِعمل تھا۔

ہندوستانی بغاوت برطانوی حکومت کے خلاف منظم کی گئی اور کسان، کاریگر اور سپاہی اس کی روحِ رواں تھے۔ اس قوت کے علاوہ جاگیرداروں کی بھی ایک جماعت تھی جس کی قیادت ان رؤسا نے کی جنہیں انگریزوں نے معزول کر دیا تھا اور جنہوں نے اپنے کھوئے ہوئے حقوق اور اختیاراتِ خصوصی دوبارہ حاصل کرنے کے لئے موقعہ کو غنیمت جانا۔ ظاہر ہے کہ بغاوت میں بڑی خامی تنظیم کی کمی تھی۔

اس کے باوجود کہ بغاوت کو دبا دیا گیا اس نے ہندوستان میں قومی شعور پیدا کرنے میں نہایت اہم پارٹ ادا کیا اور نوآبادیاتی نظام کی مخالف قوتوں کی طرف سے بلا لحاظِ مذہب، ذات اور زبان، متحدہ جدوجہد کے لئے ایک مستحکم بنیاد رکھی۔

❁❁❁❁❁

1857-2007: تہذیبوں کا ٹکراؤ یا

سامراج کے خلاف مزاحمت

آخری مغل پر تبصرہ: ایک خاندانی حکومت کا زوال: دہلی 1857

کلپنا ولسن/ترجمہ: ظفر علی خان

ولیم ڈالریمپل کی دہلی پر نئی کتاب برطانوی کالونیائی حکومت کے خلاف بغاوت کے وقت سے متعلق ہے جب ایک سو پچاس سال پہلے سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ پہلی دفعہ یہ دہلی کے محاصرے پر ہندوستانی اور ''عام لوگوں'' کے تناظر سے اس وقت اس شہر میں جو رہتے تھے کے تجربات پر لکھی گئی ہے۔ پھر بھی باوجود اس کام کے جو ڈالریمپل اور اس کے ہم کاروں، محمود فاروقی اور بروس ونیل نے ابھی تک ''استعمال نہ کی گئی'' فارسی اور اردو دستاویزات جو انڈیا کے قومی دستاویز کے محافظ خانے میں جمع ہیں کا ترجمہ کر کے کیا ہے، وہ اپنا وعدہ پورا کرنے میں بری طرح ناکام ہوا ہے کہ اس نے یہ سارا مواد بے ہنگم طریقے سے ایک حالیہ اور بہت ہی عامیانہ چوکھٹے میں جھونک دیا ہے جس میں ''کلچر'' کو طاقت یا مادی رشتوں سے علیحدہ دیکھا گیا ہے اور نہایت اہم بات ہے نسل اور سامراج کے کلیدی مسائل کو دھندلانے کے لئے مذہب پر زور دیا گیا ہے۔

1857 کی بغاوتیں شمالی نصف سے زائد اس علاقے پر پھیلیں جو آج انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش ہے اور تقریباً ایک سال تک جاری رہیں۔ ان کے مرکز پر برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستانی سپاہیوں (جنہیں سیپائز کہا جاتا تھا) کی بہت بڑی شورش تھی۔ 139,000 بنگالی فوج

میں سے سب نے سوائے 7,996 کے بغاوت کی۔ لیکن بغاوتیں عوامی شمولیت کے پھیلاؤ کی بنا بھی قابل توجہ تھیں کیونکہ انہوں نے ایک ہی وقت میں مختلف مذاہب، ذاتوں اور علاقائی شناختوں کے اختلافات کو پاٹتے ہوئے سب کو اکٹھا رکھا۔ (1)

ڈالریمپل کی کتاب دہلی پر، جو مغل خاندانی بادشاہت جس نے 330 سال تک حکومت کی تھی کا دارالخلافہ تھا، خصوصی ماسکہ رکھتی ہے۔ بغاوت سے چند برس پہلے سے شروع کر کے جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتریوں نے مغل شہنشاہ کو ایک کٹھ پتلی حکمران میں گھٹا دیا تھا اور اس کی عملداری صرف اتنی دور جاتی تھی جتنی کہ سرخ قلعے کی دیوار (اور وہاں بھی یہ محدود کر دی جاتی) ڈالریمپل دلیل دیتا ہے کہ یہ دور پھر بھی مختلف عقائد کے درمیان ہم آہنگ رواداراور بلند پایہ ادبی کلچر کی نمائندگی کرتا ہے جو مغل دربار نے اپنی ہندو مسلم رعایا میں پروان چڑھایا تھا۔ پھر وہ ان واقعات کا ذکر کرتا ہے جو میرٹھ میں سپاہیوں کی بڑی بغاوت کے بعد رونما ہوئے اور باغی قوتوں نے پھر دہلی کا رخ کیا تا کہ وہ مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر ثانی کو اپنا قائد بنائیں، وہ برطانویوں کے شہر سے فرار کا ذکر کرتا ہے اور پھر وسیع پیمانے پر دہلی کے باسیوں کے قتل عام کا ذکر کرتا ہے جو برطانوی فاتحین نے بعد میں کیا۔

ڈالریمپل اس بغاوت کو اولین طور پر مسلمانوں اور عیسائیوں میں ''مذہب کی جنگ'' کے طور پر پیش کرتا ہے: جبکہ یہ بھی جانتا ہے کہ سپاہیوں کی وسیع اکثریت ہندو تھی، وہ دہلی میں ان کی موجودگی پر طرفہ زور دیتا ہے جو ''اپنے آپ کو مجاہدین، غازی اور جہادی کہتے تھے'' اور جو محاصرے کے آخر میں شہر کے اندر ''کل لڑاکا فوج کا تقریباً ایک چوتھائی تھے'' اس کے اپنے سے پہلے اس موضوع پر لکھنے والے تمام تاریخ دانوں کا جنہوں نے انگریزی میں لکھا تھا، اس نے بے مہر مضحکہ خیز خاکہ اڑایا۔ چاہے وہ 'مارکسیوں' کے برطانوی اقتصادی پالیسیوں پر زور دینے پر نوحہ گری ہو یا تحتائی (Sabaltern) مطالعہ گروپوں کے زاویہ نظر پر جنہوں نے ''ہنر مندی سے مستشرقیت اور کالونیت کے بارے میں تھیوری گھڑی''، (ظاہر ہے یہ دونوں ڈالریمپل کے لئے درست ضمرے نہیں ہیں) یہ سارا بیان صرف خود نمائی کا ایک ذریعہ ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کے نمایاں ہمعصری سیاسی مضمرات ہیں۔ ڈالریمپل دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے 1857 میں 'جہاد' بے نقاب کرلیا ہے۔ واضح طور پر بہت سے ثقہ ہندوستانی تاریخ دانوں کے کام سے برملا اغماض برتتے ہوئے جنہوں نے پچھلے تیس سالوں

میں مذہبی محاوروں سے متعلق دستاویزاتی ثبوت فراہم کئے ہیں جن کے ذریعے سامراج کے خلاف متفرق پس منظر کے لوگوں کے درمیان مزاحمت کا اظہار ہوتا ہے۔ ابھی حال ہی میں رے کی طرف سے کئے گئے ایک گہرے مطالعے میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح 1857 کے بارے میں لوگ جو مختلف عقائد کے درمیان ہم آہنگ کلچر کے حصہ دار تھے جو مختلف مذہبوں سے اپنی شناخت رکھتے تھے، شعوری طور پر برطانوی کالونی گیروں سے لڑنے کے لئے اکٹھے تھے: ''ان کے خیال میں یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی جدوجہد نظاریز (نظرتھ کے یسوع کو ماننے والوں) کے خلاف تھی۔۔۔ اتنی زیادہ اس لئے نہیں کہ ثانی الذکر تثلیت کے اپنے جھوٹے عقائد نافذ کرنے کا مصمم ارادہ رکھتے تھے، بلکہ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی شناخت کو ایک گستاخ سامراجی طاقت کی اخلاقی اور مادی توسیعیت عظمت سے خطرہ تھا۔ (رے، 357، 2003)

ڈالریمپل ان سامراج مخالف عوامی تحریکوں کی زیادہ پیچیدہ تفہیمات کو رد کرتا ہے۔ جو ہندوستان میں بورژوی قوم پرستی کے ابھار سے پہلے چلیں تھیں اور ان کے مقابلے میں وہ ''حریف بنیاد پرست دھڑوں کے تصادم'' کے تصور کے حق میں ہے۔ اس کے برعکس یہ اکثر اس کی اپنی شہادت کو رد کرتا ہے، مثال کے طور پر وہ ''جہاد'' کی اصطلاح کے ابہامی اور متفرق معنوں کا حوالہ دیتا ہے، جو کہ دوسروں کے علاوہ اس کتاب میں ہندو باغی جرنیل نے بغاوت کے بیان میں استعمال کی ہے: بعدازاں ڈالریمپل نوٹ کرتا ہے کہ برطانوی حکام کی طرف سے بغاوتوں کو ان کے دبائے جانے کے بعد استثنائی طور پر ایک معماتی معاملے کا رنگ دینے کی متفقہ کوشش کی گئی۔ (حقیقت میں یہ ہندوستانی تاریخ کو فرقہ وارانہ خطوط پر پھر سے لکھنے کی مربوط کالونیائی پالیسی کی شروعات کی نشاندہی کرتی ہے)۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات کہ بغاوتوں سے پہلے اور بعد کے اعمال، بڑھتے ہوئے ایونجلیکل عیسائیت کے اثر کے نام لگائے گئے ہیں۔ جو کہ مصنف کو اس دور میں امپیریلزم کے کردار میں ہونے والی تبدیلیوں کی اہمیت کم کرنے کی اور اٹھارہویں صدی کے بعد سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت برطانوی لوٹ مار کو رومانوی رنگ دینے کی اجازت دیتا ہے۔

ڈالریمپل اپنے اختتام دنیا والے، 1857 کے اولین 9/11 جیسے نکتہء نظر کا مقابلہ ایک گزرے ہوئے سنہری دور جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے برطانوی افسران ہندوستانی لباس پہنتے

اور 'ہندوستانی بیبیوں' کے ساتھ بن بیاہے رہتے کرتا ہے۔ طاقت، نسل اور جنس کے مسائل سے متعلق نمایاں طور پر بے حسی کا رویہ دکھاتے ہوئے ان ''سفید مغلوں'' کی تصویر کشی بڑے پیار سے کرتا ہے ان کی ''بہت سی بیویوں'' کو شاندار طریقے پر کثیر الثقافتی دکھاتا اور یوں ایک پرسکون ''تہذیبوں کے اختلاط'' کو آگے بڑھاتا ہے۔

وہ اس حقیقت سے اغماض برتتا ہے کہ 1757 میں جنگ پلاسی میں برطانوی فتح کے بعد انہوں نے ہندوستانی معیشت کی شدید لوٹ مار اور تباہی کی صدی کی مہابت، غارت گر ٹیکس وصولی اور جبری تجارت کے دوہرے ہتھیاروں کے ذریعے کی۔ یوں مثال کے طور پر وارن ہیسٹنگز، مشرقی برطانوی عالموں میں سے ایک جس کا حوالہ ڈالریمپل بڑی تعریف وتوصیف سے دیتا ہے (اور بڑے واضح طور پر اس کی نقالی کرنا چاہتا ہے) وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے 1770 کے قحط کے دوران جو کمپنی کی پالیسیوں نے مشرقی ہندوستان میں پسپا کیا تھا جس نے ایک اندازے کے مطابق 10 ملین لوگ ایسے تھے درحقیقت ٹیکس کی شرح بڑھا کر وصول کرنے کی وجہ سے زیادہ جانا جاتا ہے۔

1857 تک پہنچتے ہوئے سالوں نے سامراج کے مقاصد، طریقوں اور غالب آئیڈیالوجی میں بڑی بڑی تبدیلیاں دیکھیں، جن میں ایونجلیکل عیسائیت صرف ایک علامت مرض تھی۔ ہندوستان کو اب فقط ٹیکس لگان کا وسیع منبع ہی نہیں (اور قیمتی اشیائے صرف کا جو جبراً حاصل کی جاتیں تھی) بلکہ برطانیہ کی اپنی حرفتی صنعتوں کے لئے منڈی اور خام مال کا بڑھتا ہوا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ 1830 تک ہندوستان کی کپڑے خوشحال صنعت تقریباً تمام تباہ کردی گئی تھی۔ اور صدی کے وسط تک ہندوستان برطانیہ کی روئی کے کپڑے کی صنعت کی ایک چوتھائی برآمد درآمد کر رہا تھا۔ بعد میں آنے والی دہائیوں میں ہندوستانی کاشتکاروں کو نیل، روئی اور گندم کی کاشت کرنے پر مجبور کیا گیا، تا کہ یہ برطانیہ کو برآمد کی جائیں۔ ایسی پالیسیوں کے لئے بلاواسطہ برطانوی حکومت کے پھیلاؤ اور بہتر ریاستی نظام عمل کی اور زیادہ تعداد میں برطانوی افسروں کی ضرورت تھی۔ 'سامراج کے دور' نے سفید فام لوگوں کی برتری کے نظریئے کا استحکام نسلی تفریق اور ''مہذب بنانے کا مشن'' دیکھا۔ جبکہ ڈالریمپل نوٹ کرتا ہے کہ 1850 تک برطانوی فوج کے افسران لوگوں سے زیادہ دور، اکھڑ اور اپنے ماتحت لوگوں کو غیر مقبول سمجھتے تھے۔ وہ نسلی برتری کے غالب تصورات سے مکمل پہلوتہی کرتا ہے جو روزمرہ کی نسلی بدسلوکی کو تقویت دیتے اور سپاہیوں کو جنہیں بھگتنا پڑتا تھا۔ ایسا

کرنے کے لئے اسے توجہ ''مذہبی کٹر پن'' کے ابلاغ دوست ماسکے سے ہٹانی پڑتی اور حد سے بڑھے ہوئے نسل زدہ سامراجی طاقت کے ڈھانچوں پر مرکوز کرنی پڑتی جن کے اندر مشنری اور ایونجلیکل عیسائی واعظ ایک خاص کردار ادا کرتے۔

مختلف موقعوں پر ڈالریمپل کی اپنی شہادت تصدیق کرتی ہے کہ برطانویوں کے لئے یہ ''نسل'' تھی نہ کہ مذہب جس کی اصل اہمیت تھی۔ مثال کے طور پر (جبکہ اسلام قبول کرنے والے برطانوی، جو باغیوں کے ساتھ مل کر لڑتے ان میں خندہ پیشانی سے قبول کئے جاتے) ہندوستانی جنہوں نے عیسائیت قبول کی تھی اور جنہوں نے برطانویوں کا ساتھ دیا تھا نے بیان کیا کہ کس طرح ان پر بار بار حملے کئے گئے اور ان کے ساتھ برطانوی افسروں نے دہلی پر قبضے کے بعد ان سے برا سلوک کیا۔

لہٰذا ''آخری مغل'' کس حد تک ہندوستانی تناظر کی ترجمانی ان واقعات کے حوالے سے جن کا ذکر یہ کرتی ہے، کرتی ہے؟ آج تک بتائی گئی برطانوی رویدادوں کے برعکس ڈالریمپل تفصیل سے بغاوت پر کالونیائی ردعمل میں ''حیران کن تشدد اور برائی'' جو آج بہت سے کیسوں میں خوفناک جنگی جرائم گردانے جائیں گے، کا ذکر کرتا ہے۔ اس میں وہ برطانوی پریس کی اس دور کی اشاعتوں میں کارل مارکس (جو ہم عصر تبصرہ نگار تھا) کی طرف سے شناخت کی گئیں غلط بیانیوں سے احتراز کرتا ہے جو حالیہ تاریخ نویسی میں ابھی بھی موجود ہیں جہاں ''جبکہ انگریزوں کی ظالمانہ کارروائیاں مارشل قوت کے طور پر بیان کی گئی ہیں سادہ انداز میں جلدی سے کریہہ تفصیل میں جائے بغیر مقامی باشندوں کی اعلانیہ تذلیل، ناخوشگوار جیسے کہ وہ ہیں آج بھی دانستہ طور پر مبالغہ آمیز ہیں۔

پھر بھی اس کے باوجود ڈالریمپل لگتا ہے، کالونیائی تشدد کی فطرت کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھا۔ یوں سقوط دہلی کے بعد ہندوستانی عورتوں سے وسیع پیمانے پر زنا بالجبر کا حوالہ دیتے ہوئے، وہ تبصرہ کرتا ہے کہ ''یقین کرتے ہوئے کہ دہلی میں برطانوی عورتوں پر بغاوت کے شروع میں جنسی تشدد ہوا تھا۔۔۔ ایک افواہ جو بالآخر بعد میں بالکل جھوٹ ثابت ہوئی۔۔۔ برطانوی افسروں نے اپنے آدمیوں کو دہلی کی عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کو روکنے کے لئے کچھ نہ کیا۔'' نسل پرستی کے تجزیے کی غیر موجودگی میں وہ نہیں سمجھ سکتا کہ کیوں برطانوی عورتوں پر ہندوستانی مردوں کے جنسی تشدد کے ''بالکل جھوٹے'' الزامات اس وقت موثر اور اتنے پھیلے ہوئے کیوں تھے اور نہ ہی وہ یہ مان سکتا ہے کہ ایسے الزامات کے ساتھ یا ان کے بغیر کالونیائی گئی عورتوں پر جنسی تشدد تو

کالونیائی جبر کا براعظموں اور صدیوں کے پار لازمی حصہ رہا ہے۔ شاید یہ بات حیران کن نہیں ہے پھر کہ ڈالریمپل واقعات کے غالب احوال کی تصدیق کرتا ہے کہ برطانوی مظالم خاص حوالے ''سزا'' کے طور پر کانپور میں کیئے گئے برطانوی عورتوں اور بچوں کے قتل کے بدلے میں کیئے گئے۔ حقیقت میں کرنل جیمز کے ایل اور اس کے ساتھیوں نے دیہی علاقوں میں تو دہشت کا بازار پہلے ہی گرم کر دیا تھا، گاؤں کے گاؤں جلا ڈالے، ''مقامی کالوں'' کو پھانسیاں دیں، ہزاروں آدمیوں عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ کانپور کے قتل عام سے بہت پہلے!

اور جبکہ ڈالریمپل بڑا جذباتی ہو جاتا ہے ''گلی کی سطح کی فطرت'' والے دستاویزات جو اس نے ڈھونڈ نکالے ہیں اور جو ''دہلی کے عام شہریوں سے متعلق ہیں'' حقیقت یہ ہے کہ کتاب کی غالب اکثریت، جہاں اکثر بیان کیئے گئے بہت سے برطانوی افسروں اور سویلینوں کا تذکرہ نہیں کر رہا۔ وہ شہر کے مغل اشرافیہ کے نکتہء نظر سے لکھ رہا ہے۔ یہ نکتہ نظر گو تاریخی دلچسپی والا ہے، واضح ہے محدود کرنے والا بھی ہے خاص طور سے جب یہ بغاوت کے واقعات کی بات کرتا ہے، تو بہت اہم مظاہر سے پہلو تہی کرتا ہے مثلاً باغیوں کی طرف سے نیم ریپبلکن سپاہی کونسلوں کا قیام درحقیقت ڈالریمپل سپاہیوں کی تصویر کشی کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ جو کہ اس بغاوت کا مرکز تھے ہر چیز میں سوائے ان معنوں کے جن میں مغل اشرافیہ انہیں دیکھتی تھی: ''گنوار اور متشدد کسان بہار اور اتر پردیش کے آئے ہوئے۔''

ایسے وقت میں جبکہ یو ایس انتظامیہ ہمیں ترغیب دینے کی کوشش کر رہی ہے کہ ہم حالیہ واقعات کو ''تہذیبوں کے تصادم'' کے مسخ شدہ شیشوں سے دیکھیں، ڈالریمپل اس اصرار سے کہ اقتصادی کایا کلپ ''عام افراد'' کی زندگیوں کے لئے کوئی علاقہ نہیں رکھتی اور مذہبی محرکات پر اس کا ضدی زور تاریخ کو دوبارہ اسی تصور میں گھڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 1857 اور ہم عصر دنیا کے درمیان حقیقی مماثلت، جیسا کہ وہ چاہتا ہے کہ ہم لڑا کا اسلام اور عیسائیت کے درمیان تصادم میں یقین کریں، لیکن جارح توسیع پسند سامراج اور عوامی مزاحمت جو کہ متفرق اور گوناگوں شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے سے اغماص برتیں۔

❁❁❁❁❁

جنگِ آزادی کی سو (100) سالہ یادگار

دو پبلک جلسے، دو متضاد توجیہات

نامہ نگار ''لیل ونہار'' کراچی

کراچی کو اب تک مسلم لیگ کا گڑھ تصور کیا جاتا رہا ہے لیکن پچھلے دنوں کچھ ایسے واقعات پیش آئے ہیں جو حالات کے رُخ پر ایک نئے زاویئے سے روشنی ڈالتے ہیں:

نیشنل اسمبلی نے ایک ماہ قبل جب پورے پاکستان کے لئے مخلوط انتخاب کا قانون منظور کیا تو مسلم لیگ نے اس کے خلاف ایک زبردست مہم چلانے کی ٹھانی۔ مسلم لیگ کے اس فیصلے سے عوامی لیگ اور ری پبلکن پارٹی کے حلقوں میں کچھ تشویش بھی محسوس کی جانے لگی تھی۔ یہاں تک کہ مسلم لیگ کے اس چیلنج سے نمٹنے کے لئے اعلیٰ افسروں اور وزیروں کی سطح پر تدبیریں بھی سوچی گئیں۔ ایک اطلاع کے مطابق وزراء تو اس درجہ ہراساں تھے کہ انہوں نے کراچی کے چیف کمشنر سے یہ وعدہ لینے کی بھی کوشش کی تھی کہ اگر مسلم لیگ نے سول نافرمانی جیسی کوئی تحریک چلائی اور بڑے پیمانے پر مظاہرے کئے تو ان کو ناکام بنانے کے لئے کم سے کم طاقت استعمال کی جائے گی۔ کہا جاتا ہے کہ چیف کمشنر نے اب کوئی وعدہ کرنے سے اس بناء پر معذوری ظاہر کی کہ معاملات کا تعلق نظم ونسق سے ہے اور امن وامان قائم رکھنے کے لئے جو اقدامات ضروری ہوتے ہیں ان پر عمل کرنے میں کوتاہی نہیں کی جاسکتی۔

لیکن معاملات اس سے آگے نہیں بڑھے کہ مسلم لیگ نے دو جلسے کئے اور دو جلوس نکالے۔ پہلا جلوس تو محض چند سو افراد پر مشتمل تھا اور دوسرا بھی ہزار ڈیڑھ ہزار سے زیادہ نہیں بڑھ سکا۔

دس مئی کو 1857ء کی صد سالہ یادگار منانے کے لئے مسلم لیگ اور نیشنل پارٹی کی طرف سے

جلسے کرنے کے اعلانات کئے گئے۔ دونوں جلسے چونکہ ایک ہی وقت یعنی رات کے 9 بجے شروع ہونے تھے اس لئے عام لوگوں کا یہی خیال تھا کہ نیشنل پارٹی کا جلسہ ناکام ہو جائے گا۔ کراچی میں مسلم لیگ کی سابقہ مقبولیت کے مدنظر خود نیشنل پارٹی کے بعض کارکنوں کو اس بات کا احساس تھا کہ انہوں نے جلسے کے وقت کا تعین کرنے میں غلطی کی ہے۔ وہ ڈر رہے تھے کہ چونکہ ان کی پارٹی کا مرکزی دارالحکومت میں یہ پہلا جلسہ عام ہوگا۔ اس لئے کہیں ناکام نہ ہو جائے۔ لیکن توقعات کے خلاف یہ جلسہ جس میں میاں افتخار الدین اور جی ایم سیّد نے تقریریں کیں خاصا کامیاب رہا۔

ایک اور خاص بات یہ تھی کہ مسلم لیگ کے جلسے میں جس سے سردار نشتر اور چودھری خلیق الزمان جیسے چوٹی کے لیگی لیڈروں نے خطاب کیا، حاضرین کی تعداد صرف مہاجرین پر مشتمل تھی۔ اس کے برعکس نیشنل پارٹی کے جلسے میں سندھی، پنجابی، پٹھان اور مہاجرین سبھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔

ایک اور قابل غور بات یہ بھی تھی کہ اس طرح کے عام جلسوں میں کراچی کا پڑھا لکھا طبقہ بہت کم شرکت کرتا ہے لیکن جہانگیر پارک میں نیشنل پارٹی کے جلسے میں اس طبقے کی خاصی تعداد موجود تھی۔

اس صورت حال کے باوجود یہ کہنا غالباً غلط اور قبل از وقت ہوگا کہ کراچی میں مسلم لیگ کے مقابلے میں نیشنل پارٹی زیادہ مقبول ہے لیکن یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ لوگ غالباً پٹے پٹائے نعروں اور خالی خولی تقریروں سے اُکتا چکے ہیں۔ یہ خیال چنداں غلط نہیں، کہ نیشنل پارٹی کے جلسے میں وہ شرکت کے لئے اس لئے آئے تھے کہ یہ اس کا پہلا جلسہ تھا۔ اور وہ یہ اندازہ لگانا چاہتے تھے کہ دیکھیں اس نئی پارٹی کے پاس لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے کیسے خیالات اور نظریے ہیں۔

بہر حال مسلم لیگ کو یہ اندازہ ضرور ہو جانا چاہئے کہ اگر اسے کراچی میں اپنی مقبولیت قائم رکھنی ہے تو اپنے پیغام کو زیادہ جاندار اور باعمل بنانے کی کوشش کرنی پڑے گی۔

دونوں جلسوں میں 1857ء کی جنگ آزادی کی بالکل متضاد توجیہات کی گئیں۔ لیگ نے اسے جنگ آزادی ماننے سے انکار کیا ہے تو دوسری طرف نیشنل پارٹی نے اس کو برصغیر پاک و ہند کی جنگ آزادی کا سنگ میل قرار دیا ہے۔

مسلم لیگ کے لیڈروں نے اپنی تقریروں میں تمام زور مخلوط انتخاب کی مذمت پر صرف کیا تو نیشنل پارٹی نے نوآبادیاتی نظام اور بیرونی غلامی کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے پر۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ رائے عامہ ان توجیہات سے کیا اثرات لیتی ہے۔

❁❁❁❁❁

ملکہ وکٹوریہ کا اعلان

کمپنی کا راج اب ختم ہوا، اس کی جگہ حکومتِ ہندوستان کی باگ ہم نے اپنے ہاتھوں میں لے لی ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ہماری انگریزی رعایا کے قتل میں حصہ لینے کے مجرم ہیں، باقی جو لوگ بھی ہتھیار رکھ دیں گے ان سب کو معاف کر دیا جائے گا۔ ہندوستانیوں کی گود لینے کی رسم آئندہ سے جائز سمجھی جائے گی اور گود لئے لڑکے کو باپ کی جائیداد اور گدی کا مالک مانا جائے گا۔ کسی کے مذہبی عقیدوں، یا مذہبی رسم و رواج میں کسی طرح کی مداخلت نہ کی جائے گی۔ ہندوستان والیان ریاست کے ساتھ کمپنی نے اس وقت تک جتنے عہد نامے کئے ہیں ان کی سب شرطوں پر آئندہ ایمانداری کے ساتھ عمل درآمد کیا جائے گا۔ اس کے بعد کسی ہندوستانی رئیس کی ریاست یا اس کا کوئی حق نہ چھینا جائے گا۔

❁❁❁❁❁

حضرت محل کا جواب

اس کے جواب میں بیگم حضرت محل کہ جنہوں نے اودھ میں جنگ لڑی تھی، یہ جواب دیا:

اس اعلان میں لکھا ہے کہ کمپنی نے جو وعدے اور عہد و پیمان کئے ہیں، ملکہ انہیں منظور کرے گی۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ اس چال کو غور سے دیکھ لیں۔ کمپنی نے سارے ہندوستان پر قبضہ کرلیا ہے...... کمپنی نے بھرت پور کے راجہ کو پہلے اپنا بیٹا بنایا پھر اس کا علاقہ لے لیا۔ لاہور کے راجا کو وہ لندن لے گئے اور پھر کبھی اسے ہندوستان نہیں لوٹنے دیا۔ نواب شمس الدین خان کو ایک طرف انہوں نے پھانسی پر لٹکا دیا، دوسری طرف اسے سلام کیا۔ پیشوا کو انہوں نے پونا اور ستارا سے نکال دیا اور زندگی بھر کے لئے بٹھور میں قید کر دیا۔ بنارس کے راجہ کو انہوں نے آگرہ میں قید کر دیا۔ بہار، بنگال اور اڑیسہ کے راجاؤں کا انہوں نے نام و نشان تک نہ چھوڑا، خود ہمارے قدیم علاقے ہم سے یہ بہانہ کر کے لے لئے کہ فوج کو تنخواہیں دینی ہیں۔ ہمارے ساتھ جو عہد نامہ کیا اس کی دفعہ 7 میں قسم کھائی گئی تھی ہم آپ سے اور زیادہ کچھ نہ لیں گے۔ اس لئے جو انتظام کمپنی نے کر رکھے ہیں، وہ اگر قائم رکھے جائیں گے تو اس سے پہلے کی حالت میں اور اب نئی حالت میں کیا فرق ہوا؟

❁❁❁❁❁

1857 کے بارے میں شاعری

قطعہ

بس کہ فعالِ ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دلّی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنہء خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیا شکوہ
سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مِلنے دل سے داغ ہجراں کا

مرزااسداللہ غالب

☆☆☆

فُغانِ دہلی

آفت اس شہر میں قلعے کی بدولت آئی
والی کے اعمال سے دلّی کی بھی شامت آئی
روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی
کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی
گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جن کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا
اہل نااہل سے کچھ خلط انہیں زنہار نہ تھا
اُن کی خلوت سے کوئی واقف و ہم راز نہ تھا
آدمی کیا ہے فرشتے کا بھی واں بار نہ تھا
وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشاں در در
خاک بھی ملتی نہیں اُن کو کہ ڈالیں سر پر

زیور الماس کا بھی جن سے نہ پہنا جاتا
بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا
گاچ کا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا
لاکھ حکمت سے اوڑھاتے نہ اوڑھایا جاتا
سر پہ وہ بوجھ لیے چار طرف پھرتے ہیں
دو قدم چلتے ہیں مشکل سے، تو پھر گرتے ہیں
عیش و عشرت کے سوا جن کو نہ تھا کچھ بھی یاد
لٹ گئے کچھ نہ رہا ہو گئے بالکل برباد
ٹکڑے ہوتا ہے جگر سُن کے یہ ان کی فریاد
پھر بھی دیکھیں گے الٰہی کبھی دہلی آباد
کب تلک داغِ دل ایک ایک کو دکھلائیں ہم
کاش ہو جائے زمیں شق تو سما جائیں ہم
روزِ وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے
مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

محمد صدرالدین آزردہ

☆☆☆

دلّی و لکھنو

ہو گئے ویران دہلی و دیارِ لکھنو
اب کہاں وہ لطفِ دہلی و بہارِ لکھنو
تھا وہ حسن بخت دہلی غیرت صد لالہ زار
رشکِ صد گلزار تھا ایک ایک خارِ لکھنو
سو فلک نے یوں کیا دہلی کو تو پامال جور
اور کیا وقف جفا ہر برگ و بارِ لکھنو
غم میں دہلی کے گلوں کے تو گریباں چاک ہیں
اور سوسن ہے چمن میں سوگوارِ لکھنو
ٹکڑے ہوتا ہے جگر دہلی کے صدمے سن کے عیش
اور دل پھٹتا ہے سن کر حال زارِ لکھنو

حکیم آغا جان عیش

☆☆☆

مصائب قید

فرخ آباد اور یارانِ شفیق
چُھٹ گئے سب گردش تقدیر سے
آئے باندہ میں مقید ہو کے ہم
سو طرح کی ذلّت و تحقیر سے

جس قدر احباب خالص تھے وہاں
درگزر کرتے نہ تھے تدبیر سے
پر کہوں کیا کاوش اہلِ نفاق
تھے وہ خوں ریزی میں بڑھ کے تیر سے
باندھ کے زندان میں لاکھوں ستم
سہتے تھے ہم گردشِ تقدیر سے
کوٹھری گرمی میں دوزخ سے فزوں
دست و پا بدتر تھے آتش گیر سے
تھا بچھونا ٹاٹ کمبل اوڑھنا
گرم تر پشمینۂ کشمیر سے
محنت و مزدوری و تکلیف و رنج
تھا زیادہ حیطۂ تحریر سے
اس جہنم کے موکل سب کے سب
دشمنی رکھتے تھے بے تعقید سے
قاتل اشراف و اہل علم تھے
رنج پہنچاتے تھے ہر تدبیر سے
پھر الہ آباد میں بھجوا دیا
ظلم سے تلبیس سے تزویر سے
ننگی تلواریں کھنچی تھیں گرد و پیش
نوک سنگینوں کی بدتر تیر سے
جو الہ آباد میں گزرے ستم
ہے فزوں تقریر سے تحریر سے
پھر ہوئے کلکتے کو پیدل رواں
گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے

ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں
ناتواں تر قیس کی تصویر سے
بے حواس و بے لباس و بے دیار
دل گرفتہ جورِ چرخ پیر سے
سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے
تھی غرض تقدیر کو تشہیر سے
کالے پانی میں جو پہنچے یک بیک
کٹ گئی قید ستم تقدیر سے

منیر شکوہ آبادی

☆☆☆

مرثیہء دہلی

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلی
بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دلی
جواب کا ہے کو تھا لاجواب تھی دلی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلی
پڑی ہے آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا
تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یہاں وہاں کے جہاں کو ہلاک کر ڈالا
غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا

جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو مہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں میں جو پتیاں گلاب کی تھیں

لہو کے چشمے ہیں چشم پُرآب کی صورت
شکستہ کاسہء سر ہیں حباب کی صورت
لٹے ہیں گھر دل خانہ خراب کی صورت
کہاں یہ حشر میں توبہ عتاب کی صورت
زبانِ تیغ سے پرسش ہے داد خواہوں کی
رسن ہے، تیغ ہے گردن ہے بے گناہوں کی

زمیں کے حال پہ اب آسمان روتا ہے
ہر اک فراقِ مکیں میں مکان روتا ہے
کہ طفل و عورت و پیر و جوان روتا ہے
غرض یہاں کے لیے اک جہان روتا ہے
جو کہیے جوششِ طوفاں کہیں نہیں جاتی
یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

برنگِ بوئے گل اہل چمن، چمن سے چلے
غریب چھوڑ کے اپنا وطن، وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بے چارے کس چلن سے چلے
قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے
مقام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

بنا ہے خالِ سیاہ رنگ مہ جمالوں کا
دوتا ہوا ہے قدِ راست نونہالوں کا
جو زور آہوں کا لب پر تو شور نالوں کا
عجیب حال دگرگوں ہے دلی والوں کا
کوئی مراد جو چاہی حصول بھی نہ ہوئی
دعائے مرگ جو مانگی قبول بھی نہ ہوئی

پئے محاسبہ پرسش ہے نکتہ دانوں کی
تلاش بہر سیاست ہے خوش زبانوں کی
جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی
کہ حکمِ عام ہے بھرتی ہو قید خانوں کی
یہ اہلِ سیف و قلم کا ہو جب کہ حالِ تباہ
کمال کیوں نہ پھرے دربدر کمال تباہ

غضب ہے بخت بد ایسے ہمارے ہو جائیں
کہ ہیں جو لعل و گہر سنگ پارے ہو جائیں
جو دانے چاہیں تو خرمن شرارے ہو جائیں
جو پانی مانگیں تو دریا کنارے ہو جائیں
پئیں جو آبِ وفا بھی تو زہر ہو جائے
جو چاہیں رحمتِ باری تو قہر ہو جائے

مرزاداغ دہلوی

☆☆☆

مرثیۂ دہلی

ذکر بربادیِ دہلی کا سنا کر ہمدم
نشتر اک زخمِ کہن پر نہ لگانا ہرگز
آبِ رفتہ نہیں پھر بحر میں پھر کر آتا
دہلی آباد ہو یہ دھیان نہ لانا ہرگز
وہ تو باقی ہی نہیں جس سے کہ دہلی تھی مراد
دھوکا اب نام پہ دہلی کے نہ کھانا ہرگز
گیتی افروز اگر حضرت نیّر رہتے
اتنا تاریک نہ ہوتا یہ زمانہ ہرگز
اب تو یہ شہر ہے اک قالبِ بے جاں ہمدم
کچھ یہاں رہنے کی خوشیاں نہ منانا ہرگز
درِ میخانہ ہوا بند صدا ہو یہ بلند
یاں حریفانِ قدح خوار نہ آنا ہرگز
رہی یارانِ گزشتہ کی کہانی باقی
یہ تو بھولا ہے نہ بھولے گا فسانہ ہرگز

میر مہدی مجروح

☆☆☆

دہلی مرحوم

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
ڈھونڈتا ہوں دلِ شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
لیکے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہے یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہو گا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دہلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہو گی یارو
یاد کرکر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز
غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

خواجہ الطاف حسین حالیؔ

☆☆☆☆☆

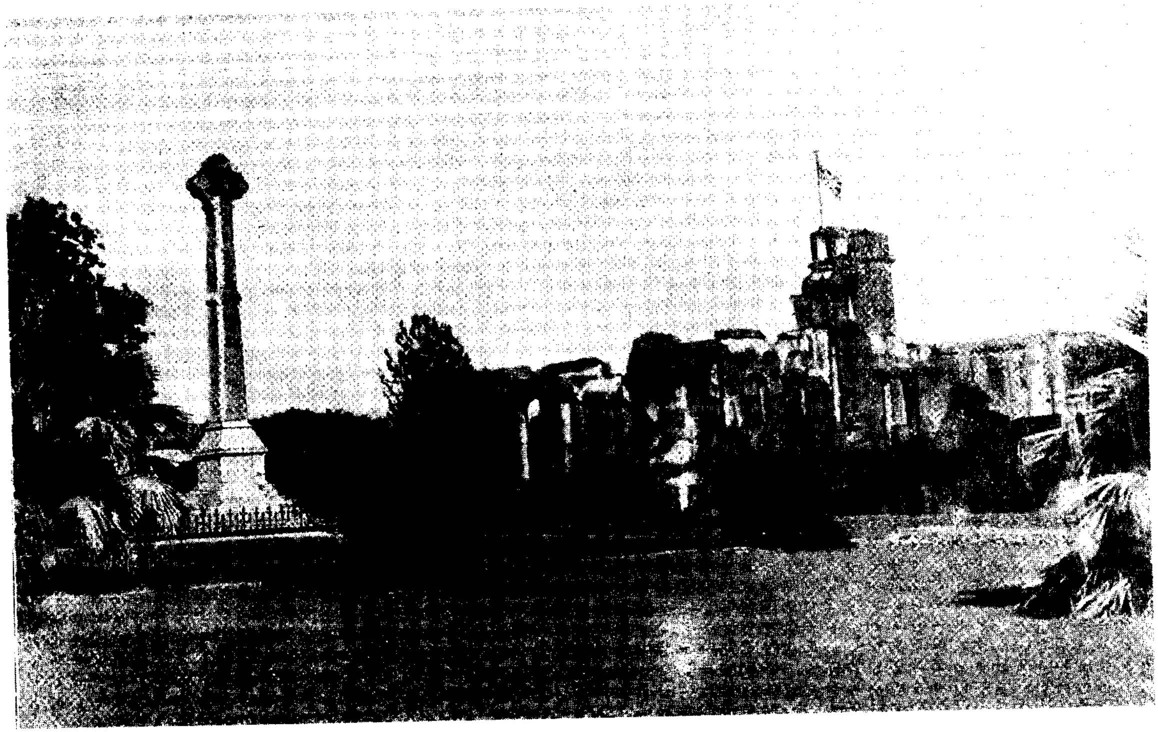

لکھنو ریذیڈنسی اور یادگار لارنس

1857 سے پہلے کے ہندوستانی انقلابی مراکز

جھانسی کی رانی لکشمی بائی

لکشمی بائی کی مہر

منگل پانڈے

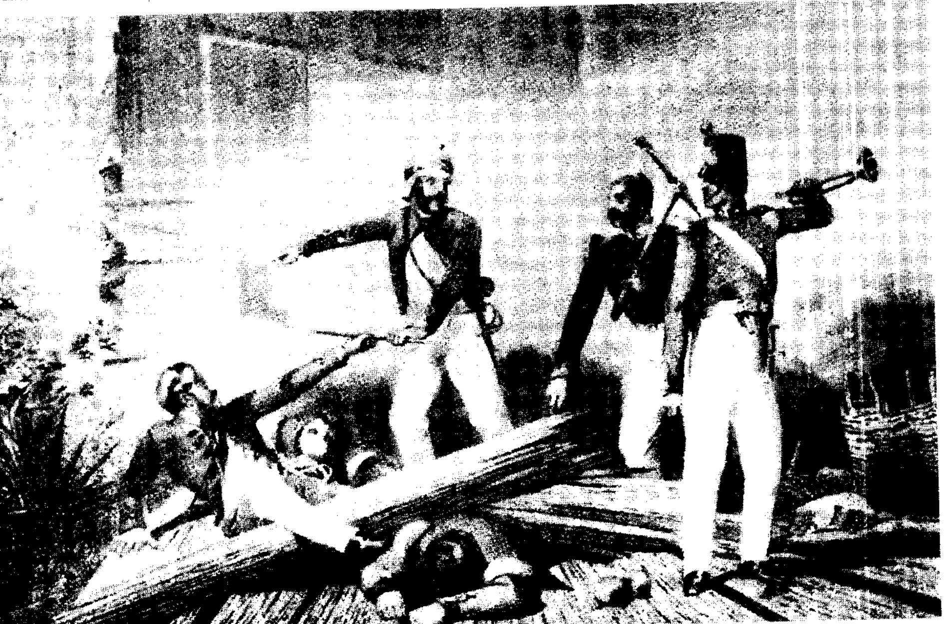

برطانوی فوجی دستہ کشمیری گیٹ دلی پر دھاوا بولتے ہوئے

1860 کے کسان

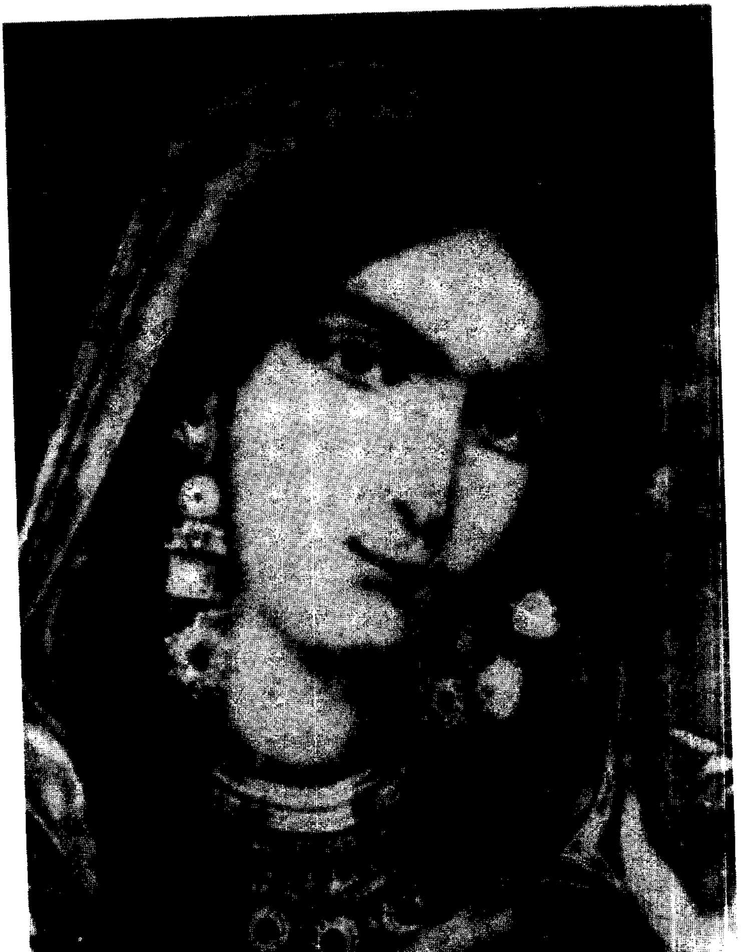

بیگم حضرت محل

سکھ ہارس رجمنٹ لکھنو

ٹاٹیا ٹوپ پھانسی کی سزا ملنے سے کچھ دیر پہلے

ناناصاحب کی فوج کا کمانڈر جوالا پرشاد

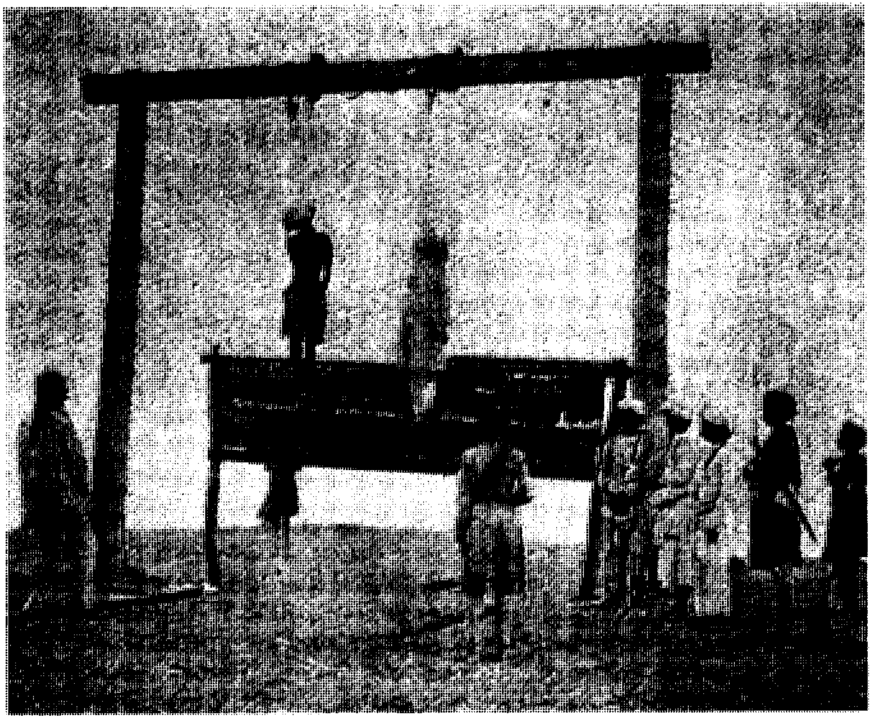

باغیوں کو پھانسی پر لٹکایا جارہا ہے

دلی کا تباہ شدہ کشمیری گیٹ

ناناصاحب

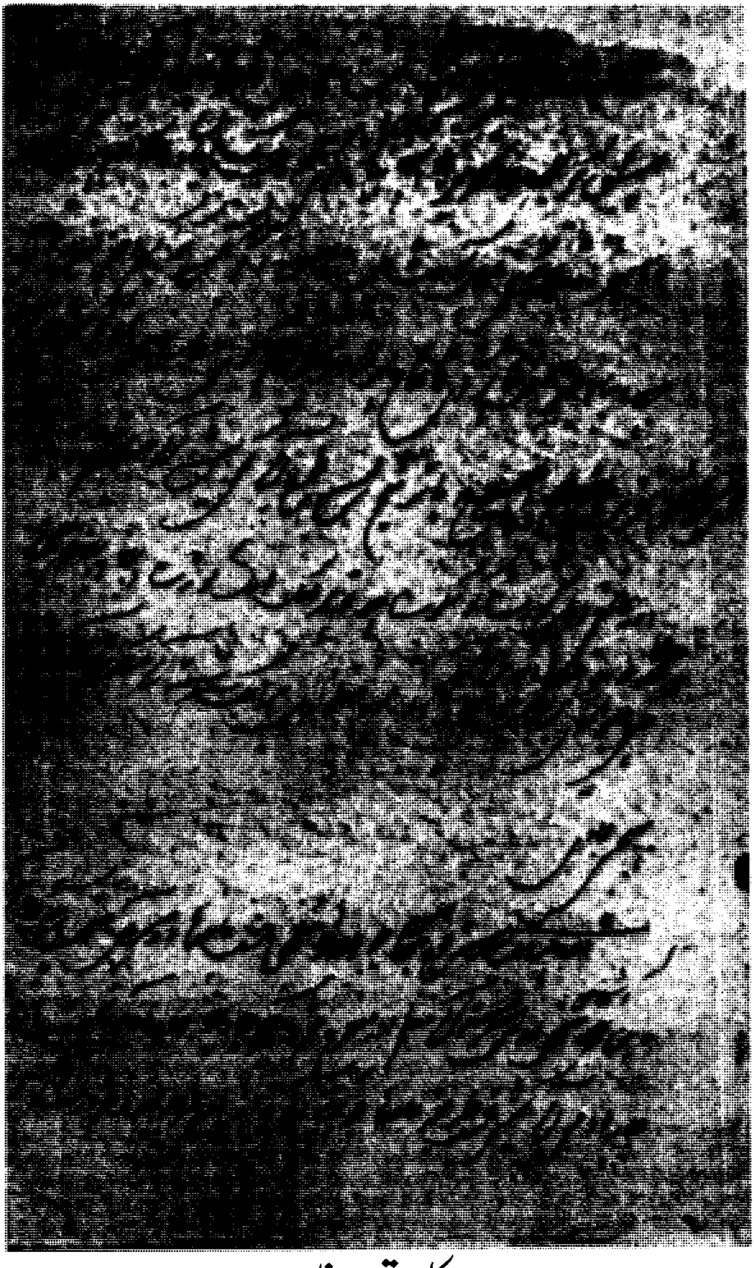

1857 کا دستور بغاوت

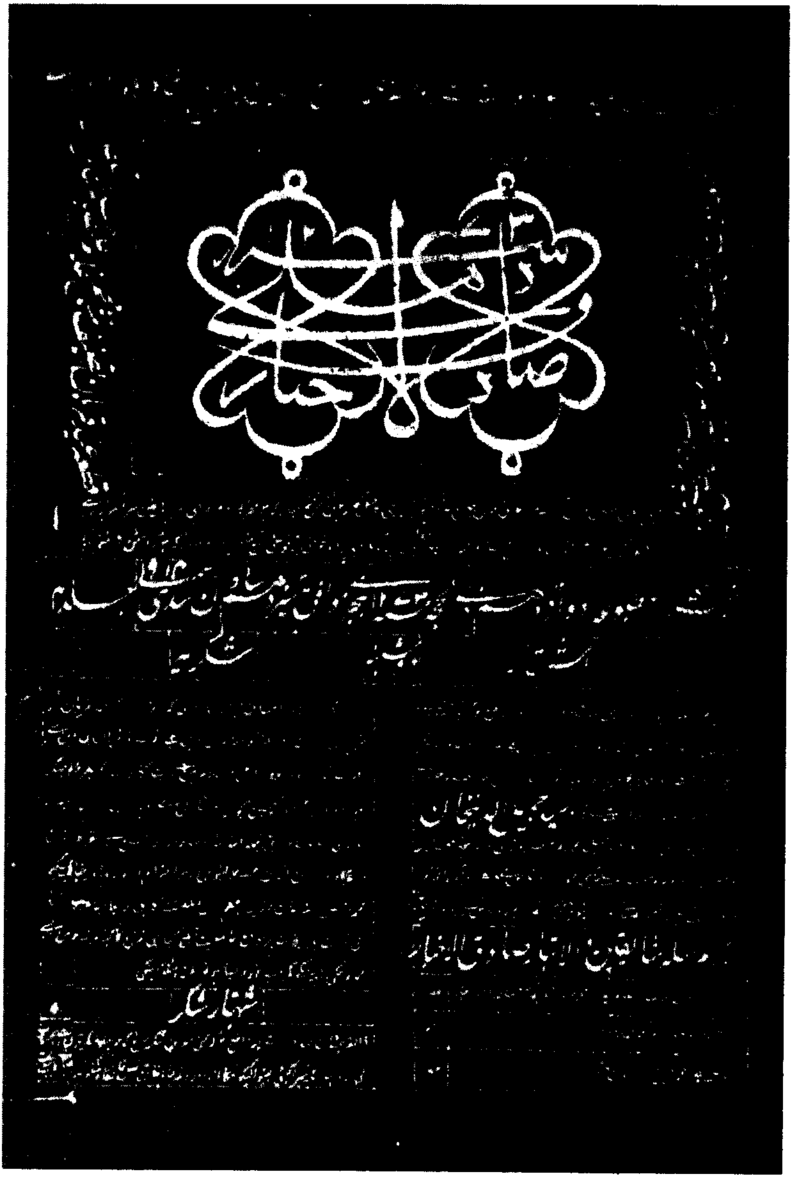

دلی کے اردو اخبار میں چھپنے والا بہادر شاہ ظفر کا اعلان

غازیوں میں بُو رہے گی جب تلک ایمان کی
تختِ لندن تک چلے گی تیغ ہندستان کی

بہادر شاہ ظفرؔ

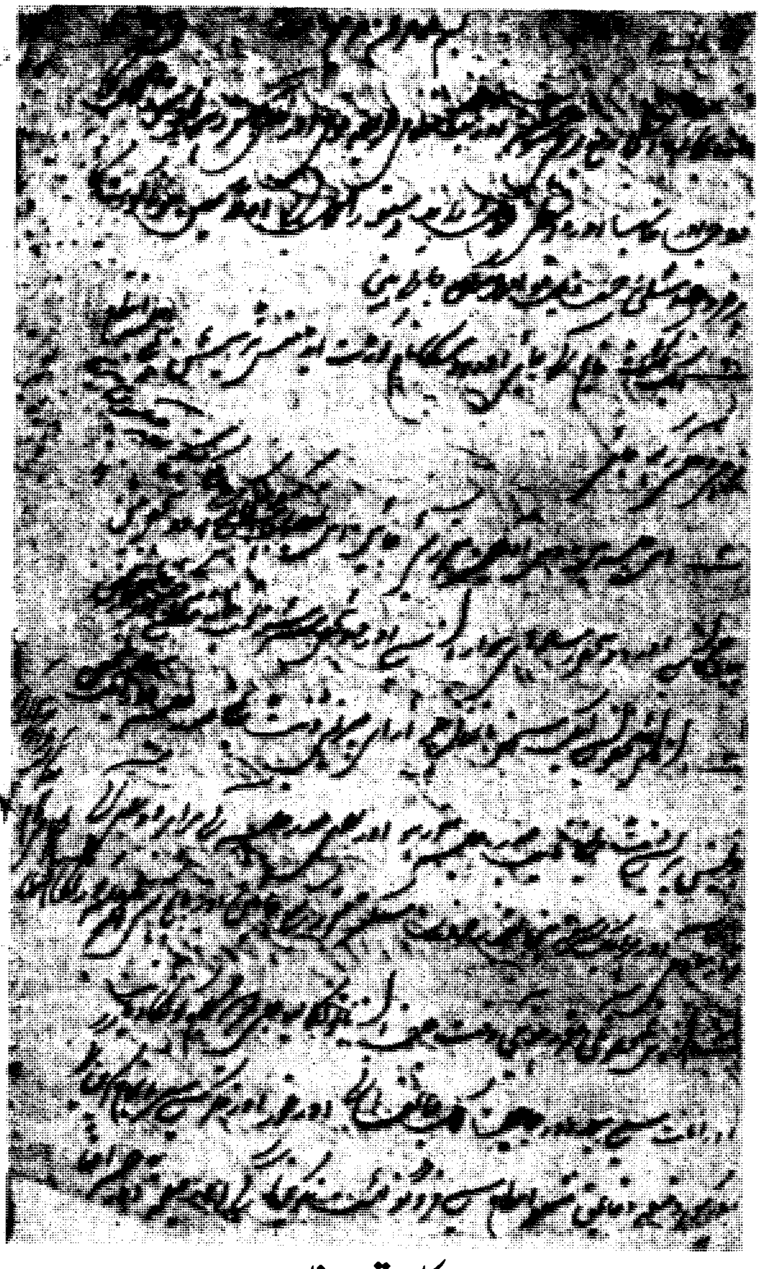

1857 کا دستور بغاوت